یادِ عہدِ رفتہ

ڈاکٹر عبادت بریلوی

ڈاکٹر عبادت بریلوی

یادِ عہدِ رفتہ

[خود نوشت]

اِدارۂ ادب و تنقید ○ لاہور

GIFT

ACCESSION 12392

۸۹۱۵۴۳۹.۹۲
ع ۱۲ ی

تصنیف : یادِ عہدِ رفتہ (خود نوشت)
مُصنف : پروفیسر ڈاکٹر عبادت بریلوی
ناشر : فریدالدین ناظم ادارۂ ادب و تنقید لاہور
کتابت : عبدالحق اکبر آبادی
مطبع : لاہور آرٹ پریس۔ لاہور
سرورق : سید انور حسین شاہ نفیس رقم
اہتمام : سیّد محمد ابراہیم جامعہ اشرفیہ لاہور
جلد سازی : مدنی بک بائینڈنگ ہاؤس لاہور
تاریخ اشاعت : ۱۹۸۸ء
تعاون : اکادمی ادبیات پاکستان
قیمت : سَو روپے

والدِ محترم

اور

والدہ محترمہ

کی

یاد میں

◆

زندگانی تھی تری مہتاب سے تابندہ تر
خوب تر تھا صبح کے تارے سے بھی تیرا سفر
مثلِ ایوانِ سحر مرقد فروزاں ہو ترا
نور سے معمور یہ خاکی شبستاں ہو ترا
آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

علامہ اقبالؒ

◆

عبادت بریلوی

دِل ہمارے یادِ عہدِ رفتہ سے خالی نہیں

علامہ اقبالؒ

یادِ عہدِ رفتہ

○

فہرست

○

پیش لفظ ۷
پہلا باب: پٹھانوں کی ایک بستی ۱۱
دوسرا باب: کچھ اپنے خاندان اور آبا و اجداد کے بارے میں ۱۶
تیسرا باب: شہر بریلی کی کچھ یادیں ۴۱
چوتھا باب: لکھنؤ ۵۷
پانچواں باب: امین آباد ہائی اسکول ۹۱
چھٹا باب: گورنمنٹ جوبلی کالج ۱۰۱
ساتواں باب: لکھنؤ یونیورسٹی ۱۲۳
آٹھواں باب: تلاشِ معاش ۱۵۱
نواں باب: اینگلو عربک اسکول ۱۸۱
دسواں باب: آشوبِ قیامت ۲۱۵
گیارہواں باب: دلی کالج ۲۶۳

بارہواں باب: اورینٹل کالج لاہور ۲۸۳
تیرہواں باب: لندن، اسکول آف اورینٹل اینڈ افریقن اسٹڈیز یونیورسٹی آف لندن ۳۱۱
چودہواں باب: پنجاب یونیورسٹی ۳۵۱
پندرہواں باب: انقرہ ۳۸۹
سولہواں باب: تجربات و تاثرات ۳۹۸

پیش لفظ

"میں بہت شرمیلا آدمی ہوں صہبا صاحب!"

"اپنے بارے میں کیا لکھوں؟ میں نے کون سا تیر مارا ہے؟"

انکار کے مدیر صہبا صاحب نے جب بھی مجھ سے اپنی خود نوشت لکھنے پر اصرار کیا، تو میری زبان اور قلم سے یہی دو فقرے نکلے۔

واقعی مجھے اپنے بارے میں بات کرنے سے اُلجھن سی ہوتی ہے۔

لیکن صہبا صاحب عجیب و غریب آدمی ہیں۔ یہ جو چاہیں کر سکتے ہیں جس سے جو چاہیں لکھوا سکتے ہیں۔ کسی کو لکھنے پر آمادہ کرنا تو اُن کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔

چار پانچ سال سے بھی زیادہ کا عرصہ گزرا کہ وہ ہر ملاقات میں مجھ سے خود نوشت لکھنے کا تقاضا کرتے رہے۔ اس سلسلے میں خط بھی انھوں نے بے شمار لکھے۔ میں ٹالتا رہا لیکن وہ نہ مانے۔

بالآخر اس بات پر فیصلہ ہوا کہ میں اپنے بارے میں کم، اپنے زمانے اور ماحول کے بارے میں زیادہ لکھوں گا تاکہ جو کچھ میں نے گزشتہ نصف صدی میں دیکھا ہے، جو حالات مجھے نظر آئے ہیں، جو واقعات میری آنکھوں کے سامنے سے گزرے ہیں، جن بزرگوں اور دوستوں سے میں نے اثر قبول کیا ہے ان سب کی اَن گنت تصویروں کا ایک مرقع تیار کر سکوں۔

اس خیال سے کہ شاید اس مُرقع کی تصویریں، اپنے خطوط اور رنگ، معنویت اور افادیت کی وجہ سے موجودہ نسل کے لیے اور آئندہ نسلوں کے لیے بھی کسی حد تک مفید اور

خاصی حد تک دلچسپی کا باعث بن سکیں گی۔

گزشتہ نصف صدی ہماری سیاسی، معاشرتی، تہذیبی، علمی و تعلیمی اور ذہنی و فکری زندگی میں بڑی اہمیت کی مالک ہے۔ اس زمانے میں آزادی کی جدوجہد تیز سے تیز تر ہوئی۔ ہندوستان آزاد ہوا۔ پاکستان کا قیام عمل میں آیا۔ عظیم سیاسی رہنما، بلند پایہ شاعر اور ادیب یگانۂ روزگار مفکر اور دانشور، عظیم اساتذہ اور ماہرِ تعلیم، شعلہ بیان خطیب اور مقرر، قلم کو تلوار بنانے والے صحافی اور اہلِ قلم اس زمانے میں پیدا ہوئے۔

میں ان خوش قسمت لوگوں میں سے ہوں جنھیں اس مخصوص ماحول اور ان معروف شخصیتوں کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا اور میں نے اس ماحول اور ان شخصیتوں سے بہت کچھ بلکہ سب کچھ حاصل کیا۔ زندگی کی راہوں میں ان کی وجہ سے جو مشعلیں سی فروزاں ہوئیں ان کی روشنی میں مَیں نے بھی اپنا سفر شروع کیا اور مجھے اَن گنت ایسی منزلوں سے ہم کنار ہونے کا موقع ملا جو میری زندگی کا بہت بڑا سرمایہ ہیں۔ ایسے ایسے تجربات ہوئے جن کی تفصیل ایک حکایتِ لذیذ کی حیثیت رکھتی ہے اور اس حکایتِ لذیذ میں زندگی کو بنانے، محنت اور لگن سے کام کرنے، انسانیت اور انسانی قدروں سے اپنے آپ کو آشنا کرنے کے جو اَن گنت پہلو ملتے ہیں وہ شاید لوگوں کے لیے کسی حد تک دلچسپی کا باعث بن سکتے ہیں۔

اسی خیال سے میں اس حکایت کو قلم بند کرنے کے لیے آمادہ ہوا ہوں۔ یہ حکایت کسی حد تک لذیذ ضرور ہے لیکن اتنی لذیذ نہیں کہ اس کو دراز سے دراز تر بنا کر پیش کیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ اس میں تفصیل کے بجائے جہاں تک ہو سکا ہے، اختصار سے کام لیا گیا ہے۔ البتہ جگہ جگہ اشاروں اور کنایوں میں بہت کچھ کہنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس میں واقعات بھی ہیں اور مسائل و معاملات بھی، مشاہدات و تجربات بھی ہیں اور احساسات و تاثرات بھی، جذبات و خیالات بھی ہیں اور عقل و شعور کے معاملات بھی۔

غرض یہ کہ زندگی، زمانے اور ماحول نے جو کچھ بھی مجھے دیا، جن پہلوؤں سے بھی مالا مال کیا، میری داخلی زندگی میں جو چراغ روشن کیے اور خارجی زندگی میں جو مشعلیں سی فروزاں کیں اور ان کی بدولت دل و دماغ پر جو تصویریں مختلف اوقات میں ابھرتی رہیں ان کو میں نے حتی الامکان رنگین اور پُرکار بنا کر کاغذ پر منتقل کرنے کی اپنی سی پوری کوشش کی ہے۔

یہ رودادِ حیات، جو اس سے قبل رسالۂ افکار کراچی میں بالاقساط چھپتی رہی، اور جو اب "یادِ عہدِ رفتہ" کے نام سے کتابی صورت میں شائع کی جا رہی ہے، ایک طالب علم، ایک استاد، اور ادب سے دلچسپی رکھنے والے ایک ایسے انسان کی زندگی کے نشیب و فراز کی کہانی ہے، جس نے زندگی کو ہمیشہ ذوقِ پرواز ہی تصور کیا، جو جہدِ مسلسل، عملِ پیہم، اور محبت و انسانیت کی مشعلوں کو ہاتھ میں لے کر زندگی بھر وادیٔ خیال کو مستانہ طے کرنے میں مصروف رہا، اور جو منزل کی تلاش میں زندگی کی پُرپیچ، ناہموار اور پُرخار راہوں پر چل کر، ان گنت صحراؤں اور ویرانوں کی خاک چھانتا ہوا، اپنے اس سفر میں خدا جانے کہاں کہاں نکل گیا!

۸۸/۸۷- این سمن آباد، لاہور
۷/ اپریل ۱۹۸۸ء

عبادت بریلوی

پروفیسر ڈاکٹر عبادت بریلوی، پرنسپل یونیورسٹی اورینٹل کالج، لاہور

ڈاکٹر عبادت بریلوی

والدمحترم خان حکایت یار خاں

والدہ محترمہ صغریٰ بیگم صاحبہ

ڈاکٹر عبادت بریلوی خاندان کے ساتھ

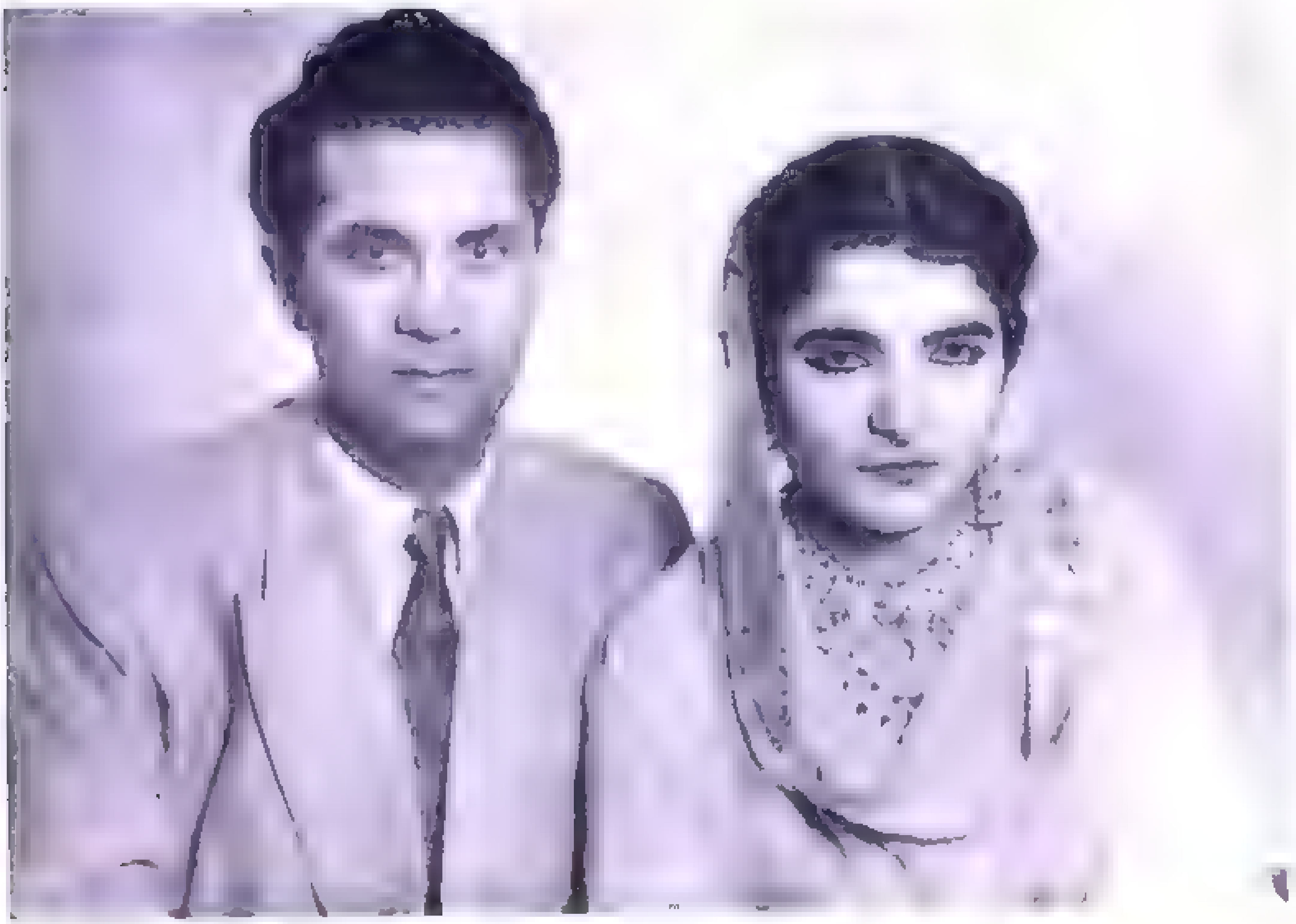

بیگم نمیدہ عبادت ۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی

ڈاکٹر عبادت بریلوی

ڈاکٹر عبادت بریلوی بی۔ بی۔ سی کے پروگرام میں

گروپ مندوبین جشن صدسالہ اورینٹل کالج لاہور

ڈاکٹر عبادت رالف رسل

مرزا کمال بیگ ڈاکٹر عبادت

ڈاکٹر عبادت بریلوی انتظار حسین محترمہ عصمت چغتائی کے ساتھ اورینٹل کالج میں

[illegible]

بیٹا

فرحان عبادت

ڈاکٹر عبادت بریلوی

بین الاقوامی مذاکرۂ غالب ۱۹۶۹ء میں مندوبین کے ساتھ

ڈاکٹر عبادت چینی ادیبوں کے ساتھ اورینٹل کالج لاہور میں

رالف رسل   ڈاکٹر عبادت   ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں

جناب عبدستار، سفیر پاکستان دہلی ڈاکٹر عبادت

پروفیسر آل احمد سرور ڈاکٹر عبادت

حضرت جوش ملیح آبادی کے ساتھ اورینٹل کالج میں

کرسیوں پر۔ میر عشرت حسین، ڈاکٹر ناظر حسن، رئیس احمد خاں، حضرت جوش ملیح آبادی، ڈاکٹر عبادت، سجاد باقر رضوی، تبسم کاشمیری
کھڑے ہوئے۔ اختر علی، منظور الاسلام، ڈاکٹر عبیداللہ خاں، عبدالحفیظ، حسن رضوی، مظفر عباس

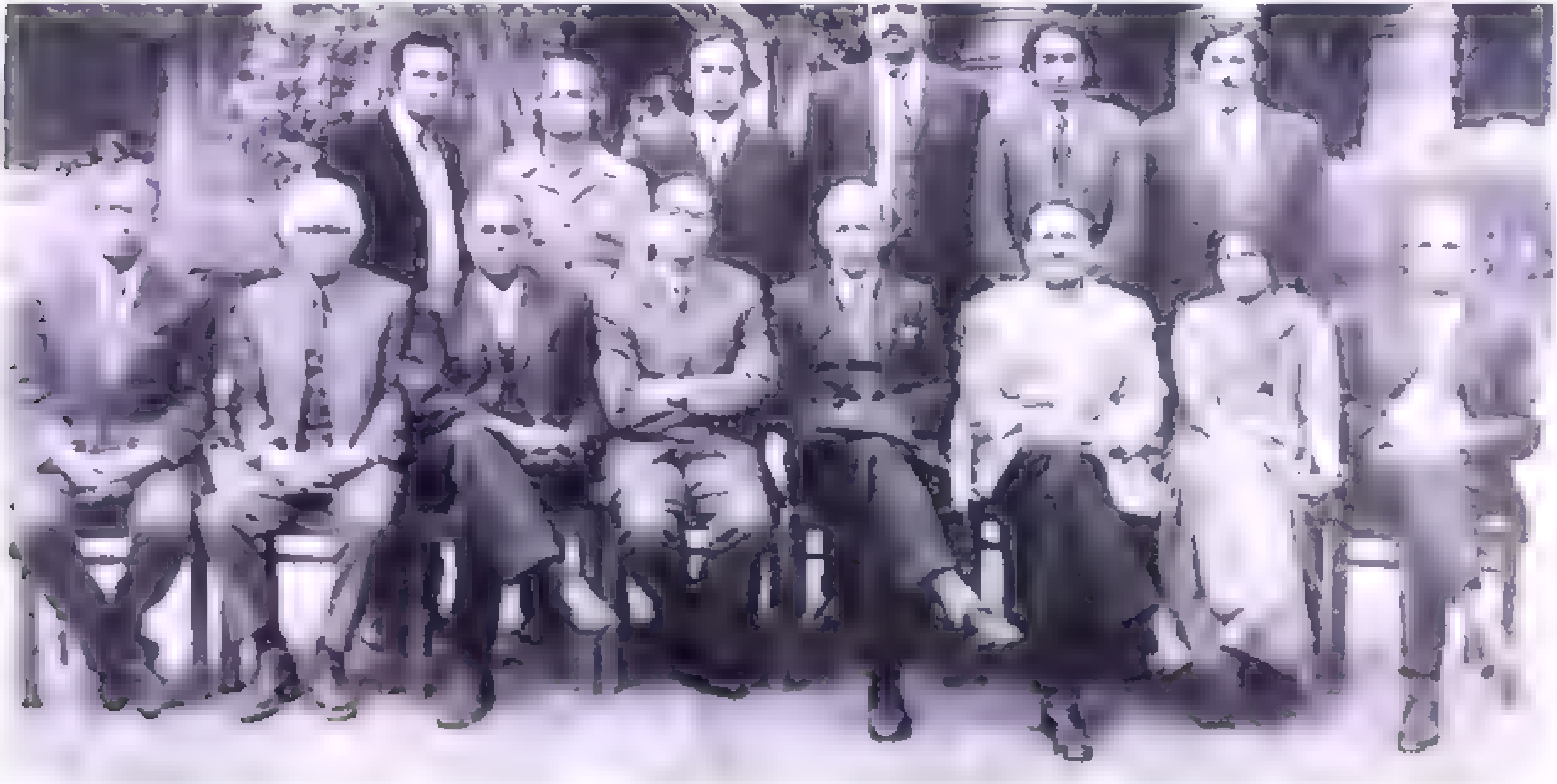

پروفیسر عزیز احمد اورینٹل کالج میں

کرسیوں پر انتظار حسین ۔ کشور ناہید ۔ اشفاق احمد ڈاکٹر وزیر آغا ، پروفیسر عزیز احمد ، ڈاکٹر عبادت ، احمد ندیم قاسمی ۔ ابن انشا

کھڑے ہوئے ۔ سہیل احمد خان ، یونس جاوید ، اکرم چغتائی ، تبسم کاشمیری ، ذوالفقار تابش ، یوسف کامران

پہلا باب

پٹھانوں کی ایک بستی

وہ پٹھانوں کی ایک بستی تھی!

بریلی کا پرانا شہر وہاں ختم ہو جاتا تھا اور یہاں سے حدِ نظر تک میدان اور سبزہ زار سرسبز و شاداب کھیت اور گھنے درختوں والے آم کے باغات نظر آتے تھے۔ زمین کچھ اونچی نیچی تھی۔ نیچے دور ایک تالاب بھی تھا۔ اس تالاب کے سامنے اونچے نیچے ٹیلے تھے جو "بجاے" کہلاتے تھے اور ہم سب اُن کو پہاڑ سمجھتے تھے۔ ان پر بھی سبزہ ہی سبزہ نظر آتا تھا اور دور دور تک باغات ہی باغات تھے، اور ان باغوں کے درمیان اور آس پاس سرسبز و شاداب کھیت لہلہاتے تھے۔ تالاب اور کھیتوں سے متصل دو مزار تھے جنھیں اس بستی کے رہنے والے "زیارتیں" کہتے تھے۔ اور نہایت عقیدت اور احترام کے ساتھ ان پر چراغاں کرتے، فاتحہ پڑھتے اور دعائیں مانگتے تھے۔ زیارتوں پر سیکڑوں سال پُرانے برگد کے درختوں کا سایہ تھا۔ یہ درخت خوبصورت اور پُرشکوہ تھے اور ان کا سایہ نہایت خوش گوار تھا۔ اس لیے گرمیوں کی دوپہر میں لوگ یہاں آرام کرتے تھے، بچے جھولے ڈالتے تھے اور دن بھر جھولا جھولتے تھے۔

شمال اور شمال مشرق کی جانب آبادی بالکل نہیں تھی اور دور دور تک جنگل کا سا سماں نظر آتا جس کو دیکھ کر روح بالیدہ ہوتی تھی۔ سوائے چڑیوں کے چہچہوں کے کوئی اور آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ البتہ باغوں کے درختوں میں سے ہو کر گزرنے والی ہوا کی سنسناہٹ کی

دل نوازی کو محسوس کیا جا سکتا تھا۔

خوبصورتی اور دل نشینی اس سرزمین پر ختم تھی۔ آسمانوں سے باتیں کرنے والے اونچے نیچے درختوں، قدِ آدم گھاس کے جھنڈوں، سرسبز جھاڑیوں، شاداب کھیتوں اور بڑے بڑے میدانوں نے اس سرزمین کو فطرت کے حسن کا شاہکار بنا دیا تھا۔ صبح، دوپہر اور شام کے مناظر ایسے دل کش ہوتے تھے کہ ان میں ڈوب جانے، گم ہو جانے اور کھو جانے کو جی چاہتا تھا۔ خاموشی اپنی زبان میں باتیں کرتی تھی، سکوت دھیمے دھیمے سروں میں نغمے گاتا تھا اور ہر وقت یہ پوری فضا نغمے گاتی اور رقص سا کرتی رہتی تھی۔

شمال اور شمال مشرق کی طرف تو یہ پُر فضا اور روح پر مناظر تھے اور اس کے سامنے دوسری بکھری ہوئی کچھ آبادیاں تھیں۔ ان آبادیوں میں بیشتر پٹھان آباد تھے۔ یہ آبادیاں بیشتر پٹھانوں کے ان قبیلوں کی تھیں جو صدیوں سے یہاں آباد تھے۔ ایک محلہ لودھیوں کا تھا۔ اسی طرح کانکڑوں، دولازاقوں، وڑائیوں، یوسف زئیوں، شیروانیوں، آفریدیوں کے الگ الگ محلے آباد تھے۔ ان ہنود کی آبادیاں یہاں دور دور تک نظر نہیں آتی تھیں۔ ان پٹھانوں نے اپنے رہن سہن اور اپنی معاشرت کے آداب اور طور طریقوں کو چھوڑا نہیں تھا۔ اسی طرح رہتے تھے جس طرح ان کے آبا و اجداد ہندوستان میں آنے سے قبل اپنے علاقوں میں رہتے تھے۔ چھوٹے پیمانے پر یہ افغانستان اور صوبہ سرحد کی بستیاں تھیں۔ مکانوں کا وہی رنگ ڈھنگ تھا۔ مکانوں کے دو حصے ہوتے تھے۔ ایک خواتین کے لیے، دوسرا مردوں کے لیے مخصوص تھا جس سرحدی علاقوں میں حجرہ کہتے تھے لیکن یہاں اس کو بیٹھک کہا جاتا تھا۔ کچھ لوگ ابھی تک اس کو حجرہ بھی کہتے تھے۔ اس بیٹھک یا حجرے میں مرد بیٹھتے، باتیں کرتے، حقہ پیتے، پان کھاتے اور گپ کرتے تھے۔ بات چیت کے موضوعات ہوتے تھے سیاست، معاشرت، تہذیب و ثقافت، جائدادوں کے معاملات، شکار کے قصے، آبا و اجداد کی شجاعت کے کارنامے اور دین، مذہب اور اخلاق وغیرہ کے مسائل۔

عورتیں اول تو سامنے سے نکلتی نہیں تھیں لیکن کوئی سواری کبھی نکلے تو لوگ اپنے منہ پھیر لیتے تھے۔ مرد چہرے مہرے کے وجیہہ اور خوش شکل ہوتے تھے۔ خوش رو، خوش شکل، صحت مند، سرخ سفید، لمبے تڑنگے، چوڑے چکلے سینے والے۔ جو بزم میں ریشم کی طرح نرم نظر آتے تھے لیکن جنگ کے موقع پر فولاد ہو جاتے تھے۔ عورتوں کا احترام بہت تھا۔ کسی قسم کا کوئی ہنگامہ ہو اگر یہ معلوم ہو جائے کہ کوئی عورت آ رہی ہے تو لوگ تتر بتر ہو جاتے تھے اور منہ چھپاتے پھرتے تھے۔ کسی پر بری نظر ڈالنے کا کوئی تصور نہیں تھا۔ اگر عورت یا مرد میں سے کسی پر شبہ ہو جائے تو اس کی سزا سخت تھی۔ عورت کا باہر دیکھنا اور کسی سواری میں پردے کے پیچھے سے جھانکنا تک ناقابلِ معافی گناہ تھا۔

میرے پردادا صاحب کا ایک واقعہ نہ صرف ہمارے خاندان بلکہ تمام آبادیوں میں مشہور تھا کہ وہ چند احباب کے ساتھ میدان میں بیٹھے ہوئے تھے۔ اس وقت بیل گاڑی میں سامنے سے عورتوں کی سواری گزری۔ اس بیل گاڑی میں اگرچہ وہ مخصوص پردہ پڑا ہوا تھا جس کی وجہ سے کوئی کسی کو دیکھنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا لیکن خاص طور پر سلے ہوئے اس پردے میں ایک دو معمولی سے سوراخ ہوتے تھے۔ غالباً ہوا آنے کی غرض سے۔ اتفاق سے اس بہلی میں جو عورتیں سوار تھیں ان میں سے ایک عورت اپنی ایک آنکھ سوراخ کے ساتھ لگا کر باہر کی طرف دیکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ پردادا صاحب کے پاس غلیل تھی۔ اس غلیل سے انھوں نے ایسا نشانہ لگایا کہ جو عورت بیل گاڑی میں سے جھانک رہی تھی غلیل کا غلہ (ڈھیلا) اس کی آنکھ میں لگا اور آنکھ پھوٹ گئی۔ مارنے والے نے صرف اتنا کہا کہ اب باہر نہیں جھانک سکو گی اور اٹھ کر اپنے حجرے میں چلے گئے۔

اس واقعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان آبادیوں کے لوگوں کے معیار کیا تھے اور ان معیاروں کو برتنے میں وہ کتنے سخت تھے۔

اس ماحول میں جہالت بہت تھی۔ کلام پاک پڑھنے کے بعد حسب توفیق دو چار فارسی

کی کتابیں پڑھ لیتے تھے۔ انگریزی زبان سے نفرت تھی اور بیسویں صدی کے شروع تک اس کو کرسٹانوں کی زبان سمجھتے تھے، اور عام خیال یہ تھا کہ اس زبان کو پڑھ کر انسان اسلام سے برگشتہ ہو جاتا ہے اس کا ایمان متزلزل ہو جاتا ہے، اور وہ صحیح مسلمان نہیں رہتا۔ لوگ یہ سمجھتے تھے کہ پڑھنے لکھنے سے شجاعت ختم ہو جاتی ہے اور شجاعت کو یہ لوگ کسی حال میں بھی خیرباد نہیں کہہ سکتے تھے کیونکہ ان کے خیال میں یہ مسلمان اور خصوصاً پٹھان کا جوہر ہے۔

سو پشت سے ان کا پیشہ آبا سپہ گری تھا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں ہتھیار چلانے کے خوب خوب جوہر دکھلائے تھے۔ ہر شخص نے اس جنگ میں حصہ لیا تھا۔ ہزاروں فرنگی ان کے ہاتھوں تہ تیغ ہوئے تھے لیکن بالآخر نظم و ضبط نہ ہونے کے باعث شکست کھانے کے بعد ہتھیار چھن گئے تھے۔ تیغ و تفنگ بہت کم لوگوں کے پاس باقی رہ گئے تھی۔ سیکڑوں ہزاروں کو پھانسی پر چڑھا دیا گیا تھا یا گولی مار دی گئی تھی۔ بندوق اور تلوار رکھنے پر پابندی تھی۔ بعد از خرابیٔ بسیار عام معافی کے بعد کچھ لوگوں کو دونالی بندوق اور رائفل وغیرہ رکھنے کی اجازت مل گئی تھی لیکن ایسے لوگوں کو انگلیوں پر گنا جا سکتا تھا۔ بندوق اور تلوار چھن جانے کے بعد لوگوں کے ہاتھوں میں لاٹھی اور غلیل آ گئی تھی اور ان دونوں کو مختلف حالات میں استعمال کرنا ان لوگوں کا محبوب مشغلہ رہ گیا تھا۔ ہر پٹھان کے ہاتھ میں لاٹھی ضرور ہوتی تھی۔ ہر بچہ اور جوان اپنے پاس غلیل ضرور رکھتا تھا۔ غلیل کے لیے مٹی کو گوندھ کر خاص طور پر ہزاروں کی تعداد میں "غلے" بنائے جاتے تھے۔ غلیل سے پرندوں کا شکار بھی کیا جاتا تھا اور لڑائی جھگڑے کے موقع پر بھی یہ کام آتی تھی لیکن زیادہ تر ایسے مواقع پر لاٹھی کا استعمال ہوتا تھا اور لاٹھی چلانا ایک فن بن گیا۔ اس فن کو لوگ بڑے شوق سے سیکھتے تھے اور بڑے بڑے تجربے کار استاد لاٹھی چلانے کا درس دیتے تھے۔ لاٹھیوں کو بڑے اہتمام سے تیار کیا جاتا تھا۔ کڑوا تیل اس پر اتنا لگاتے تھے کہ وہ سیاہ ہو جاتی تھیں۔ بعض لوگ ان لاٹھیوں کی آرائش و زیبائش بھی کرتے تھے۔ لاٹھیوں کی شامیں بنانے میں بڑا اہتمام

کیا جاتا تھا بعض لوگ ان شاموں کے اوپر پیتل کی بنی ہوئی پھلیاں بھی لگا لیتے تھے لیکن ایسا کم ہوتا تھا صرف چند شوقین لوگ ایسا کرتے تھے۔ جھگڑے فساد کے موقع پر جب لاٹھی چلتی تھی تو اس کو فوج داری کہا جاتا تھا۔ مثلاً اس طرح کہتے تھے کہ فلاں جگہ فوج داری ہو گئی یعنی جھگڑا فساد ہو گیا۔

لڑائی جھگڑا تو ان بستیوں اور آبادیوں میں عام بات تھی لیکن یہ لوگ دشمن کو بھی جان سے نہیں مارتے تھے۔ قتل کرنے کو بہت بڑا گناہ تصور کیا جاتا تھا البتہ جھگڑے پشت ہا پشت تک جاری رہتے تھے، مقدمے بازی بھی عام تھی۔ ایسی ایسی معمولی باتوں پر جھگڑا ہوتا تھا کہ زیر تعمیر مکان کی دوسری منزل کی کھڑکیاں ہماری طرف نہیں کھلیں گی کیونکہ بے پردگی ہوگی، یہ چبوترہ گھر کے سامنے نہیں بنے گا۔ اس لیے کہ یہاں لوگ بیٹھیں گے اور ہمارے گھر کی سواریاں یہاں سے گزریں گی تو ان کا سامنا ہوگا، اور یہ سب کچھ ان لوگوں کے درمیان ہوتا تھا جن میں آپس میں خون کے رشتے تھے۔ اس قسم کے جھگڑے کبھی کبھی مقدمات کی صورت بھی اختیار کر لیتے تھے۔ اور چھوٹے چھوٹے معاملات اپیلوں کی شکل میں الہ آباد ہائی کورٹ تک جاتے تھے۔ زندگیاں اس میں گزر جاتی تھیں۔

اب ان باتوں کے بارے میں سوچ کر ہنسی آتی ہے۔

ایک اور بات جو میں نے اس بستی میں دیکھی وہ نوجوانوں کے عجیب و غریب کھیل تھے مثلاً جگہ جگہ بچے اور نوجوان سرکنڈے کے تیر بنا کر ان سے کھیلتے تھے۔ اس طرح تیر سے کھیلنے کا تعلق تیر چلانے سے نہیں تھا کیونکہ تیر اور تفنگ تو ان سے چھن چکے تھے۔ اب بچے سرکنڈوں کے ان تیروں کو زمین پر اس طرح رگڑ کر پھینکتے تھے کہ وہ ہوا میں اڑتا ہوا کہیں دور جا کر گرتا تھا اور پھر پالا تھا جس کو کبڈی بھی کہتے تھے۔ اکھاڑوں میں کشتیاں بھی ہوتی تھیں۔ اور بچے گیڑیاں بھی کھیلتے تھے۔ گیڑیوں کا کھیل بھی عجیب تھا۔ لکڑی کو لکڑی سے مارنا اور اس کو کسی خاص مقام سے پار کرنا یہ بھی گویا مار پیٹ کرنے یا ہتھیار چلانے کی علامت تھی۔

اس آبادی کے بیشتر لوگوں کے پاس اجداد کی دی ہوئی زمینیں تھیں جن کی فصلوں کی آمدنی

سے ان کی گزر بسر ہوتی تھی ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے ختم ہونے کے بعد ان میں سے بیشتر لوگوں کی یہ زمینیں بحق سرکار ضبط کر لی گئی تھیں جس کی وجہ سے اکثر لوگوں کو بیکاری نے آگھیرا اور مفلسی نے آلیا۔ شرفا پیٹ سب کو محتاج ہو گئے۔ خدا جانے کس کس طرح ان لوگوں نے اپنا وقت گزارا۔ بڑی بوڑھیوں کی زبانی جو تفصیل ہم تک پہنچی ہے اس کے خیال ہی سے کلیجہ منھ کو آتا ہے۔ ہزاروں کو پھانسیاں ہو گئی تھیں۔ جو بچ گئے تھے انھوں نے محنت مزدوری کر کے پیٹ پالنا شروع کر دیا تھا۔ عورتیں جو پردہ نشین تھیں گھروں میں بیٹھ کر گوٹہ بنتی تھیں اور سلائی وغیرہ کے کام کر کے بسر اوقات کرتی تھیں۔

انیسویں صدی کا آخری زمانہ اس بستی کے لوگوں کے لیے بڑی ہی آزمائش کا زمانہ تھا۔ جنگ آزادی کے ختم ہونے کے برسوں بعد جب عام معافی کا اعلان ہوا اور اس کو عملی شکل دی گئی تو حالت کسی حد تک سدھر گئی لیکن جن کے پاس جائدادیں کم تھیں ان میں سے بیشتر قلاش ہی رہے۔ بیسویں صدی اپنے ساتھ ایک تبدیلی کا احساس لائی۔ سرسید احمد خاں کی تحریک کے اثرات پھیلے۔ چنانچہ کچھ لوگوں نے تھوڑی بہت تعلیم حاصل کر کے معمولی ملازمتیں کر لیں اور کچھ نے انگریزی تعلیم حاصل کر کے معاشرے میں پھر اپنا مقام پیدا کر لیا۔ جو ایسا نہ کر سکے اور طرز کہن پر اڑے رہے ان سے قدرت نے انتقام لیا۔ زیست کرنے کے لیے وہ چھوٹے موٹے کام کرنے لگے جن میں فرنیچر بنانا، بید چھیلنا اور کرسیاں بننا زیادہ مقبول ہوا... اور تقریباً سو سال گزرنے کے بعد آج بھی یہ کام اس بستی کے لوگوں میں پیشے کے طور پر مقبول نظر آتے ہیں۔

ان ناسازگار حالات کے سائے میں زندگی بسر کرنے کے باوجود اس بستی کے لوگ زندہ دل و خوش باش تھے اپنے آبا و اجداد کے بنائے ہوئے مکانوں میں آرام سے رہتے تھے۔ ان مکانوں میں عمارت کم اور صحن وسیع و عریض ہوتے تھے۔ ہر مکان کے صحن پر میدان کا گمان ہوتا تھا۔ اس میدان میں آم، جامن، پاکھر، املی، نیم اور نہ جانے کس کس قسم کے سرسبز گھنے اور اونچے اونچے درخت آسمانوں سے باتیں کرتے نظر آتے تھے۔ ساتھ ہی کیاریوں میں اور دیواروں

پر گلاب، جوہی، چنبیلی، موتیے اور بیلے کے پھول اپنی بہاریں دکھاتے تھے۔ ہوا میں خوشبوؤں کی مہک مشامِ جاں کو معطر کرتی تھی۔ گرمیوں میں درختوں کے سائے میں چارپائیاں ڈال دی جاتی تھیں۔ ان پر لوگ بیٹھتے، باتیں کرتے اور محفلیں جماتے تھے۔ گرمیوں میں نینی تال کے پہاڑوں سے آنے والی ہواؤں میں ایسی کچھ زیادہ خنکی تو نہیں ہوتی تھی، لیکن ان کے گرم ہونے کا احساس بھی نہیں ہوتا تھا۔ شام کو یہ ہوائیں خنک ہو جاتی تھیں اور ساری فضا پر رعنائی پھٹ پڑتی تھی۔ بارش ہونے کے بعد اونچے اونچے گھنے درختوں کے گدوں میں جھولے ڈال دیے جاتے اور لڑکے لڑکیاں جھولا جھولتے، پینگیں لیتے اور ملہاریں گاتے تھے۔ ہر موسم میں چاندنی کا منظر کھلے ہوئے صحنوں میں ایسا خوبصورت ہوتا تھا کہ طبیعت باغ باغ ہو جاتی تھی۔

عزیزوں اور رشتے داروں کے مکان آپس میں اس طرح ایک دوسرے کے ساتھ ملے ہوئے تھے کہ ایک مکان سے دوسرے مکان میں جانا مشکل نہ تھا۔ بعض مکانوں کی دیوار میں کھڑکیاں اور دروازے تھے تاکہ ایک مکان سے دوسرے مکان سے آنا جانا آسان ہو۔ خواتین اور خصوصاً لڑکیاں ایک گھر سے دوسرے گھر میں بے تکلفی سے جاتی تھیں اور بڑی بوڑھیوں کے پاس بیٹھتیں، باتیں کرتیں اور ان کے چھوٹے موٹے کام بھی کر دیتی تھیں .... غرض یہ کہ عزیزوں اور رشتے داروں میں کسی قسم کی اجنبیت نہیں تھی۔ آپس میں ملنا جلنا بہت زیادہ تھا۔ خواتین تو اس طرح ایک گھر سے دوسرے گھر میں ملنے جلنے کے لیے جاتی تھیں جیسے وہ انھیں کے گھر ہیں۔ مردوں کا یہ روزانہ کا معمول تھا کہ وہ عزیزوں اور رشتے داروں کے گھر ضرور جاتے تھے۔ تھوڑی دیر بیٹھتے تھے، اچھی باتیں کرتے تھے، اور پھر چلے جاتے تھے۔ لوگوں کے پاس وقت بہت تھا۔ فرصت اور فراغت یادہ تھی۔ غلط قسم کے ایسے مشاغل بھی نہیں تھے جن میں وقت ضائع ہوتا ہے، اس لیے لوگ ملنے جلنے اور ملاقاتوں میں زیادہ وقت صرف کرتے تھے۔ پیار اور محبت کا ماحول تھا۔ بزرگوں کے سینے شفقت، اور نوجوانوں کے سینے محبت سے لبریز تھے اور ہر فرد کو اپنی جگہ ایک طرح کی طمانیت کا احساس ہوتا تھا۔

مذہب کا رنگ ان لوگوں کی شخصیتوں میں رچا ہوا تھا۔ ننانوے فی صد لوگ دیندار تھے اور ان میں وہ خصوصیات تھیں کہ انھیں صحیح معنوں میں مومن کہا جا سکتا ہے۔ بیشتر لوگ صوم وصلوٰۃ کے پابند تھے اور اسلام کے لیے اپنی جان تک نثار کرنے کے لیے تیار رہتے تھے۔

ہمارے بزرگوں میں ایک صاحب جہان خاں نامی تھے۔ ان کی تعمیر کی ہوئی ایک بہت بڑی مسجد اس بستی میں تھی جہاں جمعہ کی نماز بڑے اہتمام سے ہوتی تھی۔ نماز کے بعد میلاد شریف کا ہونا بھی ضروری تھا اور نمازیوں کا عالم یہ تھا کہ جب تک روایتی انداز میں یہ میلاد شریف نہ ہو اور یا حبیبؐ سلام علیک کھڑے ہو کر نہ پڑھا جائے تو یہ سمجھتے تھے کہ نماز ہی مکمل نہیں ہوئی۔ بات یہ ہے کہ ہر شخص عشقِ رسولؐ سے سرشار تھا اور میلاد شریف اس عشق کی علامت تھی۔ اس لیے نہ صرف مسجدوں میں اکثر نماز کے بعد ذکرِ رسولؐ ہوتا تھا اور صلوٰۃ و درود پڑھی جاتی تھی بلکہ گھر گھر میلاد کی محفلیں منعقد ہوتی تھیں۔ کوئی تقریب ہو میلاد کی محفل کو اس کا جزو تصور کیا جاتا تھا۔

سلامی تصوف سے افراد کو نسبت خاص تھی۔ صوفیائے کرام اور بزرگانِ دین کا ہر شخص پرستار تھا۔ حضرت غوث الاعظمؒ کا نام نامی بچے بچے کی زبان پر تھا۔ ہر مہینے کی گیارھویں کو غوث پاکؒ کی نذر و نیاز تقریباً ہر گھر میں ہوتی تھی اور بڑی گیارھویں کے موقع پر تو ہمارے ہاں بڑے پیمانے پر نذر و نیاز کا اہتمام کیا جاتا تھا اور دعوتِ عام ہوتی تھی۔ اللہ تعالیٰ کی اس میں ایسی برکت ہوتی تھی کہ سیکڑوں ہزاروں کی تعداد میں لوگ کھانا کھاتے تھے لیکن کبھی کمی واقع نہیں ہوتی تھی۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیری غریب نوازؒ، حضرت صابر کلیریؒ، حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ، حضرت خواجہ بختیار کاکیؒ، حضرت بابا فرید شکر گنجؒ کی کرامات کا ذکر ہر شخص کی زبان پر تھا۔ لوگ بڑے شوق سے عرس کے موقع پر ان بزرگوں کے درباروں میں حاضری دینے کے لیے جاتے تھے۔

غرض خاصا مذہبی ماحول تھا اور اس ک [illegible] ت اخلاقی اعتبار سے زندگی بلندیوں سے ہمکنار نظر آتی تھی۔ لوگ اصول کے سخت تھے اور ان کے دلوں میں روحانی اقدار کی قندیلیں روشن تھیں۔

اور ان تمام باتوں نے مل کر اس بستی کو حد درجہ پاکیزہ بنا دیا تھا اور یہی شاید اس کی سب سے اہم خصوصیت تھی۔

دوسرا باب

کچھ اپنے خاندان اور آباؤ اجداد کے بارے میں

اس بستی کے محلوں میں سے ایک محلہ ہمارا بھی تھا۔ یہ لودھیوں کا محلہ یا لودھی ٹولہ کہلاتا تھا اور اس محلے میں بیشتر مکان لودھی پٹھانوں کے تھے۔ یہ محلہ صرف چند مکانوں پر مشتمل تھا اور یہ سب ہمارے ہی خاندان والوں کے مکان تھے۔ ہمارے آباؤ اجداد نے اپنی آسانی کے لیے زمینیں وغیرہ کاشت کرنے کی غرض سے اپنے مکانوں کے متصل کچھ دھنیوں، جلاہوں اور کاشت کاروں کو بھی آباد کر دیا تھا۔ ان کے علاوہ دور دور تک وہاں آبادی نہیں تھی صرف ہمارے میدان، کھیت اور باغات تھے۔

ہمارے خاندان کے لوگ اپنے آپ کو لودھی کہتے تھے اور اپنے لودھی پٹھان ہونے پر فخر کرتے تھے۔ بزرگوں سے یہ سنا کہ ہمارے آباؤ اجداد افغانستان سے ہجرت کر کے کئی سو سال قبل ہندوستان میں آئے اور پہلے لاہور، ملتان اور پھر دہلی میں آباد ہوئے، اور پھر دہلی میں اپنی سلطنت قائم کی۔ بعض بزرگوں کو یہ کہتے سنا کہ ان کا سلسلہ بہلول لودھی، سکندر لودھی اور ابراہیم لودھی سے ملتا ہے لیکن اس کا کوئی دستاویزی ثبوت موجود نہیں۔ مغلوں کے حکمراں ہونے کے بعد ہمارے خاندان کے بہت سے افراد روہیل کھنڈ کی طرف ہجرت کر کے آئے اور زیادہ تر بریلی کی سرزمین پر آباد ہو گئے۔ یہ علاقہ انھیں اس لیے پسند تھا کہ یہاں سکون تھا، آب و ہوا خوش گوار تھی اور ہمالیہ کے دامن میں واقع ہونے کی وجہ سے بریلی اور اس کے آس پاس کے علاقے حد درجہ زرخیز اور

سرسبز و شاداب تھے۔

ان بزرگوں کی یادگار ہمارے علاقے میں ایک مسجد تھی جو جہان خاں کی مسجد کہلاتی تھی اور جس کو ہمارے آباؤ اجداد میں سے ایک خدا رسیدہ بزرگ جہان خاں نے تعمیر کروایا تھا۔ یہ مسجد ابھی تک موجود ہے اور جامع مسجد کی ضرورت کو پورا کرتی ہے۔ مسجد سادہ لیکن کشادہ ہے اس لیے کہ یہ لوگ درویش صفت تھے اور آرائش و زیبائش انھیں پسند نہیں تھی۔ ان بزرگوں نے بڑے بڑے عالی شان مکان تعمیر نہیں کیے۔ اس لیے کہ انھیں یہ بات بھی ناپسند تھی۔ جو مکان بھی تعمیر کیے وہ سادہ لیکن کشادہ تھے۔

اور ان سادہ مکانوں میں یہ لوگ حد درجہ سادہ اور نمود و نمائش سے پاک درویشوں کی سی زندگی بسر کرتے تھے۔

یہ ان کی نسلی خصوصیت اور خاندانی وصف تھا۔

ہمارا آبائی مکان ایک بہت بڑے میدان میں واقع تھا جس کو ایک سبزہ زار کہنا چاہیے۔ مکان میں داخل ہونے کے دو راستے تھے، ایک مردوں کے لیے دوسرا عورتوں کے لیے۔ مردوں کے داخل ہونے والے دروازے کے ساتھ ایک کشادہ بیٹھک تھی جسے حجرہ بھی کہا جاتا تھا۔ مکان کے اندر صحن کی کشادگی دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ یہ صحن لمبائی میں زیادہ تھا اور لمبائی کے مقابلے میں اس کی چوڑائی نسبتاً کم تھی۔ یہ اتنا لمبا صحن تھا کہ اس میں آسانی سے چہل قدمی کی جا سکتی تھی۔ صحن میں اونچے اونچے جامن، نیم اور باکڑ کے درخت تھے جو آسمان سے باتیں کرتے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ برسات کے موسم میں ان درختوں کی بہار اپنے شباب پر ہوتی تھی۔ ان میں جھولے ڈالے جاتے تھے اور بچے دن بھر جھولا جھولتے تھے۔ ان اونچے اونچے درختوں کے علاوہ صحن میں ہر طرف موتیا، بیلے، چنبیلی، رجنی، گلاب اور رات کی رانی کی جھاڑیاں تھیں، جن کی خوشبو مشام جاں کو مہکاتی تھی غرض صحن کیا تھا اچھا خاصا باغیچہ تھا۔

مکان کی عمارت سادہ تھی۔ ایک وسیع برآمدہ، اس کے پیچھے دو کشادہ کمرے، دائیں طرف

مزید دو کمرے اور بائیں جانب کسی قدر فاصلے پر بیٹھک تھی۔ باورچی خانہ صحن کے دوسری طرف تھا۔ غسل خانے الگ تھے، رہنے والے کمروں سے خاصے فاصلے پر یہ خاص مشرقی انداز کا سیدھا سادہ مکان تھا جس کے انداز سے سادگی ٹپکتی تھی۔ برآمدے اور کمروں میں بھاری بھرکم مسہریاں پڑی رہتی تھیں۔ ان میں سے بعض بید سے بنی ہوئی تھیں اور بعض نواڑ سے۔ ان مسہریوں پر صاف ستھرے بستر لگے ہوتے تھے اور انھیں میں گھر کے افراد سوتے تھے۔ مکان کی سفیدی اور صفائی کے لیے چونے کی جگہ پنڈول استعمال کیا جاتا تھا جس کی وجہ سے در و دیوار سے ہر وقت ایک سوندھی سوندھی سی خوشبو آتی رہتی تھی۔ پنڈول تالابوں سے نکلی ہوئی مٹیالے رنگ کی مٹی ہوتی تھی اور گھروں کو پوتنے کے لیے اس کا استعمال عام تھا۔

جاڑوں کے موسم میں برآمدے میں پردے ڈال دیے جاتے تھے، اور انگیٹھیاں سلگائی جاتی تھیں۔ لوگ لحافوں میں بیٹھ جاتے تھے، مرد حقہ پیتے، عورتیں چھالیہ کاٹتیں، اور باتیں کرتی تھیں۔ گرمیوں کے موسم میں لوگ وسیع اور کشادہ صحن میں سوتے تھے اور رات کو دیر تک جشن کا سا سماں رہتا تھا۔

مکان کا ایک حصہ نماز پڑھنے کے لیے مخصوص تھا اور شاید یہ مکان کا سب سے خوبصورت حصہ تھا۔ ایک نہایت لمبا چوڑا تخت بچھا ہوا تھا۔ اس پر ایک اور چھوٹا تخت تھا۔ اس دوسرے چھوٹے تخت کے اوپر محراب دار چوکی تھی جس پر جانماز بچھی رہتی تھی۔ سب لوگ باری باری، اسی محراب دار چوکی پر نماز پڑھتے تھے۔ اس جگہ کو خاص طور پر صاف ستھرا رکھا جاتا تھا، اور گھر کے تمام افراد اس جگہ کو تقدس کی نظروں سے دیکھتے تھے۔ یہ جگہ مسجد کا سا سماں پیش کرتی تھی۔

اس مکان میں زندگی بڑی ہی سادہ اور پرسکون تھی لیکن ہر وقت چہل پہل رہتی تھی۔ خاندان کے مسائل و معاملات پر بحث کی جاتی تھی۔ میلاد کی محفلیں اکثر منعقد ہوتی تھیں۔ شادیوں کے موقع پر یہاں رات رات بھر رتجگے ہوتے تھے گلگلوں کا پکوان پکتا تھا اور لڑکیاں

رات رات بھر ڈھولک بجاتی اور شادیوں کے گیت گاتی تھیں۔ غزلوں کا پروگرام بھی ہوتا تھا اور یہ لڑکیاں میرؔ، غالبؔ اور فانیؔ کی غزلیں بڑے ذوق و شوق سے اس طرح والہانہ انداز میں گاتی تھیں کہ اس کی وجہ سے ایک سماں بندھ جاتا ہے۔ شادیوں کے موقع پر دوپٹہ اڑانے کی ایک عجیب سی رسم ہوتی تھی اور کہا یہ جاتا تھا کہ ہمارے آبا و اجداد میں سے کسی کو کوہ قاف کی ایک پری اڑا کر لے گئی تھی اس کی یاد دوپٹہ اڑا کر اور گیت گا کر تازہ کی جاتی تھی۔ ان رسموں میں خاصا رومان تھا۔

کھانے پینے کی چیزوں کی اس مکان میں فراوانی تھی۔ غلہ بھرا رہتا تھا۔ دودھ کی تو گویا نہریں سی بہتی تھیں۔ کم از کم دس بارہ بھینسیں اور گائیں پلی ہوتی تھیں۔ ان کا دودھ اتنا ہوتا تھا کہ سنبھالے نہیں سنبھلتا تھا۔ دہی اور گھی گھر ہی میں تیار کیا جاتا تھا اور مہمانوں کی تواضع ہمیشہ خوب اونٹے ہوئے سرخ سرخ بالائی والے دودھ سے کی جاتی تھی۔ دودھ کا ایک بہت بڑا بھرا ہوا پیالہ جس کو بادیہ کہتے تھے اور جس پر موٹی سی بالائی پڑی ہوتی تھی مہمانوں کو پیش کیا جاتا تھا۔ چائے وغیرہ کا رواج نہیں تھا۔

غرض اس مکان میں ہمیشہ جشن کا سا سماں رہتا تھا اور اس کی وجہ ہماری دادی اماں کی ذات اور ان کی رنگا رنگ اور پہلو دار شخصیت تھی۔

دادی اماں کو ہمارے خاندان کا شجرۂ نسب ازبر تھا۔

کہتی تھیں "کوئی پانچ سات سو سال پرانا شجرہ تمہارے دادا کے بڑے بھائی ہادی یار خاں صاحب کے پاس تھا۔ ان کے انتقال کے بعد ان کے بڑے بیٹے راحت یار خاں کے پاس رہا لیکن اپنی بیوی کے انتقال کے بعد انھوں نے فقیری لے لی، داڑھی رکھ لی۔ سر کے بال بڑھا لیے گیروے رنگ کے کپڑے پہننے لگے اور خدا کی یاد میں ایسے گم ہوئے کہ انھیں اپنا ہوش نہ رہا۔ اسی عالم میں وہ شجرہ کہیں ادھر ادھر ہو گیا ویسے مجھے بہت کچھ یاد ہے۔"

دادی اماں کہتی تھیں کہ تمہارے دادا کا خاندان کئی سو سال قبل افغانستان سے دہلی اور

پھر دہلی سے بریلی میں آکر آباد ہوا۔ البتہ میرے خاندان کو آئے ہوئے کوئی ڈیڑھ دو سو سال سے زیادہ عرصہ نہیں گزرا یہی وجہ ہے کہ ابھی تک ہماری زبانوں پر پشتو کے الفاظ ہیں اپنے ولد عمر دراز خاں کی زبانی میں نے بہت سے الفاظ پشتو کے سُنے اور اب وہ میری زبان میں بھی موجود ہیں۔

تمہارے دادا کا خاندان نو بھائیوں کا خاندان مشہور ہے۔ بریلی کا سارا شہر ان سے واقف ہے۔ یہ بھائی بڑے ہی خوش شکل، وجیہہ، نیک، شریف، اور بہادر تھے۔ تمہاری پر دادی خنداں بیگم تھیں جن کے نو سو چوراسی گاؤں تھے۔ وہ باغی ہو گئی تھیں، انھوں نے انگریزوں کے ساتھ جنگ کی تھی اور ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں سیکڑوں انگریزوں کو تہ تیغ کیا تھا۔ انھیں کی اولاد میں تمہارے پردادا تھے جن کو لوگ پیار سے نتھو خاں کہتے تھے۔ وہ اسی نام سے مشہور ہو گئے۔ ویسے اُن کا نام غلام مصطفیٰ خاں یا مصطفیٰ یار خاں تھا۔ ان کے بیٹوں میں تمہارے دادا اللہ یار خاں اور اُن کے بڑے بھائی ہادی یار خاں تھے جن کے بیٹے راحت یار خاں ہیں اور جنھوں نے اب درویشی اختیار کرلی ہے۔

اس سے زیادہ تفصیل ہمارے آبا و اجداد کی دادی اماں نے نہیں بتائی۔ دراصل وہ بہت کچھ بھول گئی تھیں۔ خاص طور پر نام اُن کے ذہن سے نکل گئے تھے کچھ تفصیل جو انھوں نے بتائی تھی اس کو میں بھول گیا ہوں۔

خیر اس سے زیادہ تفصیل کی ضرورت بھی نہیں اس لیے کہ ہمارے آبا و اجداد بادشاہ نہیں تھے، عام لوگ تھے جن کا تعلق ایسے طبقے سے تھا جس کو متوسط طبقہ کہہ سکتے ہیں۔ تھوڑی بہت جائدادیں ان کے پاس ضرور تھیں لیکن انھیں جاگیروں یا تعلقوں سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔ وقت کے ساتھ ساتھ یہ جائدادیں سکڑتی گئیں۔ ان کا طرۂ امتیاز تو ان کا کردار تھا۔ وہ شرافت اور نیکی کے پتلے تھے۔ دین دار تھے، عشق رسولؐ سے سرشار تھے، صوفیائے کرام کے پرستار تھے، خود دار تھے، خودی کے علم بردار تھے، غریبوں اور ناداروں کے مددگار تھے، سادہ زندگی بسر کرتے

تھے علم کا چرچا ان کے ہاں نہیں تھا لیکن ہوش مندی اور فراست جرأت مندی اور شجاعت ان میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ وہ کسی کو آزار پہنچانا نہیں جانتے تھے۔ مادّی زندگی کو کوئی خاص اہمیت نہیں دیتے تھے۔ اخلاقی اعتبار سے بے راہروی ان میں نام کو نہیں تھی۔

اور انھیں خصوصیات سے یہ لوگ پہچانے جاتے تھے۔ انھیں خصوصیات کی بدولت شہر میں ان کی آبرو تھی اور ہر شخص انھیں اچھی طرح جانتا، خاندانی وقار سے انھیں پہچانتا، عزت و احترام سے ان کا نام لیتا اور محبت و عقیدت سے ان کا ذکر کرتا تھا۔

ہماری دادی اماں صورت اور سیرت دونوں اعتبار سے قدرت کا ایک شاہکار تھیں۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں اپنے ہاتھ سے بنایا تھا۔

گول چہرہ، میانہ قد، سرخ سفید چمپئی رنگ، چاندی کی طرح سفید بال، چہرے پر جھرّیاں لیکن آواز میں گھن گرج کی کیفیت، سخت مزاج، بیباک، نڈر، ایماندار، سچ کی پرستار، ملنسار، مہمان نواز، ہمدرد، دوستوں کی دوست اور دشمنوں کی دشمن، سونے کا نوالہ کھلانے والی لیکن شیر کی آنکھ سے دیکھنے والی، شفقت اور محبت کا ایک اُمڈتا ہوا سمندر، قوتِ ارادی کا پیکر اور فکر و عمل کے اعتبار سے ایک آندھی، ایک طوفان! ـــــ یہ تھیں ہماری دادی اماں!

میں نے انھیں ہمیشہ سن رسیدہ اور ضعیف ہی دیکھا لیکن وہ اَن تھک کام کرنے والی تھیں۔ ان کا ایک لمحہ بھی بے کار نہیں گزرتا تھا۔ فجر کے وقت اُٹھتیں، وضو کرتیں، نماز پڑھتیں پھر گھر والوں کے لیے ناشتہ بناتیں، روغنی ٹکیاں خود پکاتیں، دادا میاں کو کھلاتیں، پھر ایک ایک بچے کو ناشتہ کرواتیں۔ دن چڑھتا تو گھر کی صفائی کا کام شروع ہوتا، سارے صحن کو خود صاف کرتیں۔ تخت، چوکیاں، مسہریاں ان کی جھاڑ پونچھ کی وجہ سے آئینے کی طرح چمکتیں۔ سارا گھر روشن نظر آتا۔ دن کا کھانا بھی وہ خود پکاتیں اور سب کو کھلا پلا کر ظہر کی نماز ادا کرتیں۔ پھر کچھ دیر آرام کرتیں۔ عصر کی نماز کے بعد وہ مصلّے پر بیٹھ جاتیں اور عشا کے وقت تک عبادت و ریاضت

میں مصروف رہتیں۔ رات کو جلدی سو جانا ان کا معمول تھا۔

مرتے دم تک ان کے معمولات میں فرق نہیں آیا۔

میں نے بچپن میں خاصا وقت ان کے قدموں میں گزارا۔ وہ مجھ سے بہت محبت کرتی تھیں اور ہر وقت دعائیں دیتی تھیں۔ ان کی شخصیت میں ایک عجیب طرح کی کشش تھی۔ اس لیے میں اپنی والدہ صاحبہ سے اجازت لے کر ان کے پاس کئی کئی مہینے رہا کرتا تھا۔ مجھ پر ان کی شفقت بے پایاں تھی۔ ان کی ہر چیز میرے لیے تھی۔ ان کے مکان کے خاص کمروں میں کسی کو جانے کی اجازت نہیں تھی لیکن میں جا سکتا تھا۔ مجھے نہ صرف ان کمروں میں جانے بلکہ ہر چیز کو دیکھنے اور استعمال کرلے کی اجازت تھی۔

میرے لیے ان کی شفقت اور محبت تو بے پایاں تھی ہی لیکن میں جو اُن سے بچپن میں اتنا زیادہ مانوس ہوا اس کا ایک بڑا سبب اُن کی شخصیت کا کھرا پن تھا۔ ان کی سچائی، صاف گوئی، دیانت داری، بیباکی، جرأت مندی اور بہادری تھی لیکن ان باتوں کے ساتھ ساتھ وہ مجھے اکثر اپنے پاس بٹھا کر خاندانی حالات کی تفصیل سناتی تھیں جس میں کہانیوں سے زیادہ لطف آتا تھا۔

اور میں بھی کرید کرید کر ان تفصیلات کو ان سے پوچھا کرتا تھا۔

میں ان سے اکثر پوچھتا "دادی اماں! تمہاری اب کتنی عمر ہے؟"

اور دادی اماں شروع ہو جاتیں۔

"عمر کا تو مجھے علم نہیں۔ ہاں اتنا معلوم ہے کہ جب غدر پڑا ہے اور فرنگیوں سے لڑائی ہوئی ہے میں اس کے تین سال بعد پیدا ہوئی ہوں۔"

غدر کا ذکر آتا تو میں ان سے پوچھتا "دادی اماں! غدر میں کیا ہوا تھا؟"

اور وہ جواب دیتیں۔

"میں نے خود تو وہ جنگ نہیں دیکھی لیکن اس کے بارے میں اپنے ماں باپ سے سنا ہے اور فرنگیوں نے جو ہمارا حال کر دیا تھا وہ میں نے بچپن سے جوانی تک اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔

بڑا برا حال تھا بیٹے!

اور میں مزید کریدتا۔

”کیا ہوا تھا دادی اماں؟“

”تمہارے پردادا اور پردادی دونوں یہ بیان کرتے تھے کہ ہر شخص باغی ہو گیا تھا۔ عورتیں تک یہ کہتی تھیں کہ فرنگیوں کو یہاں سے نکال کے دم لیں گے۔ چنانچہ جنگ ہوئی، بے شمار فرنگی مارے گئے اور معلوم ایسا ہوتا تھا کہ اس سرزمین پر فرنگی کا نام و نشان باقی نہیں رہے گا۔ پہلے سردار بہادر خاں نے بریلی میں آزادی کا اعلان کیا اور سلطنت کا انتظام سنبھالا۔ وہ بڑے بہادر آدمی تھے اور ہر شخص ان سے محبت کرتا تھا۔ ان پر جان چھڑکتا تھا۔ پھر بخت خاں دلی گئے اور شاہِ وقت سے ملے۔ وہ بھی بڑے بہادر آدمی تھے۔ ہماری ساری قوم اُن کے ساتھ تھی، لیکن خدا جانے کیا ہوا کہ وہ جو کچھ چاہتے تھے وہ نہ ہو سکا۔ وہ دلی سے واپس آئے تو لڑائی نے اور بھی زور پکڑا۔ ہماری پردادی تھیں خنداں بیگم۔ ان کے نوسو چوراسی ۹۸۴ گاؤں تھے۔ اچھی خاصی ریاست تھی۔ انھوں نے کچھ پروا نہ کی، وہ بھی باغی ہو گئیں۔ ان کے ساتھ پٹھانوں کا اچھا خاصا لشکر تھا۔ سن رسیدہ تھیں۔ لیکن وہ خود گھوڑے پر بیٹھ کر اس لشکر کی کمان کرتی تھیں۔ بہادری اور جرأت مندی ان پر ختم تھی۔ انھوں نے فرنگیوں کو بہت مارا۔ کشتوں کے پشتے لگا دیئے اور انھیں یقین ہو گیا کہ فرنگی ہندوستان سے بھاگ گئے لیکن بچے! پھر خدا جانے کیا ہوا کہ باہر سے گوروں کا لشکر آ گیا۔ گھمسان کی لڑائیاں ہوئیں۔ ان لڑائیوں میں دونوں طرف کے بے شمار لوگ مارے گئے۔ خنداں بیگم بھی شہید ہو گئیں۔ گوروں کرستانوں نے بڑا ظلم ڈھایا۔ ہزارہا بے گناہ شہید کر دیئے گئے۔ کیسے کیسے کڑیل اور خوبصورت جوان تھے۔

اور پھر جب لڑائیاں ختم ہو گئیں تو ان کے مقدمے چلائے گئے۔ بغاوت کا الزام لگایا گیا۔ گھروں سے لوگوں کو پکڑ پکڑ کر لے گئے، ہزاروں کو قید کیا گیا اور بے شمار لوگوں کو پھانسیاں دے دی گئیں۔ خاندان کے خاندان تباہ ہو گئے۔ سردار بہادر خاں کو کوتوالی کے سامنے پھانسی دی گئی۔

شہر میں تہلکہ مچ گیا۔

میں یہ سب باتیں سنتا اور پھر پوچھتا۔

اس کے بعد کیا ہوا؟

اور وہ کہتیں۔

”جو باقی بچ گئے تھے ان کا حال بہت بُرا ہوا۔ جاگیریں ضبط کر لی گئیں، جائدادیں چھن گئیں۔ سرکار نے زمینوں پر قبضہ کر لیا، گھروں پر پہرے بٹھا دیئے گئے۔ لوگوں کی آمدنی کا کوئی ذریعہ باقی نہ رہا، لوگ پیسے پیسے کو محتاج ہو گئے۔ روٹی کا ملنا مشکل ہو گیا۔ یہ سب کچھ تو میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ عورتیں گھروں میں گوٹا بُنتے اور سلائی کرنے لگی تھیں، چرخے کاتنے لگی تھیں۔ اس طرح جو کچھ سامان دن بھر کی محنت کے بعد تیار ہوتا اس کو شام کے وقت بازار میں بکوا دیتی تھیں۔ اس سے جو پیسے ملتے تھے اس سے خرچ چلتا تھا۔ روکھی سوکھی کھا کے سو جاتے تھے اور کبھی کبھی تو یہ روکھی سوکھی بھی نصیب نہیں ہوتی تھی۔ برسوں یہی حالت رہی۔ میں نے ہوش سنبھالا تو یہی سب کچھ دیکھا۔ میری عمر جب چار پانچ سال کی ہوئی تو مجھے اپنے گھر میں یہی مناظر نظر آئے۔ میری اماں گھنٹوں گوٹا بنتی تھیں اور میں پاس بیٹھی دیکھا کرتی تھی۔ بڑے بُرے دن تھے بیٹا!“

اور پھر میں سوال کرتا۔

”لیکن دادی اماں! حالت سُدھری کیسے؟“

اور وہ جواب دیتیں۔

”برسوں بعد معافی کا اعلان ہوا۔ اس اعلان کی وجہ سے کچھ زمینیں بحال کر دی گئیں اور اب جو یہ سب کچھ تم دیکھ رہے ہو زمینیں، باغات اور کھیت، یہ سب کچھ تمہیں بابا معافی کے بعد ہی واپس ملے ہیں۔ یہ سب کچھ نہ ہوتا تو ہم فقیر ہی رہتے۔ اللہ میاں کا لاکھ لاکھ شکر ہے، یہ نہ ہوتا تو ہم کیا کرتے۔“

اور دادی اماں کی یہ باتیں سن کر میری آنکھوں میں آنسو آجاتے تھے اور میں منہ چھپا کر تنہائی میں اتنا روتا تھا کہ ہچکیاں آنے لگتی تھیں۔

لیکن دادی اماں کو میں نے کبھی روتے نہیں دیکھا۔ وہ بڑے ہی عزم و ارادے والی خاتون تھیں۔ کبھی کبھی یہ سب باتیں کرتے کرتے ان پر رقت سی ضرور طاری ہو جاتی تھی لیکن رونا انھیں نہیں آتا تھا البتہ آنکھوں میں آنسو سے تیرنے لگتے تھے۔

وہ اپنی اصل نسل پر ہمیشہ فخر کرتی تھیں۔ اور ان کا خیال تھا کہ اعلیٰ خاندان اور صحیح نسل کا آدمی کبھی نیچے نہیں گرتا۔ اس سے کوئی چھچھوری حرکت سرزد نہیں ہوتی۔ انسان کے قول و عمل سے اس کی نسل کو پہچانا جاسکتا ہے۔

"اصل سے خطا نہیں، کم اصل سے وفا نہیں۔"

یہ فقرہ اکثر ان کی زبان پر رہتا تھا اور ہمیشہ اسی فقرے کے حوالے سے بات کرتی تھیں۔ کسی کے کردار کو جانچنا ہو، کسی شخص کی کسی خاص حرکت پر تبصرہ کرنا ہو، کسی معاملے میں کوئی فیصلہ دینا ہو، وہ ہمیشہ اسی کہاوت کے حوالے سے کرتی تھیں۔

یا پھر یہ فقرہ "جس کی بات نہیں اس کا باپ نہیں" ان کے منھ سے بار بار نکلتا تھا۔ اور اس کا مطلب ان کی گفتگو میں یہی ہوتا تھا کہ انسان کو لیے دیئے رہنا چاہیے، عزت کی زندگی بسر کرنی چاہیے اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب انسان کی خودی اپنے کمال پر پہنچ جائے اور اس کا فکر و عمل اپنی ذات، اپنے خاندان، اپنی نسل اور اپنے معاشرے کی آبرو کی صورت اختیار کرلے۔

بچپن میں تو مجھے ان فقروں کے بارے میں کچھ علم نہ ہو سکا کہ یہ دادی اماں کی بات چیت اور گفتگو میں کہاں سے آئے اور کیسے ان کا تکیہ کلام بن گئے۔ لیکن بہت بعد میں یہ معلوم ہوا کہ یہ تو پشتو زبان کی کہاوتیں ہیں اور پٹھانوں میں ان کا استعمال عام ہے۔ وقت نے پشتو زبان کو تو پس منظر میں ڈال دیا لیکن اس کی معنویت اردو میں ان فقروں کی صورت میں باقی رہی۔

ویسے پشتو کے بیسیوں الفاظ دادی اماں کی زبان پر تھے اور وہ اردو بولتے ہوئے بے تکلفی سے پشتو کے یہ الفاظ استعمال کرتی تھیں۔ مثلاً چمچے کو انھوں نے کبھی چمچہ نہیں کہا ہمیشہ "قاشوغہ" کہتی تھیں اور یہ قاشوغہ بھی ان کے گھر میں سیپی کا ہوتا تھا جس کو چھوٹے بڑے سب

چمچے کے طور پر استعمال کرتے تھے۔

غرض اسی طرح کے بیسیوں الفاظ دادی اماں کی زبان میں شامل تھے

دادی اماں باتیں بہت اچھی کرتی تھیں مختلف پہلوؤں پر مسلسل بولتی جاتی تھیں۔ حالات کا تجزیہ بھی خوب کرتی تھیں۔ دلائل بھی ان کے پاس اپنی بات کو صحیح ثابت کرنے اور منوانے کے لیے بے شمار ہوتے تھے۔

اور میں ان کی اس طرح کی باتیں سن کر اُن سے اکثر معصومانہ انداز میں یہ پوچھتا تھا کہ یہ اتنی بہت سی باتیں ان کے دماغ میں کیسے آجاتی ہیں؟"

اور وہ ہمیشہ کہتیں۔

"بیٹے! مجھے ماں باپ نے پڑھا لکھایا ہوتا تو میں بالسٹر ہوتی، بالسٹر!"

واقعی دادی اماں بالکل پڑھی لکھی نہیں تھیں۔ نماز وہ پڑھ سکتی تھیں، کلام پاک کی تلاوت کر سکتی تھیں لیکن اردو انھیں ٹوٹی پھوٹی ہی آتی تھی۔ البتہ باتیں کرنے میں ان کا جواب نہیں تھا۔ غضب کی روانی تھی ان کی باتوں میں!۔ بلا کا بہاؤ تھا ان کی گفتگو میں! ایسے ایسے نکتے پیدا کرتی تھیں کہ سننے والا حیرت سے سنتا، منہ تکتا اور عش عش کرتا تھا

دادی اماں دوسرے عزیزوں اور رشتے داروں کے گھر کم جاتی تھیں۔ عزیز اور رشتے دار ان سے ملنے کے لیے اُن کے ہاں آتے تھے۔ اُن کے چھوٹے بھائی مجید اللہ خاں صاحب کوئی ڈیڑھ دو میل کا راستہ پیدل طے کر کے شہامت گنج، شاہ دانا سے روزانہ ان سے ملنے آیا کرتے تھے اور گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ بیٹھ کر اور باتیں کر کے اور کبھی کبھی لڑ کر رخصت ہوتے تھے۔ ان کی بڑی بہن چچی خالہ دوسرے تیسرے دن ضرور دادی اماں سے ملنے آتی تھیں، اور دادی اماں کے گلے شکوے سن کر واپس چلی جاتی تھیں۔ وہ ڈاکٹر علی حسین خاں صاحب کی والدہ اور لیاقت حسین خاں درانی صاحب کی دادی تھیں جو آج کل کراچی میں وکالت کرتے ہیں اور کبھی کبھی ٹیلی ویژن کے بعض ڈراموں میں دلچسپ اور پُرلطف انداز گفتگو سے محفلوں کو زعفران زار بنا دیتے ہیں۔

تھی خالہ اماں دادی سے بھی زیادہ بارعب، شان دار اور دبدبے والی خاتون تھیں لیکن دادی کے سامنے ان کی بھی کچھ پیش نہیں جاتی تھی گلے شکووں ہی پر ملاقاتوں کا اختتام ہوتا تھا لیکن ان تمام باتوں کے باوجود بہن بھائیوں میں آپس میں محبت بہت زیادہ تھی۔ ایک دوسرے پر جان چھڑکتے تھے یہ اور بات ہے کہ لڑتے بھی تھے شاید اس وجہ سے کہ یہ ان کی نسلی خصوصیت تھی۔

پٹھانوں کی آپس کی لڑائیاں کبھی ختم نہیں ہوتی تھیں۔ کئی کئی پشتوں تک ان لڑائیوں کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ خاص طور پر سگے بہن بھائیوں اور چچا زاد اور ماموں زاد بہن بھائیوں اور بہنوں کے درمیان تو یہ لڑائیاں معمول کی حیثیت رکھتی تھیں اور کسی نہ کسی صورت میں ان کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔

ہماری دادی کے ایک ماموں زاد بھائی تھے منصب علی خاں۔ عرفیت ان کی منصور خاں تھی۔ ان کے ساتھ زمین کے کسی معاملے میں دادی ماں سے پرانا جھگڑا تھا۔ منصب علی خاں کے بیٹے سردار علی خاں کی جوانی بلکہ بڑھاپے تک یہ جھگڑا جاری رہا۔ معاملات عدالت تک بھی پہنچے لیکن میں نے بچپن میں دیکھا کہ منصب علی خاں اور پھر سردار خاں دونوں باپ بیٹے اس اختلاف کے باوجود آخر دم تک دادی اماں کے پاس آتے تھے اور ان کے ساتھ عزت اور احترام سے پیش آتے تھے لیکن دادی اماں کی زبان سے اکثر اس طرح کی خود کلامی سننے میں آتی تھی

"سردار! بیٹا سوہو جاگو ہو؟"

یہ سن کر میں کہتا "دادی اماں! یہ کیا کہتی ہو؟ سردار خاں کو کیوں سلاتی جگاتی رہتی ہو؟"
ہنس پڑتیں، کہتیں

منصب علی خاں اور ان کے بیٹے سردار سے زمین کا جھگڑا تو کبھی ختم ہوگا نہیں، یہ مر جائیں گے تب بھی میں ان کی قبر پر جا کر اس طرح کہوں گی کہ بیٹا سو رہے ہو یا جاگ رہے ہو؟ لڑائی جاری رکھو گے یا بند کرو گے؟

اور مجھے دادی اماں کی اس دلچسپ تشریح پر ہمیشہ ہنسی آجاتی تھی اور میں یہ سوچتا رہ جاتا تھا

کہ اللہ اللہ پٹھانوں کی دشمنی اور اختلافات کے حدود بھی کہاں سے کہاں تک پہنچتے ہیں اور یہ دشمنی کیسی کیسی عجیب صورتیں اختیار کرتی ہے۔

دادی اماں کا رعب اور دبدبہ بہت تھا۔ وہ حکومت کرنے کے لیے پیدا ہوئی تھیں۔ اپنی بات منوانا انھیں خوب آتا تھا۔ ہر شخص ان کا لحاظ کرتا بلکہ ان سے ڈرتا تھا۔ وہ بریلی کے سارے شہر میں اپنی آن بان کے لیے مشہور تھیں۔ نام تو ان کا سردار بیگم تھا لیکن بریلی کے تمام اہم خاندان انھیں سدن کے نام سے جانتے تھے اور ان کا نام سنتے ہی عزت و احترام کے خیال سے گردنیں جھکا لیتے تھے — اور تو اور ہمارے دادا میاں تک پر ان کا رعب تھا۔ وہ شوہر ہونے کی حیثیت سے اُن سے ڈرتے تو خیر کیا البتہ اُن کا لحاظ بہت کرتے تھے اور ان کی بات مانتے ضرور تھے اور یہ پٹھانوں کا عام رویہ تھا۔ وہ بیویوں کی بات اس حد تک مانتے تھے گویا ان سے ڈرتے ہیں — دادی اماں بڑی خوش ذوق تھیں۔ صفائی کا خیال تو گویا ان کی گھٹی میں پڑا تھا۔ صاف شفاف کپڑے زیب تن کرتی تھیں اور جب کہیں جانا ہوتا تھا یا کسی تقریب میں شرکت کرنی ہوتی تھی تو اپنے خاص کپڑے نکالتی تھیں چکن کا سفید کرتا، سفید شلوار اور کڑھا ہوا دوپٹہ۔ یہ سفید لباس ان پر ایسا اچھا لگتا تھا کہ جی چاہتا تھا گھنٹوں دادی اماں کو دیکھتے رہیں۔ شوخ لباس سے انھیں نفرت تھی۔ انھیں تو لباس کی سادگی ہی میں حسن نظر آتا تھا اور اس کو وضعداری کے ساتھ زیب تن کرنا ہی انھیں بھلا معلوم ہوتا تھا۔

ہمارے خاندان میں ساڑھی پہننے کا رواج بالکل نہیں تھا۔ یہ تصور کیا جاتا تھا کہ یہ ہندوؤں کا لباس ہے اور اس سے جسم برہنہ رہتا ہے۔ دادی اماں کو ساڑھی سے سخت نفرت تھی جب بھی کسی عورت کو ساڑھی پہنے دیکھتیں تو کہتیں کہ یہ دوزخ میں جلے گی۔ ہندو ہو گئی ہے۔ کرستان بنا یا ہے اس نے اپنے آپ کو میم بننے کی کوشش کر رہی ہے۔ اس سے تو یہ بہتر ہے میموں کا سایہ پہن لے — لیکن ویسے دادی اماں بعض معاملات میں بڑی روشن خیال تھیں۔ مثلاً برقع کو اچھا نہیں سمجھتی تھیں۔ پردہ ان کے نزدیک صحیح نہیں تھا۔ یہ کہتی تھیں کہ اس قسم کے پردے سے انسان مفلوج ہو جاتا ہے اور عورت احساس کمتری کا شکار ہو جاتی ہے چنانچہ وہ اکثر خاندان کی لڑکیوں کو ساتھ لے کر

زیارتوں پر چلی جاتی تھیں اور کبھی کبھی باغوں میں نکل جایا کرتی تھیں آدمی تو وہاں کوئی ہوتا نہیں تھا جو تھے وہ اپنی رعایا میں سے تھے۔ دیکھ کر منہ پھیر لیتے تھے یا خود چھپ جاتے اور پردہ کر لیتے تھے دادی اماں کے سامنے کوئی آ نہیں سکتا تھا ــــ دادی اماں کے خیالات عورت کے بارے میں عجیب و غریب تھے کہتی تھیں لڑکی کا پیدا ہونا ہی رسوائی کا پیش خیمہ ہے۔ ماں باپ کی عزت خاک میں مل جاتی ہے ہر وقت رسوائی کا ڈر رہتا ہے۔ پھر لڑکی کی وجہ سے والدین کو ہمیشہ نیچے نیچے جھکنا پڑتا ہے خودی اور خودداری کو ٹھیس لگتی ہے۔ اس لیے جب کسی کے ہاں لڑکی پیدا ہوتی تھی تو ہمیشہ یہ کہتی تھیں اُس کا گلا گھونٹ دے تاکہ ساری زندگی کی مصیبت سے نجات مل جائے۔ اور خاندان والے ان کی اس قسم کی باتوں پر ہنستے تھے ــــ دراصل وہ غلط نہیں کہتی تھیں، انھوں نے دنیا دیکھی تھی۔ لڑکی کی وجہ سے جس طرح بڑے بڑے بڑے سورماؤں کو انھوں نے اپنی خودی کو خیرباد کہتے ہوئے دیکھا تھا، اسی کا نتیجہ یہ خیالات تھے۔ دراصل اس قسم کے خیالات کی بنیاد ان کا حد سے بڑھا ہوا احساسِ غیرت اور شعور، شرم و حیا تھا۔ وہ آٹھ بیٹوں اور دو بیٹیوں کی ماں تھیں۔ بیٹوں سے خوش رہتیں لیکن بیٹیوں سے ان کا ایسا کچھ زیادہ تعلق نہیں تھا۔ شادی کے بعد بیٹی کے گھر جانا یا اُس کے ہاں کچھ کھانا پینا ایک ایسا گناہ تھا جس کی تلافی اُن کے نزدیک کسی طرح ممکن نہیں۔ چنانچہ وہ بیٹیوں کے گھر کبھی نہیں جاتی تھیں۔ ویسے ان کا خیال بہت رکھتی تھیں۔

دادی اماں مذہبی معاملات میں بہت سخت تھیں۔ سخت قسم کی حنفی سُنی۔ عشقِ رسولؐ ان کا نصب العین تھا اور اہلِ بیت صحابہ کرامؓ اور صوفیائے عظام کی پرستار تھیں۔ سب پوتی پوتوں میں سے مجھ پر ان کی خاص عنایت تھی، ہر وقت دعائیں دیتی رہتی تھیں، مثلاً کہتی تھیں زندہ رہے جگ جگ جیے، سو برس سے زیادہ کی عمر ہو، موٹا ہو، توند بڑے، محل بنوائے، موٹروں میں سیر کرے وغیرہ وغیرہ۔ بار بار یہ کہتی تھیں کہ جلدی سے بڑا ہو جا، اپنی خوبصورت زمینوں پر اچھی سی کوٹھی بنا۔ میں نہیں ہوں گی تو میری روح اس کو دیکھ کر خوش ہوگی۔

آج بھی سوچتا ہوں تو خیال آتا ہے کتنی شفقت و محبت تھی اُن کی ان باتوں میں!

دادا میاں ہمارے بڑے ہی سیدھے سادے، مرنجاں مرنج، درویش صفت آدمی تھے۔ طبیعت میں دھیما پن بہت تھا۔ کبھی اونچی آواز میں نہیں بولتے تھے۔ میں نے انھیں کبھی کسی سے اُلجھتے، جھگڑا کرتے، کسی کو ڈانٹتے یا کسی پر غصہ کرتے نہیں دیکھا۔ ہر ایک کے ساتھ نہایت شفقت اور محبت سے پیش آتے تھے اور ہر شخص کی مدد کرنے کے لئے تیار رہتے تھے۔ یوں دیکھنے میں وہ بے نیاز سے آدمی تھے ملتے جلتے کم تھے۔ جائدادوں تک کے معاملات میں کوئی خاص دلچسپی نہیں لیتے تھے لیکن ویسے گھر کے نظام کو چلانے میں وہ اپنی تمام ذمہ داریاں پوری کرتے تھے۔ گھریلو معاملات سے انھیں کوئی سروکار نہیں تھا۔ تھا شادی بیاہ تک کے معاملات میں وہ دخل نہیں دیتے تھے۔ یہ سب "رموزِ مملکت" تھے جن کو صرف ہماری دادی اماں جانتی اور سمجھتی تھیں اور اس قلمرو میں انھیں کا سکہ چلتا تھا۔ جو کچھ کروانا ہوتا دادی اماں ان سے کروالیتیں۔ جن چیزوں کی ضرورت ہوتی دادا میاں ان کو فراہم کر دیتے۔ جو مل جاتا تھا وہ کھالیتے تھے۔ جو مل جاتا تھا وہ پہن لیتے تھے۔ انھوں نے کبھی کسی خواہش کا اظہار نہیں کیا۔ کسی قسم کی کوئی فرمائش کسی سے نہیں کی۔ شکایت کا کوئی لفظ تو ان کی لغت میں نہیں تھا۔

بلند و بالا قد و قامت، کھلتا ہوا گندمی رنگ، متناسب اعضا، رعب دار چہرے پر سفید گھنی داڑھی سے وہ پہچانے جاتے تھے۔ ان کا لباس نہایت سادہ تھا۔ کم گھیر کی سفید شلوار جس کو اس زمانے میں مغلئی پائجامہ بھی کہا جاتا تھا، سفید رنگ کا لمبا کرتا یا قمیص، اس پر لمبا کوٹ اور سر پر سفید ململ کی بھاری پگڑی ـــــ بس یہ ان کا لباس تھا۔ ہاتھ میں لاٹھی ضرور رکھتے تھے یہ اس زمانے کا عام رواج تھا ـــــ مرتے دم تک ان کی اس وضع میں فرق نہیں آیا۔ وضع داری ان پر ختم تھی فجر کے وقت اٹھتے نماز ادا کرتے، صبح کی سیر کے لیے جاتے، واپس آکر ناشتہ کرتے۔ گھر کے لیے روزانہ جن چیزوں کی ضرورت ہوتی ان کی فہرست تیار کرتے اور پھر اپنے کام پر چلے جاتے۔ تقریباً سارا دن وہاں پر گزارتے۔ سہ پہر یا شام کو واپس آتے تو لدے پھندے ہوتے۔ اکثر ان کے ساتھ کوئی مزدور ہوتا جو گوشت، سبزی ترکاری، پھل اور مٹھائی وغیرہ اٹھا کر گھر تک پہنچاتا۔ تمام گھر والے ان کا انتظار کرتے رہتے تھے۔ جیسے ہی دادا میاں گھر میں داخل ہوتے سب کی باچھیں کھل جاتیں، رونق سی آجاتی

اور گھر کی فضا پر ایک طرح کی طمانیت کا احساس سایہ سا کر لیتا۔ بچے دادا میاں کی لائی ہوئی چیزوں کو سنبھالنے لگتے اور ان سے لطف اندوز ہونا بھی شروع کر دیتے۔

گھر واپس آ کر وہ کچھ دیر آرام کرتے۔ پھر وضو کر کے مغرب کی نماز پڑھتے۔ کھانا کھاتے، عشا کی نماز ادا کرتے، اور سو جاتے۔ ساری زندگی ان کا یہی معمول رہا۔ اُن کے پاس آنے جانے والے بھی برائے نام تھے۔ کبھی کسی کو کوئی کام ہوتا تو آ جاتا اور دادا میاں فوراً اس کا کام کر دیتے۔ ماشاءاللہ اُن کے سات بیٹے اور دو بیٹیاں تھیں۔ ان کے معاملات سے اُنھیں فرصت ہی کہاں تھی کہ دوسروں سے ملتے جلتے۔ طبعاً بھی وہ تنہائی پسند اور کم گو تھے۔ عام پٹھانوں کی طرح زیادہ پڑھے لکھے نہیں تھے۔ جو بچے پڑھنے کے لیے جاتے تھے خاص طور پر انگریزی اسکولوں میں پڑھنے کے لیے۔ اُن سے دبی زبان سے یہ ضرور کہتے کہ انگریزی پڑھنے سے شجاعت اور وضع داری ختم ہو جائے گی۔ گویا انگریزی پڑھنا اور زیادہ تعلیم حاصل کرنا انھیں اس لیے پسند نہیں تھا کہ اس سے ان کی نسلی خصوصیت کے مجروح ہونے کا اندیشہ تھا۔

دادا میاں باتیں کم کرتے تھے لیکن اگر کوئی کچھ پوچھے تو اس کا جواب اختصار کے ساتھ اس طرح دیتے تھے کہ وہ مطمئن ہو جاتا تھا۔

میں نے ایک دن اُن سے پوچھا "دادا میاں! آپ کب، کس سنہ میں پیدا ہوئے تھے؟"

کہنے لگے "سن اور تاریخ کا تو مجھے علم نہیں لیکن اتنا یاد ہے کہ جب غدر پڑا ہے اور پٹھانوں اور فرنگیوں میں لڑائی ہوئی ہے اُس وقت میں گیارہ بارہ سال کا تھا۔"

"غدر میں آپ پر کیا گزری تھی؟"

"بریلی میں گھمسان کی لڑائی ہوئی۔ آس پاس سے بھی لڑائی کی خبریں آتی تھیں۔ ہر شخص یہ کہتا تھا کہ اب ہندوستان میں فرنگیوں کا نام و نشان باقی نہیں رہے گا۔ ہر ایک شخص باغی ہو گیا تھا۔ بس ایک ہی نعرہ تھا کہ فرنگیوں کو ہندوستان سے نکالو۔"

یہ سن کر میں کہتا "کیا آپ بھی اس جنگ میں شریک ہوئے تھے؟"

اور وہ کہتے "میں تو اس وقت بہت چھوٹا تھا مجھے اور دوسرے بچوں کو حفاظت کے خیال سے بریلی سے کچھ فاصلے پر "نشہ" کے گاؤں میں کچھ عزیزوں کے پاس بھیج دیا گیا تھا ہم کئی مہینے وہاں رہے خبریں آتی رہیں کہ بریلی، شاہجہاں پور، بجنور اور لکھنؤ میں قیامت برپا ہے، زمین اور آسمان سے خون برس رہا ہے۔"

"پھر آپ بریلی کب واپس آئے؟"

جب جنگ ختم ہو گئی تو ہمارے عزیزوں نے ہمیں بریلی پہنچا دیا۔ بریلی آکر دیکھا کہ ہر شخص جنگ کی باتیں کر رہا ہے۔ جو لوگ کام آ گئے ان کا ذکر ہو رہا ہے۔ پٹھانوں کی بہادری کے واقعات بیان کیے جا رہے ہیں۔ فرنگیوں کے مظالم کی تفصیلات سنائی جا رہی ہیں۔ بے گناہ لوگوں کی پھانسیوں کا تذکرہ ہو رہا ہے۔ یہ سب باتیں سن کر میری طبیعت پریشان ہو جاتی تھی۔ کیا کرتا میاں! کوئی بات بس میں نہیں تھی۔

اور پھر میں پوچھتا گذر بسر کیسے ہوتی تھی؟

دادا میاں کہتے "زمینیں بحق سرکار ضبط کر لی گئی تھیں۔ ہمارا خاندان اس فیصلے سے سب سے زیادہ متاثر ہوا تھا۔ بڑی بے کسمپرسی اور پریشانی کا عالم تھا۔ کئی سال اسی عالم میں گزرے۔ پھر عام معافی کے بعد کچھ سامان پیدا ہوا۔ میں اب سن شعور کو پہنچ گیا تھا۔ اس لیے میں نے حالات کا جائزہ لے کر یہ فیصلہ کیا کہ مجھے کوئی ملازمت کر لینی چاہیے چنانچہ کلٹربک گنج کے دیا سلائی کے کارخانے میں مجھے ایک ملازمت مل گئی اور میں نے اس ملازمت کو غنیمت جانا۔"

غرض دادا میاں اس طرح کی باتیں کرتے رہتے تھے۔ ان کے مزاج میں معاملہ فہمی اور صلح پسندی زیادہ تھی اور جذبے سے زیادہ عقل سے کام لینے کے قائل تھے

اور مزاج کی اس کیفیت کا اُن کی شخصیت میں بہت نمایاں تھی، ہر معاملے میں اس کا اظہار ہوتا تھا۔

دادا میاں زیادہ پڑھے لکھے نہیں تھے۔ اس زمانے کے رواج کے مطابق انھوں نے ناظرہ

انھیں بس پڑھنا آتا تھا۔ عربی فارسی اردو کی تعلیم حاصل کی تھی۔ انگریزی کا ایک لفظ نہیں جانتے تھے کیونکہ انگریزوں اور انگریزی زبان سے ان کو نفرت شدید تھی۔ وہ خاندان کے بچوں کو بھی انگریزی تعلیم دینے کے سخت خلاف تھے۔

جب میں نے انگریزی کی تعلیم حاصل کرنا شروع کی تو دادا حضور مجھے پاس بٹھا کر یہ کہا کرتے تھے کہ میاں تم جو تعلیم حاصل کر رہے ہو اس سے شجاعت ختم ہو جاتی ہے اور شجاعت ہمارے خاندان کا طرۂ امتیاز ہے۔"

اور میں چپ چاپ دادا میاں کی اس طرح کی باتیں سنا کرتا تھا ان کے سامنے بولنے کی مجال نہیں تھی لیکن یہ عجیب بات ہے کہ دادا میاں نے خود کبھی شجاعت کے جوہر نہیں دکھائے۔ وہ کسی سے کبھی الجھتے نہیں تھے بحث نہیں کرتے تھے۔ لڑائی جھگڑے سے انھیں کوئی سروکار نہیں تھا۔ اگر کوئی ایسا موقع آ بھی جاتا اور اکثر آ جاتا تھا تو وہ آپس میں صلح صفائی کرنے کی کوشش کرتے تھے اور اس میں انھیں خاطر خواہ کامیابی ہوتی تھی۔ ان کی وجہ سے پٹھانوں کی آپس کی بہت سی لڑائیوں کا خاتمہ ہو جاتا تھا اور رنجشیں دور ہو جاتی تھیں۔

وہ کبھی کسی کی برائی نہیں کرتے تھے۔ برائیوں کو انسان کی کمزوریوں اور اس کی نادانیوں پر محمول کرتے تھے۔ عفو و درگزر کا خیال اُن کے مزاج میں رچا ہوا تھا۔ ہر شخص کو معاف کر دیتے تھے۔ قوتِ ارادی ان میں بے پایاں تھی اور وہ بڑے سے بڑے کام کا جب بیڑہ اٹھا لیتے تھے تو اُس کی تکمیل سے ہمکنار کر کے چھوڑتے تھے

انھوں نے اپنے سات بیٹوں اور دو بیٹیوں کو پال پوس کر جوان کیا۔ اس زمانے کے رواج کے مطابق انھیں تعلیم دی۔ ان کی تربیت کی انھیں دنیاوی اور اخلاقی اعتبار سے بلند مراتب تک پہنچایا۔ اس اعتبار سے ان کی زندگی نہایت کامیاب تھی

دادا میاں بڑے ہی محنتی اور جفاکش تھے۔ منہ اندھیرے بیدار ہوتے فجر کی نماز پڑھتے اور دن نکلنے سے پہلے ہی اپنے کام پر روانہ ہو جاتے پورا دن گزار کر وہ شام کو گھر واپس آتے۔ ان کے پاس

کوئی سواری نہیں تھی اس لیے وہ پانچ چھ میل پیدل جاتے اور پیدل واپس آتے۔ اس زمانے میں بس ہاں گھوڑے کی سواری کا رواج تھا۔ گھوڑا وہ رکھ سکتے تھے اور انھوں نے رکھا بھی لیکن ظاہر ہے وہ گھوڑے پر دفتر نہیں جا سکتے تھے اس طرح اپنی بڑائی کا احساس ہوتا۔ دوسری بات انھیں پسند نہیں تھی کرائے کی سواری ہمارے علاقے میں ملتی نہیں تھی اس لیے وہ پیدل چلتے تھے اور پیدل چلنے کی انھیں ایسی عادت ہوگئی تھی کہ انھیں اس میں لطف آتا تھا۔

میں اگرچہ اس وقت بہت چھوٹا تھا لیکن ان کے معمولات کو دیکھ کر یہ سوچتا تھا کہ وہ کتنی سخت اور جفاکشی کی زندگی بسر کرتے ہیں۔

چنانچہ کبھی کبھی میں ان کے پاس بیٹھ کر باتوں میں یہ کہتا "دادا میاں آپ کوئی سواری لے لیا کیجیے۔ پیدل چل کر آپ تھک جاتے ہوں گے۔"

اور وہ جواب دیتے۔

"بیٹا! پیدل چلنے کی عادت ڈالنی چاہیے۔ اس سے مزاج میں خاکساری پیدا ہوتی ہے، اور برے خیالات سے انسان بچا رہتا ہے اور پھر اس طرح ورزش بھی ہو جاتی ہے۔"

انھوں نے تقریباً سو سال کی عمر پائی لیکن مرتے دم تک ان کے ان معمولات میں فرق نہیں آیا اور ان کے مزاج میں بھی کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔

وہ ہمیشہ عزم، ارادے، عمل، محبت، نیکی، شرافت اور انسانیت کا ایک مجسمہ ہی رہے۔

ہماری دادی اماں اور دادا میاں کے سات بیٹے اور دو بیٹیاں تھیں۔ میرے والد اپنے تین بھائیوں سے چھوٹے اور تین بھائیوں سے بڑے تھے۔ ایک بہن ان سے بڑی تھیں اور ایک چھوٹی تھیں جو جوانی میں انتقال کر گئیں۔ کسی پہنچے ہوئے بزرگ نے میرے والد کا نام حکایت یار خاں رکھا اور وہ اسی نام سے مشہور رہے۔

میرے والد ۱۲ مارچ ۱۸۹۲ء کو بریلی میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے شہر کے مدرسوں

اور اسکولوں میں حاصل کی۔ اُنھوں نے مخالفت کے باوجود انگریزی اسکولوں میں داخلہ لیا اور مڈل اور میٹرک کے امتحان پاس کیے اور چھوٹی عمر ہی میں لکھنؤ جاکر چیف کورٹ میں ملازمت کرلی اس طرح اُن کا زیادہ وقت لکھنؤ ہی میں گذرا، اور وہ نصف صدی سے کچھ زیادہ لکھنؤ میں رہ کر وہاں کی تہذیب و معاشرت کا نمونہ بن گئے۔

وہ لکھنؤ میں اپنے زمانے کے خوش شکل لوگوں میں شمار ہوتے تھے اور لوگ انھیں خوبصورت خان صاحب کہتے تھے۔ وہ اپنے گول چہرے، کھلتے ہوئے چمپئی رنگ اور دراز قد سے پہچانے جاتے تھے ـــــ ان میں ایک ایسی وجاہت اور طرحداری تھی جو کم لوگوں کو نصیب ہوتی ہے۔ باتیں کم کرتے تھے، لیے دیے بہت رہتے تھے۔

سردیوں میں شیروانی، لکھنوی انداز کا پاجامہ اور ترکی ٹوپی پہنتے تھے۔ گرمیوں میں ترکی ٹوپی کی جگہ لکھنؤ کی دوپلی ٹوپی لے لیتی تھی۔ روزانہ کپڑے بدلتے تھے، اور ہمیشہ صاف ستھرے اور ہر اعتبار سے چمکتے ہوئے نظر آتے تھے۔ پان بڑے شوق سے کھاتے تھے عطر لگانے کا بہت شوق تھا جس کی وجہ سے ان کے پاس خوشبوئیں مہکتی تھیں۔ صوم و صلوٰۃ کے پابند تھے۔ اسلامی تصوف سے انھیں گہری دلچسپی تھی۔ اس لیے دفتر کے بعد اُن کا زیادہ وقت حضرت مخدوم شاہ مینا صاحبؒ کے مزار پر گذرتا تھا۔ وہاں رات گئے تک عبادت کرتے اور دعائیں مانگتے تھے۔ گیارہویں کی نیاز ہر مہینے دلاتے تھے اور ربیع ثانی کی گیارہ تاریخ کو تو حضرت غوث پاک کی نیاز کے موقع پر دعوت عام ہوتی تھی۔ اسی کا فیض تھا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی ہر دعا قبول کی۔

ان کی اولاد نے لکھنؤ میں رہ کر اعلیٰ تعلیم حاصل کی، اور بڑے بڑے عہدوں پر فائز ہوئے اور والد صاحب کی انسانیت، شرافت، محبت، خدا ترسی، رحم دلی، نیکی اور خلوص کی خصوصیات اُن میں سے ہر ایک کی شخصیت میں نمایاں ہوئیں۔ ان خصوصیات ہی کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان سب کو اپنے کرم سے نوازا۔

وہ بڑے سخت قسم کے مسلم لیگی اور پاکستانی تھے۔ قیام پاکستان کے بعد وہ پاکستان آگئے اور

اپنی بقیہ زندگی لاہور میں گذاری۔ ۲۰ر مارچ سنہ ۱۹۸۱ء کو تقریباً نوے سال کی عمر میں ان کا انتقال ہو گیا، اور میرے لئے زندگی میں وہ ایک بہت بڑا خلا چھوڑ گئے۔

اگرچہ ان کے انتقال کو کئی سال گذر گئے ہیں لیکن میں ہر وقت انھیں یاد کرتا ہوں، اور ان کی چھوڑی ہوئی چیزوں کو دیکھ کر ان کی یاد کو تازہ کرتا ہوں۔ اُن کی ہر چیز اُن کے کمرے میں ابھی تک اسی طرح رکھی ہوئی ہے جس طرح ان کی زندگی میں رکھی ہوئی تھی۔ میں اس کمرے میں معمول کے مطابق صبح کو ضرور حاضری دیتا ہوں۔ یہ معمول ان کی زندگی میں بھی تھا۔ آج بھی ہے، اور زندگی بھر رہے گا۔ مجھے اس سے ایک طرح کا ایسا سکون ملتا ہے جس کو الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔

ہماری والدہ محترمہ بڑی ہی نیک اور شریف خاتون تھیں۔ اُن کی زندگی صرف خدمت سے عبارت تھی۔ انھوں نے زندگی بھر نہ صرف یہ کہ میرے والد کی خدمت کی بلکہ اُن کے خاندان کے بیشتر لوگوں کی خدمت کی۔ بچپن ہی سے میں نے دیکھا کہ اُن کا گھر مہمانوں سے بھرا رہتا تھا۔ میرے دو تین چچا، اور میری پھوپھی کی دو تین بیٹیاں تو مستقل طور پر اُن کے پاس رہتی تھیں، اور وہ ہر ایک کا خیال رکھتی تھیں۔ اُن کا دسترخوان بہت وسیع تھا۔ ہر ایک کو ذاتی توجہ سے کھلاتی پلاتی تھیں۔ قسم قسم کے کھانے پکانے میں انھیں مہارت حاصل تھی۔ نوکر موجود تھے لیکن وہ سالن ہمیشہ اپنے ہاتھ سے پکاتی تھیں۔ ان کے ہاتھ میں بڑی لذت تھی۔

انھوں نے اپنے آٹھ بیٹوں اور دو بیٹیوں کی ایسی پرورش کی جس کو مثالی کہا جا سکتا ہے۔ بسم اللہ کے بعد وہ ہر بچے کو قرآن پاک خود پڑھاتی تھیں، اور ساتھ ہی دینی معاملات کی تعلیم بھی دیتی تھیں۔

میری بھی وہ اولین معلمہ تھیں۔ انھوں نے مجھے کلام پاک پڑھایا، نماز سکھائی اور دینی معاملات کی تعلیم دی۔ ان کی شفقت اور محبت کو میں کبھی بھول نہیں سکتا۔ میں کبھی بیمار ہو جاتا تھا تو رات رات بھر میرے پاس بیٹھی رہتی تھیں۔ انھیں مجھ سے بڑی محبت تھی، آخر ماں تھیں، اور میں بھی اُن سے اتنی محبت کرتا تھا کہ ایک لمحہ بھی اُن کے بغیر رہ نہیں سکتا تھا۔

وہ ارادے کی مضبوط اور بڑی ہی باعمل خاتون تھیں اور جو کچھ صحیح سمجھتی تھیں، وہ کر گذرتی تھیں۔ ضرورت مندوں کی مدد کرنا ان کی زندگی کا نصب العین تھا۔ انھوں نے اپنے بچوں کی اس طرح پرورش کی جس کی مثال ملنی مشکل تھی۔

میں نے اگر زندگی میں کچھ کیا تو یہ سب کچھ انھیں کی تربیت اور قوت ارادی کا نتیجہ تھا میں نے اُن سے بہت کچھ سیکھا، اور مجھے ان کی شخصیت کی بدولت زندگی میں کام کرنے اور اس کام کو انتہا تک پہنچنے کے آداب آئے۔

۱۸ر فروری ۱۹۵۹ء کو ان کا انتقال ہوا تو مجھے یہ محسوس ہوا جیسے میرے جسم کا ایک حصہ کٹ گیا ہے، مہینوں بے چین، اور بے قرار رہا۔ حالت یہ تھی کہ ہر ایک سے یہ کہتا تھا کہ میرے لیے دعا کیجیے۔

آج بھی تقریباً سولہ سترہ سال گذر جانے کے بعد بھی میں انھیں ہر وقت یاد کرتا ہوں، اور اُن کی تصویر ہر وقت میرے سامنے رہتی ہے۔

غرض میں نے اپنے بزرگوں کی آغوش میں آنکھ کھولی، اور ان کی شفقت اور محبت کے سائے میں زندگی کے سفر کی اَن گنت منزلیں طے کیں۔

ان میں سے ہر ایک اپنی اپنی جگہ ایک شجر سایہ دار تھا۔

تیسرا باب

شہرِ بریلی کی کچھ یادیں

بعض بزرگ کہتے ہیں کہ میں ۱۴؍ اگست سن ۱۹۲۰ء کو بریلی کے ایک محلے شاہ آباد میں پیدا ہوا جس کو دیوان خانہ بھی کہتے تھے۔ یہاں میری خالہ کا مکان تھا میری والدہ کی عمر اس وقت بہت چھوٹی تھی۔ اس لیے ان کی دیکھ بھال میری خالہ کرتی تھیں، اور وہ اسی غرض سے انھیں اپنے گھر لے آئی تھیں۔ دراصل میری نانی کا انتقال میری والدہ کے بچپن ہی میں ہو گیا تھا اس لیے میری خالہ ہی نے ان کی پرورش کی تھی اور میری والدہ انھیں اپنی ماں کی جگہ سمجھتی تھیں۔ خالہ بھی بڑے عزم و ارادے والی خاتون تھیں۔ انتظامی معاملات اور خصوصاً گھر چلانے میں ان کا جواب نہیں تھا۔ کھانا ایسا پکاتی تھیں کہ اس کی خوشبوئیں دور تک پھیلتی تھیں اور کھانے والے ایک عجیب سی لذت اُن کے پکائے ہوئے کھانے میں محسوس کرتے تھے۔ گھر کو چلانا بچوں کی صحیح پرورش، اُن کے مستقبل کی منصوبہ بندی اُن پر ختم تھی۔ میری والدہ کی شخصیت پر ان کے اس مزاج کے اثرات بڑے گہرے ہوئے اور وہ بھی ان خصوصیات سے مالا مال ہو گئیں۔

بعض بزرگوں کا یہ کہنا ہے کہ میں ۱۳؍ اگست سن ۱۹۲۰ء کو لکھنؤ کے محلے سبحان نگر کے ایک مکان میں پیدا ہوا خدا جانے ان میں سے کون سی بات صحیح ہے۔ بہرحال اس کا ایک فائدہ ضرور ہے اور وہ یہ کہ میں بیک وقت، بریلوی بھی ہوں اور لکھنوی بھی میرے والد صاحب نے لکھنؤ کے چیف کورٹ میں ملازمت کر لی تھی اور وہ مستقل طور پر لکھنؤ میں رہنے لگے تھے۔ میں بہت چھوٹا تھا جب وہ ہم لوگوں کو لکھنؤ

ے گئے۔ اس طرح بریلی سے لکھنؤ اور لکھنؤ سے بریلی آنے جانے کا سلسلہ رہا۔ میں اپنی والدہ کے ساتھ کوئی پانچ چھ سال کی عمر تک کبھی بریلی میں اپنی خالہ یا دادی کے ہاں اور کبھی لکھنؤ میں اپنے والد صاحب کے پاس رہا۔

مجھے اس زمانے کے شہر بریلی کی بعض باتیں یاد ہیں جن کا مجھ پر گہرا اثر ہے اور جو میری زندگی میں ہر وقت سائے کی طرح میرے ساتھ رہتی ہیں۔

اس زمانے میں آمد و رفت کے لیے خصوصاً عورتوں کی آمد و رفت کے لیے بریلی شہر میں خاص طرح کے ٹھیلے استعمال ہوتے تھے۔ یہ گاڑی تین طرف سے بند ہوتی تھی۔ سامنے کے حصے میں پردہ باندھ دیا جاتا تھا۔ عورتیں اس میں بیٹھ جاتی تھیں۔ ایک آدمی پیچھے کی طرف سے اس گاڑی کو کھینچتا تھا۔ جب یہ گاڑی چلتی تھی تو اس قدر شور ہوتا تھا اور سڑکوں کی ناہموار کیفیت کی وجہ سے ایسی آوازیں نکلتی تھیں کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ اس میں بیٹھنے والوں کا حلیہ بگڑ جاتا تھا اور ہڈی پسلی ایک ہو جاتی تھی۔ یکے اور تانگے کم تھے اور جو تھے وہ بڑی سڑکوں یا بازاروں وغیرہ میں چلتے تھے۔ تھوڑے فاصلے کو طے کرنے اور محلوں میں آنے جانے کے لیے یہ ٹھیلا استعمال ہوتا تھا۔ عجیب و غریب سواری تھی۔

میں اسی میں اپنی والدہ کے ساتھ اپنی دادی اماں کے ہاں جاتا تھا اور وہاں میں کئی کئی دن رہتا تھا۔ وہاں کی کھلی فضا میں میرا دل لگتا تھا۔ درخت، میدان اور سبزہ زار میری دلچسپی کا باعث تھے۔ دادی اماں مجھے بہت پیار کرتی تھیں اور بے شمار دعائیں دیتی تھیں۔ جب ہم ان کے ہاں پہنچتے سرخ سرخ بالائی سے بھرا ہوا دودھ کا پیالہ مجھے اور میری والدہ کو دیتیں اور یہ کہہ کر اصرار کرتیں کہ "پی لے، پی لے، کوئی ڈر نہیں"۔ صحن میں بیٹھ کر کھلے آسمان کے نیچے ہمیں دودھ کا یہ پیالہ پینا پڑتا تھا۔ دادی اماں یہ کہتیں "پہلے قل ہو اللہ پڑھ لے اور دو چار بوندیں قاشوبے سے نکال کر پھینک دے تاکہ نظر نہ ہو جائے۔ نظر پتھر کو پھاڑ دے ہے بیٹے! جانور تک نظر لگا دیتے ہیں!"

یہ باتیں سن کر میں اور میری والدہ قل ہو اللہ پڑھ کر دودھ پی لیتے۔ پھر دادی خود گرم گرم

گھی کی روٹی پکاتیں اور اصرار کرکے کھلاتیں، پھر سہ پہر کو ہمیں زیارتوں پر لے جاتیں۔ باغوں اور کھیتوں کی سیر کرواتیں۔ کئی کئی دن اسی طرح ہماری خاطر مدارات میں گزر جاتے اور ہم بہت خوش رہتے۔ پھر چند روز کے بعد جب ہم لوگ خالہ بی کے ہاں واپس جانے کے لیے تیار ہوتے تو دادی اماں کچھ اداس سی ہو جاتیں لیکن ہم لوگ پھر آنے کا وعدہ کرکے رخصت ہوتے تو وہ خوش ہو جاتیں سواری میں بیٹھنے سے قبل دادی اماں ہزاروں دعائیں دینے کے بعد کہتیں۔ "چالیس پیادے سو سوار، علیؑ کا رسالہ تیرے ساتھ!"

اور اس طرح ہم اُن کے گھر سے رخصت ہو جاتے۔

اُس زمانے میں بریلی شہر میں محرم بڑے زور شور سے منایا جاتا تھا۔ شیشم کی مضبوط اور جاندار لکڑی کے تعزیے بنائے جاتے تھے جن کو بریلی کی اصطلاح میں "تخت" کہتے تھے۔ ان کا جلوس محرم کی ساتویں اور نویں تاریخوں کو شہر کے مختلف علاقوں سے نکالا جاتا تھا۔ یہ تخت اور تعزیے خوب سجائے جاتے تھے۔ رنگ برنگی روشنیوں اور طرح طرح کے رنگوں سے انھیں مزین کیا جاتا تھا۔ ان کے سامنے ڈھول اور تاشے بجائے جاتے تھے پٹے بازی کا مظاہرہ ہوتا تھا اور جواں مردی کے کرتب دکھائے جاتے تھے۔ نوحے اور مرثیے نہیں پڑھے جاتے تھے، ماتم بھی نہیں ہوتا تھا کیونکہ یہ تمام تعزیے اور تخت سنیوں کے تھے اور سنیوں کے ہاں ماتم یا سینہ کوبی کو اچھا نہیں سمجھا جاتا تھا۔

تعزیوں کے ساتھ اس زمانے میں ایک عورت سکینہ نامی سبز رنگ کا لباس تنگ پاجامہ اور قمیص پہن کر ضرور چلتی تھی۔ یہ لمبے قد کی موٹی عورت تھی۔ رنگ سیاہ تھا گلا پھولا ہوا تھا۔ اس پھولے ہوئے گلے میں وہ بہت سے ہار ڈال لیتی تھی اور تعزیوں کے جلوس میں شریک ہوتی تھی۔ پٹے بازوں کے آگے آگے چلتی تھی اور کچھ پڑھتی جاتی تھی۔ اُسے بچے اور نوجوان لڑکے چھیڑتے بھی تھے جس دن کوئی نہیں چھیڑتا تھا تو کہتی تھی "آج سب مر گئے، کہاں چلے گئے؟"

محرم کے دس دنوں میں گوٹا بنتا تھا۔ اس میں دھنیے کی گری، ناریل، کشمش اور چھالیہ وغیرہ ملائی جاتی تھی۔ رنگ برنگ کے بٹوے بنائے جاتے تھے۔ اور ہر بچے کو ایک بٹوہ دیا جاتا جو گوٹے (دھنیے)

سے بند ہوتا تھا۔ بچے ان ہنڈوں کو گلے میں ڈال لیتے اور دن بھر اس وجھیے یعنی گڑنے کو کھاتے پھرتے۔ کھچڑا نہایت اہتمام سے پکتا تھا اور گھر گھر حضرت امام حسین علیہ السلام کی نذر و نیاز ہوتی تھی۔ خاص طور پر ۸، اور ۹ محرم کو اس کا خاص اہتمام کیا جاتا تھا۔ ٹھنڈے دودھ کا شربت بھی بنایا جاتا تھا، اس میں گلاب اور کیوڑے کی خوشبو بہت مزہ دیتی تھی۔ پستے بھی ڈالے جاتے تھے۔ سخت سردیوں میں بھی امام حسین علیہ السلام کے نام کا یہ شربت بنتا تھا اور خیال یہ کیا جاتا تھا کہ اس کے پینے سے کبھی کوئی نقصان نہیں ہوگا اور واقعی کبھی کوئی نقصان نہیں ہوتا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ گھر گھر شہادت نامے کی مجلسیں منعقد ہوتی تھیں، جن میں شہادت نامہ پڑھا جاتا تھا اور شہادت حسین علیہ السلام پر تقریریں ہوتی تھیں۔ ان محفلوں کا خاتمہ میلاد کی طرح نذر و نیاز پر ہوتا تھا اور ہر شریک ہونے والے کو شیرینی کی صورت میں تبرک تقسیم کیا جاتا تھا۔ بارہ دن تک ان محفلوں کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ عشرے کے دن ہمارے گھروں میں توا نہیں چڑھتا تھا۔ روٹی نہیں پکتی تھی، صرف چاول پکائے جاتے تھے۔ محرم کی تقریبات کا سلسلہ چہلم تک کسی نہ کسی صورت میں ضرور جاری رہتا تھا۔ اس عرصے میں کوئی شادی نہیں ہوتی تھی۔ ہمیشہ چہلم یعنی ۲۰ صفر کے بعد شادیوں کا سلسلہ شروع ہوتا تھا۔

گیارھویں شریف کی نذریں تو ہر مہینے ہوتی تھی لیکن ربیع الثانی کے مہینے میں بڑی گیارھویں کے موقع پر نذر و نیاز کا بڑا اہتمام کیا جاتا تھا۔ دیگیں پکتی تھیں، دعوتِ عام ہوتی تھی، بریانی پکتی جاتی تھی اور حضرت غوث الاعظمؒ کا نام لے لے کر لوگ آتے جاتے اور کھاتے جاتے تھے۔ معجزہ یہ ہے کہ گیارھویں کے موقع پر یہ کھانا کبھی کم نہیں پڑتا تھا۔

بریلی پٹھانوں کا شہر تھا۔ پٹھان اپنے ساتھ یہاں کباب لائے اور یہاں رہ کر انھوں نے کباب کو کچھ ایسا کلچر کیا کہ بریلی کے کبابوں میں ایک انفرادیت پیدا ہو گئی۔ واقعی ان میں جو لذت تھی وہ کسی اور جگہ کے کبابوں میں نہیں دیکھی۔ ہر محلے میں کئی کئی کبابیوں کی دکانیں تھیں۔ کباب بنانے والا کباب بناتا جاتا تھا اور کھانے والے کھاتے جاتے تھے۔ سب سے زیادہ مزیدار کباب کلیجے کے ہوتے تھے۔ نہایت نرم اور خوشبودار۔ لوگ ان کبابوں کو وہاں باسی روٹی کے ساتھ چٹنی ڈال کر کھاتے تھے۔ ہر گھر کے

دسترخوان پر کبابوں کا ہونا ضروری تھا۔ لوگ ان کبابوں کو بڑے شوق سے کھاتے تھے اور واقعی ان کی لذت کا جواب نہیں تھا۔

جاڑوں میں ایک نہایت ہی لذیذ چیز تل شکری بنائی جاتی تھی۔ اس کو تل اور گڑ ملا کر تیار کیا جاتا تھا۔ گڑ کو کھینچ کھینچ کر اتنا صاف کر دیتے تھے کہ سفید ہو جاتا تھا۔ اس گڑ میں تل ملائے جاتے تھے۔ سستی چیز تھی، لوگ مزے سے کھاتے تھے۔ مجھے بھی بچپن میں بہت پسند تھی۔ شکر کی بھی تل شکری بنتی تھی لیکن اس کا مزہ مختلف ہوتا تھا۔ زیادہ مزے دار نہیں ہوتی تھی۔ البتہ خوش رنگ ضرور ہوتی تھی۔ جاڑوں میں ایک چیز "تل بگا" بھی بنتا تھا اور بڑی دکانوں پر ملتا تھا۔ تلوں کو کوٹ کر کھوئے میں ملاتے تھے اور دھیمی آنچ پر کتے تھے۔ بہت لذیذ اور مفید ہوتا تھا۔ تل شکری کے مقابلے میں ذرا مہنگی چیز تھی لیکن ہمارے گھروں میں سیروں کی مقدار میں آتا تھا اور بچے بوڑھے سب ہی اس سے لطف اندوز ہوتے تھے۔ بریلی کی گڑدھانی بھی مجھے اب تک یاد ہے۔ بھنے ہوئے چنوں کو گڑ میں ملا کر بناتے تھے۔ ہر دوکان پر ملتی تھی۔ ایک پیسے میں اتنی ملتی تھی کہ پیٹ بھر جاتا تھا۔ ہمارے گھر کے قریب ایک حاجی صاحب کی دوکان تھی۔ ان کے ہاں جب بھی معمولی سودا لینے جائیں تو وہ بچہ سمجھ کر تھوڑی سی گڑدھانی گھاتے میں ضرور دیتے تھے۔ اس گھاتے کی گڑدھانی میں جو مزہ آتا تھا وہ خریدی ہوئی گڑدھانی میں بھلا کہاں آسکتا تھا۔

گائے کا گوشت بریلی کے لوگوں کی خاص خوراک تھی۔ تقریباً ہر گھر میں دونوں وقت گائے کا گوشت مختلف شکلوں میں پکتا تھا۔ ویسے عام بات یہ تھی کہ اگر کوئی شخص خصوصاً کوئی پٹھان بکرے کا گوشت خریدنے جاتے اور جاننے والوں کو علم ہو جائے تو وہ پوچھتے تھے کہ "کہیں خیریت تو ہے کوئی بیمار تو نہیں ہے؟"

مطلب یہ تھا کہ بکرے کا گوشت تو صرف بیماروں کی غذا ہے۔

میں نے بچپن میں اکثر یہ فقرے سنے ہیں اور آج تک ان سے لطف اٹھاتا ہوں۔ بچپن میں ان فقروں کو پوری طرح سمجھ نہیں سکتا تھا۔ اب سمجھتا ہوں تو واقعی مزہ آتا ہے۔

بریلی میں ہر سال شہر سے کچھ فاصلے پر آموں کے باغوں میں مسلمانوں کا ایک میلہ ہوا کرتا تھا جس کو پیر بہوڑا کا میلہ کہتے تھے۔ سارا شہر اس میلے میں جاتا تھا۔ زیادہ تر لوگ بیل گاڑی میں سوار ہو کر میلے میں پہنچتے تھے۔ کچھ گھوڑوں پر اور کچھ پیدل بھی جاتے تھے۔ عقیدہ یہ تھا کہ جس جگہ یہ میلہ برسوں سے ہوتا ہے وہاں کسی زمانے میں حضرت سالار مسعود غازی رحمۃ اللہ علیہ نے قیام کیا تھا۔ بس، اس کی یاد منانے کے لیے خلقت وہاں جاتی تھی۔ لوگ آموں کے باغوں میں درختوں کے نیچے ڈیرہ جما لیتے تھے۔ نوجوان میدانوں میں پتنگ بازی کرتے تھے۔ بزرگ درختوں کے نیچے آرام کرتے تھے اور گپ لڑاتے تھے اور شام کو بڑے بڑے تربوزے کر اپنے اپنے گھروں کو واپس آجاتے تھے۔ گھر پر نذر و نیاز بھی ہوتی تھی۔

میں بہت چھوٹا تھا جب مجھے ایک دو دفعہ اس میلے میں شریک ہونے کا موقع ملا۔ میرے ماموں شفقت حسین صاحب وکیل ایک دفعہ اپنے تمام بچوں کو بیل گاڑی (دہلوا) میں بٹھا کر میلے میں لے گئے۔ مجھے بھی ساتھ لے لیا۔ راستے میں سڑکوں کی سطح ناہموار ہونے کی وجہ سے خاصے جھٹکے لگے۔ کوئی ڈیڑھ دو گھنٹے کی مسافت طے کرنے کے بعد ہم لوگ میلے میں پہنچے۔ دن وہاں آم کے باغ میں ایک گھنے درخت کے نیچے گزارا۔ دن بھر گرمی کی کر اور خاک پھانک کر بڑے بڑے تربوزے کر شام کو گھر واپس آئے۔

اب ٹھیک سے تو یاد نہیں کہ بریلی میں ننھیال میں یا ددھیال میں جب چار سال چار مہینے، چار دن کا ہوا تو ہماری خاندانی روایت اور اس زمانے کے رواج کے مطابق میری بسم اللہ ہوئی۔ مجھے نئے کپڑے پہنائے گئے، پگڑی باندھی گئی، عزیز و اقارب جمع ہوئے، کلام پاک سامنے رکھا گیا۔ قاعدہ میرے ہاتھ میں دیا گیا اور الف ب کہہ کر میں نے پڑھنے کا آغاز کیا۔ میری والدہ محترمہ میری پہلی معلمہ تھیں۔ انھوں نے قاعدہ کھول کر مجھے الف ب پڑھنا سکھایا۔ شیرینی اور شربت وغیرہ سے حاضرین کی تواضع کی گئی، اور اس طرح یہ تقریب شام کو خاصی دیر تک جاری رہی۔ میں بہت خوش ہوا۔ مجھے اپنی اہمیت کا احساس ہوا اور میرے دل میں مسرت کی ایک عجیب سی لہر اٹھی۔ یہ دن میری

زندگی کا اہم ترین دن تھا جس کو میں کبھی بھول نہیں سکتا۔

شاہ آباد کے محلے میں، میں محلے کے بچوں کے ساتھ آنکھ مچولی، کوڑا جمال شاہی، اور نہ جانے کون کون سے کھیل کھیلا کرتا تھا۔ ان کھیلوں میں سب سے اچھی ساتھی ایک بچی تھی جو عمر میں مجھ سے پانچ چھ سال بڑی تھی۔ سرخ و سفید رنگ، کتابی چہرہ، سیاہ آنکھیں، لمبے بال، چھریرا بدن، تیزی اور پھرتی کا مجسمہ۔ جب تک یہ بچی کھیلنے نہیں آتی میں چپ چاپ بیٹھا رہتا تھا اور اس کا انتظار کرتا رہتا تھا۔ جب وہ آجاتی تو کھیل کود میں میرا دل لگتا تھا۔ وہ بھی میرا بہت خیال رکھتی تھی۔ گھنٹوں ہم ایک ساتھ کھیلتے تھے۔ پھر بیٹھ کر باتیں کرتے تھے۔ وہ مجھے اپنے چھوٹے بھائیوں کی طرح پیار کرتی تھی اور میں بھی اس سے بہت محبت کرتا تھا۔ اس کی محبت اور شفقت کو میں آج بھی یاد کرتا ہوں اور اس کی دلکش شخصیت کے نقوش آج بھی میرے دل پر ثبت ہیں۔

اس زمانے میں، بریلی اپنی رنگ برنگی چکیوں کے لیے مشہور تھا۔ یہ لکڑی کی بنائی جاتی تھیں۔ لکڑی کی اس گول گول چیز میں مضبوط ڈوری باندھی جاتی اور اس ڈوری کو انگلی میں باندھ کر ان چکیوں کو چلایا جاتا تھا۔ ہر بچے کے ہاتھ میں چھوٹی بڑی چکی ہوتی تھی اور بعض ان کو چلانے اور دیر تک چلانے میں مہارت رکھتے تھے۔ مجھے اس کو چلانا تو کبھی آیا نہیں، البتہ میں ان کے خوشنما رنگوں کو دیکھ کر خوش ہوتا تھا اور جب بچے ان کو چلاتے تھے تو میں خاموشی سے دیر تک یہ تماشا دیکھا کرتا تھا۔

پردہ بہت سخت تھا۔ عورتیں دور دور تک نظر نہیں آتی تھیں۔ ان کی دنیا صرف گھر کی چار دیواری تھی۔ اس کے اندر ان کو بند رکھا جاتا تھا۔ برقع پہن کر بھی وہ باہر نہیں نکل سکتی تھیں۔ کبھی کسی خاتون کو باہر جانا ہوتا تو ڈولی منگوائی جاتی۔ اس میں چاروں طرف کپڑا لپیٹا جاتا۔ وہ ڈولی مکان کی ڈیوڑھی میں رکھی جاتی۔ خواتین اس میں اطمینان سے بیٹھ جاتیں اور چار کہار اس ڈولی کو لے کر چلے جاتے اور منزل مقصود پر پہنچاتے۔ اگر مکان میں سے سڑک تک کسی اور سواری میں جانا ہوتا تو یا تو ڈولی میں بیٹھ کر وہاں تک جاتیں یا پھر دونوں طرف چادریں تانی جاتیں اور ان کے درمیان سے ہو کر خواتین سواری تک پہنچتیں۔

مجھے یہ سب کچھ بہت عجیب معلوم ہوتا تھا اور اس وقت اتنی کم عمری میں بھی مجھے یہ خیال آتا تھا کہ اس طرح کی زندگی عورتوں کے لیے قید خانے سے کم نہیں ہے لیکن اس کاروبار میں ایک رومان بھی تھا اس لیے یہ سب کچھ اچھا بھی لگتا تھا۔

شادیوں کے موقع پر گانے بجانے کے لیے ڈومنیاں آتی تھیں۔ وہ غزلیں اور گیت لہک لہک کر گاتی تھیں لیکن ان کا گانا بجانا گھر کے اندر محدود تھا اور صرف عورتوں کے لیے تھا۔ باہر مجرا ہوتا تھا ایک گانے والی آتی محفل جماتی۔ غزل چھیڑتی، بھاؤ بتاتی اور مرد اس کے گانے اور انداز دکھانے میں خاص دلچسپی لیتے۔ داد دیتے۔ فقرے کستے اور آپس میں کانا پھوسی کرتے اور اس طرح اپنے دلوں کی بھڑاس نکالتے اور اپنے آپ کو تسکین پہنچاتے۔

اس وقت یہ باتیں کچھ سمجھ میں نہیں آتی تھیں۔ اب سوچتا ہوں تو اس زندگی کے ان گنت پہلو سامنے آتے ہیں اور اس خلا کا اندازہ ہوتا ہے جو ان لوگوں کی زندگیوں میں مخصوص معاشرتی اور تہذیبی روایات نے پیدا کر دیا تھا۔

شادیوں کے موقع پر دو رسمیں مجھے بہت اچھی لگتی تھیں۔ ایک تو وہ رسم جب برات کے ساتھ آنے والی خواتین دلہن کے گھر میں داخل ہوتی تھیں۔ اس وقت دلہن کے گھر کی خواتین پھولوں کی بنی ہوئی چھڑیاں مار کر ان کا استقبال کرتی تھیں۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ جو لوگ دلہن کو لے جانے کے لیے آئے ہیں، انہیں مارا جائے گا لیکن پھولوں کی نرم و نازک چھڑیوں سے۔ دوسری رسم آرسی مصحف کی ہوتی تھی۔ جب نکاح کے بعد دلہن کی رخصتی کا وقت قریب آتا تھا تو دولہا میاں زنان خانے میں بلائے جاتے تھے۔ دلہن کو سامنے بٹھایا جاتا تھا لیکن اس کا منہ دوسری طرف کر کے آئینے میں دکھایا جاتا تھا۔ کتنا عجیب رومان تھا ان رسموں میں!

جانوروں اور پرندوں کے اس زمانے میں لوگ دیوانے تھے۔ لال خاص طور پر بڑے شوق سے پالتے تھے۔ کچھ لوگوں کو دیکھا کہ ان کے پاس پھٹکی ہے۔ یہ پھٹکی وہ کھیتوں اور میدانوں میں لگا دیتے تھے۔ اس میں لال خود بخود پھنس جاتے تھے۔ میرے چھوٹے چچا، اصغر یار خاں صاحب کے

پاس بلا مبالغہ سیکڑوں کی تعداد میں لال تھے اور دن بھر ان کا محبوب مشغلہ ہی یہ تھا کہ لال پکڑتے اور ان کی دیکھ بھال کرتے۔ ایک زمانے تک ان کو یہی شوق رہا۔ اس چھوٹی سی خوبصورت رنگ رنگی چڑیا کو پنجرے میں بند دیکھ کر مجھے بہت دکھ ہوتا تھا اور جی چاہتا تھا کہ انھیں آزاد کر دیا جائے لیکن کچھ پیش نہیں جاتی تھی۔

شکار کا شوق ہر شخص کو تھا۔ صبح کو اپنی دونالی بندوقیں لے کر نکل جاتے اور جنگلوں اور باغوں میں قسم قسم کی چڑیوں کا شکار کر کے لاتے۔ کبھی کبھی تو کئی کئی دن کے لیے شکار کا پروگرام بنتا اور آس پاس کے ترائی کے جنگلوں میں ہفتوں اس کا سلسلہ جاری رہتا۔ جب یہ لوگ واپس آتے تو کبھی نیل گائے کبھی ہرن، کبھی چیتل، کبھی بارہ سنگھے گولیوں سے چھلنی مکان کے صحن میں مجھے دیکھنے کو ملتے اور مجھے ہمیشہ ان خوبصورت جانوروں کو اس عالم میں دیکھ کر دکھ ہوتا۔ ان کا گوشت کھانے کو جی نہ چاہتا اور میں یہ سوچتا رہتا کہ خدا جانے کس جنگل میں ان جانوروں کا گھر ہوگا۔ ان کے بچے ہوں گے، عزیز اور دوست احباب ہوں گے۔ ظالم شکاریوں نے ان سب کو ایک دوسرے سے جدا کر دیا اور وہ اس طرح تباہ و برباد ہو گئے۔

یہ سب کچھ سوچ کر کلیجہ منہ کو آتا اور میں گھنٹوں اداس اور پریشان رہتا لیکن ایسا کرنے والے میرے بزرگ تھے، میں اُن سے کیا کہہ سکتا تھا۔ کبھی دبی زبان سے کچھ کہتا بھی تو وہ یہ کہہ کر میرا منہ بند کر دیتے کہ "تم پٹھان ہو، تمھیں بزدلی کی باتیں نہیں کرنی چاہئیں۔ یہ جانور تو اللہ تعالیٰ نے ہمارے لیے حلال کیے ہیں" اور میں اُن کی یہ باتیں سُن کر خاموشی اور اداسی کے سمندروں میں ڈوب جاتا۔

بقرعید کے موقع پر قربانی زور شور سے کی جاتی۔ گائے کو ذبح کرنے کا خاص طور پر اہتمام ہوتا۔ بچوں سے خاص طور پر کہا جاتا کہ "بیٹا! اللہ اکبر کہہ کر اس جانور کی گردن پر چھری چلاؤ، یہ سنت ہے، کارِ ثواب ہے۔ اس سے تمھارے اندر جرأت اور بہادری بھی پیدا ہوگی اور ثواب بھی ہوگا۔" اور بچے اپنے بزرگوں کی بات مانتے۔ گائے یا بکرے کی گردن پر چھری چلاتے، خون کے فوارے چھوٹتے۔ پھر قصائی اس جانور کو ذبح کر دیتا اور ساری فضا لہولہان ہو جاتی لیکن مجھے یہ سب کچھ اچھا نہیں لگتا تھا۔ خون مجھ سے دیکھی نہیں

جاتا تھا۔ جانور کی بے بسی اور بے کسی پر مجھے افسوس ہوتا اور میں پریشان ہو جاتا تھا۔ میں کبھی کسی جانور کی گردن پہ چھری نہ چلا سکا اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مجھ پر بزدلی کی مہر لگا دی گئی لیکن میں بھی ٹس سے مس نہ ہوا۔ یہ خونخواری اپنی جگہ تھی لیکن اس کے باوجود یہ لوگ محبت کے مجسمے تھے، خلوص کے پیکر تھے۔ تنگ دلی ان میں نام کو نہیں تھی، برخلاف اس کے بڑے مخلص اور کشادہ دل تھے۔

میرے ایک چچا تھے اختر یار خاں (الحمد للہ کہ ابھی تک زندہ ہیں اور بریلی میں رہتے ہیں) ایک دن میں نے دیکھا کہ ان کی جیب میں ایک نہایت ہی خوبصورت سبز رنگ کا پارکر فاؤنٹین پن لگا ہوا ہے۔

انھوں نے کچھ لکھنے کے لیے یہ قلم نکالا تو مجھے بہت اچھا لگا۔ میں نے اس قلم کی تعریف کر دی اور کہا "اختر چچا! یہ قلم تو بہت ہی اچھا ہے۔ بہت ہی خوبصورت ہے۔ بڑا ہو کر میں بھی ایسا ہی قلم لوں گا۔"
اختر چچا یہ سن کر کہنے لگے "یہ قلم میں تجھے دیتا ہوں۔ اب یہ قلم تیرا ہے۔ تیرے لیے ہے کیونکہ تجھے پسند ہے۔

میں نے کہا "میں ابھی چھوٹا ہوں۔ یہ قلم بڑوں کے لیے ہے، فاؤنٹین پن ہے۔"
وہ کہنے لگے "بس یہ قلم میں نے تجھے دے دیا۔ اب میرے لیے اس کو اپنے پاس رکھنا حرام ہے۔ جو چیز تجھے پسند ہے وہ تیرے پاس ہونی چاہیے۔"

چنانچہ مجبوراً مجھے وہ قلم لینا پڑا۔ حالانکہ مجھے اس وقت ٹھیک سے لکھنا بھی نہیں آتا تھا۔ پٹھان لوگ تھے۔ بھلا ان کے سامنے کس کو انکار کی جرأت ہو سکتی تھی؟"

برسات کا موسم بریلی میں بہت ہی خوبصورت ہوتا تھا۔ بادل گھر کر آتے تھے۔ اودی اودی گھٹائیں چھائی رہتی تھیں۔ موسلا دھار مینھ برستا تھا۔ ساون کے مہینے میں کئی کئی دن تک جھڑی لگی رہتی تھی۔ خنک ہوائیں چلتی تھیں۔ آم، نیم اور جامن کے درخت اس طرح جھومتے تھے جیسے ان پر مستی چھائی ہوئی ہو۔ راتوں کو بجلی چمکتی۔ بادل گرجتے، اور موسلا دھار مینھ سے سائبان بولنے لگتے۔ بوندیں ان پر اس طرح پڑتیں جیسے دور کوئی ستار بجا رہا ہو، یا دور بہت دور سے کسی کے رقص کرنے کی آواز

آ رہی ہو۔

اس موسم میں پوریوں کا پکوان پکتا۔ آلو یا قیمے کے ساتھ کھائی جاتیں اور اس پر گرم گرم دودھ پیا جاتا۔

درختوں میں جھولے ڈال دیئے جاتے۔ لڑکیاں پینگ لیتیں اور مجھے گود میں لے کر جھلاتیں لمبے پینگوں کے ساتھ وہ جو پیٹ میں ایک طرح کی لطیف سی گدگدی ہوتی تھی اُس کو میں آج تک بھول نہ سکا جھولا جھولتے ہوئے مجھ پر عجیب سی کیفیت طاری ہوتی تھی۔ الفاظ میں اس کیفیت کو بیان نہیں کیا جا سکتا۔

آم اس موسم میں بڑا مزہ دیتے تھے اور آموں کی اتنی افراط تھی کہ ہر طرف آم ہی آم نظر آتے تھے بریلی کے آس پاس دور دور تک آموں کے جنگل تھے۔ زیادہ تر یہ آم تخمی ہوتے تھے جس کو وہاں کی اصطلاح میں "کُٹھا" کہتے تھے۔ ان آموں کو گاؤں والے گاڑیوں میں بھر بھر کر شہر میں لاتے تھے آنے دو آنے بلکہ پیسے دو پیسے سو بکتے تھے اور سو کا مطلب چھبیس پنجے ہوتا تھا شام کو جو بکنے سے رہ جاتے تھے ان کو گاڑی والے سڑک پر یونہی چھوڑ کر واپس چلے جاتے تھے۔ گھروں میں یہ آم ٹبوں میں پانی بھر کر ڈال دیئے جاتے تھے اور لوگ ان کو وقت کی قید کے بغیر کھاتے رہتے تھے۔ میں بھی اس میں شریک ہوا کرتا تھا اور جو اس موقع پر محفلیں جمتی تھیں۔ ان میں مجھے لطف آتا تھا۔ ہنسی، مذاق، قہقہے دلچسپ باتیں، لطیفے، کہاوتیں، غرض بہت کچھ سننے کو ملتا تھا۔ آم تو کوئی کھٹا ہوتا تھا، کوئی میٹھا، کوئی رسیلا، کوئی خشک لیکن محفلوں میں بڑی مٹھاس ہوتی تھی۔ میرے ماموں جان مولوی شفقت حسین صاحب علیگ بریلی کے مشہور و معروف وکیل تھے۔ ایک شب رات گئے میری آنکھ کھل گئی تو دیکھا اتنی رات گئے آم کھا رہے ہیں۔ میں نے انھیں اس عالم میں دیکھ کر کہا "ماموں جان! آپ اتنی رات کو آم کھا رہے ہیں؟ کہنے لگے "مجھے نیند نہیں آ رہی تھی سوچا آم کھا لوں کس طرح نیند آ جائے گی" بعد میں معلوم ہوا کہ آموں کی فصل میں ان کا تو معمول ہی یہی ہے ہر شب سونے سے [illegible] آم کھاتے ہیں۔ غرض آم کھانے کے لیے دن رات کی کوئی قید نہیں تھی قلمی آم بھی بہت ہوتا تھا لیکن تخمی کی طرح زیادہ [illegible] نہیں ہو سکا

تھا۔ اس کے لیے ایک تو اہتمام کرنا پڑتا تھا اور زیادہ کھانے سے نظامِ ہضم میں خرابی پیدا ہو جاتی تھی۔ بمبئی آم (جس کو سرولی اور سہارنی بھی کہتے ہیں) بہت خوبصورت اور سنہرے رنگ کا ہوتا تھا۔ آٹھ آنے یا روپے کے سو مل جاتے تھے۔ ہمارے باغوں میں عجب عجب قسم کے آم تھے۔ ایک آم سیندوریا ہوتا تھا۔ اس پر سیندور کی طرح سرخ رنگ اپنی بہار دکھاتا تھا۔ ایک آم میں سوئے کے ساگ خوشبو آتی تھی۔ ایک میں کھیرے اور ککڑی کی خوشبو کا احساس ہوتا تھا۔ آباؤ اجداد نے نہ جانے کس کس طرح کتنی محنت کر کے آموں کے اس قسم کے درخت تیار کیے تھے۔ میرے لیے ان کی خوشبو اور رنگ دلچسپی کا باعث بنتے تھے اور میں گھنٹوں اس قسم کے آموں کو دیکھتا اور ان کے رنگوں اور خوشبوؤں سے لطف اندوز ہوتا تھا۔

اس زمانے میں تفریح کا کوئی خاص سامان نہیں تھا۔ گھروں میں لوگ چوسر اور پچیسی کھیل لیتے تھے۔ لیکن تاش کے کھیل کو اچھا نہیں سمجھا جاتا تھا۔ اس کھیل کو جوا سمجھتے تھے۔ بعض لوگ غزلیں گاتے تھے اور ان کو شوق سے سنا جاتا تھا۔ لیکن عجیب طرح کی غزلیں ہوتی تھیں۔ مثلاً فانی کی یہ غزل جس کا شعر ہے ؎

مآلِ سوزِ غم ہائے نہانی دیکھتے جاؤ　　کفن سرکاؤ میری بے زبانی دیکھتے جاؤ

یا پھر اس قسم کی غزلیں:

آئینہ دیکھ رہا ہے سرِ محفل قاتل　　مجھ کو ڈر ہے کہیں لڑ جائے نہ قاتل قاتل

یا ؎

رنگ لائے گی حنا پتھر پہ پس جانے کے بعد

لوگ اس قسم کی غزلوں کو لہک لہک کر گاتے تھے لیکن مجھے یہ غزلیں کچھ اچھی نہیں لگتی تھیں۔ بس سنتا تھا لیکن دلچسپی اور تفریح کا کوئی سامان مجھے ان میں نظر نہیں آتا تھا۔ حالانکہ بیشتر لوگ ان کو سن کر بہت خوش ہوتے تھے۔

اب سوچتا ہوں تو خیال آتا ہے کہ کتنے معصوم تھے یہ لوگ اور کیسا عجیب تھا ان کا ذوقِ جمال!

یہ سب باتیں سہانی یادوں کی صورت میں آج بھی میرے سینے میں محفوظ ہیں۔ دراصل بات یہ ہے کہ ان لوگوں کو ادب اور شاعری سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔ بس انھیں تو وقت گزارنے

کے لیے کوئی نہ کوئی مشغلہ چاہیئے تھا اس لیے کچھ لوگ اس قسم کی غزلیں گاتے تھے۔ وقت بہت تھا کرنے کے لیے زیادہ کام نہیں تھے۔ مصروفیت بہت کم تھی۔ یہی وجہ ہے کہ جگہ جگہ محلوں میں لوگ اپنے مکان کے سامنے میدانوں میں بیٹھتے تھے۔ باتیں کرتے، گپ لڑاتے، فقرے بازیاں کرتے اور اس طرح ہنستے ہنساتے تھے

بریلی کے محلے براہم پورہ میں میری ننھیال تھی۔ اپنے قدیم آبائی مکان میں میرے نانا میاں منشی اخلاق حسین صاحب رہتے تھے۔ وکالت اور زمینداری کے کاموں میں ان کا زیادہ وقت گزرتا تھا۔ ان کے مکان کے سامنے میرے منجھلے ماموں جان مولوی شفقت حسین صاحب ایڈوکیٹ کا لق ودق مکان تھا۔ اس مکان میں وہ رہتے بھی تھے اور ان کا دفتر بھی تھا۔ ان کے ڈرائنگ روم کے سامنے جو برآمدہ تھا اس میں بڑی رونق رہتی تھی۔ طرح طرح کے لوگ آتے تھے اور اپنے اپنے مسائل پر باتیں کرتے تھے۔ نانا میاں اور ماموں جان ان کے مسائل کو سلجھاتے انھیں تسلّی دیتے اور خوش رکھنے کی کوشش کرتے تھے۔

اور میں چپ چاپ بیٹھا ان مناظر کو دیکھا کرتا تھا۔ مجھے دیکھ کر خوشی ہوتی تھی کہ آنے جانے والے خوش اور مطمئن ہیں۔

دادا میاں کا شمار شہر کے رئیسوں میں ہوتا تھا۔ ان کی جائداد بہت تھی۔ اکثر گاؤں سے ان کے کاشتکار ملنے کے لیے آیا کرتے تھے۔ ان میں سے بیشتر ہندو تھے، وہ جو زبان بولتے تھے، وہ میری سمجھ میں بالکل نہیں آتی تھی۔ وہ اردو نہیں تھی۔ برج بھاشا یا کھڑی بولی کی قسم کی ملی جلی سی زبان نانا میاں اور ماموں جان ان کی باتیں خوب سمجھتے تھے لیکن میرے پلّے ایک لفظ بھی نہیں پڑتا تھا اور مجھے الجھن سی ہوتی تھی۔

میں نانا میاں سے پوچھتا تھا ”یہ گاؤں والے کیا کہتے ہیں؟“

وہ کہتے تھے ”بیٹا! یہ گاؤں کے بارے میں باتیں کہتے ہیں۔ تم ان کی زبان نہیں سمجھ سکتے۔ ان کی باتیں ہماری سمجھ میں آجاتی ہیں۔ ان کی زبان ”گنواری“ زبان ہے۔“

نانا میاں اور ماموں جان مجھ سے بڑی محبت کرتے تھے، اور مجھے کھانے اور کھیلنے کی بے شمار

چیزیں دکر دیا کرتے تھے۔

میرے سب سے چھوٹے ماموں مولوی عظمت حسین صاحب مختار تھے اور اپنے نانا میاں کے ساتھ مل کر وکالت کرتے تھے، جائیداد کی دیکھ بھال کرتے اور ہاکی کھیلتے تھے۔ بریلی نوبلز ہاکی کلب انھوں نے قائم کیا تھا اور خود ہاکی کھیلنا اور اس کھیل کے لیے نوجوانوں کو تیار کرنا ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں میں اپنی ٹیم لے کر ہاکی کھیلنے کے لیے جاتے تھے اور اکثر جیت کر آتے تھے۔ ان کی کئی الماریاں انعامات سے بھری ہوئی تھیں۔

میں ان سے ہاکی کی باتیں سن کر خوش ہوا کرتا تھا اور جی چاہتا تھا کہ میں خود بھی ہاکی کھیلوں۔ انھوں نے مجھے بھی ایک چھوٹی سی ہاکی اور گیند بھی دی تھی جس کو لے کر میں ادھر ادھر گھوما کرتا تھا اور یہ سمجھتا تھا کہ میں ہاکی کا اہم کھلاڑی ہوں۔

میرے سب سے بڑے ماموں منشی رحمت حسین صاحب نے اپنی بہت بڑی کوٹھی پرانے شہر کے محلے سیدنی میں بنائی تھی اور مستقل طور پر وہیں ان کا قیام تھا۔ میں اکثر اپنی والدہ کے ساتھ ان کے پاس کئی کئی دن جا کر رہتا تھا۔ وہ پولیس میں کسی بڑے عہدے پر فائز تھے۔ ایک دفعہ وہ مجھے اور میری والدہ کو اپنے ساتھ جالون لے گئے۔ یہ جگہ جھانسی کے قریب تھی۔ وہاں میں نے نیلے پانی کی ایک باؤلی دیکھی جس کو دیکھ کر مجھے بہت ڈر لگا۔ پھر ان کی کوتوالی یا تھانے میں بھی گیا۔ وہاں بہت سے لوگ حوالات میں بند دیکھے۔ ان پر مجھے بہت ترس آیا، اور میں نے ماموں جان سے کہا: "آپ ان سب کو چھوڑ کیوں نہیں دیتے؟ ان کا دل گھبراتا ہوگا۔"

ماموں جان ہنسے اور کہنے لگے: "بیٹا! انھوں نے جرائم کیے ہیں، اس لیے یہاں بند کیے گئے ہیں۔ اب ان کے معاملات عدالتوں میں پیش ہوں گے۔ پھر کوئی فیصلہ ہوگا۔"

میں یہ باتیں سن ہی رہا تھا کہ ایک طرف سے رونے پیٹنے کی آوازیں آئیں۔ دیکھا تو دو تین سپاہی ایک آدمی کو بری طرح مار رہے تھے۔

مجھ سے یہ منظر نہ دیکھا گیا اور میں وہاں سے بھاگ کر گھر آ گیا۔ والدہ کی گود میں چھپ گیا اور

دیر تک روتا رہا۔

گھر کے تمام لوگ مجھے تسلی دیتے رہے لیکن دیر تک میرے آنسو نہیں رُکے۔

میرے بچپن میں گنڈے تعویذوں کا بڑا زور تھا۔ جس گھر میں جاؤ تعویذ گھس رہے ہیں، سیہی کے کانٹوں کا ذکر ہو رہا ہے اور لوگ کہہ رہے ہیں کہ تکیے کے نیچے سے یہ کانٹے نکلے ہیں، کہیں خون سے بھری ہوئی کوئی ہنڈیا گھر میں آ کر گر رہی ہے۔ کوئی بنگالی مولوی کتھا چونا لگے ہوئے پان کو سامنے رکھ کر گھر والوں کو کسی دوسرے گھر میں ہونے والے واقعات کی تصویریں دکھا رہا ہے، کہیں کسی جانور کا کٹا ہوا سر گھر میں آ کر گر رہا ہے وغیرہ وغیرہ

یہ باتیں میری سمجھ سے باہر تھیں لیکن میں ان سب کو دلچسپی سے سنتا اور دیکھا کرتا تھا۔

پُرانے شہر میں ہمارے گھر سے کچھ فاصلے پر ایک صاحب مولوی ہادی کا مکان تھا۔ یہ صاحب اپنے مکان کی بیٹھک میں باقاعدہ مطب کرتے تھے۔ طبیب بھی تھے لیکن زیادہ زور گنڈے تعویذوں پر تھا۔ سیکڑوں عورتیں ان کے ہاں تعویذ لینے کے لیے آیا کرتی تھیں۔ سیاہ روشنائی سے لکھا ہوا تعویذ وہ میٹھے پانی میں گھول کر عورتوں اور بچوں کو پلا دیتے تھے اور کمر میں باندھنے، گلے میں پہننے اور دھونی دینے کے لیے وہ بے شمار تعویذ لکھ کر دیا کرتے تھے۔

مجھے دو ایک دفعہ ان کے ہاں جانے کا اتفاق ہوا۔ عجیب پُراسرار سا ماحول ہوتا تھا ان کے مطب میں ــــ مجھے تو بڑی ہی یبوست کا احساس ہوتا تھا اور طبیعت گھبراتی تھی لیکن لوگ بڑے اعتقاد کے ساتھ وہاں آتے اور خوش خوش واپس جاتے تھے۔ میلے کا سا ماحول ہوتا تھا۔

یہ اور اسی طرح کی بے شمار یادیں ابھی تک میرے دل و دماغ میں محفوظ ہیں اور اگرچہ نصف صدی گزر جانے کی وجہ سے یہ یادیں خاصی حد تک دھندلا گئی ہیں لیکن اب بھی کسی نہ کسی گوشے سے اکثر جھانکتی ہوئی نظر آتی ہیں۔

چوتھا باب

لکھنؤ

میری بسم اللہ کے بعد میری والدہ اور والد نے یہ طے کیا کہ روز روز یہ بریلی اور لکھنؤ کا راستہ ناپنا صحیح نہیں۔ میری صحیح تعلیم و تربیت کے لیے مستقل طور پر لکھنؤ میں قیام ضروری ہے چنانچہ ہم لوگ لکھنؤ پہنچ گئے اور اب میں تھا، میری والدہ محترمہ، میرے والد صاحب اور ایک نوکر جو بریلی سے خاص طور پر ہمارے ساتھ لکھنؤ بھیجا گیا تھا۔

میری والدہ میری معلّم اوّل قرار پائیں۔ انھوں نے مجھے الف ب پڑھایا۔ قاعدہ ختم کروایا اور ناظرہ کلام پاک شروع کروا دیا۔ میں نے دو دو چار چار گھنٹے محنت کر کے کم عمری ہی میں قرآن مجید ختم تو کر لیا لیکن چونکہ مطلب سمجھ میں نہیں آتا تھا اس لیے الجھن سی ہوتی تھی لیکن کیا کیا جائے کہ اُس زمانے میں بچوں کو قرآن مجید پڑھانے کی یہی صورت تھی۔ کارِ ثواب سمجھ کر گھر کے بڑے بوڑھے بچوں کو پڑھاتے اور بچے بغیر اس کے معنی و مطالب کو جانے ہوئے اس کو پڑھتے تھے۔

اور آج بھی شاید اس انداز میں کوئی خاص تبدیلی نہیں ہوئی ہے۔

قرآن مجید کی تعلیم کے ساتھ ساتھ مجھے اردو بھی پڑھائی گئی اور چند مہینے میں میں فرفر اردو پڑھنے لگا۔ انگریزی کی کنگس ریڈر بھی شروع کروا دی گئی اور چند مہینے میں انگریزی کے کچھ الفاظ بھی مجھے یاد ہو گئے۔

اسی زمانے میں ایک مولوی صاحب ہمارے ہاں آ گئے اور ہمارے مکان کے پیچھے کے کمرے میں رہنے لگے۔ نام تو اُن کا غالباً ریاست علی خاں تھا۔ رام پور کے رہنے والے تھے۔ اردو فارسی اور

دینی علوم کے فاضل تھے۔ ضعیف آدمی تھے۔ کھلتا ہوا گندمی رنگ، دراز قامت، بھرا بھرا چہرہ، سفید داڑھی، کرتے پاجامے، شیروانی اور کشتی نما مخمل کی ٹوپی میں ملبوس۔ یہ تھے ہمارے مولوی صاحب۔ رعب اور دبدبہ ان کے ایک ایک انداز سے ٹپکتا تھا۔ مزاج کے سخت اور کھردرے تھے۔ آواز گرجدار تھی۔ ڈانٹ پھٹکار خاصی کرتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ چھوٹے بچوں پر سختی ضروری ہے۔ میں گھر میں اکیلا بچہ تھا اس لیے ان کی مشق ستم کے لیے میری ننھی سی جان ہی نشانہ تھی۔

والد صاحب نے اس خیال سے انھیں اپنے پاس رکھا تھا کہ وہ میری نگہداشت کریں گے مجھے پڑھائیں گے۔ فارسی اور اردو کا درس دیں گے۔ مجھے دینی معاملات سے آشنا کریں گے۔ اس طرح میری صحیح تربیت ہوگی اور میں، اس بھٹی میں سے کندن ہو کر نکلوں گا۔

چنانچہ مجھے مولوی صاحب کے سپرد کر دیا گیا وہ میرے اتالیق مقرر کر دیئے گئے اور میری تعلیم و تربیت کا بیڑا انھوں نے اٹھا لیا۔

مولوی صاحب نے مجھے نماز کی پابندی کرنے کا درس دیا۔ تمام کلمے سکھائے۔ بعض دعائیں ازبر کرائیں، اہم حدیثوں سے مجھے آشنا کیا اور اس طرح میں مولوی ریاست علی خاں صاحب کے سائے میں تعلیم و تربیت کی مختلف منزلیں طے کرنے لگا۔

فارسی کی کچھ کتابیں بھی مولوی صاحب نے منگوائیں۔ پہلے آمد نامہ شروع کرایا اور رٹوایا، پھر کریما پڑھایا جس کا پہلا شعر ہے ؎

کریما! بہ بخشائے برحال ما   کہ ہستم اسیر کمند ہوا

"آمد نامہ" پڑھ چکا تھا جس سے فارسی زبان کے کچھ قواعد مجھے آ گئے تھے چنانچہ میں کریما سمجھ کر پڑھنے لگا۔ چند روز میں کریما ختم ہو تو مولوی صاحب نے انوار سہیلی شروع کروا دی۔ کریما پڑھنے میں تو خیر کسی قدر لطف بھی آتا تھا لیکن انوار سہیلی بڑی ہی ثقیل اور غیر دلچسپ کتاب تھی۔ دابشلیم وغیرہ اور خجستہ خو وغیرہ کے ناموں تک سے مجھے الجھن سی ہوتی تھی لیکن مولوی صاحب ان کے بارے میں نہ جانے کیا کیا کچھ کہتے تھے اور میں چپ چاپ سنتا رہتا تھا۔

آخر کر بھی کیا سکتا تھا۔ مولوی صاحب بہرحال مولوی صاحب تھے۔ استاد تھے اور پٹھان تھے۔

اس کتاب نے کئی مہینے میرا پیچھا نہیں چھوڑا کیونکہ مولوی صاحب اس کے پیچھے پڑے رہے۔ خدا خدا کر کے جب کئی مہینے بعد یہ کتاب ختم ہوئی تو جان میں جان آئی۔

مولوی صاحب نے اس کے بعد گلستان سعدی شروع کرا دی اور اس کے بعد بوستاں پڑھانے کا آغاز کر دیا۔ ان دونوں کتابوں کے پڑھنے میں کسی حد تک میرا دل لگا۔ اس لیے کہ ان میں کہانیاں دلچسپ تھیں اور ان کا انداز و اسلوب بھی آسان اور سادہ تھا۔

اردو میں نصاب کی ایک کتاب میرے لیے تجویز کی گئی اور میں اردو نثر و نظم اس کتاب سے پڑھتا رہا۔ اس طرح اردو سے بھی مجھے اچھی خاصی واقفیت ہو گئی اور میں لکھنے پڑھنے لگا۔

مولوی صاحب مجھے بڑی محنت سے پڑھاتے تھے کئی کئی گھنٹے ان کا درس جاری رہتا تھا وہ تھکتے نہیں تھے۔ مجھ سے عالمانہ باتیں کرتے تھے لیکن میں ان کی عالمانہ باتوں کو سمجھ نہیں سکتا تھا۔ مولوی صاحب بولتے جاتے تھے میں سنتا جاتا تھا اور یہ ظاہر کرتا تھا کہ میں سب کچھ سمجھ رہا ہوں۔ مولوی صاحب میرے اس انداز سے خوش ہوتے تھے اور پیٹھ پیچھے میرے والدین سے میری تعریف کرتے تھے۔

اس میں شبہ نہیں کہ مولوی صاحب نے میرے اندر اردو اور فارسی دونوں زبانوں سے دلچسپی پیدا کی اور مجھے ان زبانوں کو پڑھنے لکھنے کی شد بد بھی ہو گئی۔ انھوں نے مجھے دینی معاملات سے بھی آشنا کیا۔ نماز پڑھنے کی عادت بھی ڈالی۔ خوفِ خدا بھی میرے دل میں پیدا کیا لیکن یہ زمانہ مجھ پر بہت سخت گزرا۔ ہر وقت بس مولوی صاحب تھے اور میں تھا۔ میرا جی چاہتا تھا کہ باہر جاؤں، سڑکوں پر ہنگامہ کروں، چھتوں پر دوڑوں، گلیوں میں گھوموں، محلے کے لڑکوں کے ساتھ کھیلوں لیکن مولوی صاحب میری اس کیفیت کو بالکل نہیں سمجھ سکتے تھے۔

جمعے کی چھٹی تک مولوی صاحب نہیں دیتے تھے۔

میں کبھی کبھی جرأت کر کے ان سے کہتا تھا۔ ”مولوی صاحب جمعے کو تو چھٹی ہونا چاہیے۔“

اس کے جواب میں وہ ہمیشہ کہتے ”بچے کو اگر ہفتے میں ایک دن جمعے کی چھٹی دے دی جائے

تو پھر چالیس دن تک پڑھنے میں اس کا دل نہیں لگتا۔ استاد کی ساری محنت اکارت ہو جاتی ہے۔ اس لیے میاں! جمعے کو بھی پڑھا کرو۔ میں جمعے کی چھٹی کا قائل نہیں۔“

اور میں ان کی یہ باتیں سن کر چپ ہو جاتا تھا اور مجھے ایک عجیب سی تکلیف اور کوفت ہوتی تھی۔ کیونکہ میری صرف یہ خواہش ہی نہیں تھی کہ مجھے جمعے کی چھٹی ملے بلکہ مولوی صاحب سے اس معاملے میں میرا اختلاف شدید تھا اور میرے خیال میں ان کے یہ خیالات و نظریات صحیح نہیں تھے۔

ایک دن کوئی بارہ بجے کا وقت تھا مولوی صاحب مجھے انوار سہیلی کا درس دے رہے تھے کہ اندھیرا سا چھا گیا، آندھی آئی، تیز اور ٹھنڈی ہوا کے جھونکے مجھے باہر کی طرف یا چھت پر پکار پکار کر بلانے لگے لیکن مولوی صاحب انوار سہیلی کے کرداروں میں خود بھی اُلجھے ہوئے تھے اور مجھے بھی الجھائے ہوئے تھے۔ میری ایک نہ سنی بس پڑھاتے رہے، پڑھاتے رہے لیکن یہاں کس کمبخت کا دل پڑھنے میں لگ رہا تھا۔ خاک سمجھ میں نہیں آیا۔ کوئی دو گھنٹے وہ آندھی چلتی رہی۔ اس نے کالے، پیلے، نیلے کئی رنگ بدلے لیکن میں اس سے محظوظ نہ ہو سکا، اس کی داد نہ دے سکا۔ آج تک یہ محرومی میرے دل میں ایک داغ ہے۔

مولوی صاحب کو کون سمجھاتا کہ آندھی میں چھت پر گھومنا، شور مچانا اور تیز ہوا سے لطف اندوز ہونا انوار سہیلی کی حکمتوں سے زیادہ دلچسپ ہے۔ کاش انہیں یہ معلوم ہوتا کہ اس قسم کی رنگ برنگی آندھی پھر کبھی نہیں آئے گی۔ ایسی ٹھنڈی ہوا کے جھونکے پھر کبھی نہیں چلیں گے اور آندھی کی یہ دھوم پھر کبھی نہیں ہوگی۔

آندھیاں تو اس کے بعد بھی بہت آئیں، غبار تو بے شمار چھائے لیکن اس قسم کی آندھی پھر کبھی نہیں آئی جس میں شور کرنے اور دھوم مچانے سے مولوی صاحب نے مجھے روکا تھا۔

مولوی صاحب کی تعلیم و تربیت کا یہ اثر ہوا کہ میں چھوٹی سی عمر میں پکا نمازی ہو گیا۔ پانچوں وقت مسجد میں جا کر باجماعت نماز پڑھتا، مذہب پر باتیں کرتا، دینی معاملات میں گہری دلچسپی لیتا، مسلمانوں کو جنتی سمجھتا اور غیر مسلموں کو کافر جان کر جہنمی خیال کرتا۔ مولوی صاحب میرے اس رویے پر فخر کرتے، سب کے سامنے میری تعریفوں کے پل باندھتے اور ”شاباش شاباش“ کہہ کر میرا دل بڑھاتے۔

مغرب کی نماز کے بعد جب میں نمازیوں کے ساتھ مسجد سے باہر نکلتا تو دیکھتا کہ میلے کچیلے کپڑوں میں ملبوس عورتیں اپنے اپنے نحیف و نزار بچوں کو لیے مسجد کے دروازے پر کھڑی ہیں اس خیال سے کہ نمازی ان بچوں پر پھونک ماریں گے اور اس کا اثر ان پر اچھا ہوگا۔ جب مجھے یہ بچے ماؤں کے کاندھوں پر گردنیں ڈالے ہوئے نظر آتے تو مجھے ان پر بہت ترس آتا اور میں ہمدردی میں کئی کئی بار ان پر پھونک مارتا۔ اس خیال سے کہ اس سے ان کا بھلا ہوگا۔ ان کی غربت دور ہو جائے گی اور یہ صحت مند اور توانا ہو جائیں گے۔

کئی سال تک یہ عمل جاری رہا لیکن ان عورتوں اور بچوں کی غربت ختم نہ ہوئی۔ ان کے بچے نحیف و نزار اور بیمار ہی رہے لیکن ان کے عقیدے میں کسی قسم کا تزلزل پیدا نہیں ہوا۔

مغرب کی نماز کے بعد تو میں سیدھا گھر آتا لیکن ظہر اور عصر کی نماز کے بعد تھوڑا سا وقت ملتا تو مسجد کے برابر حافظ جی کی دوکان پر جاتا۔ وہ بڑی محبت سے پیش آتے اپنے بیٹے یونس خالدی کو بلاتے مجھ سے ملاتے، کچھ باتیں کرتے۔ یونس خالدی کو ساتھ لے کر کبھی کبھی ہم ربڑ کی گیند سے سڑک پر یا نیچے میدان کھیلنا شروع کر دیتے، کبھی تھوڑی دیر کے لیے گلی ڈنڈا بھی کھیلتے۔ کبھی یوں ہی سڑکوں پر دوڑ بھاگ بھی کرتے۔

اس دوڑ بھاگ کے کھیل میں ایک دن کنکروں والی سڑک پر میں اس زور سے گرا کہ بھوں پھٹ گئی، خاصا خون نکلا۔ آنکھوں کے نیچے اندھیرا آ گیا اور تھوڑی دیر بے ہوش بھی رہا۔ یونس خالدی نے مجھے گھر پہنچایا، مرہم پٹی ہوئی، گھر کے سب لوگ پریشان ہو گئے، والدہ نے صدقہ دیا، بکرے کی قربانی کی، نظر اتاری، غریبوں کو کھانا کھلایا، نذر دلائی، نیاز مانی، ورنہ جانے کیا کیا کچھ کیا۔

اس واقعے کے بعد میرا باہر جانا بند کر دیا گیا اور سڑکوں اور میدانوں میں کھیلنے پر پابندی لگا دی گئی۔ اب میں تھا اور گھر کی چہار دیواری۔

خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ اسی زمانے میں مولوی ریاست علی خاں صاحب کسی نجی ضرورت سے اپنے وطن رام پور واپس چلے گئے۔ ان کے جانے سے مجھے نقصان بھی ہوا اور فائدہ بھی۔ نقصان تو یہ کہ میں

ن کی عالمانہ باتوں اور درس و تدریس سے محروم ہو گیا اور فائدہ یہ کہ گھر میں آزادی نصیب ہوئی، اب نیچے کا کمرہ خالی تھا، اس میں اطمینان سے بیٹھا جا سکتا تھا۔ چھتوں پر اچک پھاند کر سکتے تھے، اور پتنگ بازی کے نئے نئے شوق سے دل لگانے اور اس کو پروان چڑھانے کے مواقع مل سکتے تھے۔

لیکن مولوی صاحب کو ان کے جانے کے بعد میں نے بہت یاد کیا اور ایمان کی بات تو یہ ہے کہ آج بھی میں انھیں یاد کرتا ہوں کیونکہ انھوں نے بچپن میں میرے دل کے اندر علم کی شمع روشن کی، کام کرنے کی لگن اور محنت کرنے کی دھن کے چراغ جلائے اور مجھے اتنا سخت جان بھی بنایا کہ محنت مشقت کی زندگی بسر کرنا میری طبیعت میں داخل ہو گیا، اور محنت کوشی اور جفاکشی میرے مزاج کا جزو بن گئی۔ اور ساری زندگی میں اس دولت بیش بہا سے مالا مال رہا۔

مولوی صاحب کے رخصت ہو جانے کے بعد جب ذرا پابندیاں کم ہوئیں اور آزادی نصیب ہوئی تو مجھے بھی دیکھا دیکھی پتنگ بازی کا شوق چرایا۔ پتنگ بازی کا اُن دنوں لکھنؤ میں خاصا زور تھا۔ خاص طور پہ سردیوں کے زمانے میں تو دن دن بھر پتنگ بازی ہوتی تھی۔ بڑی بڑی عمر کے لوگ چھتوں پر چڑھ کر پتنگ اڑاتے اور پیچ لڑاتے تھے۔ پتنگیں آسمانوں میں کم نظر آتی تھیں آگے خاصا لمبا، لچھا ہوتا تھا اس کے بعد ڈور جس کو سادی کہتے تھے۔ جس کی پتنگ کٹ جاتی تھی وہ اپنے ہاتھ کے قریب سے ڈور توڑ دیتا تھا اور دوسری چھتوں پر لوٹنے والے ڈور لوٹ لیتے تھے۔ بعض بڑے پتنگ باز دس دس پانچ پانچ روپے کے نوٹ پتنگ میں باندھ کر بھی لڑاتے تھے۔ یہ سب کچھ اپنے دولت مند ہونے کا کھوکھلا اظہار تھا۔ میرے گھر میں کئی بار ایسی پتنگیں کٹ جانے کے بعد آ کر گریں جن میں دس دس پانچ پانچ روپے کے نوٹ بندھے ہوئے تھے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ نوابی کی رسی جل گئی ہے لیکن بل ابھی نہیں گیا ہے۔ یہ سب کچھ دیکھ کر حیرانی ہوتی تھی لیکن اس وقت اس کی اہمیت اور حقیقت واضح نہیں ہوتی تھی۔ ہم تو بس اس قسم کی پتنگ بازی کو دیکھ کر اور پتنگوں اور ڈور کو لوٹ کر خوش ہوتے تھے۔

مجھے بازار سے پتنگ خرید کر اڑانے کی اجازت نہیں تھی۔ البتہ اس کی اجازت تھی کہ جو پتنگ

گھر میں آ کر گرے اس کو لوٹ کر اڑایا جا سکتا ہے۔ میرے لیے یہ بات بھی غنیمت تھی چنانچہ میں دن بھر قسم قسم کی پتنگوں کو کٹتے ہوئے دیکھتا تھا اور اس تاک میں رہتا تھا کہ کوئی پتنگ آ کر گرے تو میں اس کو خود اڑاؤں، اس وقت تو پتنگ اڑانا بھی نہیں آتا تھا۔ اگر پتنگ اڑاتا تو یا تو وہ پھٹ جاتی تھی یا پھر کسی کے گھر میں گر جاتی تھی۔ رفتہ رفتہ پتنگ اڑانا تو آ گیا لیکن پیچ لڑانا کبھی نہیں آیا اور سچی بات تو یہ ہے کہ میں نے پیچ لڑانے کی کوشش بھی نہیں کی۔ پتنگ بازی میرے لیے تو ایک تماشا تھی اور ہمیشہ ایک تماشا ہی رہی۔

لکھنؤ کی پتنگوں کے رنگوں اور رنگ برنگ ڈیزائنوں کا جواب نہیں تھا۔ مانگ دار، طوقیہ اور خدا جانے کن کن ناموں اور ڈیزائنوں کی پتنگیں دامنِ دل کو اپنی طرف کھینچتی تھیں۔ ہمارے محلے میں ایک مولوی صاحب کی دوکان تھی جو پینے کی تمباکو بیچتے تھے اور ان کی دوکان سے ہر وقت خوشبوؤں کی مہک آتی رہتی تھی۔ قسم قسم کی تمباکو کے ساتھ ساتھ وہ پتنگیں بھی بیچتے تھے۔ میں اُن کی دوکان پر کبھی کبھی جا کر ان خوبصورت پتنگوں کو دیکھتا اور کبھی کبھی دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر خرید بھی لیتا تھا، حالانکہ اس کی وجہ سے خاصی جھاڑ بھی کھانی پڑتی تھی۔

یہ دیکھ کر کہ میں دن بھر اپنا وقت اس طرح ضائع کرتا ہوں اور مولوی صاحب کے جانے کی وجہ سے میری تعلیم کا نظام درہم برہم ہو گیا ہے مجھے میرے والد صاحب نے سبحان نگر کے مڈل اسکول میں داخل کروا دیا اور اس طرح میں تیسرے درجے میں باقاعدہ تعلیم حاصل کرنے لگا۔ صبح کو ناشتہ کر کے اسکول جاتا اور ساڑھے تین بجے کے بعد جب اسکول میں چھٹی ہوتی تو گھر واپس آتا۔

اس اسکول کو غالباً لکھنؤ کی میونسپل کمیٹی چلاتی تھی۔ اسکول سبحان نگر سے مولوی گنج جانے والی اس سڑک پر واقع تھا جو نادان محل روڈ کے متوازی چلتی تھی۔ چھوٹا سا اسکول تھا جو ایک مکان میں کھول دیا گیا تھا۔ مکان اچھا خاصا بڑا تھا لیکن اس میں کشادگی نہیں تھی، گھٹا گھٹا سا ماحول تھا۔ کمروں میں تاریکی رہتی تھی اس زمانے میں بجلی کا کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا تھا چنانچہ بغیر روشنی اور پنکھے کے تمام طالب علم اپنے اپنے کلاس کے کمروں میں پڑھتے تھے۔ ایک استاد انگریزی بھی پڑھاتا تھا، حساب بھی، تاریخ بھی اور جغرافیہ

بھی۔ دن کو وقفہ ہوتا تھا تو بچے باہر کھیلتے۔ سڑک پر شور مچاتے خوانچے والوں سے چیزیں خرید کر کھاتے، مختلف قسم کے کھیل کھیلتے۔ اُستاد تو اس زمانے کے یاد نہیں کہ کون تھے اور کیسے تھے البتہ ہیڈ ماسٹر صاحب مجھے ابھی تک یاد ہیں۔ یہ نہایت شریف، نیک دل اور سادہ مزاج انسان تھے۔ ہمیشہ سادہ لباس پہنتے۔ بچوں سے بڑی محبت اور شفقت سے پیش آتے، انھیں چمکاتے، پیار کرتے اور جو غلط کام کرتا، شور مچاتا، یا ایک دوسرے سے لڑتا تو اُس کو بھی اپنی میٹھی باتوں اور نرم گفتگو سے اس طرح سمجھاتے کہ وہ موم ہو جاتا۔ پڑھاتے بھی تھے اور دلچسپ انداز میں پڑھاتے تھے۔ گول چہرہ، گندمی رنگ، میانہ قد، چہرے پر مونچھیں، سر پر انگریزی بال، دھوتی اور کرتے میں ملبوس۔ یہ تھے ہمارے اسکول کے ہیڈ ماسٹر صاحب قوم کے کائستھ تھے اس لیے فصیح اردو میں باتیں کرتے تھے۔ ان کی شخصیت میں بڑی ہی نرمی تھی، بہت ہی گداز تھا۔ محبت اور شفقت سے انھوں نے بچوں کے دلوں کو تسخیر کر لیا تھا۔

مجھ پر اس زمانے میں ان کے اس انداز کے اثرات بڑے گہرے ہوئے اور ان کی وجہ سے تنگی، تاریکی، اور گندگی کے باوجود اس چھوٹے سے اسکول میں میرا دل لگ گیا اور میں پڑھنے لکھنے میں بھی خاصی دلچسپی لینے لگا چھ مہینے میں میں نے خاصی ترقی کر لی اور اسکول کے ہونہار طالب علموں میں میرا شمار ہونے لگا آج بھی ہیڈ ماسٹر صاحب کا شفیق چہرہ میرے سامنے رہتا ہے اور ان کی شفقت اور محبت کی ساحری مجھے یاد آتی ہے جو پتھروں کو بھی موم کرنے اور جنوں تک کو شیشے میں اتارنے کی صلاحیت رکھتی تھی۔

لکھنؤ کے جس محلے میں ہم شروع شروع رہ رہے تھے وہ تاڑی خانہ کہلاتا تھا۔ یہ محلہ مشک گنج کا ایک حصہ تھا۔ ہمارا گھر مشک گنج کی طرف سے دائیں طرف کوئی پانچ دس گز کے فاصلے پر تھا۔ اس لیے اس کو بھی مشک گنج ہی کہتے تھے۔ ایک سیدھی سڑک سٹی ریلوے اسٹیشن تک جاتی تھی جس کے ایک طرف تو وزیر گنج اور گولہ گنج کے محلے تھے اور دوسری طرف ریلوے لائن کے اُس پار ڈیوڑھی آغا میر، باغ شیر جنگ، باغ مولوی، فوارہ صاحب، رکاب گنج، یحییٰ گنج اور ناداں محل روڈ کی آبادیاں تھیں۔ مشک گنج کی یہ سیدھی سڑک کوئی چار فرلانگ لمبی ہوگی لیکن اس پر گاڑیوں کی آمد و رفت

زیادہ نہیں تھی اس لیے کچھ سناٹا سا رہتا تھا جس کو ویرانی کہا جائے تو بے جا نہیں۔

اس سڑک پر کوئی بازار نہیں تھا۔ اس لیے ضرورت کی چیزیں خریدنے کی غرض سے ریل کے پل کو پار کر کے رکاب گنج جانا پڑتا تھا۔ یہ خاصا بڑا بازار تھا اور یہاں ضرورت کی تمام چیزیں مل جاتی تھیں، خاص طور پر پھل، سبزی ترکاری اور بساط خانے کا سامان وغیرہ۔

میری والدہ کبھی کبھی سبزی ترکاری لینے کے لیے مجھے رکاب گنج بھیج دیتی تھیں۔ شاید اس خیال سے کہ میرے اندر اس طرح خود اعتمادی پیدا ہوگی۔ ورنہ ایک چھوڑ دو دو نوکر موجود تھے۔ میں بازار خوشی خوشی جاتا تھا لیکن رکاب گنج کے پل کو پار کرنا مجھے پل صراط سے کم نہیں معلوم ہوتا تھا۔ کیونکہ اس پل پر نیچے اوپر اور بیچ میں پُن کی ہوئی بے شمار گائیں بیٹھی یا کھڑی رہتی تھیں۔ مجھے ان سے بہت ڈر لگتا تھا۔ خیر پل پر چڑھنے کے لیے کھڑا ہوا انتظار کرتا رہتا کہ کوئی بڑا آدمی جائے تو اس کے ساتھ ساتھ چلوں۔ چنانچہ یہ ترکیب کارگر ثابت ہوتی تھی اور اس طرح میں پل کے دوسری طرف رکاب گنج کی سڑک پر اطمینان سے پہنچ جایا کرتا تھا۔ سودا خریدنے کے بعد واپسی بھی اسی طرح ہوتی تھی۔

بازار آنا جانا اس لیے بھی اچھا لگتا تھا کہ واپسی میں ایک پیسے کی چٹپٹی چاٹ کے دو دونے خرید لیتا تھا اور راستے ہی میں اس کو کھا لیتا تھا۔ سڑک پر کھڑے ہو کر کھانا معیوب سمجھا جاتا تھا، اس لیے میں مزادار اسکے کچالو یا پکوڑیوں وغیرہ کے یہ دونے ہاتھوں میں دبا لیتا تھا، اور چھپکے چھپکے کھاتا جاتا تھا۔ گھر پہنچنے تک چاٹ ختم ہو جاتی تھی اور کسی کو پتہ بھی نہیں چلتا تھا کہ چاٹ کھائی ہے۔ چاٹ کھانے کی مجھے سختی سے ممانعت کی گئی تھی۔ ظاہر ہے اس لیے کہ اس کو گندگی سے تیار کیا جاتا تھا اور اس کو کھا کر بیمار ہونا یقینی تھا۔ لیکن میں کبھی کبھی کیا بلکہ اکثر پاسبان عقل کو تنہا چھوڑ کر حدود سے باہر نکل جاتا تھا تاکہ ناکردہ گناہوں کی حسرت باقی نہ رہے۔

اور اس حقیقت کا اعتراف کرنے میں مجھے کوئی حجاب نہیں کہ اس قسم کی چاٹ آج بھی میری کمزوری ہے!

اس زمانے میں نے ایک بکری پالی تھی۔ اس کا چارہ دینے کی غرض سے میں خود بازار جایا کرتا

تو کبھی نوکر ساتھ لے جاتا تھا اور کبھی اس کو چھوڑ کر جاتا تھا۔ ایک دو پیسے میں مزدور کر لیتا تھا اور وہ مزدور چارہ گھر تک پہنچا دیا کرتا تھا۔ اس طرح آزادی نصیب ہوتی تھی اور چاٹ کھانے کا خوب موقع ملتا تھا۔

جب بھی چارہ دینے کے لیے پہنچتا تھا تو سڑک پر بیٹھے ہوئے چارے والے مجھے آواز دے کر بلاتے تھے۔ آنے دو آنے کا چارہ خرید جاتا تھا لیکن بیچنے والے خاصی محنت کرتے تھے۔ ایک دن میں اسی عالم تھا کہ ایک چارے والے نے اپنی اودھی زبان میں کہا کہ ”بھیا جب تم ہنسی کرا دیت ہو تو ہمرا ہمارا سارا چارہ جلدی بک جات ہے۔“

اگرچہ اس وقت بھی میں اس بات کو تو کم سمجھتا تھا، لیکن اسی چارے والے سے چارہ خریدتا تھا تاکہ اس کی دل شکنی نہ ہو۔

آج بھی کسی کے دل کو توڑنا یا دکھانا میرے نزدیک سب سے بڑا گناہ ہے اور میں اس کا قائل ہوں؛

دل بدست آور کہ حج اکبر است

رکاب گنج کے بازار میں دیوالی کے موقع پر جشن کا سا سماں ہوتا تھا۔ کھلونوں کی دوکانیں خاص طور پر سجائی جاتی تھیں اور قسم قسم کے نہایت خوبصورت مٹی کے کھلونے بچوں کے لیے دلچسپی کا باعث بنتے تھے۔ اس کے علاوہ شکر کے کھلونوں کی دوکانوں پر بھی خاصی رونق ہوتی تھی۔ اس کے چڑوے یا چورے بکتے تھے جو چاول سے تیار کیے جاتے تھے اور جن کو شکر کے کھلونوں کے ساتھ کھاتے تھے۔ رات کو دیوں کی روشنی کا سماں بھی قابل دید ہوتا تھا مجھے اس تہوار سے بڑی دلچسپی تھی، اس لیے کہ اس موقع پر کھلونے خریدے جاتے تھے اور روشنی کی بہار دکھتی تھی۔

یہ زمانہ خلافت کی تحریک کا زمانہ تھا۔ سڑکوں اور گلیوں میں بوڑھے جوان اور بچے یہ شعر لہک لہک کر پڑھتے تھے بلکہ گاتے تھے ؎

بولیں اماں محمد علی کی   جان بیٹا خلافت پہ دے دو

لیکن اس کا مطلب اس وقت میری سمجھ میں بالکل نہیں آتا تھا۔ البتہ جو جلسے اس سلسلے میں ہوتے اور جو جلوس نکلتے ان کی تفصیل میں اخباروں میں پڑھتا تھا لیکن خلافت کی تحریک کے بارے

میں کچھ معلوم نہیں تھا کہ یہ کیوں شروع کی گئی ہے؟ کیسے شروع ہوئی ہے؟ اور یہ کہ اس کا مقصد کیا ہے؟

البتہ ہمارے گھر میں ہر شخص مولانا محمد علیؒ اور مولانا شوکت علی کا شیدائی تھا۔ مولانا حسرت موہانی مولانا ابوالکلام آزاد اور علامہ اقبالؒ کا ذکر بھی اکثر ہوتا تھا۔ ان کی تصویریں بھی کمروں میں لگی ہوئی تھیں۔ لیکن ان کے ساتھ انور پاشا مصطفےٰ کمال پاشا، اور امان اللہ خاں کی تصویریں بھی گھر کے بعض کمروں میں سجی ہوئی تھیں۔ میں ان تصویروں کو دیکھتا تھا، دیکھ کر خوش ہوتا تھا لیکن اس بات کا مجھے علم نہیں تھا کہ یہ تصویریں خصوصاً ترکوں اور افغانوں کی یہ تصویریں گھروں میں کیوں لگائی گئی ہیں! میرے والد صاحب گھر میں اکثر "بولیں اماں محمد علی کی۔ جان بیٹا خلافت پہ دے دو" گنگناتے تھے، لیکن تفصیل نہیں بتاتے تھے۔ البتہ میری والدہ تحریکِ خلافت کی کچھ حقیقت بیان کرتی تھیں۔ ان کی باتوں کو میں پوری طرح سمجھ نہیں سکتا تھا، لیکن ان باتوں سے انگریزوں کے خلاف میری نفرت میں غیر شعوری طور پر اضافہ ضرور ہونے لگا اور میرے دل میں وطن پرستی اور قومیت کی لہریں بیدار ہو کر انگڑائیاں سی لینے لگی تھیں۔

انسانوں کی غربت اور افلاس پر میرا دل کڑھتا تھا۔ طبقاتی تفرق اس زمانے میں بہت زیادہ تھی۔ خاص طور پر مسلمانوں میں۔ اور خصوصیت کے ساتھ لکھنؤ کے مسلمانوں میں۔ وہاں یا تو بڑے بڑے تعلقے دار اور زمیندار ہوتے تھے یا پھر نوابان، اودھ کی نئی نسل کے لوگ جو معمولی وثیقے پر گزر بسر کرتے تھے، اور یہ وثیقے تقسیم ہونے کی وجہ سے گھٹتے گھٹتے صرف چند روپوں تک رہ گئے تھے۔ ان کی حالت خراب تھی، لیکن ایک ایسا طبقہ بھی تھا جو صرف محنت مزدوری کر کے اپنا پیٹ پالتا تھا اور مزدور کی مزدوری دو چار آنے روز سے زیادہ نہیں تھی۔ ہندوؤں میں بھی کم و بیش اسی طرح کے طبقے تھے۔ البتہ ہندوؤں میں ایک مہاجنوں کا طبقہ تھا جو سود پر روپیہ دیتے اور اس طرح لوگوں کی کھال کھینچتے تھے۔ بڑی تعداد میں ان کے گاہک مسلمان تھے جن کی زندگی ابھی تک شکست و ریخت سے دوچار تھی۔ وہ اپنی بیویوں کے زیور، ان کے کپڑے، گھر کے برتن اور نہ جانے کیا کیا کچھ ان مہاجنوں کے پاس رہن رکھتے تھے اور تھوڑا سا روپیہ لے کر سود کی گرفت میں اس طرح آ جاتے تھے کہ ساری زندگی اس

جال سے ان کا نکلنا مشکل بلکہ ناممکن ہوتا تھا۔

میرے گھر کے قریب ایک بہت بڑا مہاجن لتول رہتا تھا۔ مشک گنج سے سٹی اسٹیشن جانے والی سڑک پر اس کا نہایت تاریک سا گھر تھا۔ اس گھر میں باہر سڑک کی طرف ایک کشادہ سی دوکان تھی۔ اس دوکان میں لتول ایک سیاہ رنگ کا موٹا سا بے ہنگم آدمی، اپنے بہی کھاتوں کو سامنے رکھے بیٹھا رہتا تھا اس کے کارندے دوکان میں مختلف قسم کے کام کرتے رہتے تھے۔ مسلمانوں کی دوسری چیزیں تو بھلا سامنے کیا نظر آتیں کیونکہ وہ تو فوراً تجوریوں میں دفن کر دی جاتی تھیں، البتہ تانبے کے بڑے بڑے وزنی برتن سامنے نظر آتے، اور ہر وقت کوئی نہ کوئی مسلمان اس کی دوکان پر بیٹھا ہوا ضرور نظر آتا تھا۔ لتول اس طرح برسوں لوگوں خصوصاً مسلمانوں کا خون چوستا رہا اور اس کی دولت روز بروز بڑھتی گئی۔ لکشمی کا دیا بجلی کے ایک قمقمے کی صورت میں رات بھر اس کی چھت پر جلا کرتا تھا اور ہمارے مکان سے بخوبی نظر آتا تھا۔

مجھے یہ سب کچھ دیکھ کر بڑی تکلیف ہوتی تھی مفلسوں اور ناداروں کا غم جیسے کلیجے کو کھائے جاتا تھا، اور کچھ عجیب سے انقلابی خیالات میرے دل میں پیدا ہونا شروع ہو گئے تھے۔ سوچتا تھا لوگ اتنے امیر اور اس درجہ غریب کیوں ہیں؟ کیا دولت سب کے پاس نہیں ہو سکتی؟ کیا امیروں سے دولت چھین کر غریبوں کو نہیں دی جا سکتی؟ کیا سب آسودگی کی زندگی بسر نہیں کر سکتے؟

اس قسم کے سوال تو دل میں چٹکیاں سی لیتے تھے، لیکن ان سوالوں کے جواب دینے والا کوئی نہیں تھا۔ ہر طرف دیواریں سی کھڑی ہوئی نظر آتی تھیں اور دروازے بند دکھائی دیتے تھے۔

لکھنؤ میں اس صورت حال کے باوجود لوگوں کے مشاغل عجیب و غریب تھے۔ ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھے رہنا، گپ کرنا، بے کار باتوں میں وقت ضائع کرنا، چھوٹی چھوٹی باتوں پر الجھنا اور زبانی جھگڑا فساد کرنا، شطرنج، چوسر اور پچیسی اور کیرم کھیلنا، کبوتر اڑانا، بٹیریں پالنا، مرغ لڑانا —— بس اس قسم کے کاموں میں ان کا وقت گزرتا تھا۔ وہ بڑے معصوم اور بے خبر لوگ تھے۔ انھیں معلوم نہیں تھا کہ جس کشتی میں وہ سفر کر رہے ہیں اس میں چھید ہو چکے ہیں، پتوار ان کے ہاتھوں میں نہیں ہے۔ آس پاس اور گرد و پیش

نہ جانے کتنے طوفان چھپے ہوئے ہیں جو ان کی زندگی کو خس و خاشاک کی طرح بہانے جانے کی تیاری کر رہے ہیں۔

رات کو ہمارے گھر کے آس پاس عجیب طرح کا شور ہوتا تھا اور چیخوں کی خوفناک آوازیں کئی کئی گھنٹوں تک مسلسل آتی رہتی تھیں میں ان آوازوں سے ڈرتا تھا، جاگ جاتا تھا اور اپنے والد صاحب سے چمٹ جاتا تھا۔ میں سمجھتا تھا کہ کوئی آسیب ہے، جن یا بھوت پریت ہیں جو اس طرح کی آوازیں نکالتے ہیں۔ یہ باتیں شروع سے میرے کانوں میں ڈالی گئی تھیں۔ اس لئے ان آوازوں کو سن کر ذہن انھیں کی طرف منتقل ہوتا تھا۔ لیکن دریافت کرنے سے یہ معلوم ہوا کہ آس پاس کے محلوں میں دور دور تک جو لوگ بٹیریں پالتے ہیں اور انھیں پالی کے لیے تیار کرتے ہیں، وہ رات کو ان بٹیروں کے کانوں میں زور زور سے آوازیں نکالتے ہیں (لکھنؤ کی اصطلاح میں کوکتے ہیں) تاکہ ان بٹیروں کے کانوں کے پردے پھٹ جائیں اور وہ بہرے ہو جائیں، اس لیے کہ جب پالی کے موقع پر لڑیں تو انھیں کوئی آواز سنائی نہ دے صرف لڑائی میں مصروف رہیں۔ پالی کے موقع پر جب بٹیر لڑتے تھے تو دونوں طرف کے آدمی اس قدر شور مچاتے تھے کہ پالی اچھا خاصا میدان کارزار بن جاتی تھی۔ بٹیر اس شور سے گھبراتے تھے اس لیے پالنے والے راتوں کو "کوکنے" کی عجیب و غریب آوازیں نکال کر انھیں بہرہ کر دیتے تھے۔ کیسے عجیب لوگ تھے اور ان کا یہ رویّہ بھی کتنا عجیب تھا!

میں نے بچپن میں صرف ایک دفعہ بٹیروں کی یہ پالی دیکھی اور دیکھ کر نہ صرف افسوس ہوا بلکہ وحشت بھی ہوئی اور میں سوچتا رہا اور اب بھی سوچتا ہوں کہ ان لوگوں میں خود تو لڑنے کی سکت باقی نہیں رہی تھی اس لیے ان پرندوں کو لڑا کر اپنی اس حس کو پورا کرتے تھے، اور ان میں سے ہر ایک اپنے آپ کو تیس مار خاں تصوّر کرتا تھا۔ بٹیر کی پالی جیتنا ان کے نزدیک گویا ملک اور سلطنت کو فتح کرنے کے برابر تھا۔

اور اب میں غور کرتا ہوں تو خیال آتا ہے کہ معاشرتی اور ذہنی انحطاط کے باعث پیدا ہونے والا اجتماعی انحطاط بھی انسان کی زندگی میں کیسی کیسی عجیب صورتیں اختیار کر سکتا ہے!

خود آپس میں لڑنے کا یہ عالم تھا کہ اول تو آپس ایک دوسرے سے کوئی باقاعدہ لڑائی ہوتی نہیں تھی، اور ہوتی بھی تھی تو اس میں لڑائی سے زیادہ تہذیب اور شائستگی کا اظہار ہوتا تھا۔

ایک دن لکھنؤ کے دو مہذب نسانوں کو میں نے آپس کسی قدر تیز گفتگو کرتے ہوئے دیکھا لیکن دونوں ایک دوسرے سے کہہ رہے تھے۔

"ذرا کسی سنائے کی جگہ پر آجایئے سر رہے س طرح باہم دست و گریباں ہونا معیوب معلوم ہوتا ہے۔ لوگ کیا کہیں گے؟"

یہ باتیں کر کے یہ لوگ یک سنسان سی گلی میں چلے گئے جہاں پہنچ کر دو چار تیز جملوں کے بعد ایک نے دوسرے سے کہا:

واللہ! آپ ہٹ جایئے ورنہ میں مارے ہی دیتا ہوں۔"

دوسرے نے بھی جواب میں یہی کہا۔ "واللہ! مجھے مجبور نہ کیجیے ورنہ قیامت ہی آجائے گی۔ حشر برپا ہو جائے گا۔"

لیکن نہ تو ایک نے دوسرے کو مارا، نہ کوئی قیامت ہی آئی اور نہ کوئی حشر ہی برپا ہوا۔ دونوں نے تھوڑی دیر کے بعد اپنی اپنی راہ پکڑی اور گھروں میں جا کر بیٹھ رہے۔

میرے لیے لکھنوی لوگوں کی یہ لڑائی دلچسپی کا باعث بنی اور دیر تک میں ان کے اس انداز سے محظوظ ہوتا رہا۔ اور یہ کوئی عجیب بات نہیں تھی۔ ایسے واقعات تو لکھنؤ میں آئے دن دیکھنے میں آتے رہتے تھے۔

ایک واقعہ تو خود میری ذات سے متعلق ہے:

ہوا یوں کہ جن دنوں میں پتنگ بازی کے چکر میں پھنسا ہوا تھا تو ایک دن کوئی زبردست پیچ لڑایا جا رہا تھا۔ میں نے یہ سمجھ کر کہ پتنگ کٹ گئی ہے ڈور پر لنگر ڈال کر نیچے گرا کر اس کو پکڑ لیا۔

"دادا آئی! پٹیا ہے۔" (یعنی پتنگ ابھی کٹی نہیں اور کسی نے پیچ میں ڈور توڑ لی ہے۔ لیکن میں کیا کر سکتا تھا۔ ڈور میرے ہاتھ میں آ چکی تھی اور پتنگ صحیح سلامت تھی۔ اس وقت میں گھر میں اکیلا تھا۔ تھوڑی

دیر میں کیا دیکھتا ہوں کہ کچھ لوگ گھر پر آئے اور کہا: "باہر تشریف لائیے"۔ میں سہم گیا باہر نکلا تو بجائے اس کے کہ مجھ کو وہ لوگ سخت سست کہیں، یہ کہہ کر چلے گئے کہ "آپ تو بچے ہیں، آپ سے کیا کہیں کوئی بڑا ہوتا تو واللہ قیامت ہی آ جاتی!"

اس طرح بات آئی گئی ہو گئی۔ لڑائی اس سے زیادہ آگے نہ بڑھ سکی۔

اس زمانے میں تقریباً لکھنؤ کے تمام محلوں میں دوپہر کے وقت ایسی عورتیں گھومتی رہتی تھیں جن کو روضہ والیاں کہتے تھے۔ ان کے پاس سفید چادر میں لپٹا ہوا ایک چھوٹا سا بکس ہوتا تھا، اس بکس میں کچھ بھیانک قسم کی تصویریں ہوتی تھیں جن کو دکھا کر وہ عورتوں کو ڈراتی تھیں تاکہ وہ ہر طرح کے غلط کام کرنے سے باز رہیں۔ ایک تصویر میں ایک عورت آرے سے کاٹی جا رہی ہے اس لیے کہ اس نے کوئی غلط کام کیا ہے۔ ایک تصویر میں ایک عورت کو سانپ بچھو چمٹے ہوئے ہیں اس لیے کہ وہ بے راہرو ہو گئی تھی۔ روضے والی پہلے یہ تصویریں دکھاتی تھی اور پھر روضے کی زیارت کراتی تھی جس پر وہ مورچھل جھلتی جاتی تھی۔

مجھے ان روضہ والیوں سے ڈر لگتا تھا۔

ان کے علاوہ کچھ عورتیں ایسی بھی محلوں میں گھومتی تھیں جو سنگی والیاں کہلاتی تھیں۔ ان کے پاس بکرے یا گائے کے سینگ کی ایک چیز ہوتی تھی جس کو منہ میں لے کر وہ انسان کی ہتھیلیوں اور تلوؤں سے اندر کی گرمی کھینچتی تھیں۔

کہتے ہیں کہ اس عمل سے لوگوں کو فائدہ ہوتا تھا، اور اندر کی گرمی باہر نکل جاتی تھی جس سے طبیعت کا ہیجان دور ہو جاتا تھا۔ واللہ اعلم۔

میں نے خود کبھی اس کا تجربہ نہیں کیا۔

لکھنؤ کے جس مکان میں ہم لوگ شروع میں جا کر رہے، وہ رسول بخش صاحب کا مکان تھا۔ رسول بخش صاحب لکھنؤ کے رئیس تھے۔ کئی بڑے بڑے مکانوں میں ان کا چھاپے خانہ تھا جس میں لحاف اور رضائیوں کی فردیں چھاپی جاتی تھیں۔ یہ صاحب میرے والد کے دوست تھے۔ ان کے پاس

موٹرکار بھی تھی۔ ان کی تفریح یہ تھی کہ شام کو وہ اپنی موٹر میں سیر کے لیے نکلتے تھے اور مجھے بھی ساتھ لے جاتے تھے۔ رات گئے واپس آتے تو میں موٹر ہی میں سو جاتا تھا اور وہ مجھے گود میں لے کر گھر کے اندر تک پہنچاتے تھے۔ مطلب یہ ہے کہ نہایت شریف مخلص اور محبت کرنے والے آدمی تھے اور میرا بہت خیال رکھتے تھے۔

چند سال کے اندر دیکھتے دیکھتے رسول بخش صاحب کو ادبار نے آ لیا۔ کارخانے بند ہو گئے اور وہ پیسے پیسے کو محتاج ہو گئے۔ دراصل انھیں ریس کھیلنے کا چسکا تھا۔ اس ریس نے انھیں برباد کر دیا۔ ان کی ساری دولت اس ریس کی "نذر" ہو گئی۔ بعض لوگوں نے اس خیال کا اظہار کیا کہ جس مکان میں ہم لوگ رہتے ہیں اس میں جنوں کا مسکن ہے۔ ان سے کوئی بے ادبی ہو گئی ہے جس کا خمیازہ انھیں بھگتنا پڑا ہے۔ رسول بخش صاحب کے زوال کی وجہ کچھ بھی ہو ویسے یہ بات یقینی ہے کہ کچھ نہ کچھ اس مکان میں تھا ضرور!

رات کو گھر کے ہر فرد کو عجیب عجیب خواب دکھائی دیتے تھے۔ کوئی ادھر ادھر چلتا ہوا نظر آتا تھا جیسے ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں جا رہا ہو۔ لیکن سب لوگوں کو اطمینان یہ ہوتا تھا کہ اس مکان میں باقاعدہ قرآن مجید پڑھا جاتا ہے، میلاد شریف ہوتا ہے۔ گیارھویں کی نذر بھی دی جاتی ہے اور دوسرے بزرگانِ دین اور اولیائے کرام کی نیاز کا اہتمام بھی ہوتا ہے، قوالی کی محفلیں بھی جمائی جاتی ہیں اس لیے سب گھر والوں کا خیال تھا کہ گر جن صاحب واقعی اس مکان میں ہیں تو کم از کم وہ کسی کو نقصان نہیں پہنچائیں گے اور حقیقت یہ ہے کہ کئی سال کے عرصے میں کسی کو کوئی نقصان نہیں پہنچا۔ کسی قسم کی کوئی "کلفت" نہیں ہوئی، البتہ ڈر اور خوف ہر ایک کے دل میں ضرور رہا۔ ہو سکتا ہے یہ سب کچھ وہم ہو!

جن صاحب سے ڈرنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ان زمانے میں بریلی سے میری پھوپھی کی بیٹیاں آئی ہوئی تھیں اور وہ اپنے منہ پر کالک مل کر اور کمبل یا چادر اوڑھ کر مجھے "بیچا" بن کے ڈراتی تھیں بچوں کو ٹھیک رکھنے اور راہِ راست پر لانے کا اس زمانے میں اس طرح ڈرانا اور ان کے دل میں دہشت

بٹھانا عام بات تھی۔

وہ تو کہیئے میرے والد صاحب اور والدہ دونوں دیندار تھے، صوم وصلوٰۃ کے پابند تھے۔ میں بھی نمازیں پڑھتا اور قرآن مجید کی تلاوت کرتا تھا۔ اس لیے ہم لوگ کچھ زیادہ ڈر اور خوف کے شکار بھی نہیں تھے۔

والد صاحب روزانہ حضرت مخدوم شاہ مینا صاحبؒ کے مزار پر حاضری دیتے تھے اور دیر تک وہاں بیٹھ کر اور دعائیں مانگ کر رات گئے گھر واپس آتے تھے۔ حضرت مخدوم شاہ مینا صاحب عہد مغلیہ کے بہت بڑے صوفی بزرگ تھے جن کی درگاہ پر ہندو اور مسلمان سب ہی جاتے اور دعائیں مانگتے تھے۔ ہم لوگوں پر ان کا خاص کرم تھا، اس لیے ایک ڈھارس سی رہتی تھی۔ میں خود بھی اکثر شاہ صاحب کے مزار پر حاضری دیا کرتا تھا۔ جمعرات کو مزار پر بڑی رونق ہوتی تھی۔ بسنت کے تہوار کے موقع پر بھی مزار پر جشن ہوتا تھا۔ مزار پر لوگ ہندو اور مسلمان جوق در جوق آتے تھے اور فاتحہ پڑھتے اور دعائیں مانگتے تھے۔ عرس کے موقع پر تین دن تک قل ہوتا تھا۔ چنے کی دال اور خمیری روٹی تبرک کے طور پر تقسیم ہوتی تھی۔ صبح سے شام تک سماع کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ ہم سب بڑی عقیدت سے ان تقریبات میں شریک ہوتے تھے اور ہم سب کا یہ عقیدہ تھا کہ شاہ مینا صاحب لکھنؤ کے قطب ہیں اور ان کی اجازت کے بغیر یہاں کچھ نہیں ہو سکتا اور تجربے نے یہ بتایا کہ یہ سب کچھ صحیح تھا۔

والد صاحب دینی معاملات میں اپنے اصول کے سخت تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اس زمانے میں ان کے ایک دوست شکل جی تھے جو اکثر اپنے بیٹوں کے ساتھ ہمارے ہاں آتے تھے۔ ان کے بارے میں شبہ تھا کہ شراب پیتے ہیں، اس لیے والد صاحب نے یہ ہدایت کر رکھی تھی کہ جس گلاس میں شکل جی کو پانی یا شربت پلایا جائے اُس کو ان کے جانے کے بعد توڑ دیا جائے تاکہ استعمال میں نہ رہے چنانچہ بیسیوں گلاس اس زمانے میں ہمارے ہاں توڑے گئے۔ بات یہ ہے کہ ہمارے ہاں شراب کو گندی چیز تصور کیا جاتا تھا۔ شراب کا نام تک نہیں لیتے تھے۔ نام لینے تک کو گناہ سمجھتے تھے۔

لیکن ان تمام سہاروں کے باوجود اس مکان سے ہم لوگوں کا جی اچاٹ ہو گیا تھا۔ سب سے

زیادہ میری طبیعت پریشان رہتی تھی۔ والد صاحب میری پریشانی کو برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ والدہ بھی مجھے کسی قسم کی پریشانی میں نہیں دیکھ سکتی تھیں۔ اس لیے اس مکان کو چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا گیا۔ مکان کی تلاش شروع ہوئی۔ اُس زمانے میں مکان کے ملنے میں کوئی خاص دشواری نہیں ہوتی تھی۔

چنانچہ چند روز کی تلاش کے بعد ڈیوڑھی آغا میر میں ایک بڑا اور کشادہ مکان مل گیا۔ اس نئے مکان میں ہم لوگ جلد ہی منتقل ہو گئے اور اس طرح ہم نے اطمینان کا سانس لیا۔

ڈیوڑھی آغا میر کا شمار لکھنؤ کے پرانے محلوں میں ہوتا تھا۔ محمود آباد کی چھوٹی رانی کے مکان سے گزرتے ہوئے اسٹیشن کے پھاٹک کو پار کر کے مغرب کی طرف جو سڑک جاتی تھی اُس پر یہ محلہ شروع ہو جاتا تھا۔ بائیں جانب شیر جنگ کا باغ تھا، اس کے بعد مولوی انوار صاحبؒ کا باغ اور پھر رکاب گنج کا بازار۔ اسٹیشن کی سڑک کے شروع میں دائیں جانب آغا میر کے امام باڑے کی پُرشکوہ عمارت تھی جو کبھی سلطنت اودھ کے وزیر اعظم آغا میر کا امام باڑہ تھا۔ اس عمارت میں اب گورنمنٹ جوبلی کالج کے اسکول کی کلاسیں ہوتی تھیں۔ آگے چل کر دونوں طرف نوابوں کے مکان تھے جو اداس اور سوگوار سے نظر آتے تھے۔ شاید اس وجہ سے کہ وہ اپنے مکینوں کو یاد کرتے تھے۔ ان کے مکین یا تو اللہ کو پیارے ہو گئے تھے یا پھر یہاں سے ہجرت کر کے کہیں اور چلے گئے تھے۔ بعض مکانوں پر سود لینے والوں نے قبضہ کر لیا تھا کیونکہ اصل اور سود کی رقم ان کے مکین ادا نہیں کر سکے تھے۔

انہیں مکانوں میں سے ایک مکان ہم لوگوں کو مل گیا تھا۔ بہت بڑا سا پھاٹک تھا جس کے اندر تین بہت بڑے مکان تھے۔ سامنے کا مکان بہت ہی بڑا تھا۔ بائیں جانب اس کے مقابلے میں کسی قدر چھوٹا مکان تھا۔ دائیں جانب دوسری منزل پر بھی کئی کمرے تھے، جو غالباً کسی زمانے میں مردانہ مکان تھا۔ اس کو بھی کرایہ کا مکان بنا دیا گیا تھا اور اس میں بھی کچھ لوگ رہتے تھے۔ سامنے والا مکان خالی تھا۔ بائیں جانب کا مکان جو ہمیں کرائے پر ملا، اس پر ابھی تک "مملوکہ سکینہ بیگم" کی تختی لگی ہوئی تھی اور یہ سکینہ بیگم

کا پھاٹک کہلاتا تھا

اب یہ ساری جائیداد لکھنؤ ہی کے ایک نواب بنّے صاحب کی ملکیت ہوگئی تھی بنّے صاحب کا سود کا کاروبار تھا۔ یہ جائیداد ان کے پاس رہن رکھی گئی اور پھر چھڑائی نہ جاسکی، اس لیے اس پر انھوں نے قبضہ کرلیا۔ یہ سب کچھ سود کی "دین" تھی۔

بنّے صاحب بھی نوابوں میں سے تھے، لیکن انھوں نے سود کا کاروبار شروع کر رکھا تھا۔ اور اس طرح خاصی دولت جمع کرلی تھی۔ لمبے قد کے آدمی تھے۔ جسم بھاری تھا اس لیے وجیہہ معلوم ہوتے تھے۔ گول بھرا بھرا چہرہ۔ اس پر خشخاشی داڑھی، سر پر پٹے بال، اس پر سیاہ رنگ کی کسی قدر اونچی دیوار کی ٹوپی، تنگ پائجامہ اس پر شیروانی جس کے بٹن ہمیشہ ہر موسم میں گلے تک بند لیکن اس لباس کے ساتھ جوتے کی جگہ پاؤں میں کلکتے کے بادامی رنگ کے سلیپر، ہاتھ میں چھڑی۔ بس اس وضع قطع میں نواب بنّے صاحب کرایہ وصول کرتے نظر آتے تھے۔ پہلے دن بھی انھیں اسی وضع قطع میں دیکھا اور جب تک ہم لوگ اس مکان میں رہے یعنی کوئی دس بارہ سال تک، وہ اسی وضع قطع میں دکھائی دیتے رہے، لیکن ان کو دیکھ کر مجھے خدا جانے کیوں گھن سی آتی تھی۔

مہینے کی پہلی تاریخ کو ان کا آنا یقینی تھا۔ مکان کی ڈیوڑھی میں آکر آواز دیتے تھے "جناب قبلہ صاحب!"

اندر سے نوکر جواب میں کہتا "کون صاحب؟"

وہ فوراً لہک کر کہتے۔ "بنّے صاحب!"

دس گیارہ روپے مہینہ اس مکان کا کرایہ تھا۔ بس یہ کرایہ وصول کرنے آتے تھے۔ کرایہ مل جائے تو پھر ٹھہرتے نہیں تھے۔ بلکہ فوراً چل دیتے تھے کہ کہیں کوئی مرمت یا سفیدی وغیرہ کروانے کی فرمائش نہ کردے تیر کی طرح ہمارے گھر سے نکلتے اور دوسرے کرایہ داروں سے کرایہ وصول کرتے۔ چاندی کے روپے ہاتھ میں لے کر بہت خوش ہوتے۔ ان کو ہاتھوں میں ملتے رہتے اور اس طرح لطف اندوز ہوتے کہ پھولے نہیں سماتے۔ محلّے کا کوئی شخص انھیں اچھا نہیں سمجھتا تھا۔ سب کو معلوم تھا کہ یہ سود کھاتے ہیں اور اسی کاروبار سے کوڑیوں کے مول اتنی بڑی جائیداد کو ہتھیا بیٹھے یہاں تک کہ ان کے لڑکے تک انھیں

اچھا نہیں سمجھتے تھے۔ اُن کے دو لڑکے تو نہایت معقول تھے، پڑھتے لکھتے بھی تھے اور کھیل کود میں بھی حصہ لیتے تھے۔ دونوں کے جسم کسرتی تھے، صحت بہت اچھی تھی۔ ہمارے محلّے ڈیوڑھی آغا میر کے قریب ہی چودھری گڑھیا میں ان کا مکان تھا ہمارے پھاٹک کی طرف سے دن میں کئی کئی بار گزرتے تھے، میں انھیں دیکھا کرتا تھا، کبھی کبھی ملاقات بھی ہو جاتی تھی۔ اچھی باتیں کرتے تھے۔ اپنے والد بنّے صاحب کو خوب کھری کھری سناتے تھے۔

نواب بنّے صاحب پرلے درجے کے خسیس آدمی تھے۔ لڑکوں کو یہی شکایت تھی کہ اُن کے والد اُن کے ضروری اخراجات تک کے لیے پیسے نہیں دیتے۔ دوسروں پر تو خیر وہ کیا خرچ کرتے وہ تو اپنی ذات تک پر کچھ خرچ نہیں کر سکتے تھے ان کے پاس صرف دو شیروانیاں اور دو پاجامے تھے، ایک جوتا تھا جس میں وہ کڑوا تیل لگا کر رکھتے تھے اور جب دن انھیں کچہری جانا ہوتا تھا اس جوتے کو پہنتے تھے، بقیہ دنوں میں صرف بادامی رنگ کا گلگتیہ سلیپر ان کے پاؤں میں ہوتا تھا جس میں انھوں نے نعل اور گوکھرو اس خیال سے ٹھکوا لیے تھے کہ ایڑیاں اور سول گھس نہ جائیں۔ ان کی دلچسپی صرف لوگوں کا خون چوس کر پیسہ جمع کرنا تھا۔

ویسے تھے نہایت مہذب اور شائستہ آدمی، لکھنؤ کی بگڑی ہوئی تہذیب اور معاشرت کا نمونہ۔ ادب آداب کا وہی پاس لحاظ اور لہجے میں وہی ہیرے کی طرح ترشی ہوئی کیفیت اور گفتگو میں وہی نستعلیق انداز جس کو لکھنوی تہذیب کی جان سمجھا جاتا تھا۔

اس جائیداد سے جو بنّے صاحب کو کوڑیوں کے مول ملی تھی کئی سو روپے مہینے کی آمدنی تھی، لیکن ان کی خست نے ان عمارتوں کو جو کبھی منھ سے بولتی ہوں گی اور جہاں پرندہ پر نہ مار سکتا ہوگا، برباد کر دیا تھا۔ پھاٹک کے آس پاس دربانوں کے لیے جگہ تھی ان کو بھی دوکانیں بنا کر کرائے پر اٹھا دیا تھا۔ پھاٹک کے اندر جو راستہ تھا اس میں بھی آس پاس دوکانیں بنا کر کرائے پر دے دی تھیں۔ سڑک کی طرف جو حصے تھے ان کو بھی دوکانوں میں تبدیل کر دیا تھا اور عام طور پر کبڑیے ان دوکانوں میں رہتے تھے۔ وہی کبڑیے جن کے بارے میں رجب علی بیگ سرور نے کہا تھا: ”ہر کبڑن کی وہ تیکھی چتون آدمی

صورت دیکھتا رہے۔ رعبِ حُسن سے بات نہ کر سکے"۔ ایسی چنگاریاں بھی اس خاکستر میں نظر آتی تھیں، لیکن ان دوکانوں کو دیکھ کر بنے صاحب کی ہوسِ زر کی بیماری کا احساس ہر شخص کو ہوتا تھا۔ سب اُس کی شکایت کرتے تھے اور بنے صاحب کو بُرائی سے یاد کرتے تھے۔

مرزا رجب علی بیگ سرور نے چونکہ لکھنؤ کی ہر کبڑن کی تیکھی چتون کا ذکر کر کے اُس کو زندہ جاوید کر دیا ہے اس لیے جی چاہتا ہے کہ لگے ہاتھوں تھوڑا سا ذکر لکھنؤ اور ڈیوڑھی آغا میر کے اُن کبڑیوں اور کبڑنوں کا بھی کر دوں جن کے دم سے ہمارے اس محلے میں خاصی رونق تھی۔

ڈیوڑھی آغا میر کے بازار میں کئی خاندان کبڑیوں کے آباد تھے۔ عام طور پر یہ لوگ دوکانوں میں رہتے تھے۔ باقاعدہ چار دیواری والا گھر نہیں بناتے اور بساتے تھے۔ مرد لحیم شحیم ہوتے تھے اور عورتیں خوبصورت اور خوش شکل۔ تیکھی چتونوں اور بھرے بھرے جسموں والی جن کی صورت دیکھی جا سکتی تھی، رعبِ حُسن سے کسی کا اُن سے بات کرنا مشکل تھا۔ یہ لوگ پھل یا ترکاری سبزی بیچتے تھے جو پھل بیچتا تھا اُس کے پاس سبزی ترکاری نہیں ہوتی تھی اور جو سبزی ترکاری کی تجارت کرتا تھا اُس کی دوکان پر پھل نہیں بکتے تھے۔ کوئی اور کام یہ لوگ نہیں کرتے تھے۔ کبڑیے کی اصطلاح کہاں سے آئی اور کس طرح رائج ہوئی، اس کا کچھ علم نہیں۔ بظاہر تو کبڑیا، کباڑی کا مترادف معلوم ہوتا ہے یعنی ایک ایسا شخص جو کاٹھ کباڑ یعنی پرانی چیزیں بیچتا ہو، لیکن لکھنؤ کے کبڑیے کباڑی سے مختلف تھے۔ وہ یہ کام نہیں کرتے تھے، صرف پھلوں اور ترکاریوں کی تجارت ان کا خاص میدان تھا۔

یہ لوگ سخت قسم کے سُنّی مسلمان تھے۔ مردوں کا لباس تہبند کرتا یا شلوار اور کرتا تھا۔ عورتیں زیادہ تر لہنگا پہنتی تھیں اور اس لباس میں ان کے جسم کا حُسن کچھ اور بھی نمایاں ہو جاتا تھا۔ چلتی تھیں تو معلوم ہوتا کہ مور ناچ رہا ہے، زمین تھرا رہی ہے، آسمان کانپ رہا ہے۔ شرمانا لجانا انھیں نہیں آتا تھا، بے حجاب تھیں، لیکن پاک دامن۔ نظر بھر کر اُن کی طرف دیکھنا مشکل تھا۔ جوانی اُن پر آندھی اور طوفان کی طرح کر آتی تھی اور انسان کیا در و دیوار تک کو ہلا کر رکھ دیتی تھی۔ چھوٹی عمر میں یہ لوگ اپنی لڑکیوں کی شادیاں کر دیتے تھے۔ شادیوں کے موقع پر یہ لوگ خاص قسم کے کھانے پکاتے

تھے۔ پلاؤ اور بریانی وغیرہ پکوانے کا رواج ان کے ہاں نہیں تھا۔ صرف مونگ اور سادے چاول پکتے تھے اور برات کو بھی کھانا پیش کیا جاتا تھا لیکن ایسے لذیذ ہوتے تھے کہ بریانی اور پلاؤ کو مات کرتے تھے مختلف مسالوں کے علاوہ دودھ، بالائی، گھی اور نہ جانے کیا کیا پکوان میں ڈالا جاتا تھا اور سادے چاولوں سے ایسی مہک نکلتی تھی کہ دور دور تک لوگوں کو علم ہو جاتا تھا کہ کسی کبڑن کی شادی میں خاص کھانا پک رہا ہے۔

عورتیں تو باتیں کم کرتی تھیں لیکن مرد بڑے چرب زبان اور حاضر جواب ہوتے تھے۔ ان کا کمال یہ تھا کہ کوئی سودا لینے کے لیے آئے تو پھر بغیر خریدے ہوئے واپس نہیں جا سکتا تھا۔ گاہک کو شیشے میں خوب اتارتے تھے اور اس فن میں ان کا جواب نہیں تھا۔ گاہک کے سامنے اگر دو بیوپاری چیزوں کے بھاؤ وغیرہ کے بارے میں آپس میں بات کرتے تھے تو وہ ایسی زبان ہوتی تھی جس کو سمجھنا کسی دوسرے کے لیے ناممکن تھا۔ کچھ خاص اصطلاحیں انھوں نے بنا رکھی تھیں ان سے اپنے مافی الضمیر کو ظاہر کرتے تھے۔

شرفا کے ساتھ بات کرتے ہوئے ادب آداب اور حفظ مراتب کا ان لوگوں کو خاص خیال رہتا تھا۔ میں نے ان میں سے کسی کو بدتمیزی کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔ شائستگی اور تہذیب ان پر ختم تھی۔

ایک کبڑیے کی چرب زبانی اور حاضر جوابی کا واقعہ سارے لکھنؤ میں مشہور تھا۔ یہ شخص جب پھیری پر نکلتا تھا تو اس طرح کے جملے بولتا جاتا تھا

—"کیوں صاحب! دسہری آم لیجیے گا—"

—"چار روپے کے سو لیجیے گا—"

—"ڈیڑھ روپے کی ڈھیری لیجیے گا—"

—"آم کی صحیح لذت حاصل لیجیے گا—"

ایک دن کسی نوجوان لڑکے نے اس کی یہ باتیں سن کر ازراہ تفنن طبع اس کو چھیڑنے اور

اس کا مذاق اڑانے کے لیے یہ کہہ دیا۔

"کیوں صاحب! ڈھیری ایک روپے کے سو دیجیے گا۔"

اس کبڑیے نے فوراً جواب دیا۔

"کیوں جناب غریب کے منھ لگیے گا۔"

یہ حاضر جوابی سن کر وہ لڑکا شرمندہ ہو کر وہاں سے بھاگ نکلا۔ اس لیے کہ آئندہ خدا جانے وہ کبڑیا اس کے علاوہ اور کیا کچھ کہہ دے۔

آغا میر کی ڈیوڑھی کے چار پانچ کبڑیے مجھے آج تک یاد ہیں، اور میں انھیں کبھی نہیں بھول سکتا۔ رحیم بخش، عبدالرحیم، نظام دین، محمد دین اور شیراتی۔ رحیم بخش بہت ضعیف ہو گیا تھا۔ سرخ و سفید رنگت سفید داڑھی، نازک سا دبلا پتلا جسم، تہبند اور بنیان پہنے اپنی اونچی سی دوکان پر بیٹھا رہتا تھا اور اسی دوکان میں اس کا رہنا سہنا بھی تھا۔ وہ بالکل تنہا تھا۔ صرف آم اور خربوزے بیچتا تھا۔ وضع داری کا یہ عالم تھا کہ سردیوں میں اس کی دوکان زیادہ تر بند رہتی تھی لیکن گرمیوں کے موسم میں آم اور خربوزے ایسے لاتا تھا کہ سارے لکھنؤ میں اس معیار کے نہ ملیں۔ قیمت کچھ زیادہ لیتا تھا۔ بندھے ہوئے اس کے گاہک تھے۔ انھیں کے ہاتھ بیچتا تھا۔ بات کم کرتا تھا۔ اس کے برخلاف عبدالرحیم کو باتیں کرنے میں مہارت حاصل تھی۔ دین، اسلام، تصوف، صوفیائے کرام، پرانے لکھنؤ کی وضع داریاں، نوابوں کے عہد کی باتیں ان سب پر ایسی باتیں کرتا کہ گاہک اس کا گرویدہ ہو جاتا اور منھ مانگے دام دے کر سودا خریدتا۔ عرس کے موقع پر حضرت مخدوم شاہ مینا صاحب کے مزار پر جلوس کی شکل میں چادر لے جاتا تھا۔ شاہ عبدالرحمٰن صاحب کی درگاہ میں محفلِ سماع کا انتظام کرتا تھا اور قوالی سن کر خوب جھومتا تھا۔ شیراتی ان میں سب سے مختلف تھا۔ اس کے مزاج میں قلندری تھی۔ نہ تو اس کا کوئی گھر تھا نہ دوکان۔ دن بھر ادھر ادھر گھومتا تھا۔ صبح کو منڈی میں کاروبار کر لیتا تھا۔ دن اس کا باتیں کرتے، نعرے لگاتے اور گپ لڑاتے ہوئے گزرتا تھا۔ ایک ایک کے پاس جاتا اور کہتا "آج کتاب ہوگی۔" یعنی آج طلسم ہوشربا پڑھی جائے گی۔ چنانچہ رات کو وہ اپنے دوستوں کے ساتھ کسی بند دوکان کے سامنے بیٹھتا۔ ایک شخص ان میں سے طلسم ہوشربا، فسانۂ آزاد

یا کوئی اور داستان پڑھتا اور خیراتی نہ صرف سنتا بلکہ مختصر فقروں میں اظہار خیال بھی کرتا۔ کسی مہ جبیں نازنین کا داستان میں ذکر آتا تو کہتا "کنکیا ہے بھیا"۔ فٹ بال میچ دیکھنے کا شوقین تھا۔ دن بھر طالب علموں سے پوچھتا کہ اب میچ کہاں ہے؟ — یونیورسٹی میں کسی میچ کی اسے خبر ملتی تو سارے محلے میں کہتا۔

"بادشاہ باغ چلو۔ آج بڑا شاندار میچ ہے۔"

ان لوگوں کے محبوب تفریحی مشاغل میلاد کی محفلیں منعقد کرنا، رات رات بھر مل کر بیٹھنا اور کجری گانا جس کی ایک خاص دھن ہوتی تھی اور کبھی کبھی سال میں ایک دو دفعہ نوٹنکی کا اہتمام کرنا تھا۔ کجری میں لمبی بحر کی کچھ طویل نظمیں گائی جاتی تھیں جن کا موضوع حمد و نعت تھا۔ کچھ لوگوں کو نظمیں یاد تھیں۔ کچھ خود گانے کے لیے کجری بنا لیتے تھے۔ نوٹنکی میں یہ لوگ خود کچھ نہیں کرتے تھے۔ چھوٹی چھوٹی ٹولیاں تھیں جن کو بلا لیتے تھے۔ سڑک کے چوراہے پر تخت وغیرہ ڈال کر اسٹیج بنا دیا جاتا تھا اور رامائن مہابھارت یا کسی اور ایسی ہی داستان کو مختلف اداکار ڈرامائی انداز میں پیش کرتے تھے۔ ان کی ہر بات نظم میں ہوتی تھی۔ آخر میں بھیا جی وغیرہ کے الفاظ ملا کر وزن پورا کر دیتے تھے۔ رات رات بھر ڈھول و تاشوں باجوں کے ساتھ یہ لوگ نوٹنکی دیکھتے تھے۔ ایک رات مجھے بھی بچپن میں نوٹنکی دیکھنے کا تجربہ ہوا لیکن کچھ زیادہ مزہ نہیں آیا۔ کجری البتہ مزے دار چیز ہوتی تھی اور اس کو سننے میں مزہ آتا تھا۔ اور میلاد شریف روحانی سرور کا سامان فراہم کرتا تھا۔

اس محلے میں ہمارے گھر کے پھاٹک سے ملی ہوئی ایک جٹا دھاری پنڈت کی پان کی دوکان تھی۔ وہ بہت بوڑھا آدمی تھا۔ اس کو دیکھ کر معلوم ہوتا تھا کہ زمانے کے گرم و سرد دیکھے ہوئے ہے۔ سر پر بڑے بڑے بال تھے جو بالکل سفید ہو چکے تھے۔ چہرے پر مونچھیں اور معمولی سی داڑھی۔ ہندوؤں کے مخصوص طریقے سے دھوتی باندھتا تھا۔ جسم کو ننگا رکھتا تھا۔ قمیص یا کرتا نہیں پہنتا تھا۔ صرف جنیو ڈالے رکھتا تھا۔ ماتھے پر بڑا سا سفید رنگ کا ٹیکا لگاتا تھا۔ منہ اندھیرے وہ گومتی میں اشنان کرتا، پھر ہنومان کے مندر میں پوجا پاٹ کر کے اپنی دوکان پر آتا۔ دوکان کھولتا اور سب سے پہلے دوکان کے سامنے اور آس پاس گومتی سے لائے ہوئے پانی کا چھڑکاؤ کرتا ... اور خاصی دور تک سڑک پر

پھڑکا ڈکے ساتھ یہ کہتا جاتا

"جس کو نہ دے مولا اس کو دیں آصف الدولہ"۔

اور میں ہر صبح اس بڈھے کو اس عالم میں دیکھتا تو مجھے بڑی حیرت ہوتی اور میں یہ سوچتا رہ جاتا کہ جب آج تک آصف الدولہ کی مقبولیت کا یہ عالم ہے تو اس زمانے میں کیا کیفیت ہوگی جب لکھنؤ کی سرزمین پر آصف الدولہ خود حکمراں تھے۔

اس آبادی میں عہد نوابی کی خصوصیات ابھی تک زندہ تھیں، اور ابھی کچھ ایسی طور طریقے برتے جاتے تھے جن کا نوابوں کے زمانے میں رواج تھا۔

مثلاً جب بھی حکومت اور انتظامیہ عوام تک کوئی اطلاع پہنچانا چاہتی تھی تو ڈھنڈورہ پٹتا تھا ایک شخص زور زور سے ڈھول پیٹتا ہوا آتا تھا اور جگہ جگہ ٹھہر ٹھہر کر اس طرح آواز لگاتا تھا۔

"خلق خدا کا، ملک ہندوستان کا، حکم ڈپٹی کمشنر صاحب بہادر کا ــــ ہر خاص و عام کو اطلاع دی جاتی ہے کہ دفعہ ۱۴۴ لگا دی گئی ہے، اور چار سے زیادہ لوگوں کا ایک جگہ جمع ہونا ممنوع ہے"۔

ہر حکم کا اعلان اسی طرح ہوتا تھا اور لوگ اس اعلان کو بڑی توجہ سے سنتے تھے۔

نواب بھی اس آبادی میں خاصی تعداد میں رہتے تھے، لیکن ان کی حالت خاصی ابتر ہوگئی تھی کسی کا وظیفہ نو سو، کسی کا پانچ سو، تو کسی کا سو، تو کسی کا پچاس تو کسی کا دس پندرہ روپے مہینہ تقسیم ہوتے ہوتے نوبت یہاں تک پہنچ گئی تھی۔ بیشتر اندر سے کھوکھلے تھے لیکن ظاہری آن بان ایسی تھی کہ اس حقیقت کا پتہ نہیں چلتا تھا کہ اندر کا حال کیا ہے۔

ویسے وضع داری کا عالم یہ تھا کہ خربوزوں اور آموں کی فصل میں اخراجات کپڑوں تک کو رہن رکھ کر پورے کئے جاتے تھے تاکہ جاننے والوں، عزیزوں اور دوستوں کو یہ احساس نہ ہو کہ حالات بدل چکے ہیں اور اب افلاس کا دور دورہ ہے۔

وزیر اعظم اودھ آغا میر کی اولاد میں ایک صاحب نواب مصطفےٰ علی خاں تھے۔ آغا میر جب معتوب ہوئے تو کان پور بھیج دیئے گئے۔ وہاں ان کے خاندان کے افراد نے بھی سکونت

اختیار کر لی لیکن لکھنؤ سے ان کا تعلق قائم رہا۔ عزیز داریاں، رشتے داریاں انھیں لکھنؤ کھینچ لاتی تھیں۔ نواب مصطفیٰ علی خاں انھیں میں سے تھے۔ کانپور سے لکھنؤ آکر چوکی والے نواب محمد حسن خاں کے ہاں اکثر مہینوں قیام کرتے کیونکہ ان کے قریبی عزیز تھے۔ کوئی پندرہ سولہ سو ۱۶۰۰ روپے مہینہ ان کا وثیقہ تھا۔ اس زمانے کے حساب سے یہ بہت بڑی رقم تھی اس لیے لکھنؤ میں بھی پرانے رئیسوں کی طرح رہتے تھے۔

میرے والد صاحب سے ان کی گہری دوستی تھی۔ مجھ پر بھی بہت شفقت فرماتے تھے۔ گھر پر بھی ان کا آنا جانا تھا۔ والد صاحب بھی ان کے پاس جاتے رہتے تھے۔

نواب صاحب کو کتوں کا شوق تھا۔ اخبار اسٹیٹسمین ضرور خریدتے تھے۔ صرف اس لیے کہ اس میں کتوں کے اشتہار اس زمانے میں بہت چھپتے تھے۔ ان کی نسلوں کی پوری تفصیل ان اشتہاروں میں نکلتی تھی۔ نواب صاحب صرف اشتہار کا صفحہ پھاڑ لیتے اور اخبار کے باقی صفحات ہمارے ہاں چھوڑ دیتے اور کہتے کہ "میاں یہ صفحات تم پڑھ لینا انگریزی اچھی ہو جائے گی۔ مجھے تو یہ پہلے صفحے کے اشتہار پڑھ کر سنا دو تاکہ کتوں کی نسلوں کا علم ہو۔ میں ایسے کتے پالنا چاہتا ہوں جو صحیح النسل ہوں۔ ابھی تک ملے نہیں۔"

اور میں انھیں اشتہار پڑھ کر سنا دیتا اور مفہوم بھی بتا دیتا لیکن یہ صفحہ وہ دن بھر اپنے پاس رکھتے اور جو بھی انگریزی داں ان کے پاس آتا اس سے ان اشتہاروں کو اردو میں منتقل کرنے کی فرمائش کرتے۔

کئی سال اس طرح گزرے لیکن نواب صاحب کو اعلیٰ نسل کا کوئی کتا دستیاب نہ ہوا۔ صرف تلاش جاری رہی۔ ریاست کا یہ عالم تھا کہ دن بھر کوٹھی کے سامنے صحن میں بیٹھے رہتے۔ پھل والا آیا۔ کسی صاحب کو ہدایت کی کہ سارے پھل خرید لو۔ قیمت بھی ادا کی، انعام بھی دیا اور اس طرح وہ خوش خوش دعائیں دیتا ہوا چلا گیا۔

ایک دن ایک پھل والا جو تقریباً روزانہ آتا تھا، کوئی مہینہ بھر تک نہیں آیا۔ مہینے کے بعد

جب وہ آیا تو نواب صاحب نے پوچھا:

"بھئی تم کہاں رہے اتنے عرصے؟ تم نے تو ہمیں بھلا ہی دیا!"

وہ کہنے لگا: "حضور! یہ غلام علیل ہو گیا تھا۔ اب کچھ بہتر ہوں۔"

نواب صاحب نے کہا: "بھئی عجیب بات ہے، کم از کم ہمیں اطلاع تو دی ہوتی۔ ایسی بھی کیا اجنبیت!"

یہ کہہ کر آواز دی: "مکرم آغا!"

مکرم آغا حاضر ہوئے، عرض کیا: "ارشاد۔"

فرمایا: "بھئی مکرم آغا! یہ بے چارہ علیل ہو گیا تھا۔ ایک زمانے کے بعد آیا ہے۔ اس کو پچاس روپے اندر سے لا کر دے دو۔"

مکرم آغا حکم بجا لائے۔ اندر گئے اور پچاس روپے لا کر گل والے کو دے دیئے۔

وہ ہزاروں دعائیں دیتا ہوا رخصت ہوا۔

اس وقت بھی سخاوت کا یہ عالم تھا۔ رسی جل گئی تھی لیکن بل نہیں گیا تھا۔

میرے ساتھ بچپن میں کھیلنے والوں میں کئی ایسے نواب تھے جن کی عمریں مجھ سے کچھ زیادہ تھیں، لیکن ان کا بھی یہی عالم تھا۔ ہر روز اسی طرح کی سخاوت کا مظاہرہ کرتے تھے۔

ایک چھوٹے نواب تھے، ایک نواب فرخ آغا تھے، ایک باقر حسین تھے۔ ان میں خدا جانے کیوں نسائیت بہت زیادہ تھی۔ عورتوں کی طرح باتیں کرتے اور دلہنوں کی طرح شرماتے تھے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کا زیادہ وقت گھروں میں عورتوں کے ساتھ گزرتا تھا۔ باہر نکلتے تو ان کی حفاظت کے لیے ایک یا دو ملازم پیچھے پیچھے ضرور چلتے۔ لیکن مجھے ان سب کی یہ ادائیں پسند تھیں اور مجھے ان میں تہذیب اور شائستگی، اور رکھ رکھاؤ کا عکس نظر آتا تھا۔

محرم کا زور شور یوں تو سارے لکھنؤ میں ہوتا تھا، لیکن ہماری اس آبادی میں محرم کی کچھ

زیادہ ہی شدت نظر آتی تھی۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ اس محلّے کے آس پاس دور دور تک شیعوں کی آبادیاں تھیں۔ محرم سے ان کی دلچسپی حضرت امام حسینؑ کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کے لیے تھی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی محرم ان کے لیے اپنے گناہوں کو معاف کروانے کا ایک ذریعہ اور وسیلہ بھی تھا۔ یکم محرم سے شروع ہو کر ۸ ربیع الاول تک محرم کی تقریبات کا سلسلہ مختلف صورتوں میں جاری رہتا تھا۔ ویسے مجلسیں تو ۲۱ رمضان ہی سے لگ جاتی تھیں اور اس طرح محرم کا آغاز ہو جاتا تھا۔ کسی نہ کسی تقریب سے مجلسیں ہوتی رہتی تھیں۔ محرم کی تقریبات کا زور یکم محرم سے ہوتا تھا۔ عشرے اور تیجے تک تو لکھنؤ میں اتنی مجلسیں ہوتی تھیں کہ ان کا شمار مشکل ہے۔ ہر گھر میں مجلس، ہر گھر میں ماتم، ہر گھر میں تعزیہ، ہر گھر میں مہندی، ہر گھر میں مرثیہ خوانی اور سوز خوانی۔ لوگ سیاہ کپڑے پہنے جوق جوق سڑکوں پر اِدھر اُدھر آتے جاتے نظر آتے تھے۔ ذکرِ امام مظلومؑ کا ہر گھر میں ہوتا۔ بہت سے لوگ اس زمانے میں پان کھانا چھوڑ دیتے تھے۔ کچھ لوگ کپڑے تبدیل نہیں کرتے تھے۔ بعض ننگے پاؤں اور ننگے سر رہتے تھے۔ غرض یہ کہ ہر طرح سے شہدائے کربلا کے ساتھ عقیدت اور محبت کا اظہار ہوتا تھا۔

عاشورہ کے دن یہ مجلسیں تو ختم ہو جاتی تھیں۔ عَلَم اور تعزیے سڑکوں پر نکلتے تھے اور بیشتر آغا میر کی ڈیوڑھی اور پاٹے نالے سے ہوتے ہوئے وکٹوریہ اسٹریٹ پر نخاس سے گزر کر کربلا کی طرف جاتے تھے۔ اس کو حضرت عباسؑ کی درگاہ بھی کہا جاتا ہے۔ وہاں تعزیے اور عَلَم ٹھنڈے کیے جاتے اور عزادار ننگے سر ننگے پاؤں غفراں مآب کے امام باڑے کا رخ کرتے جہاں مجلس شامِ غریباں برپا ہوتی۔

میں محرم کی ان تقریبات کا خاموش تماشائی تھا۔ مجلسوں میں جانے کی مجھے اجازت نہیں تھی، اس لیے مجلسوں میں جانے کی میری ہمت نہیں پڑتی تھی۔ البتہ عَلَم اور تعزیوں کے ساتھ جو نوحے پڑھے جاتے تھے اُن کو سننے کو جی چاہتا تھا۔ مختلف انجمنوں کے لوگ اپنے اپنے خاص لحن میں یہ نوحے پڑھتے اور ماتم کرتے تھے۔ میرے پھاٹک کے سامنے سے جو عَلَم نکلتے تھے ان کو میں روکنے کی کوشش کرتا تاکہ نوحے [illegible] سکوں اور ماتم دیکھ سکوں۔ یہ نوحے جذبات میں ڈوبے ہوئے

ہوتے تھے اور ان میں اعلیٰ درجے کی شاعری ہوتی تھی اس لیے بہت اچھے لگتے تھے۔ ان میں سے بعض انجمنوں کے ساتھ میں کسی بڑے آدمی کو ساتھ لے کر وکٹوریہ اسٹریٹ تک چلا جاتا تھا اور خوب نوحے سنتا تھا۔ وکٹوریہ اسٹریٹ پر نخاس سے آگے نکل کر جیسے جیسے کربلا قریب آتی جاتی تھی، نوحے زیادہ پڑھے جاتے تھے، سوزخوانی بھی ہوتی تھی۔ بعض طوائفیں بھی سیاہ کپڑوں میں ملبوس اپنے اپنے تعزیوں کے ساتھ سوزخوانی کرتی تھیں۔

غرض یہ کہ عاشورہ کے دن کچھ عجیب سا سماں ہوتا تھا عقیدت و محبت، جذب و شعور، شیفتگی و وارفتگی اور تہذیب و شائستگی کے ایسے ایسے نظارے دیکھنے میں آتے تھے کہ روح بالیدہ ہو جاتی تھی۔

محمود آباد کی چھوٹی رانی کا تعزیہ ان تقریبات کی ایک اہم کڑی تھی۔ چہلم کے دن یہ تعزیہ نہایت اہتمام سے اٹھایا جاتا تھا۔ اس جلوس میں نوحہ خوانوں اور سوزخوانوں کے ساتھ بڑی تعداد میں ہاتھی، گھوڑے اور اونٹ وغیرہ بھی ہوتے تھے جن پر ہاتھوں میں علم لے کر لوگ بیٹھتے تھے اور کچھ پڑھتے جاتے تھے۔ کوئی میل بھر لمبا جلوس ضرور ہوتا ہوگا۔ خلقت اس جلوس کو دیکھنے کے لیے ہمارے محلّے میں خاص طور پر جمع ہوتی تھی۔ جشن کا سا سماں ہوتا تھا۔ بیشتر لوگ تفریح کے خیال سے اس جلوس کو دیکھنے کے لیے جمع ہوتے تھے۔

اگرچہ مجلسوں میں مجھے جانے کی اجازت نہیں تھی لیکن عشرے کی شام کو چھپ چھپا کر چپکے سے شامِ غریباں کی مجلس سننے اور دیکھنے کے لیے غفراں مآب کے امام باڑے ضرور چلا جاتا تھا اس لیے کہ یہ مجلس اپنے ڈرامائی انداز اور المیہ فضا کی وجہ سے خاصی موثر ہوتی تھی جب پہلی بار دیکھا و رُش، تو وہی مناظر نظر آئے جن کے بارے میں بہت کچھ سن رکھا تھا۔

غفراں مآب یا آغا باقر کا امام باڑہ ہمارے گھر سے ایسا کچھ زیادہ دور نہیں تھا۔ آغا میر کی ڈیوڑھی کی پولیس چوکی سے نکل کر کیننگ اسٹریٹ کو پار کر کے نیچے کی طرف چلیں تو امام باڑے کی بوسیدہ عمارت سامنے نظر آتی تھی۔ آس پاس ٹوٹے پھوٹے پرانے مکان تھے جن کی نہ تو کبھی مرمت

ہوتی تھی نہ کبھی صفائی۔ مکانوں کی ننگی اینٹوں کی دیواریں چڑیلیں بن کر دانت دکھاتی تھیں۔ رات کو واقعی یہاں ڈر لگتا تھا۔

خیر تو اس جگہ عاشورے کی شام کو شامِ غریباں کی مجلس ہوتی تھی۔ اس مجلس میں نہ تو فرش ہوتا تھا نہ شامیانہ اور قناتیں وغیرہ۔ عزادار آتے جاتے تھے اور زمین پر بیٹھتے جاتے تھے۔ سامنے صرف ایک منبر رکھا جاتا جس پر مولانا کبن صاحب آ کر بیٹھ جاتے تھے اور مجلس شروع کر دیتے تھے۔ اندھیرا بڑھتا جاتا تھا۔ دس تاریخ کی ملگجی سی چاندنی بے اثر معلوم ہوتی تھی بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ اس کے سوگوار ہونے کا احساس ہوتا تھا۔ امام باڑے کا میدان تھوڑی دیر میں کھچا کھچ سوگواروں سے بھر جاتا تھا۔ عورتیں برقعے پہنے، چادریں اوڑھے، پردہ کیے امام باڑے اور آس پاس کے بوسیدہ مکانوں کی چھتوں پر بیٹھ جاتی تھیں اور تھوڑے تھوڑے وقفے سے گریہ وزاری کرتی تھیں۔ اس مجلس میں کوئی سنی نہیں آ سکتا تھا صرف ایک سنی کی ننھی سی جان ہوتی تھی اور وہ میں تھا لیکن بھیس بدلے ہوئے۔ کسی کو خیال بھی نہیں آ سکتا تھا کہ میں شیعہ نہیں ہوں۔

میں ایک کنارے پر ایسی جگہ بیٹھتا جہاں سے ہنگامے کے وقت بھاگنے میں آسانی ہو اور حقیقت یہ ہے کہ یہ مجلس جب آخری مرحلے میں پہنچتی تھی اور جب اس میں خاصا ڈرامائی انداز پیدا ہو جاتا تھا تو میں بھاگ آیا کرتا تھا۔ اس منظر کو برداشت کرنے کی سکت میرے اندر نہیں تھی۔ ویسے ڈر بھی بہت لگتا تھا۔

اندھیرے اور ملگجی سی چاندنی میں جب سارا امام باڑہ سوگواروں اور عزاداروں سے بھر جاتا تھا اور تل دھرنے کو جگہ باقی نہیں رہتی تھی تو مجتہد مولانا کلب حسین عرف کبن صاحب اچانک منبر پر آ کر بیٹھ جاتے تھے اور مجلس شروع کر دیتے تھے۔ خطابت ان پر ختم تھی۔ بڑے ہی خوبصورت انداز اور نہایت ہی دل کش زبان میں تقریر کرتے تھے۔

"حسینؑ شہید ہو گئے، عباسؑ شہید ہو گئے، علی اکبرؑ شہید ہو گئے۔ بچے، جوان، بوڑھے سب شہید ہو گئے۔ جو زندہ بچے ان پر کیا قیامت گزری ہوگی تصور کیجیے اس شب کا جب وہ تنہا، بے یار و مددگار

رہ گئے۔ اپنے پیاروں کو یاد کرنے کے لیے .... جنگ ختم ہو گئی۔ سناٹا چھا گیا۔ خون کے ساتھ آنسوؤں کے دریا بھی موجزن ہوئے ...... اور پھر ان کے لیے کھانا بھیجا گیا؟"

یہ آخری جملہ جیسے ہی اُن کی زبان سے نکلتا، کچھ لوگ سروں پر سفید چادروں میں لپٹے ہوئے ٹوکرے لے کر ایک طرف سے داخل ہوتے۔ ان کے ہاتھوں میں موم بتیاں بھی ہوتی تھیں۔ اس سے اندھیرے میں کچھ روشنی ہوتی۔ اس کو دیکھ کر لوگ کھڑے ہو جاتے، اور زور زور سے سینہ کوبی شروع کر دیتے۔ کچھ لوگ خاص طور پر خواتین گریہ و زاری کرنے لگتیں، آہوں، چیخوں اور کراہوں کا شور فضا پر چھا جاتا۔ ہنگامے کی سی کیفیت پیدا ہو جاتی۔ اور بس اس کو دیکھ کر میں بھاگتا۔ بڑی مشکل سے باہر نکلتا اور اپنے گھر کی راہ لیتا۔ اس منظر کو مزید دیکھنے کی میرے اندر تاب و طاقت نہیں تھی۔

محرم کی تقریبات کا یہ سلسلہ ۸ ربیع الاول تک جاری رہتا تھا۔ چہلم کے موقع پر بھی عشرے کے دن ہی کی طرح تعزیے اور علم نکلتے اور کربلا تک جاتے تھے۔ نوحہ خوانی اور سوز خوانی ہوتی تھی۔ اس موقع پر عزادار چونکہ زیادہ تھکے ہوئے نہیں ہوتے تھے اس لیے نوحہ خوانی اور سوز خوانی کو زیادہ وقت دیتے تھے۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو لکھنؤ کا چہلم عشرۂ محرم سے زیادہ اہم ہوتا تھا۔

اور ۸ ربیع الاول کو چپ تعزیہ نکلتا تھا۔ اس میں ہزارہا آدمی شریک ہوتے تھے لیکن سب ننگے سر چپ چاپ، خاموش جلوس میں چلتے تھے۔ ایک نقیب کچھ واقعات بیان کرتا جاتا تھا۔ لوگ خاموشی کے ساتھ گریہ کرتے تھے۔ چوک کی لمبی سڑک پر اس جلوس کا منظر دیکھنے والوں کو بہت متاثر کرتا تھا اور ہزارہا لوگ اس کو دیکھنے کے لیے دور دور سے آتے تھے۔

میں بھی اپنے کسی بزرگ کے ساتھ اس جلوس کو دیکھنے کے لیے جایا کرتا تھا۔ جلوس تو خاموشی سے گزر جاتا تھا لیکن سے پیچھے کچھ لوگ چھریوں اور زنجیروں کا ماتم بھی کرتے تھے۔ اس کو دیکھ کر ڈر لگتا تھا۔

لکھنؤ میں محرم کی یہ آخری تقریب ہوتی تھی۔

۸ ربیع الاول کو محرم کا ماحول اچانک ختم ہو جاتا تھا اور عزاداری اور سوگواری کی جگہ مسرت

اور شادمانی لے لیتی تھی۔ سیاہ اور سبز پوشاکیں اتر جاتی تھیں اور اس کی جگہ سرخ اور گلابی رنگ کے لباس لے لیتے تھے۔ لوگ ہنستے، بولتے، خوشیاں مناتے، تفریح کرتے اور سڑکوں اور گلیوں میں اہلے گہلے پھرتے تھے۔

یہ تقریب تہوار کی طرح منائی جاتی تھی اور اس کو لکھنؤ کی اصطلاح میں "عید غدیر" کہتے تھے۔ میں نے جب کئی بار اس کے بارے میں اپنے نوجوان ساتھیوں میاں جانی، فرخ آغا اور چھوٹے نواب سے پوچھا تو مجھے ایک ہی جواب ملا کہ شہدائے کربلا میں سے جو زندہ سلامت رہ گئے تھے انھوں نے خواب دیکھا کہ تمام شہدا جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام پر ہیں۔ انھیں بشارت ہوئی کہ خوش ہونا چاہیے۔ اس لیے یہ مسرت و شادمانی کا دن منایا جاتا ہے اور اس کو عید غدیر کہتے ہیں۔

عید غدیر کے اس موقع پر گھروں میں اور بھی بہت کچھ ہوتا تھا۔ میں نے خود دیکھا ہے لیکن اس کی تفصیل خوفِ فسادِ خلق کے پیشِ نظر ناگفتنی رہے تو بہتر ہے۔

لکھنؤ کے بچے کھچے نواب زیادہ تر ایرانی النسل تھے اس لیے ۲۱ مارچ کو ایرانیوں کے تتبع میں نوروز کا تہوار بڑے اہتمام سے مناتے تھے۔ لوگ ہندوؤں کی طرح رنگ کھیلتے تھے۔

مجھے اس رنگ بازی سے الجھن اس لیے ہوتی تھی کہ اس کے ساتھ مجھے ہولی کے تہوار کا خیال آتا تھا اور ہولی کے رنگ کے بارے میں بچپن سے میرے کانوں میں یہ بات ڈالی گئی تھی کہ مسلمان کے جسم کے جس حصے پر یہ رنگ پڑے گا وہ حصہ جہنم میں جلے گا۔

اس لیے میں نوروز کے دن گھر میں بند ہو کر بیٹھ جایا کرتا تھا۔ جب یہ طوفان گزر جاتا تو شام کو باہر نکلتا تھا۔

ہمارے اس محلے کی سڑک پر بے شمار ایسے افراد نظر آتے تھے جو لکھنؤ کی قدیم تہذیب کا نمونہ تھے۔ ان میں ایک صاحب مصطفیٰ حسین کشمیری تھے جو سر پر بڑے بڑے بال رکھتے تھے اور عورتوں کی طرح چوٹی بناتے تھے۔ ان کے سر پر دوپلی ٹوپی ہوتی تھی۔ اس کے پیچھے چوٹی لٹکتی رہتی تھی.....
شیروانی اور پاجامہ پہنتے تھے۔ دبلے پتلے چھریرے بدن کے آدمی تھے۔ نہایت مستعلیق۔ کری سلام

کرتے تو کئی سو قدم تک آداب کرتے ہوئے جاتے تھے۔ ان کے ساتھ دو نوجوان لڑکے بھی ہوتے تھے۔ جو اسی وضع قطع سے مصطفیٰ حسین کشمیری کے ساتھ چلتے تھے۔

لکھنؤ کے اس دورِ آخر کے نواب موت سے بہت ڈرتے تھے۔ کوئی مرجائے تو اس کے قریب تک نہیں جاتے تھے جنازے کو کندھا تک نہیں دیتے تھے۔ جنازے کو اٹھانے کے لیے کچھ خاص قسم کے لوگ تھے جو "شہدے" کہلاتے تھے۔ میت لکڑی کے بنے ہوئے ایک تابوت میں رکھ دی جاتی تھی۔ اس تابوت کو چار "شہدے" اپنے کاندھے پر اٹھاتے تھے۔ اس تابوت پر ایک شامیانہ ہوتا تھا۔ جس پر قرآن پاک کی آیتیں لکھی ہوتی تھیں۔ چار "شہدے" اس شامیانے کو لے کر چلتے تھے۔ آگے آگے ایک شخص چاندی کا عصا ہاتھ میں لے کر چلتا تھا اور قرآن مجید کی آیتیں بہت تیز اور دھاردار آواز میں پڑھتا جاتا تھا۔ اس کو لکھنؤ کی اصطلاح میں "نقیب" کہتے تھے۔ پیچھے اہلِ خانہ، عزیز اور دوست سوگواری اور اداسی کی تصویر بنے ہوئے، رومال چہروں پر رکھے، پیدل چلتے تھے۔ جنازے کو کندھا نہیں دیتے تھے۔ بلکہ اس سے کچھ فاصلے پر رہتے تھے۔ اس طرح یہ میت آغا باقر یا غفران مآب کے امام باڑے جاتی تھی۔ جہاں ایک غسال اس کو نہلاتا تھا، اور پھر دفن کرنے کے لیے قبرستان لے جاتے تھے۔

ڈیوڑھی آغا میر میں آبادی زیادہ تر مسلمانوں کی تھی لیکن ایک طرف کچھ ہندو بھی رہتے تھے چار چھ گھر ہوں گے لیکن یہاں ہنومان کا ایک مندر تھا جہاں دور دور سے عقیدت مند آتے تھے، پوجا کرتے تھے اور پرشاد چڑھاتے تھے۔ منگل کو تو وہاں اچھا خاصا میلہ ہوتا تھا۔ تنگ تاریک گلیوں میں تل دھرنے کی جگہ باقی نہیں رہتی تھی۔ کھوے سے کھوا چھلتا تھا اور سال میں ایک دفعہ تو بہت ہی بڑا میلہ لگتا تھا۔ جوان اور بچے لنگوٹ باندھے لیٹ لیٹ کر راستہ ناپتے ہوئے دور دور سے اس مندر تک آتے تھے۔ اس کو ہندوؤں کی اصطلاح میں "پیکرما" کہتے تھے۔ مئی جون کی تپتی ہوئی سڑکوں گلیوں میں لیٹ لیٹ کر راستہ طے کرنا آسان نہیں ہوتا تھا۔ جسم پر چھالے پڑ جاتے تھے۔ مائیں اور بہنیں ان پیکرما کرنے والوں کے ساتھ ساتھ چلتی تھیں اور پنکھا جھلتی جاتی تھیں۔ اس طرح یہ لوگ ہنومان کے مندر تک پہنچتے تھے اور پوجا وغیرہ کرتے اور دعائیں مانگتے تھے۔

یہ تھا ڈیوڑھی "آغا میر لکھنؤ کا ماحول جس میں میرے بچپن اور جوانی کے کئی سال گزرے اور جس نے مجھے مہذب، شائستہ اور جہاں دیدہ بنایا۔ بھلے اور برے کی تمیز میرے اندر پیدا کی، تہذیبی شعور میرے اندر بیدار کیا، اور مجھے لکھنؤ کی اس مٹتی ہوئی تہذیب کا مزاج داں بنا دیا جو تاریکی کے غاروں کی طرف تیزی سے دوڑی جا رہی تھی لیکن جس کی "تاریکیوں میں اب بھی جگنو سے چمکتے ہوئے نظر آتے تھے۔

پانچواں باب

امین آباد ہائی اسکول

اس عرصے میں مجھے امین آباد ہائی اسکول کے چوتھے درجے میں داخل کرا دیا گیا۔ یہاں مجھے اچھے ساتھی، قابل اساتذہ اور مجموعی طور پر خوشگوار ماحول نصیب ہوا جس کی بدولت تعلیم کے ساتھ ساتھ میرے اندر خود اعتمادی پیدا ہوئی اور ذہن کے دریچے کھلتے ہوئے محسوس ہوئے۔ میری عمر اس وقت آٹھ نو سال سے زیادہ نہیں تھی لیکن مجھے یاد ہے کہ میں حالات کے مختلف پہلوؤں کو سمجھنے لگا تھا۔ سیاہ و سفید اور اچھے برے میں تمیز کرنے کی صلاحیتیں میرے اندر بیدار ہونے لگی تھیں۔ یوں کہنا چاہیے کہ اس اسکول سے میری صحیح تعلیم و تربیت کا آغاز ہوا۔

یہ اسکول ایک ایسی جگہ واقع تھا جس کو لکھنؤ کا دل کہنا چاہیے۔ سامنے لڑکیوں کا کالج مہیلا ودیالیہ تھا۔ اس کے سامنے امین الدولہ پارک تھا جس کو جھنڈے والا پارک بھی کہا جاتا تھا۔ یہاں کانگریس اور مسلم لیگ کے جھنڈے لہراتے رہتے تھے اور بڑے بڑے سیاسی جلسے یہیں ہوتے تھے۔ اس پارک کے بائیں طرف سامنے گنگا پرشاد میموریل ہال تھا جس میں ایک لائبریری تھی اور بڑی بڑی کانفرنسیں، سیمینار اور جلسے اس ہال میں ہوتے تھے۔ اس کے آگے امین آباد پارک تھا جہاں سیاسی جلسے تو نہیں ہوتے تھے لیکن لوگ گھومنے اور تفریح کرنے کے لیے یہاں ضرور آتے تھے۔ اسکول کا انتظام لکھنؤ میونسپل کارپوریشن کے ہاتھ میں تھا۔ اس میں وہ سختیاں اور پابندیاں نہیں تھیں جو حکومت کے اسکولوں اور کالجوں میں ہوتی ہیں بلکہ خاصی آزادی تھی۔ آئے دن سیاسی جلسے بھی

اس اسکول کے اندر اور باہر ہوتے رہتے تھے۔ مجھے اس وقت تک سیاسی معاملات کا کوئی شعور نہیں تھا لیکن جلسوں جلوسوں میں جو رونق ہوتی تھی، اس کا میری طبیعت پر اچھا اثر ہوتا تھا اس لیے میں ان میں دلچسپی لیتا تھا۔

میں تو اس وقت چوتھے درجے میں داخل ہوا تھا، عمر بھی بہت کم تھی، اس لیے زیادہ تر میں اپنے آپ کو کلاس کی پڑھائی تک محدود رکھتا تھا۔ پابندی سے اسکول جاتا تھا اور وقت سے پہلے ہی اسکول پہنچ جاتا تھا۔ میرے گھر سے اسکول کا فاصلہ کوئی ڈھائی تین میل کا ضرور تھا۔ میں صبح کو فجر کے وقت اٹھتا اور آٹھ بجے سے قبل ہی ناشتے وغیرہ سے فارغ ہو کر پیدل اسکول کی طرف روانہ ہو جاتا۔ نو بجے اسکول لگتا تھا، لیکن میں ساڑھے آٹھ بجے کے قریب اسکول میں ہوتا تھا۔ یہ جو آدھ گھنٹہ مجھے مل جاتا تھا اس میں لٹو نچاتا اور اپنے بعض ساتھیوں کے ساتھ کھیلتا تھا ـــــ اقبال صفی پوری بھی جو بعد میں شاعر کی حیثیت سے مشہور ہوئے اور جنھوں نے بے شمار مشاعرے لوٹے میرے ساتھ ہی چوتھے درجے میں داخل ہوئے تھے۔ ان سے میری دوستی تھی اور ہم دیر تک ایک ساتھ کھیلتے یا باتیں کرتے تھے۔ کچھ اور بھی ساتھی تھے، مثلاً نزہت اللہ اور زینت لال وغیرہ لیکن اب میں ان کو بالکل بھول گیا ہوں۔

اسکول میں ہمیں مختلف استاد پڑھاتے تھے۔ ایک استاد ماسٹر مہادیو پرشاد صاحب تھے۔ نہایت نستعلیق آدمی تھے۔ کرتے پاجامے اور کوٹ میں ملبوس، سر پر کلابتوں والی ٹوپی، پاؤں میں اونچی نوک کا کالا سا چمکتا جوتا۔ ان کو دیکھ کر جی خوش ہوتا تھا۔ بچوں کے ساتھ بڑی شفقت اور محبت سے پیش آتے تھے۔ ہر وقت پان کھاتے رہتے تھے اس لیے شگفتگی اور تازگی ان کے چہرے پر ہر وقت کھیلتی رہتی تھی۔ یہ ہمیں انگریزی اور حساب پڑھاتے تھے۔ ایک استاد نقوی صاحب تھے جو انسان تو بہت اچھے تھے۔ تاریخ اور جغرافیہ پڑھاتے بھی خوب تھے لیکن ذرا بے چین سے رہتے تھے۔ سیمابی کیفیت ان پر ہر وقت طاری رہتی تھی۔ پڑھاتے ہوئے بھی انھیں ایک جگہ قرار نہیں تھا۔ نہ ایک جگہ بیٹھتے تھے نہ کھڑے ہوتے تھے۔ بس کلاس کے کمرے میں گھوم گھوم کر پڑھاتے تھے۔ ایک استاد منیر صاحب تھے۔ یہ کھیلوں کے انچارج تھے۔

ان کا تعلق اسکول کی تمام کلاسوں سے تھا، خوش رہتے تھے۔ رواں دواں رہتے تھے کبھی تھکتے نہیں تھے۔ ایک گھنٹہ کھیل کا بھی ہوتا تھا۔ اس میں وہ دوڑ لگواتے تھے، مختلف طرح کے کھیل کھلاتے تھے۔ انھوں نے اسکول کی ہاکی اور فٹ بال کی ایسی ٹیمیں بنائی تھیں جن کا سارے شہر میں شہرہ تھا۔ یہ ٹیمیں بڑے بڑے ٹورنامنٹ میں کھیلنے جاتی تھیں، اور جیت کر آتی تھیں۔ ایک ہمارے ڈرائنگ ماسٹر صاحب تھے جو ہمیں ڈرائنگ کا درس دیتے تھے۔ نام تو ان کا یاد نہیں، لمبے موٹے اور وجیہ آدمی تھے، لیکن نہایت نرم مزاج اور رحم دل۔ طالب علموں کو اپنے بیٹوں کی طرح سمجھتے تھے، وہ ہمیشہ بڑی ہی شفقت سے پیش آتے تھے۔ پنسل سے پھلوں اور ترکاریوں کی تصویریں ہم سے بنواتے تھے اور اگرچہ میری ڈرائنگ کوئی خاص اچھی نہیں تھی لیکن ان کی کلاس میں میرا دل لگتا تھا۔ ایک مولوی صاحب اردو فارسی پڑھاتے تھے۔ بہت سیدھے سادے آدمی تھے، پڑھاتے محنت سے تھے، لیکن ان کی کلاس میں شور بہت ہوتا تھا۔ ایک ڈرل ماسٹر صاحب تھے جو ایک پیریڈ میں ہمیں پریڈ کرواتے تھے۔ موٹے سے آدمی تھے، فوج سے ریٹائر ہو کر آئے تھے، خوب ورزش کرواتے تھے، بچے ان سے بہت خوش رہتے تھے۔

ان اساتذہ کے ساتھ میں نے امین آباد سکول میں کوئی دو ڈھائی سال گزارے، اور ان سے بہت کچھ حاصل کیا۔ شرافت، اور نیکی، محنت اور لگن، شفقت، اور محبت کی خصوصیات کو ان لوگوں میں مجسم دیکھا اور اس کے اثرات مجھ پر بڑے گہرے ہوئے اور آج تک کسی نہ کسی صورت میں مختلف زاویوں سے میری زندگی اور شخصیت میں جھانکتے ہیں۔

میں جب صبح گھر سے اسکول روانہ ہوتا تھا تو میری والدہ دو پیسے میری جیب میں ڈالتی تھیں اور کہتی تھیں "بیٹا! کنارے کنارے جانا اور سیدھے گھر واپس آنا، کہیں ٹھہرنا نہیں۔ دیر نہ لگانا، جلدی آنا، تمھیں دیر ہو جاتی ہے تو میں بے چین ہو جاتی ہوں۔ طرح طرح کے خیالات دل میں آتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کوئی دل کے اندر ڈوئی چلا رہا ہے۔" گھر سے سکول کا فاصلہ کوئی دو ڈھائی میل ضرور تھا۔ میں بڑا سا بستہ بغل میں دبا کر گھر سے چلتا تھا اور کیننگ اسٹریٹ پر چل کر کباب گنج کے بازار کو پار کر کے

نادان محل روڈ پر آتا اور پھر سیدھا مولوی گنج ہوتا ہوا امین آباد اسکول پہنچتا۔ اس سفر میں کوئی پون گھنٹہ لگ جاتا تھا، اور ساڑھے تین بجے جب چھٹی ہوتی تو اسی طرح گھر واپس آتا تھا۔ کئی سال میں اس طرح پیدل چلا۔ اس کے کئی فائدے ہوئے۔ سب سے بڑا فائدہ تو یہ ہوا کہ تکلف، تھکانے اور سڑک پر چلنے کے آداب آ گئے۔ اس کے علاوہ سڑکوں، اور بازاروں کی رونق، اور طرح طرح کے لوگوں کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملتا تھا۔ پھر صحت پر بھی اچھا اثر ہوتا تھا۔ نیند خوب آتی تھی۔ اس زمانے میں موٹریں اور سائیکلیں اور دوسری گاڑیاں بہت کم تھیں، زیادہ تر لوگ پیدل چلتے تھے۔ اس لیے مجھے پیدل اسکول آنا ایسا کچھ عجیب نہیں معلوم ہوتا تھا اور کوئی خاص تکلیف بھی نہیں ہوتی تھی۔

ایک دو سال اسی طرح گزرے اور جب میں کوئی دس گیارہ برس کا ہو گیا تو سائیکل پر اسکول جانے لگا۔ گھر میں ایک ہی سائیکل تھی جس کو عام طور پر لوگ استعمال کرتے تھے۔ میں نے اسی سائیکل پر سائیکل چلانا سیکھا اور پھر اسی پر اسکول جانا شروع کیا۔ سائیکل پر اسکول جانے کا لطف ہی کچھ اور تھا۔ دس منٹ میں اسکول پہنچ جاتا تھا۔ واپسی میں رکاب گنج کے بازار سے ایک پیسے کی چاٹ کے دو دونے لیتا تھا اور کھاتا ہوا گھر پہنچ جاتا تھا۔ اس طرح اب وقت بھی خاصا ملنے لگا اور میں شام کو گھر کے قریب کے میدان میں کھیلنے بھی چلا جاتا تھا۔

جب میں اپنی سائیکل رکاب گنج کے پل سے آگے بڑھ کر امین آباد والی سڑک پر بائیں طرف مڑتا تو پیچھے سے آواز آتی۔ وہ جو سائیکل پر ترکی ٹوپی پہنے، ایک آنے کا سوال ہے، میاں!"

یہ ایک فقیر کی آواز ہوتی تھی۔ وہ اسی طرح آوازیں لگا کر پیسے مانگتا تھا۔ جو شخص جس طرح کے کپڑے پہنے ہوتا، اس کو لباس کے حوالے سے پکار کر ایک دو آنے کی صدا لگاتا۔ مثلاً وہ جو سر پہ ٹوپی دھوتی اور کوٹ پہنے، ——— وہ جو شیروانی پہنے ننگے سر۔ وہ جو سائیکل پر ترکی ٹوپی پہنے ——— جس سے جو ہو سکتا اس کو دے دیتا۔ لوگ بتاتے تھے کہ یہ شخص خاندانی ہے۔ زمانے نے اس کا یہ حال کر دیا ہے۔ کہ اس انداز سے سوال کرتا ہے اور جو کچھ ملتا ہے اس سے گزر بسر کرتا ہے۔ حالت اس کی یہ تھی کہ ایک میلا سا جانگیہ، ایک میلا سا کرتا یا بنیان، کپڑے پھٹے ہوئے، بال بکھرے ہوئے، داڑھی بڑھی ہوئی

بس اس جگہ یعنی پل پر ادھر اُدھر چل پھر کر سوال کیا کرتا تھا۔ شہر میں کسی اور جگہ اس کو نہیں دیکھا۔ خاصا بے نیاز سا آدمی تھا۔ جی چاہتا تھا کہ اس سے بات کروں اور اس کے ماضی کے بارے میں پوچھوں، لیکن کبھی ہمت نہیں پڑی۔ بس سائیکل پر تیزی سے اس کے سامنے سے گزر جاتا تھا اور وہ آواز لگاتا رہتا تھا۔

"وہ جو سائیکل پر۔"

اسکول پہنچ کر اگر کچھ وقت باقی ہوتا تو میں ساتھیوں کے ساتھ کھیلتا یا باتیں کرتا۔ پھر کلاسوں میں باقاعدگی سے شریک ہوتا۔ شاید ہی کبھی کوئی کلاس میں نے چھوڑی ہو۔ جب بارہ بجے کے قریب انٹرول ہوتا تو میں باہر نکلتا۔ ایک چُندھی آنکھوں والا آدمی اسکول کے اندر پھل بیچتا تھا۔ اس سے پیسے دو پیسے کے پھل لے کر کھاتا۔ کبھی کبھی اسکول کے پھاٹک کے باہر سڑک پر نکلتا۔ فٹ پاتھ پر سیاسی رہنماؤں کی تصویریں جگہ جگہ بکتی تھیں۔ ان تصویروں کو دیکھتا۔ کبھی کبھی کوئی تصویر خرید بھی لیتا۔ پیسے دو پیسے کی تصویر مل جاتی تھی۔ بھگت سنگھ، گاندھی جی، جواہر لال نہرو مولانا ابوالکلام، مولانا حسرت موہانی، مولانا محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی وغیرہ کی تصویریں اس زمانے میں جگہ جگہ فٹ پاتھ پر بکتی تھیں۔ میرے لیے یہ تصویریں دلچسپی کا باعث تھیں۔

یہ زمانہ خاصا سیاسی خلفشار کا زمانہ تھا۔ سائمن کمیشن آیا ہوا تھا اور جگہ جگہ دیواروں پر لکھا ہوا تھا۔ سائمن گو بیک۔ اس وقت مجھے کچھ معلوم نہیں تھا کہ سائمن کمیشن کیا ہے اور کیوں آیا ہے لیکن اتنا جانتا تھا کہ اس کی مخالفت ہو رہی ہے، اور یہ مخالفت انگریز کی مخالفت ہے۔ اس لیے میں بھی کبھی کبھی یہ نعرہ لگا دیتا تھا۔

انھیں دنوں ہمارے اسکول میں ایک دن باقاعدہ اسٹرائک ہوئی۔ بڑی بڑی عمر کے لڑکے کہیں سے آ گئے۔ انھوں نے تمام لڑکوں کو باہر نکالا۔ اسکول کے پھاٹک پر پکیٹنگ کی اور پھر ایک جلوس نکالا جو امین الدولہ پارک کے آس پاس چکر لگاتا رہا۔ اس جلوس میں انگریزوں کے خلاف اور خصوصیت کے ساتھ سائمن کمیشن کے خلاف نعرے لگتے رہے۔ میں بھی اپنے بعض ساتھیوں کے ساتھ جلوس میں

شریک رہا۔ جلوس کئی گھنٹے امین آباد کی مختلف سڑکوں پر چکر لگاتا رہا اور پھر امین الدولہ پارک میں جلسے کی صورت میں تبدیل ہو گیا۔ پھر دھواں دھار تقریریں ہوئیں لیکن کسی نے کوئی مزاحمت نہیں کی۔ پولیس کھڑی تماشا دیکھتی رہی۔

یہ پہلا سیاسی تجربہ تھا جو مجھے چھوٹی سی عمر میں ہوا اور اس کے نقوش زندگی بھر میرے دل و دماغ پر ثبت رہے اور آج بھی ثبت ہیں۔ اس تجربے نے مجھے حزب مخالف یعنی اپوزیشن کا انسان بنا دیا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ میں اسی وقت سے اپوزیشن کا آدمی ہوا، جو حکومت آتی ہے اس سے مجھے اختلاف ہو جاتا ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ میں شروع ہی سے بنیادی طور پر ایک آئیڈیاسٹ ہوں۔ حکومت کے افراد پر برسر اقتدار آنے کے بعد وہ جو ایک نشہ سا چھا جاتا ہے اور اس کے نتیجے میں یہ لوگ جس طرح انسانی اقدار کو مجروح کرنے پر تل جاتے ہیں، جس طرح آزادی کا گلا گھونٹ دیتے ہیں، جس طرح غلط کو صحیح اور صحیح کو غلط بنا کر پیش کرتے ہیں، جس طرح اپنے آپ کو برسر اقتدار رکھنے کے لیے لوگوں کو جیلوں میں ٹھونستے ہیں یا دوسری قسم کی اذیتیں پہنچاتے ہیں، اس سے میں کبھی بھی مطابقت اور مناسبت پیدا نہ کر سکا۔

میں نے شروع ہی سے برعظیم کی سیاست کا نہایت ہنگامہ خیز دور دیکھا۔ میں نے ابھی ہوش سنبھالا ہی تھا کہ خلافت کی آوازیں میرے کانوں میں آنے لگیں۔ پھر سائمن کمیشن پر احتجاج ہونے لگا۔ نمک کی تحریک میرے سامنے شروع ہوئی۔ دیکھا کہ چھوٹی چھوٹی گاڑیوں میں بھرے بازاروں میں لوگ نمک بنا رہے ہیں۔ پھر دیکھا کہ عورتیں اور مرد نہ صرف گھروں میں چرخہ کات رہے ہیں اور سوت بنا رہے ہیں بلکہ سڑکوں اور بازاروں تکلی اور روئی لیے پھر رہے ہیں اور جہاں موقع ملتا ہے، سوت کاتنے لگتے ہیں اور یہ مصرعہ پڑھتے جاتے ہیں ؎

لنکا شائر سوت کے گولوں سے اڑوا دیا گاندھی بابا نے

یہ کھادی اور سودیشی کی تحریک تھی جس کا مقصد انگریزوں کی صنعت و حرفت کو ہندوستان سے

دیس نکالا دینا تھا۔ اس کے ساتھ ہی مکمل آزادی کے خیالات عام ہوئے اور انقلاب زندہ باد اور انگریز سامراج مردہ باد کے نعرے لگنے لگے۔

یہ احتجاج کی سیاست تھی جس کا مقصد انگریزوں کی غلامی کی زنجیروں کو توڑنا اور اپنے آپ کو آزادی کی دیوی سے ہم کنار کرنا تھا۔ اس وقت ہندوستان میں رہنے والے تمام فرقے ان نعروں پر متفق تھے۔

میرے شعور نے اس ماحول میں آنکھ کھولی اور بچپن ہی سے میرے مزاج میں ایک انقلابی رنگ و آہنگ پیدا ہو گیا۔ میرے دل میں ان خیالات کی لہریں اٹھنے لگیں کہ ہندوستان پر انگریز کیوں مسلط ہیں؟ انھیں سات سمندر پار سے یہاں آ کر حکومت کرنے کا کیا حق ہے؟ حکومت تو عوام کی ہونی چاہیے اور حکومت ایسی ہو جو نظامِ اقدار میں ہمواری پیدا کرے، جو امیروں اور غریبوں میں کوئی تفریق باقی نہ رکھے، جو مساوات کی قائل ہو، جو دولت کی تقسیم صحیح طور پر کر سکے، جس کے نتیجے میں ملک میں خوش حالی کا دور دورہ ہو اور اقوامِ عالم میں ہماری قوم اور ہمارا ملک اپنی صحیح جگہ بنا سکے۔

ادھر تو یہ خیالات پیدا ہو رہے تھے، اُدھر انگریزی حکومت عجیب عجیب تماشے کر رہی تھی۔ جب کبھی نیا گورنر آتا تھا تو تمام اسکول کے بچوں کو اس سڑک پر لے جا کر کھڑا کر دیا جاتا تھا جدھر سے گورنر صاحب کی سواری گزرتی تھی۔ خاصا مضحکہ خیز منظر ہوتا تھا۔

ایک دفعہ مجھے بھی اس منظر کو دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ غالباً سر میلکم ہیلی اس زمانے میں یو پی کے گورنر ہو کر آئے تھے۔ ریلوے اسٹیشن سے ان کی سواری گورنر ہاؤس تک جانے والی تھی، اس لیے اوپر سے یہ ہدایات جاری کی گئیں کہ اسکولوں کے تمام بچے ایسٹ روڈ پر پہنچیں، گورنر صاحب کا دیدار کریں اور ان کی سواری کو دیکھ کر تالیاں بجائیں جس سے یہ معلوم ہو کہ ان کا پُرتپاک خیر مقدم کیا جا رہا ہے۔

حکم حاکم تھا اس لیے ہمارے اسکول کے استاد اور بچے بھی قطار اندر قطار ایسٹ روڈ لے جائے گئے اور وہاں فٹ پاتھ پر کھڑے کر دیے گئے۔ گورنر صاحب کی سواری گزر گئی تو سب بچوں نے تالیاں

بجائیں مگر میں تالیاں نہ بجا سکا اور چپ چاپ کھڑا ہوا اس غیر دلچسپ اور مضحکہ خیز منظر کو دیکھتا رہا۔

طبیعت بدمزہ ہو گئی۔ وہ تو کہیے آس پاس کے فلیٹوں سے چند خوبصورت چہروں نے دعوتِ نظارہ دے کر دلچسپی کا کچھ سامان پیدا کیا ورنہ تو اس منظر نے سوہانِ روح بن جانے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی تھی۔

ایبٹ آباد اسکول میں ہر سال مارچ، اپریل کے مہینے میں سالانہ تقسیم انعامات کا جلسہ ہوتا تھا۔ اس موقع پر چھوٹا موٹا ڈراما بھی پیش کیا جاتا تھا۔ ڈراما کیا تھا، اسکول کے کسی مسئلے کے بارے میں دو چار افراد کے درمیان مکالمہ سا ہوتا تھا جس میں ڈرامائی کیفیت پیدا کر دی جاتی تھی۔ یہ مجھے بہت اچھا لگتا تھا، اور اس میں شبہ نہیں کہ ڈراما دیکھنے کا چسکا مجھے اس مکالمے کو دیکھ کر لگا جو زندگی بھر برقرار رہا۔ علامہ اقبالؒ کی نظمیں بھی اس موقع پر بچوں سے پڑھوائی جاتی تھیں اور مجھے بہت اچھی لگتی تھیں۔ ہم سب مل کر گاتے تھے ؎

لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری   زندگی شمع کی صورت ہو خدایا میری

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا   ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا

نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو   تمہاری داستاں تک بھی نہ ہو گی داستانوں میں

سوائے اقبالؒ کے اس موقع پر کسی اور شاعر کا کلام نہیں گایا جاتا تھا۔ اس طرح مجھے علامہ اقبالؒ کے کلام سے دلچسپی پیدا ہوئی اور میں نے "بانگِ درا" کی کئی نظمیں زبانی یاد کر لیں۔ ان کو میں تنہائی میں ترنم سے پڑھتا تھا اور محظوظ ہوتا تھا ان سے میری روح بالیدہ ہو جاتی تھی۔

ہمارے ڈرل ماسٹر صاحب اس سالانہ جلسے کے موقع پر قواعد پریڈ کا اہتمام بھی کرتے تھے۔ جھنڈیوں کی بڑی ہی دلچسپ پریڈ ہوتی تھی۔ ڈرل ماسٹر صاحب پریڈ کے آخر میں لڑکوں کو قطاروں میں جمع کر کے زور زور سے قہقہے لگانے کے لیے کہتے تھے اور ہم لوگ بلکہ پورا اسکول اور اس کے در و دیوار قہقہوں سے گونج اٹھتے تھے۔ ڈرل ماسٹر صاحب کہتے تھے کہ قہقہے لگانے سے تمہیں خوشی ہنسنے

کی عادت پڑے گی پھیپھڑے مضبوط ہوں گے اور سینہ چوڑا ہوگا۔

یہ تو مجھے معلوم نہیں کہ ہمارے پھیپھڑے مضبوط اور ہمارے سینے چوڑے ہوئے یا نہیں البتہ ایک بات یقینی ہے اور وہ یہ کہ ہمیں ہنسنا اور قہقہے لگانا آگیا جو فضا کو خوشگوار بنانے اور نساتوں کو خوش وخرم رکھنے میں اپنا جواب نہیں رکھتا اور جس نے ہماری دنیا ہی بدل دی۔

اور اب امین آباد اسکول کے زمانے کا ایک ناخوش گوار واقعہ جس کا اثر کبھی زائل نہیں ہوا۔ اور اس ناخوش گوار واقعے کی وجہ سے میں نے امین آباد اسکول کو خیرباد کہا اور گھر کے قریب گورنمنٹ جوبلی کالج میں داخلہ لے لیا۔ ورنہ ویسے مجھے اس اسکول سے کوئی شکایت نہیں تھی۔

ہوا یوں کہ میں چوتھے یا پانچویں درجے کا طالب علم تھا کہ تحریری طور پر پہلا سالانہ امتحان مجھے دینا پڑا۔ اس سے قبل زبانی امتحان لے کر ترقی دے دی جاتی تھی۔ اب جب تحریری امتحان ہوا تو امتحان کی غرض سے خاص انداز میں سیٹیں لگائی گئیں، پرچے بنائے گئے، ڈیٹ شیٹ بنائی گئی۔ اس کے مطابق میں اپنے پورے کلاس کے ساتھ امتحان دینے کے لیے کمرے میں پہنچا۔ گرمیوں کا زمانہ تھا۔ سات بجے گھنٹی بجی سب لڑکے اپنی اپنی جگہ بیٹھ گئے۔ سادے کاغذ تقسیم کیے گئے۔ اس سادے کاغذ میں ایک خانہ تاریخ کا بھی تھا۔

مجھے تاریخ کا علم نہیں تھا اس لیے میں نے اپنے کلاس فیلو نونیت لال سے پوچھا کہ "یار آج کون سی تاریخ ہے؟"

اس نے کہا۔۔۔"۱ مارچ"

میں اس سے پوچھ کر اپنے کاغذ پر تاریخ لکھنے لگا کہ اتنی دیر میں داہنے گال پر ایک زور کا طمانچہ پڑا۔

میں بھنّا گیا۔ آنکھوں کے نیچے اندھیرا آگیا۔

لیکن اپنے کو سنبھالنے کی کوشش کی اور دیکھا تو سامنے ماسٹر پرتھی ناتھ کو کھڑا ہوا پایا جو طمانچہ مار کر خاموش کھڑا ہوا تھا۔

میں بھی چپ رہا، کچھ نہ کہا اور وہاں سے اُٹھ کر باہر نکل آیا امتحان نہیں دیا اور اس کی تفصیل اپنے گھر جا کر سب کو سنائی۔ سب نے افسوس کیا اس لیے کہ پرتھی ناتھ نے مجھے خواہ مخواہ مارا تھا میری کوئی غلطی نہیں تھی۔ والد صاحب نے اس کو بہت محسوس کیا۔ دوسرے دن وہ اسکول گئے۔ ہیڈ ماسٹر صاحب سے بات کی۔ ماسٹر پرتھی ناتھ کی پیشی ہوئی۔ ہیڈ ماسٹر نے اس کو آڑے ہاتھوں لیا، لیکن اب کیا ہو سکتا تھا تیر کمان سے نکل چکا تھا اور ہم گھائل ہو چکے تھے۔

اسی دن سے میرا دل امین آباد اسکول سے اچاٹ ہو گیا اور غیر شعوری طور پر امتحان کو میں ایک عذاب تصور کرنے لگا۔ چنانچہ اس واقعہ کے بعد اگرچہ ہر سال پندرہ برس تک میں امتحانات دیتا رہا، لیکن ہر امتحان سے چند روز قبل ہی میں بیشتر بیمار ہو جاتا تھا اور ہمیشہ تیز بخار میں امتحان دیتا تھا۔ پرتھی ناتھ کی اس حرکت نے امتحان کی دہشت میرے دل میں کچھ اس طرح بٹھا دی تھی کہ امتحان کے قریب مجھ کو بخار آ کر گھیر لیتا تھا۔

اس ناخوش گوار واقعے سے قطع نظر امین آباد اسکول میں میرے دو تین سال اچھے گزرے۔ اچھے استاد اور اچھے ساتھی ملے۔ زندگی کے ساتھ دلچسپی پیدا ہوئی۔ معاملات کو سمجھنے کا شعور پیدا ہوا۔ سیاست سے آشنا ہونے کے مواقع ملے۔ ادب، شاعری اور فن کی اہمیت واضح ہوئی اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ محنت زندگی بسر کرنے اور ناساز گار حالات میں بھی زندہ رہنے، زیست کرنے اور مسکرانے ہنسنے اور قہقہے لگانے کے خیالات زندگی کا جز بن گئے اور ان تمام باتوں نے مل کر میرے ذہن کے دریچوں کو کھولا اور مجھے ان دریچوں میں سے چھن چھن کر آنے والی تازہ ہوا اور تیز روشنی سے آشنا ہونے کا حسین و دل آویز تجربہ ہوا۔

چھٹا باب

گورنمنٹ جوبلی کالج

امین آباد اسکول کو خیر باد کہہ کر میں جوبلی کالج کے ساتویں درجے میں داخل ہو گیا۔ جوبلی کالج ہمارے محلے ڈیوڑھی آغا میر ہی میں واقع تھا۔ گھر کے بہت قریب تھا۔ ہمارے مکان کی تیسری منزل سے اس کی پر شکوہ عمارتیں اور دور دور تک پھیلے ہوئے سبزہ زار صاف نظر آتے تھے۔ صرف مکانوں کی ایک قطار اور آغا میر ڈیوڑھی کی خاص سڑک درمیان میں حائل تھی۔ گھر سے کالج کا راستہ چار پانچ منٹ سے زیادہ نہیں تھا۔

کہنے کو تو یہ کالج تھا لیکن اس میں اسکول کی کلاسیں بھی تھیں۔ اسکول کی کلاسوں میں داخلہ مشکل سے ہوتا تھا کیونکہ نشستیں محدود تھیں لیکن پرنسپل صاحب نے میرے وپر خاص عنایت کی۔ شاید اس لیے کہ ہمارا گھر کالج سے قریب تھا اور وہ والد صاحب کی شخصیت سے بہت متاثر تھے۔ طالب علمی میں برا نہیں تھا اس لیے انھوں نے اپنے خصوصی اختیارات سے کام لے کر مجھے اپنے کالج میں داخل کر لیا اور جب تک میں اس کالج میں رہا مجھ پر ہمیشہ شفقت فرمائی۔

مجھے اور میرے والدین کو اطمینان یہ ہوا کہ آئندہ چھ سات سال تک مجھے کسی اور اسکول یا کالج میں نہیں جانا پڑے گا — انٹرمیڈیٹ تک اسی کالج میں پڑھوں گا ور اس کے بعد یونیورسٹی چلا جاؤں گا۔

جوبلی کالج کے پھاٹک میں داخل ہوتے ہی بائیں جانب سیڑھیاں تھیں اور کوئی دس فٹ

کی اونچائی پر پرنسپل کا کمرہ تھا اور اس کے برابر کے دو تین کمروں میں ان کے دفاتر تھے۔ پرنسپل کے کمرے کے سامنے آغا میر کے امام باڑے کی وہ وسیع اور پرشکوہ عمارت تھی جس میں اب اسکول کی کلاسیں ہوتی تھیں۔ اس عمارت کے سامنے بہت بڑا میدان تھا، جس کو فٹ بال اور ہاکی کی گراؤنڈ کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔ اس گراؤنڈ کے آمنے سامنے دو بلاک نئے بنے تھے جس میں کالج کی کلاسیں ہوتی تھیں اور پروفیسر پڑھاتے یا بیٹھتے تھے۔ گراؤنڈ کے دوسری طرف ٹریننگ کالج تھا جہاں طالب علم اساتذہ کو سی ٹی کی ڈگری کے لیے تربیت دی جاتی تھی۔

میں جب پہلے دن داخلے کے لیے پرنسپل صاحب کے کمرے میں داخل ہوا تو کچھ سہما ہوا تھا۔ والد صاحب ساتھ تھے پھر بھی مجھے ڈر سا لگ رہا تھا لیکن جب پرنسپل صاحب نے مجھے اپنے پاس بٹھایا، بڑے اچھی اچھی باتیں کیں، اور شفقت سے پیش آئے تو دل سے سارا ڈر نکل گیا۔

کہنے لگے "میں آپ کو داخل کر رہا ہوں۔ آپ لوگوں کا اس کالج پر حق ہے۔ آپ خاندانی لوگ ہیں۔ یہ کالج آپ ہی لوگوں کے لیے ہے خوب دل لگا کر پڑھنا اور اچھے نمبروں سے پاس ہونا۔ کبھی کوئی دقت ہو تو مجھے بتانا۔ میرے دفتر اور گھر کے دروازے تمہارے لیے ہر وقت کھلے ہوئے ہیں۔

پرنسپل اس وقت ایس کے گھوش صاحب تھے۔ بنگالی تھے لیکن اردو اعتماد کے ساتھ بولتے تھے۔ طالب علموں سے انہیں بڑی محبت تھی۔ ان کا بہت خیال رکھتے تھے۔ ہر طالب علم ان سے بغیر کسی روک ٹوک کے مل سکتا تھا۔ ان کے مزاج میں بڑی شفقت تھی لیکن سخت بھی بہت تھے۔ تیز کی آنکھ سے دیکھتے تھے۔ لمبے چوڑے، بھرے بھرے جسم والے صحت مند انسان تھے اور بڑی ہی پر وقار شخصیت کے مالک تھے۔ پتلون اور بند کالر کا کوٹ پہنتے تھے۔ اس لباس میں کبھی فرق نہیں آیا۔ میں نے انہیں کبھی ٹائی لگائے ہوئے نہیں دیکھا۔ کالر ہمیشہ بند رہتا تھا۔ ان کی پرنسپلی کا زمانہ جوبلی کالج کا سنہری دور تھا۔ ہر شخص خوش تھا اور ہر چیز میں باقاعدگی تھی۔ آخر میں وہ یو پی کے ڈی پی آئی ہو گئے تھے۔

گھوش صاحب کی ہدایت کے مطابق ۹ بجے جب کالج کی گھنٹی بجتی تھی تو تمام کلاسوں کے لڑکے مع اپنے اساتذہ کے کالج کی پرانی عمارت کے وسیع و عریض چبوترے پر اسمبلی کیلیے

جمع ہو جاتے تھے، یہاں حاضری ہوتی تھی۔ کچھ ضروری باتیں بیان کی جاتی تھیں۔ ساڑھے نو بجے تک تمام لڑکے اور استاد دھوپ میں کھڑے رہتے تھے۔ تیز دھوپ ہوتی تھی تو بعض لڑکے بیہوش ہو کر گر بھی جاتے تھے۔ یہ آدھا گھنٹہ کافی تکلیف میں گزرتا تھا۔ بیشتر استاد اور طلبہ اس اسمبلی کو اچھا نہیں سمجھتے تھے۔ میں خود بھی یہ سوچتا تھا کہ اس کی کیا ضرورت ہے: وقت بھی ضائع ہوتا ہے اور تکلیف بھی ہوتی ہے۔

ایک دن میں پرنسپل صاحب کے کمرے میں گیا اور ان سے اپنے ان خیالات کا اظہار کیا اور یہ بھی کہا کہ استادوں کا تو مجھے علم نہیں لیکن بیشتر طالب علم اسی طرح سوچتے ہیں۔

گھوش صاحب کہنے لگے "میں صرف اس وجہ سے تم لوگوں کو آدھ گھنٹے تک دھوپ میں کھڑا رکھنا چاہتا ہوں تاکہ تمھیں دھوپ کھانے اور اس میں کام کرنے کی عادت ہو۔ ہو سکتا ہے تم لوگوں کو زندگی میں ایسی ملازمت ملے جس میں سارا دن دھوپ میں کام کرنا پڑے۔ اس وقت تمھیں اس کی اہمیت کا اندازہ ہوگا۔ میری خواہش ہے کہ تم لوگ سخت زندگی گزارنے کے عادی ہو۔ تم دیکھتے ہو کہ تمھارے ساتھ میں بھی دھوپ میں کھڑا رہتا ہوں"

مجھ پر ان کی ان باتوں کا بہت اثر ہوا۔ بات میری سمجھ میں آگئی اور میں نے اُن کی ان باتوں سے بہت کچھ سیکھا۔

اب میں جوبلی کالج کی ساتویں جماعت کا باقاعدہ طالب علم تھا۔ ہمارے کلاس ٹیچر ایچ۔ ڈی گھوش صاحب (ہری داس گھوش صاحب) تھے۔ بنگالی تھے لیکن ایک زمانے سے لکھنؤ میں رہتے تھے اس لیے فصیح اردو میں باتیں کرتے تھے۔ چہرے پر فرنچ کٹ داڑھی تھی۔ بنگالی انداز کی دھوتی باندھتے تھے اور اس پر ہر موسم میں بند گلے کا لمبا کوٹ پہنتے تھے۔ بذلہ سنج آدمی تھے۔ ظرافت ان کے مزاج میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ ہمیں انگریزی اور حساب پڑھاتے تھے۔ کالج کے کھیلوں کا انتظام بھی ان کے سپرد تھا اس لیے ان کے آس پاس بڑے بڑے لڑکے بھی جمع رہتے تھے اور اس کی وجہ سے ان کے کمرے میں خاصی رونق رہتی تھی۔

فارسی ہمیں مولانا ثاقب حسین اور اردو مولانا اختر علی تلہری پڑھاتے تھے۔ ثاقب حسین صاحب امروہے کے رہنے والے تھے لیکن لکھنؤ میں آکر آباد ہو گئے تھے لمبی شیروانی اور بڑے پائچوں کا پاجامہ پہنتے تھے۔ روزانہ فارسی کا ایک گھنٹہ ہوتا تھا۔ اس میں وہ ہمیں سعدی کی گلستاں اور بوستاں پڑھاتے تھے اور دورانِ تدریس بڑی دلچسپ باتیں کرتے تھے۔ لکھنوی تہذیب کے شیدائی تھے اور کسی نہ کسی طرح پڑھاتے ہوئے لکھنوی تہذیب کی تباہی، نوابانِ اودھ کی بربادی اور لکھنوی مسلمانوں کی زبوں حالی کا ذکر ضرور کرتے تھے۔ ثاقب صاحب ہمیشہ دیر میں کالج آتے تھے۔ کلاس کے لڑکے کوئی پندرہ بیس منٹ تک ان کا انتظار کرتے رہتے تھے۔ پھر مولانا آتے تھے اور آتے ہی اپنی اہلیہ کی علالت، بچوں کی پریشانی، سواری کی دقتوں کا ذکر کرتے تھے۔ ہم چپ چاپ سنتے تھے۔ ان کی کلاس میں بہت مہذب اور شائستہ ہو کر بیٹھنا پڑتا تھا۔ پڑھاتے بہت اچھا تھے۔ بڑے عالم فاضل شخص تھے اور طالب علموں پر ان کی شفقت بے پایاں تھی۔

مولانا اختر علی تلہری بھی بہت بڑے عالم تھے۔ تھے تو عربی کے استاد لیکن ہماری اردو کی کلاس بھی انھیں دے دی گئی تھی۔ مولانا شاہجہاں پور کے قریب تلہر کے قصبے کے رہنے والے تھے۔ لیکن اب انھوں نے لکھنؤ ہی کو اپنا وطن بنا لیا تھا۔ لکھنؤ میں باہر سے آنے کا راستہ تو تھا مگر باہر جانے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ جو آتا تھا انھیں کا ہو کر رہ جاتا تھا۔ مانے ہوئے ادیب تھے ان کے علمی اور ادبی مضامین اردو کے اہم رسالوں میں شائع ہوتے تھے۔ طبیعت میں بے چینی سی تھی۔ باتیں بھی سیمابی انداز میں کرتے تھے۔ پڑھاتے ہوئے بھی اس بے چینی کا اظہار کرتے تھے۔ چلتے تھے تو معلوم ہوتا تھا کہ کچھ پریشان سے ہیں اور اپنے آپ سے باتیں کرتے جاتے تھے۔ مزاج فلسفیانہ تھا۔ اس لیے پڑھاتے ہوئے نہ جانے کہاں کہاں پہنچ جاتے تھے ان کے ساتھ اڑنا اور ان کی گہری باتوں کا سمجھنا چھوٹی جماعت کے طالب علموں کے لیے مشکل ہوتا تھا لیکن زبان و بیان کے اسرار و رموز سے اچھی طرح آشنا کر دیتے تھے۔ وضع داری ان کی گھٹی میں پڑی تھی۔ علی گڑھ کا تنگ موری کا پاجامہ پہنتے تھے۔ اس پر شیروانی اور ذرا اونچی دیوار کی ٹوپی۔ شیروانی کے بٹن کالر تک بند رہتے تھے اور یا وحق

کی ٹوپی اتارتے نہیں تھے۔

ایک دن میں بغیر شیروانی پہنے اسکول چلا گیا۔ گرمی بہت زیادہ تھی اس لیے سوچا صرف کرتا پہن کر اسکول چلا جاؤں ذرا آرام ملے گا۔ مولانا نے مجھے اس حالت میں دیکھ لیا۔ آدمی بھیج کر مجھے بلایا۔ پاس بٹھایا اور فرمایا کہ "کیا آپ گھر سے نکال دیئے گئے ہیں؟"

میں نے کہا "مولانا! آج گرمی زیادہ تھی اس لیے میں نے شیروانی نہیں پہنی۔ صرف کرتا پاجامہ پہن کر اسکول آگیا۔"

مولانا نے فرمایا "اسی لیے تو میں نے کہا کہ آپ گھر سے نکال دیئے گئے ہیں۔ شرفا کا یہ لباس نہیں ہے۔"

مولانا نے فرمایا "فوراً گھر جایئے اور شیروانی پہن کر آیئے۔"

میں فوراً گھر گیا۔ شیروانی پہنی اور واپس کالج آیا۔ مولانا کے سامنے سے جان کر گزرا تاکہ وہ دیکھ لیں۔ انھوں نے اپنی نظروں سے اطمینان کا اظہار کیا۔ مجھے بھی سکون ملا۔ اور پھر اس کے بعد میں کبھی صرف کرتا پاجامہ پہن کر کالج نہیں گیا۔

ساتویں درجے سے لے کر ہائی اسکول کے دسویں درجے تک میرے ہم جماعت تو کئی تھے جن کے ساتھ میں وقت گزارتا تھا ان میں ظہیر حیدر، کمال بیگ، صادق حسین، احمد علی، ارشاد حسین خاں، نورالحسن اور آغا حسن عابدی سے میری بہت بے تکلفی تھی۔ صحیح معنوں میں یہ میرے دوست تھے۔

ظہیر حیدر "اودھ پنچ" کے دوسرے دور کے ایڈیٹر اور مشہور انشا پرداز ممتاز حسین صاحب کے بیٹے تھے۔ نخاس میں رہتے تھے۔ بچپن میں ان کے والد کا انتقال ہو گیا اور بہت چھوٹی عمر میں انھوں نے "اودھ پنچ" کا بوجھ اپنے کاندھوں پر اٹھایا۔ بڑا خاندان تھا اس کا بوجھ بھی ظہیر پر آپڑا۔ پریشان رہنے لگے۔ بیمار ہوئے اور چھوٹی عمر ہی میں اللہ کو پیارے ہو گئے۔ اپنے والد ممتاز حسین صاحب کے دور کے اودھ پنچ کی ایک فائل انھوں نے مجھے دی تھی جو آج تک اُن کی یادگار کے طور پر میرے پاس محفوظ ہے۔

احمد علی بھی نوجوانی میں مر گئے۔ بڑی محبت والے آدمی تھے گھنٹوں مجھ سے باتیں کرتے تھے۔ دق کے مریض تھے اس لیے زیادہ دن زندہ نہ رہ سکے۔ ارشاد حسین خاں نواب حامد حسین خاں اور نواب سلطنت بیگم کے بیٹے تھے۔ ان کا نہایت شاندار مکان جس کو محل کہنا چاہیے سیتی ریلوے اسٹیشن کے سامنے سلطنت منزل کے نام سے مشہور تھا۔ اکثر میں ان کے ہاں جاتا تھا افسوس ہے کہ وہ بھی نوعمری میں ہی انتقال کر گئے۔ کمال بیگ بھی میرے بڑے مخلص دوست تھے۔ ان کے والد اور بھائی چمڑے کا کاروبار کرتے تھے ... کمال بیگ کبھی میرے لیے مگرمچھ کے چمڑے کا سوٹ کیس بنواتے کبھی اس قیمتی چمڑے کے جوتے تیار کرواتے اور کبھی نہایت مضبوط اور خوبصورت کینوس کا ہولڈال بنواتے۔ آج تک ان کی یہ یادگاریں میرے پاس محفوظ ہیں۔ پاکستان بننے کے کئی سال بعد لکھنؤ سے ہجرت کر کے کھوکھراپار کے راستے کراچی آئے اور وہیں مختلف ملازمتیں کر کے گزر بسر کرتے رہے۔ چند سال ہوئے وہیں ان کا انتقال ہوا۔ صادق حسین ریلوے میں ملازم ہو گئے۔ قیام پاکستان کے بعد کراچی آئے اور اب وہیں رہتے ہیں۔

سید نورالحسن اودھ چیف کورٹ کے چیف جسٹس سر سید وزیر حسن کے نواسے یوپی سکریٹریٹ کے سکریٹری سید عبدالحسن صاحب کے بیٹے اور مشہور ادیب سید سجاد ظہیر کے بھانجے تھے۔ بھرا بھرا بھاری بھرکم جسم، سرخ سفید رنگ، ٹھگنا سا قد، نیکر اور قمیص میں ملبوس۔ یہ تھے نورالحسن جو کلاس میں کئی سال تک میرے پاس بیٹھتے رہے۔ پڑھنے لکھنے میں تیز تھے۔ باتیں کم کرتے تھے لیکن شائستگی اور تہذیب، خلوص اور محبت کے عناصر ان میں کوٹ کوٹ کر بھرے تھے۔ ہائی اسکول کا امتحان انھوں نے میرے ساتھ دیا۔ اس کے بعد وہ الہ آباد چلے گئے۔ ایم اے تک الہ آباد یونیورسٹی میں رہے۔ ہر امتحان اچھے نمبروں سے پاس کیا۔ ایم اے کرنے کے بعد وہ انگلستان بھیج دیے گئے۔

نیو کالج آکسفورڈ میں داخل ہوئے۔ وہاں سے کئی سال بعد تاریخ میں ڈی فل کر کے لکھنؤ واپس آئے اور لکھنؤ یونیورسٹی کے شعبۂ تاریخ میں لیکچرر ہو گئے۔ شادی ان کی نواب صاحب رام پور کی صاحبزادی سے ہوئی۔ علی گڑھ یونیورسٹی میں کئی سال تک تاریخ کے پروفیسر رہے اور پھر مسز اندرا گاندھی کی پچھلی حکومت

میں وزیرِ تعلیم کا عہدہ سنبھالا اور کئی سال تک اس حیثیت سے کام کرتے رہے۔ آج کل ہندوستان کے ہسٹاریکل کمیشن (تاریخ کمیشن) کے چیرمین ہیں، اور مغربی بنگال کے گورنر، ان کا زیادہ وقت علمی کاموں میں گزرتا ہے۔ ان کا مطالعہ بہت وسیع ہے۔ پڑھنا لکھنا ان کا اوڑھنا بچھونا ہے۔ دو تین سال ہوئے امرتسر کسی کانفرنس میں شرکت کے لیے آئے تھے، وہاں سے صرف چند گھنٹے کے لیے لاہور آئے اور سیدھے اورینٹل کالج میں میرے پاس پہنچے۔ تیس بتیس سال بعد ملاقات ہوئی۔ حال احوال پوچھا، دیر تک باتیں کرتے رہے۔ پھر پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں میرے ساتھ گئے اور وہ جو چند گھنٹے اُن کے پاس تھے وہ اُنھوں نے نادر و نایاب قلمی نسخوں کو دیکھنے میں گزار دیئے۔ تین بجے کے بعد میں نے انھیں امرتسر رخصت کیا۔

آغا حسن عابدی جو کئی سال تک جوبلی کالج میں میرے کلاس فیلو رہے میرے گھر کے قریب ہی رہتے تھے اس لیے ان سے دوستی کچھ زیادہ ہی تھی۔ کلاسوں میں تو ایک ساتھ بیٹھتے ہی تھے، گھر پر بھی آنا جانا تھا۔ اکثر وہ میرے گھر آتے اور میں بھی ان کے گھر جاتا تھا۔ ڈیوڑھی آغا میر سے متصل پاٹے نالے پر ان کے دو مکان تھے۔ ایک میں وہ اور ان کے خاندان کے افراد رہتے تھے۔ دوسرا بہت کشادہ مردانہ مکان تھا جو مہمان خانے کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ آغا حسن کے والد صاحب ریاست محمود آباد میں تحصیلدار تھے۔ اس لیے قیام تو اُن کا ضلع سیتاپور کی تحصیل بھنڈیا میں رہتا تھا لیکن وہ لکھنؤ آتے رہتے تھے اور ہم لوگوں کے ساتھ بڑی شفقت سے پیش آتے تھے۔

میں جب جوبلی کالج میں داخل ہوا تو سب سے پہلے میری ملاقات آغا حسن سے ہوئی۔ ہم ساتھ ساتھ بیٹھتے، ساتھ ساتھ پڑھتے، ساتھ ساتھ گھر واپس آتے، ساتھ ساتھ گھومنے جاتے، ساتھ ساتھ سینما دیکھتے، ساتھ ساتھ تفریح کرتے، گویا آغا حسن کا میرا چوبیس گھنٹے کا ساتھ رہتا تھا۔

آغا حسن اس زمانے میں ہر اعتبار سے بالکل بچہ تھا، سیدھا سادا، بھولا بھالا، حد درجہ جذباتی، ٹوٹ کر محبت کرنے والا، مخلص، دوستی کو محبت میں تبدیل کرنے والا، دوستوں پر جان چھڑکنے والا۔ دراصل اس کی دنیا بہت محدود تھی۔ خاندان میں وہ اکیلا بیٹا تھا، بہنیں اس کی کئی تھیں لیکن بھائی

کوئی اور نہیں تھا اس لیے وہ تنہا تھا اور اس کی تنہائی نے اس کی زندگی میں عجیب عجیب گل کھلائے تھے۔ وہ مجھ سے بہت قریب رہا۔ اس لیے مجھے اس کی زندگی کے ہر پہلو کو بہت قریب سے دیکھنے کے مواقع ملے۔ شاید ہی میں نے اپنے کسی ساتھی کو اتنے قریب سے دیکھا ہو جتنا کہ آغا حسن کو دیکھا ہے۔ اسکول کے زمانے سے لے کر یونیورسٹی اور اس کے بعد ملازمت حاصل کرنے تک وہ مجھ سے اتنا قریب رہا کہ مجھ سے پوچھے اور مشورہ کیے بغیر کوئی کام نہیں کرتا تھا۔

اور آج میں فخر کے ساتھ یہ بات کہہ سکتا کہ آغا حسن کی زندگی ایک خاص راستے پر ڈالنے میں سب سے بڑا ہاتھ میرا ہے۔

آغا حسن اسکول کے زمانے میں بڑے ہی جذب و کشش کا مالک تھا۔ جو بھی اس سے ملتا اس کا گرویدہ ہو جاتا تھا۔ میں بھی اس زمانے میں اس کے گرویدہ ہو جانے والوں میں سے ایک تھا۔ اس کی صورت شکل میں کوئی خاص بات نہیں تھی۔ سانولا رنگ، کتابی چہرہ، تیکھے نقوش اور اس کے گال پر جو "ڈمپل" پڑتا تھا وہ قیامت سے کم نہ تھا۔ میں اس کو دیکھ کر ہمیشہ میر صاحب کا یہ شعر پڑھا کرتا تھا:

رخسار اس کے ہائے رے جب دیکھتے ہیں ہم جی چاہتا ہے آنکھوں کو ان میں گڑو دیئے

یہ سب باتیں اپنی جگہ لیکن آغا حسن کو خوش شکل نہیں کہا جا سکتا۔ اس کے باوجود اس میں دل موہ لینے والی ایک کیفیت ضرور تھی۔

جوبلی کالج کے زمانے میں آغا حسن صاف ستھرا لباس پہنتا تھا۔ بڑے پائنچوں کا خاص لکھنوی طرز کا پاجامہ، اس پر سفید تنزیب کا کرتا، اس پر لکھنوی وضع کی شیروانی اور سر پر خاص لکھنوی انداز کی دو پلی ٹوپی۔ اس وضع قطع سے یہ حضرت اپنے گھر سے چلتے تھے اور ڈیوڑھی آغا میر سے ہوتے ہوئے ہمارے گھر کے سامنے سے گزر کر جوبلی کالج پہنچتے تھے۔ پیچھے ایک بوڑھا ملازم ہوتا تھا جو ان کی کتابیں اور بستہ وغیرہ ہاتھوں میں لے کر ان کے ساتھ ساتھ چلتا تھا۔ اس ملازم کے انداز سے یہ بات واضح ہوتی تھی کہ وہ صرف سامان ہی اٹھانے کے لیے نہیں ہے آغا حسن کی حفاظت کرنا بھی اس کے فرائض میں داخل ہے۔ کسی نے آنکھ اٹھائی اور اس نے اس کی طرف اس طرح گھور کر دیکھا کہ بے چارہ وہیں دبک کر رہ گیا۔

آغا حسن اس اہتمام سے کالج پہنچتے تھے اور پھر دن بھر ہمارے ساتھ رہتے تھے۔ کھیل کود سے انہیں کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی، زیادہ وقت گھر پر گزارتے تھے اور شام کو اکثر میرے ہاں آتے تھے۔ اگر میں گھر پر نہ ملوں تو پھر ان کی عجیب کیفیت ہوتی تھی۔ پریشان ہو جاتے تھے اور اکثر کچھ اس طرح کی تحریریں چھوڑ جاتے تھے:

> "عبادت! میں کل شام تمہارے گھر جا کر ناامید واپس آیا۔ تمہارے بھائی سے کہہ آیا تھا کہ آج صبح تم مجھ سے ضرور مل لینا۔ مجھے بہت غصہ اور تکلیف ہے کہ تم کیوں نہیں آئے۔ روڈ نمبر حبیب اللہ اور شل، میں آج سے کل دوپہر تک۔ آ کر مل لو ورنہ خودکشی کروں گا۔"
>
> تمہارا آغا حسن

یہ ایک تحریر اتفاق سے میرے پاس آغا حسن کی دی ہوئی ایک کتاب میں محفوظ رہ گئی ہے ورنہ اس قسم کی تحریریں تو نہ جانے کتنی میری عدم موجودگی میں اس نے چھوڑیں لیکن افسوس کہ میں ان تمام تحریروں کو محفوظ نہ رکھ سکا۔ اگر یہ تحریریں محفوظ ہوتیں تو آغا حسن کی شخصیت کے چند نہایت ہی دلکش پہلو لوگوں کو دکھا سکتا اور اس طرح اس عجیب و غریب شخص کی نہایت ہی دلچسپ اور پہلودار شخصیت کے ان گنت روپ دنیا کے سامنے آتے، جو لٹریچر کا آدمی تھا لیکن جس نے بینکنگ کی دنیا میں ایک نہیں کئی انقلاب برپا کیے اور جس کی اہمیت کو بین الاقوامی سطح پر تسلیم کیا گیا۔

یہ کامیابی آغا حسن کے حصے میں اس لیے آئی کہ اس کے پاس بلند پروازی کی دولت بیش بہا ہے جو اسے خواب دیکھنے اور منصوبے بنانے کے لیے اکساتی ہے اور اس کی شخصیت میں ایک عجیب طرح کی کشش ہے کہ وہ جس کو چاہے اپنا گرویدہ بنا سکتا ہے اور جس سے جو کام چاہے کروا سکتا ہے۔ اس میں ملک و قوم، مذہب اور ملت کی کوئی تفریق نہیں۔ امریکی ہو یا انگریز، عرب ہو یا پاکستانی، وہ وہی کچھ کرے گا جو کچھ آغا حسن چاہے گا۔ یہی وجہ ہے کہ آج میکنا مارا تک اس کی غیر معمولی صلاحیتوں کا قائل ہے اور عربوں کی دولت کی کنجی اس کے ہاتھ میں ہے اور وہ اس کا

منتظم و منصرم ہے۔ بی۔ سی۔ سی۔ آئی کا قیام اس کا ایسا کارنامہ ہے جس کو بینکنگ کی تاریخ میں ہمیشہ سنہری حروف سے لکھا جائے گا۔

بات کہاں سے کہاں پہنچی۔ ہاں تو میں ذکر کر رہا تھا آغا حسن کے بچپن کے زمانے کا۔ بچپن میں ہم نہ صرف ایک ساتھ پڑھتے تھے بلکہ ہماری تفریح بھی مشترک تھی۔ اس زمانے میں خاموش فلموں کے بجائے بولنے والے فلم آنے لگے تھے۔ اس لیے فلم دیکھنا ہی سب سے بڑی تفریح تصور کیا جاتا تھا کسی اور قسم کی تفریح کی تو ہمارے اندر نہ ہمت تھی نہ سکت۔ اس لیے ہم اپنے والدین سے اجازت لے کر اکثر قیصر باغ کے الفنسٹن سینما جاتے تھے اور اکثر فلمیں ساڑھے چار آنے والے کلاس میں دیکھتے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ہمارے کالج کے انگریزی کے استاد مترا صاحب بھی ہمیشہ ساڑھے چار آنے والے درجے میں فلم دیکھنے جایا کرتے تھے۔ اکثر ان سے وہاں مڈبھیڑ ہو جاتی تھی، اس لیے اچھا نہیں لگتا تھا کہ استاد تو ساڑھے چار آنے والے کلاس میں فلم دیکھ رہا ہے اور ہم کسی بڑے کلاس میں۔ ویسے پیسے بھی ہمارے پاس زیادہ نہیں ہوتے تھے فلمیں بھی زیادہ دیکھتے تھے اس لیے خیال رہتا ہوتا تھا کہ اونچے درجے کے بجائے نیچے درجے میں ایک فلم کی جگہ کئی فلمیں دیکھ سکتے ہیں۔

آغا حسن اس زمانے میں جذباتی آدمی تھا کچھ اختلاجی کیفیت بھی اس میں تھی۔ فلم دیکھتے دیکھتے بعض اوقات زور زور سے دہاڑیں مار کر رونے لگتا تھا پھر میں اس کو گولی والی لیمن یا جنجر کی بوتل پلاتا تھا اس طرح تھوڑی دیر میں وہ تو ٹھیک ہو جاتا تھا لیکن اس کی یہ حالت دیکھ کر میری کیفیت عجیب ہو جاتی تھی۔ اس کا اس طرح رونا مجھ سے دیکھا نہیں جاتا تھا۔ میں اسے پیار کرتا تھا، دلاسا دیتا تھا اور بار بار پوچھتا تھا کہ کیسی طبیعت ہے؟

اور وہ کہتا تھا "ٹھیک ہوں یار! خدا جانے کیا ہو جاتا ہے مجھے!"

مہمان نوازی آغا حسن کی گھٹی میں پڑی تھی۔ اس کے والد اور دوسرے گھر والے بھی مہمان نوازی میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ میں جب بھی ان کے گھر جاتا چند منٹ میں طرح طرح کی کھانے پینے کی چیزوں کا ڈھیر لگا دیا جاتا۔ ایک دفعہ تو یہی مہمان نوازی مجھے اور میرے چند دوستوں کو محمود آباد

کی تحصیل بھنڈیا لے گئی جہاں آغا حسن کے والد تحصیل دار تھے۔ وہاں ہماری جو خاطر تواضع ہوئی اس کو میں کبھی بھلا نہیں سکتا۔ قسم قسم کے کھانے پکے۔ طرح طرح کے پھل، مٹھائیاں اور خدا جانے کن کن چیزوں سے ہماری تواضع کی گئی، پھر شکار کا پروگرام بنایا گیا۔ آس پاس کے دیہاتوں کی سیر کروائی گئی۔ کھیتوں، باغوں، میدانوں، سبزہ زاروں اور جھیلوں کا نظارہ کروایا گیا، اور اس طرح کوئی چار پانچ دن ہم لوگ آغا حسن اور ان کے والد کے مہمان رہ کر بھنڈیا سے لکھنؤ واپس آئے۔

آج بھی بھنڈیا کے سفر اور آغا حسن کی مہمان نوازی کی یاد میرے دل میں تازہ ہے اور اس کا خیال طبیعت کو باغ باغ کرتا ہے۔

آغا حسن ہائی اسکول تک کلاس میں میرے ساتھ رہے۔ ہائی اسکول پاس کرنے کے بعد انھوں نے سائنس لے لی اور میں آرٹس کی طرف چلا گیا لیکن ملاقاتیں روزانہ ہوتی رہیں۔ دو سال میں میں نے انٹرمیڈیٹ پاس کر لیا اور یونیورسٹی میں پہنچ گیا لیکن آغا حسن کے مزاج کو سائنس کے ساتھ کوئی مناسبت نہیں تھی اس لئے وہ کئی سال میں بڑی مشکل سے انٹرمیڈیٹ پاس کر سکے۔

بہرحال خدا خدا کر کے آغا حسن انٹرمیڈیٹ سے نکلے اور یونیورسٹی میں داخل ہوئے۔ میں اس وقت تک ایم اے کر چکا تھا اور میں نے پی۔ ایچ۔ ڈی کے لیے کام شروع کر دیا تھا۔ آغا حسن نے بی اے پاس کرنے کے بعد انگریزی کے ایم۔ اے اور ایل ایل بی میں داخلہ لیا اور دو سال میں انھوں نے یہ دونوں امتحان پاس کیے اور بالآخر لکھنؤ میں وکالت شروع کر دی۔

وکالت کا ابتدائی زمانہ بہت سخت ہوتا ہے۔ بڑے بڑے بھاگ نکلتے ہیں۔ آغا حسن بھی جلدی بھاگ نکلا۔ ایک دن قیصر باغ میں محمود آباد ہاؤس کے سامنے اس نے مجھ سے کہا۔

"میں وکالت چھوڑ رہا ہوں مجھ سے یہ کام نہیں ہو سکتا۔"

میں نے کہا "پھر کیا کرو گے؟"

کہنے لگا "کوئی نوکری کروں گا۔"

میں نے کہا "معقول نوکری تو آج کل مسلمانوں کو ملتی نہیں اور معمولی نوکری تم کر نہیں سکتے۔"

بولا "پھر کیا کروں ؟"

میرے منھ سے سٹا یہ فقرہ نکلا "راجہ صاحب سے کہو تمھیں حبیب بینک میں نوکری دلا دیں۔"

یہ سن کر آغا حسن کہنے لگا "یار! میں بنک میں نوکری کروں گا؟ یہ میرے بس کی بات نہیں ہے۔"

میں نے کہا "میاں صاحبزادے! حالات بہت خراب ہیں اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں ہے۔ راجہ صاحب سے بات کرو، وہ حبیب سیٹھ کو سفارشی خط لکھ دیں گے تو تمھیں ضرور حبیب بنک میں ملازمت مل جائے گی۔"

میری یہ باتیں سن کر وہ کچھ اداس سا ہوا، چپ رہا اور کچھ نہ بولا۔

تھوڑی دیر میں ادھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد ہم ایک دوسرے سے رخصت ہوئے۔

اس زمانے میں آغا حسن محمود آباد ہاؤس قیصر باغ ہی میں رہتا تھا۔ رات کو اس نے راجہ صاحب سے بات کی۔ راجہ صاحب نہایت شریف انسان تھے۔ انھوں نے فوراً حبیب بنک کے ڈائریکٹر کو خط لکھ دیا اور کہا کہ "جلد یہ خط لے کر بمبئی چلے جایئے۔"

وہ خط لے کر آغا حسن میرے پاس آیا اور یہ روداد سنائی۔ اور پوچھا "تم بولو اب کیا کروں؟"

میں نے کہا "فوراً یہ خط لے کر بمبئی چلے جاؤ۔"

وہ یہ سن کر حیران و پریشان ہوا کیونکہ لکھنؤ چھوڑنے کو وہ کسی حال میں بھی برداشت نہیں کر سکتا تھا۔

بہرحال میرے کہنے پر وہ دو تین دن بعد بمبئی چلا گیا۔ حبیب سیٹھ کو راجہ صاحب کا خط دکھایا اور اس کو حبیب بنک میں ملازمت مل گئی۔

جونیر آفیسر کی حیثیت سے اس کا تقرر ہوا اور ٹریننگ شروع ہو گئی۔

سال بھر بعد آغا حسن عابدی صاحب حبیب بنک میں آفیسر ہو گئے اور بمبئی ہی میں ان کی

پوسٹنگ ہوئی۔

میں اس زمانے میں لیکچرار ہو کر اینگلو عربک کالج دہلی سے وابستہ ہو گیا۔ اس زمانے میں جب بھی آغا حسن دورے پر دہلی آتا تو میرے پاس ٹھہرتا اور کئی کئی دن رہتا۔

اس طرح آغا حسن کے بینکنگ کے کیریر کی ابتدا ہوئی اور اس کے بعد جو کچھ ہوا اور جو کارنامے اس نے انجام دیئے اس کی تفصیل میں پھر کبھی لکھوں گا۔

خیر تو جوبلی کالج میں اس قسم کے میرے ساتھی تھے۔

میں کوئی پانچ چھ سال جوبلی کالج میں رہا۔ تین سال ہائی اسکول پاس کرنے میں لگے۔ اس کے بعد دو سال میں انٹرمیڈیٹ کا امتحان پاس کیا۔

اس عرصے میں بعض اساتذہ نے مجھے کچھ اس طرح متاثر کیا کہ میری دنیا ہی بدل گئی۔ زندگی میں انقلاب آگیا اور وہ ایک خاص راستے پر گامزن ہو گئی۔ منزل کا نشان مجھے مل گیا۔ اور میں اس سے ہم کنار ہونے کی کوشش میں رواں دواں نظر آنے لگا۔ اساتذہ نے اس سفر میں میری رہنمائی کی اور یہ انھیں کی دین ہے کہ مجھے منزل پر پہنچنے اور اس سے ہم کنار ہونے کے مواقع نصیب ہوئے۔

آٹھویں درجے میں ہمارے کلاس ٹیچر تھے ایچ۔ کے۔ بنرجی۔ بھاری بھرکم جسم کے سرخ سفید آدمی تھے، چہرے پر فرنچ کٹ داڑھی، ہمیشہ پتلون اور بند گلے کے کوٹ میں ملبوس رہتے تھے تو بنگالی لیکن دیکھنے سے یونانی معلوم ہوتے تھے۔ بڑی دھیمی آواز میں بولتے تھے اور بچوں کو بڑے پیار اور محبت سے پڑھاتے تھے۔ بنرجی صاحب کی شخصیت میں بڑا جادو تھا۔ طالب علم بھی ان سے بڑی محبت کرتے تھے۔ ان کو دیکھ کر ٹیگور کی شخصیت کے تقدس اور ان کی حسین دلکش شاعری کا خیال آتا تھا۔

ہم نویں درجے میں پہنچے تو انگریزی اور حساب ایک صاحب پنڈت چھاؤلال پڑھانے لگے اور تاریخ پڑھانے کا کام مشہور افسانہ نگار اور صاحب طرز ادیب سید علی عباس حسینی صاحب کے سپرد ہوا۔ فارسی ایک ایسے صاحب پڑھانے لگے جنھیں ہم کالے مولوی کہتے تھے۔ تھے تو بہت موٹے اور کالے لیکن حد درجے کے شائستہ اور نستعلیق۔ طالب علموں سے محبت کرنے والے اور

بڑے ہی عالم فاضل۔ فارسی زبان اور ادب کا ذوق انھوں نے ہم سب میں پیدا کیا اور ہمیں تہذیب و شائستگی کے سانچے میں ڈھالا۔ اردو مولوی کفایت علی پڑھاتے تھے جو نہایت نیک، سیدھے اور سادہ انسان تھے۔ بہت آہستہ لیکن روانی کے ساتھ بولتے تھے اور طالب علموں کے ساتھ بڑی شفقت سے پیش آتے تھے۔

ان تمام اُستادوں میں سے ہمیں ڈر حسینی صاحب سے لگتا تھا چھ فٹ کے لمبے اور توانا آدمی تھے۔ گلے تک بند شیروانی اور بڑے پائنچوں کا پاجامہ پہنتے تھے۔ اُن کے سر پر ہمیشہ مخمل کی کشتی نما ٹوپی ہوتی تھی۔ ان کے ایک ایک انداز سے رعب اور دبدبہ ٹپکتا تھا۔ باتیں کرتے تھے تو معلوم ہوتا تھا شاخِ گل ہوا میں جھوم رہی ہے۔ تاریخ پڑھاتے تو معلوم ہوتا تھا کہ علم کا ایک دریا ہے جو امڈا چلا آ رہا ہے۔ اُن کے لیکچر کا آغاز نجی باتوں سے ہوتا تھا۔ پہلے کچھ اپنے بارے میں اور اپنے خاندان کے بارے میں، کچھ تہذیب و معاشرے کے بارے میں باتیں کرتے تھے پھر سبق کا آغاز ہوتا تھا۔ تاریخ قوم اور ترقی پسندانہ زاویۂ نظر کو سامنے رکھ کر پڑھاتے تھے۔ ان کے لیکچر میں بہت لطف آتا تھا۔ طالب علم مسحور ہو جاتے تھے۔ اُن کے لیکچروں سے ہمیں بڑا فائدہ ہوا۔ علم کی لگن پیدا ہوئی اور ایک قومی زاویۂ نظر نے ہمارے دل و دماغ میں جگہ بنالی۔ انھوں نے اپنی گفتگو سے ہمارے اندر علم کا ذوق اور حالات و واقعات کو دیکھنے کا ایک تجزیاتی زاویہ پیدا کیا۔ بڑے پیارے پڑھاتے تھے۔ اور طالب علموں کے لیے ان کی شفقت بے اندازہ اور محبت بے پایاں تھی۔ کبھی کبھی طالب علموں پر برستے بھی تھے، لیکن اس طرح جیسے کوئی پھولوں کی چھڑیوں سے آہستہ آہستہ صرف دکھانے کے لیے یا کسی رسم کو پورا کرنے کے لیے مار رہا ہے۔ ڈانٹتے تھے تو صرف شرم دلانے کے لیے، بُرا بھلا کہتے تھے تو صرف شرمندہ کرنے کے لیے۔ ایک دن کسی بات پر ناراض ہوئے تو اپنا ہاتھ دکھا کر کہنے لگے "ان موٹی موٹی انگلیوں کو دیکھا ہے۔ ان کی ضرب ایسی کاری ہوتی ہے کہ انسان تلملا جاتا ہے اور ساری زندگی اس ضرب کو یاد رکھتا ہے۔ ان کی دلچسپی صرف پڑھنے لکھنے اور اچھی باتیں کرنے میں تھی۔ فٹ بال دیکھنے کا بھی شوق تھا۔ بڑے اہتمام سے فٹ بال کے میچ دیکھنے جاتے تھے اور فٹ بال کے کھیل پر بڑی دلچسپ باتیں کرتے تھے۔

کبھی کبھی لیکچر کے شروع میں اپنی باتیں کرتے ہوئے اپنی افسانہ نگاری اور ادبی مصروفیات کا تذکرہ بھی کرتے تھے۔ اس وقت تک ان کے افسانوں کے تین مجموعے "رفیق تنہائی"، "باسی پھول" اور "میلہ گھومنی" چھپ چکے تھے۔ ان میں سے بعض افسانوں کا پس منظر انھوں نے ہمارے سامنے کلاس ہی میں بیان کیا اور اس سے ہمارے دلوں میں ادبی ذوق کی شمع فروزاں ہوئی اور افسانوں سے دلچسپی کا چراغ روشن ہوا۔

میں طالب علمی کے زمانے میں کبھی ان کے سامنے بولا نہیں، کبھی ان سے باتیں کرنے کی ہمت نہیں پڑی۔ بس انھیں دیکھتا اور ان کی باتیں سنتا رہتا تھا۔

ہائی اسکول پاس کرنے کے بعد جب میں انٹرمیڈیٹ میں پہنچا تو جوبلی کالج میں دو استاد مجھے ایسے ملے جن کو میں کبھی فراموش نہ کرسکا۔ ایک تو تاریخ اور انگریزی کے پروفیسر اے۔ پی۔ بینرجی، دوسرے پروفیسر حامداللہ افسر جو ہمیں اردو زبان اور ادب پڑھاتے تھے۔

اے۔ پی۔ بینرجی صاحب کی صورت شکل اور انداز و اطوار دیکھ کر ہمیشہ کسی فرشتے کا خیال آتا تھا اور واقعی وہ ہر لحاظ سے فرشتہ معلوم ہوتے تھے۔

میانہ قد، سرخ سفید رنگ، بھرے بھرے گال، اس پر گھنی موٹی سفید داڑھی بنگالی کرتے اور دھوتی میں ملبوس، یہ تھے پروفیسر اے۔ پی۔ بینرجی۔ ہمیشہ سفید براق کپڑے پہنتے تھے۔ کرتے کی آستینیں بہت ڈھیلی ڈھالی اور خاصی لمبی ہوتی تھیں جن کو وہ اپنی کہنیوں تک دوہرا کرلیتے تھے۔ جاڑوں میں وہ بند گلے کا کوٹ اور پتلون پہنا کرتے تھے اور اس لباس میں ان کا چمپئی رنگ کچھ اور بھی دمکتا تھا۔ ہمیشہ اپنے کمرے میں بیٹھے رہتے اور وہیں پڑھاتے تھے۔ کبھی پرنسپل کے دفتر میں جانا ہوتا تھا تو نظریں نیچی کرکے بچوں کی طرح تیز تیز چلتے تھے۔ کسی کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھتے نہ تھے۔ حد درجہ شرمیلے آدمی تھے۔

بینرجی صاحب تاریخ کے پروفیسر تھے۔ ہمیں ہندوستان اور انگلستان کی تاریخ پڑھاتے تھے۔ تاریخ کی ہر بات انھیں یاد تھی۔ کبھی کتاب یا نوٹس کا سہارا نہیں لیتے تھے۔ بس بولتے جاتے تھے اور ہنستے جاتے تھے۔ اور سننے والوں کو یوں محسوس ہوتا تھا کہ پھولوں کی بارش ہو رہی ہے یا موتی بکھیرے جا رہے ہیں۔ لڑکے دم بخود ہو جاتے تھے اور ہر ایک کی یہ خواہش ہوتی تھی کہ پروفیسر صاحب بولتے جائیں اور وہ سنتے جائیں

اور ان کا پیریڈ کبھی ختم نہ ہو۔ دراصل ان کی شخصیت میں معصومیت کی وجہ سے کچھ ایسی جذب وکشش تھی جو پہنچے ہوئے بزرگوں میں ہوتی ہے۔ معلوم ہوتا تھا کہ تاریخ کی کتابیں ان کے دماغ میں محفوظ ہیں۔ لڑکوں کے نام بھول جاتے تھے۔ کہتے تھے "میرا دماغ مرے ہوئے لوگوں کے ناموں سے بھرا ہوا ہے اس لیے زندہ لوگوں کے نام میرے ذہن میں محفوظ نہیں رہتے۔"

یک دن روہیلوں کے بارے میں لیکچر دے رہے تھے۔ ان کی تاریخ بتانے کے بعد کہنے لگے، یہ لوگ بڑے جنگجو تھے۔ میری پوسٹنگ چند سال قبل مرادآباد کے ایک کالج میں ہوگئی۔ وہاں روہیلے بہت پڑھتے تھے۔ سرخ وسفید صحت مند اور خوبصورت، استادوں کے سامنے مہذب لیکن جب کلاس سے باہر جاتے تھے تو ایک دوسرے سے لڑتے تھے اور پتھر اٹھا اٹھا کر ایک دوسرے کو مارتے تھے THEY WERE VERY TURBULENT PEOPLE یہ باتیں وہ بڑی معصومیت سے کرتے تھے۔ دراصل وہ تصور نہیں کر سکتے تھے کہ انسان ایک دوسرے سے لڑ بھی سکتا ہے اور ایک انسان دوسرے انسان کو تکلیف بھی پہنچا سکتا ہے۔

چند مہینے پروفیسر صاحب نے ہمیں انگریزی ادب بھی پڑھایا۔ خوب پڑھاتے تھے لطف آتا تھا لیکن ڈکنس کے ناول "TALE OF TWO CITIES" کو پڑھاتے ہوئے مادام ڈی فارج کو ہمیشہ مادام ڈی فارگے کہتے تھے معذرت کے ساتھ کہتے تھے کہ میں فرانسیسی تلفظ صحیح طور پر ادا نہیں کر سکتا، اس لیے جو لکھا ہوتا ہے وہی پڑھتا ہوں۔

عاجزی اور انکساری کا یہ عالم تھا کہ تاریخ اور انگریزی پڑھاتے ہوئے جب کبھی کہیں تفصیلات پیش کرنے کا موقع آتا تھا تو کہتے تھے میں یہ کام ڈاکٹر نندلال چٹرجی یا سوکمار بینرجی کے لیے چھوڑ دیتا ہوں جو آپ کو یونیورسٹی میں تاریخ پڑھائیں گے۔ ڈاکٹر نندلال چٹرجی یونیورسٹی میں برٹش انڈین ہسٹری اور سوکمار بینرجی مسلم انڈین ہسٹری کے پروفیسر تھے جن کے سامنے میں نے زانوئے ادب تہہ کیا۔ اسی طرح انگریزی ادب اور شاعری کی باریکیوں پر بات کرتے ہوئے کہا کرتے تھے کہ "یہ باتیں آپ کو پروفیسر سدھانت یا پروفیسر مترا سمجھائیں گے وہ یونیورسٹی میں

انگریزی ادبیات بڑے پائے کے پروفیسر ہیں"۔ جب میں یونیورسٹی میں گیا تو مجھے ان سے بھی فیض حاصل کرنے کا موقع ملا اور پروفیسر بینرجی کی بات صحیح معلوم ہوئی۔ لیکن یہ عقدہ بھی کھلا کہ ان کی باتوں میں عاجزی اور انکساری حد درجہ تھی۔

پروفیسر بینرجی نے مجھے سادگی سے زندگی گزارنا، الگ تھلگ رہنا، کسی سے سروکار نہ رکھنا، کسی کی برائی نہ کرنا، اپنے آپ کو کچھ نہ سمجھنا، شوق سے پڑھنا، ہنس ہنس کر پڑھانا اور اس طرح پھولوں کی بارش کرنا اور موتیوں کا بکھیرنا سکھایا جو آئندہ زندگی میں میرے بہت کام آیا۔

پروفیسر حامد اللہ افسر جوبلی کالج میں اردو زبان اور ادب کے پروفیسر تھے۔ دو سال تک انھوں نے مجھے اردو زبان اور ادب پڑھایا اور ایمان کی بات یہ ہے کہ سب سے پہلے انھوں نے صحیح ادبی ذوق کا چراغ میرے دل میں روشن کیا۔ اس زمانے میں اُن کی شاعری کی دھوم تھی۔ افسر میرٹھی کے نام سے اردو رسالوں میں اُن کی نظمیں اور غزلیں شائع ہوتی تھیں۔ بچوں کے لیے بھی وہ نظمیں لکھتے تھے۔ اور جماعت کے نصاب میں ان کی نظمیں داخل تھیں۔ بچے ان نظموں کو شوق سے پڑھتے تھے۔ چھوٹی جماعتوں کے نصاب میں اُن کی نظمیں میں نے بھی پڑھی تھیں۔ انھیں دنوں تنقید پر ایک کتاب انھوں نے "نقد الادب" کے نام سے لکھی تھی جو اردو میں اصول تنقید پر پہلی مبسوط کتاب تھی لیکن "یار لوگوں" نے اس پر خواہ مخواہ ایک ہنگامہ برپا کر رکھا تھا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ یہ معاصرانہ چشمک تھی۔

افسر صاحب چھوٹے قد کے آدمی تھے۔ سرخ و سفید رنگ، گول چہرہ، سر پر بھورے بال لیکن جلد اُڑ جانے کی غمازی کرتے ہوئے۔ ان کی ایک آنکھ لمبی تھی اور ایک گول لیکن ان تمام باتوں کے باوجود ان کی شخصیت میں بلا کی جاذبیت تھی۔ ایک ہی کپڑے کی پتلون اور شیروانی پہنتے تھے اور یہی گویا ان کا سوٹ تھا۔ میں نے انھیں کبھی پتلون پر کوٹ پہنے ہوئے نہیں دیکھا۔ ننگے سر رہتے تھے۔ کبھی ٹوپی پہن کر کالج نہیں آئے۔ البتہ شیروانی کے بٹن کبھی کھلے ہوئے نہیں دیکھے گئے۔ ان کے لبوں پر ہر وقت ایک ہلکی سی مسکراہٹ کھیلتی رہتی تھی۔ پڑھاتے ہوئے بھی ہنستے اور مسکراتے جاتے تھے۔ آہستہ آہستہ ٹھہر ٹھہر کر کچھ اس طرح بولتے تھے کہ سننے والا مسحور ہو جاتا تھا۔

انھوں نے اردو زبان کی اہمیت ہم پر واضح کی، غزل کے مزاج سے ہمیں آشنا کیا، اردو کے بڑے بڑے شاعروں کا تعارف کرایا، تنقید کے اصول ہمیں سمجھائے، ادب و شعر سے لطف اندوز ہونے کے گر ہمیں سکھائے، اور سب سے پہلے یہ اطلاع بھی ہم پہنچائی کہ بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب کو ان کی خدمات اردو کے اعتراف کے طور پر الہ آباد یونیورسٹی نے ڈی لٹ کی ڈگری دی ہے۔

ادب کا چسکا جو زندگی بھر سائے کی طرح میرے ساتھ رہا وہ درحقیقت افسر صاحب ہی کی دین ہے۔ یہ کام انھیں بخوبی آتا تھا۔ اور وہ اس اعتبار سے جادو جگاتے اور ساحری کرتے تھے۔

مجھ پر افسر صاحب کی ساحری نے اثر کیا اور آج تک میں ان کے اس ساحری کے حصار سے باہر نہیں نکل سکا ہوں۔ ادب سے لو لگاتا ہوں۔ شاعری کو اپنا اوڑھنا بچھونا بناتا ہوں، فن کی دیوی کی پرستش کرتا ہوں اور اس کے توسط سے زندگی کو سمجھنے، اس کے مزاج کو جاننے، اس کے حسن کو پہچاننے اور مسائل کو سلجھانے کی کوشش کرتا ہوں۔

اور یہ سب کچھ میرے لیے ایک بیش بہا دولت ہے، اور ایک گراں بہا خزانہ ہے جو مجھے افسر صاحب سے ملا ہے۔

اسی لیے تو میں انھیں اب تک یاد کرتا ہوں۔

پڑھنے کے اس ماحول کے ساتھ ساتھ جوبلی کالج میں تفریحی اعتبار سے بھی میرا اچھا وقت گزرتا تھا کالج میں اچھے، اور باذوق ساتھی تھے جن کو رونے والوں کو ہنسانے کا گر آتا تھا۔

کالج شروع ہونے سے قبل یا انٹرول میں ہم لوگ نیم کے اس بڑے درخت کے نیچے جمع ہوتے تھے جو بڑی گراؤنڈ کی زینت تھا۔ وہاں دلچسپ باتیں ہوتی تھیں۔ لطیفے سنائے جاتے تھے، شعر سنائے جاتے تھے، فقرے کسے جاتے تھے۔ فلموں پر تبصرے کیے جاتے۔ تھے۔ غرض بہت اچھا وقت گزرتا تھا۔

انٹرول میں اس زمانے میں ہر طالب علم کو ایک ایک کچے یا اُبلے ہوئے چنوں کا دونا دیا جاتا تھا۔ اس میں نمک مرچ ادرک اور نیبو وغیرہ ڈال کر لذت پیدا کی جاتی تھی اور اس کا کھانا

غذائیت کے اعتبار سے بہت مفید تھے۔

اور میں ان چنوں کو بہت شوق سے کھاتا تھا۔

چنے کھانے کے بعد ہم لوگ پھل والے چندی کی دوکان پر براجمان ہوتے تھے اور کبھی بنگالی مٹھائی والے کے چم چم اور رس گلوں کی داد دیتے تھے

کالج کا پھل والا چندی بھی خوب آدمی تھا۔ دھوتی، کُرتے اور خاص لکھنوی انداز کی دو پلی ٹوپی میں ملبوس اپنی چھوٹی سی دوکان پر بیٹھا رہتا تھا۔ اس کی دوکان کیا تھی آپس میں ملنے اور باتیں کرنے کا ایک مرکز تھا، جہاں کالج کے اہم طالب علم ضرور جمع ہوتے تھے چندی خود بھی ان کی گفتگو میں شریک ہو جاتا تھا اور حالات حاضرہ، کالج کے حالات ۔ نوجوانوں کے معاملات پر خاص لکھنوی لہجے میں باتیں کرتا تھا۔ بیشتر لڑکوں کے نام اسے معلوم تھے۔ کھیلوں سے اسے بڑی دلچسپی تھی اور وہ کالج کی ٹیموں کے میچ دیکھ کر ان پر بہت اچھا تبصرہ کرتا تھا۔

غرض چندی کی حیثیت ایک پھل والے ہی کی نہیں ایک ادارے کی سی تھی۔ جوبلی کالج کا تصور اس کے بغیر نا ممکن تھا۔

جوبلی کالج میں ماحول ادبی اور تہذیبی تھا۔ آئے دن تقریبات ہوتی رہتی تھیں۔ اس میں سب سے اہم تقریب مشاعرے کی تھی۔ ہر سال بڑی شان سے مشاعرہ ہوتا۔ اس میں روایت کی پاسداری خاص طور پر ملحوظ رکھی جاتی تھی۔ پورا ماحول لکھنوی تہذیب کا آئینہ دار ہوتا تھا۔ لکھنو کے تمام اہم شاعران مشاعروں میں شریک ہوتے تھے۔ روایتی انداز میں طرحی مشاعرے کی بزم سجائی جاتی تھی۔ شمع کا اہتمام کیا جاتا تھا۔ یہ شمع جس شاعر کے سامنے جاتی تھی وہ اپنا کلام پیش کرتا تھا۔ خاصدان پانوں سے بھرے جاتے تھے اور یہ خاصدان مہمانوں کے سامنے بڑے اہتمام سے پیش کیے جاتے تھے۔ سبز کشمیری چائے کا دور چلتا تھا اور اس میں سے ایسی خوشبوئیں نکلتی تھیں کہ دل و دماغ فرحت اور تازگی سے ہم کنار ہو جاتے تھے۔ بیشتر شاعر ترنم سے اپنا کلام سناتے تھے رات رات بھر یہ مشاعرہ جاری رہتا تھا

ان مشاعروں میں جن شاعروں کو میں نے شریک ہوتے دیکھا اور ان کے کلام سے لطف اندوز ہوا، ان میں نواب مرزا جعفر علی خاں اثرؔ، حضرت صفیؔ لکھنوی، حضرت اصغرؔ گونڈوی، حضرت جگرؔ مرادآبادی، سیمابؔ اکبرآبادی، ساغرؔ نظامی، روشؔ صدیقی، جاں نثار اخترؔ، حضرت یاسؔ یگانہ چنگیزی، حضرت آرزوؔ لکھنوی، حضرت جوشؔ ملیح آبادی، جناب سید آل رضا، حضرت بسملؔ الہ آبادی، پنڈت آنند نرائن ملاؔ، سراجؔ لکھنوی، قدیرؔ لکھنوی، مجازؔ ردولوی، معین احسن جذبیؔ، ارمؔ لکھنوی، منے آغا ذکی، سروش عسکری طباطبائی وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ کبھی ملک کے دوسرے حصوں سے بھی شاعر آتے تھے اور ان مشاعروں میں شرکت کرتے تھے۔ مثلاً ساغرؔ نظامی، احسان دانشؔ، سکندر علی وجدؔ حیدرآبادی اور مخدوم محی الدین کو میں نے انھیں مشاعروں میں سنا۔ یہ لوگ خوب کہتے تھے اور خوب لہک لہک کر ترنم کے ساتھ کچھ اس طرح پڑھتے تھے کہ سماں بندھ جاتا تھا۔

یہ مشاعرے میرے لیے عظیم تہذیبی اور ادبی تجربہ ثابت ہوئے اور ان سے میں نے ادبی اور تہذیبی اعتبار سے بہت کچھ حاصل کیا۔

میری طالب علمی کے زمانے میں جوبلی کالج نے تہذیبی اور ادبی کارناموں کے ساتھ ساتھ کھیلوں میں بھی بڑی شہرت اور ناموری حاصل کی تھی۔ اس کی فٹ بال اور ہاکی کی ٹیموں کا شمار نہ صرف لکھنؤ کے کالجوں کی صف اول کی ٹیموں میں ہوتا تھا بلکہ وہ بڑے بڑے کلبوں کی ٹیموں کے ساتھ کھیلتی تھیں اور اکثر کامیابی حاصل کرتی تھیں۔ میڈیکل کالج کی طرف سے ہنس راج میموریل ٹورنامنٹ ہر سال لکھنؤ میں میڈیکل کالج گراؤنڈ پر کھیلا جاتا تھا۔ اس کی ٹرافی تو اکثر جوبلی کالج کے حصے میں آتی تھی۔

میں بھی جب سے جوبلی کالج میں داخل ہوا فٹ بال اور ہاکی کھیلتا تھا۔ شام کو کم از کم دو تین گھنٹے گراؤنڈ پر گزرتے تھے۔ خوب مشق ہوتی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میں تین چار سال کے اندر کالج کی فٹ بال اور ہاکی کی فرسٹ الیون میں منتخب کیا گیا اور کالج چھوڑنے کے وقت تک برابر ان ٹیموں میں کھیلتا رہا، کئی ٹورنامنٹ جیتے اور ایک کھلاڑی کی حیثیت سے اچھی خاصی شہرت میرے حصے میں آئی۔

س ترقی کی وجہ کھیلوں کے انچارج ایچ. ڈی گھوش صاحب کی شفقت اور محبت تھی. وہ ہمیشہ میرا دل بڑھاتے تھے اور میرے کھیل کو معیاری قرار دیتے تھے. کچھ اس ماحول کا بھی اثر تھا جو ان دنوں جوبلی کالج میں تھا. کچھ کھیلوں کی عظیم روایات بھی اس کا سبب تھیں جن سے یہ کالج پہچانا جاتا تھا. کچھ اپنی محنت اور دلچسپی بھی تھی جس نے کھیلوں کی طرف توجہ دلائی اور میں نے قلیل وقت میں کھیلوں کی دنیا میں اپنی جگہ بنالی۔

جوبلی کالج سے میری وابستگی تعلیمی بھی تھی علمی بھی، تہذیبی بھی، معاشرتی بھی، جذباتی بھی تھی جمالیاتی بھی. میں نے عمر عزیز کے کوئی سات آٹھ سال اس گہوارۂ علم و ادب اور مرکزِ تہذیب و ثقافت میں گزارے اور اس نے مجھے وہ سب کچھ دیا جس کی مجھے ضرورت تھی اور مجھے اُن برکتوں سے نوازا جن کا زندگی میں نصیب ہونا آسان نہیں ہوتا۔

یہی وجہ ہے کہ تقریباً نصف صدی گزر جانے کے بعد آج بھی میں نہ صرف اپنے طالب علم ساتھیوں اور استادوں کو یاد کرتا ہوں بلکہ کالج کی عمارتوں، وہاں کے چمن زاروں، نیم اور اشوک کے درختوں اور کریم اور مہاراج کے ایسے چپراسیوں اور چوکیداروں اور چندی کے ایسے پھل والوں کی حسین یادوں کو بھی اپنے سینے سے لگائے پھرتا ہوں۔

ساتواں باب

لکھنؤ یونیورسٹی

گورنمنٹ جوبلی کالج سے سنہ ۱۹۳۸ء میں انٹرمیڈیٹ پاس کرنے کے بعد میں نے لکھنؤ یونیورسٹی کا رخ کیا۔ جولائی کی آٹھ یا دس تاریخ تھی میں یونیورسٹی کے دفتر میں پہنچا۔ بی۔ اے میں داخلے کا فارم لیا، اس کو پُر کیا، سرٹیفکیٹ وغیرہ لگائے، تین مہینے کی فیس چھتیس روپے اور کچھ دوسری فیسیں سب ملا کر کوئی ستر پچھتر روپے کیشیر کے حوالے کیے اور اس طرح میں کیننگ کالج لکھنؤ یونیورسٹی کے بی۔ اے فرسٹ ایر کا طالب علم ہو گیا۔ بے حد خوشی ہوئی یہ سوچ کر کہ میں یونیورسٹی کا طالب علم ہوں۔

اس زمانے میں داخلے پر کوئی پابندی نہیں تھی جس کا جی چاہے بی۔ اے میں داخلہ لے سکتا تھا۔ صرف انٹرمیڈیٹ کی سند ضروری تھی۔ بلا مبالغہ ہزاروں کی تعداد میں لڑکے بی۔ اے میں داخل ہوتے تھے۔ ان کے سیکشن بنا دیے جاتے تھے۔ ان سیکشنوں کو مختلف اساتذہ پڑھاتے تھے اساتذہ کی تعداد خاصی تھی اس لیے کام بخوبی چلتا تھا۔

میرے یونیورسٹی پہنچنے کے وقت تک کیننگ کالج بظاہر ختم ہو چکا تھا اور اس کی جگہ فیکلٹی آف آرٹس نے لے لی تھی لیکن کیننگ کالج کا نام اب بھی چلتا تھا اور لوگ کیننگ کالج کو یونیورسٹی اور یونیورسٹی کو کیننگ کالج سمجھتے تھے۔ اس وقت تک کالج کا ایک پرنسپل بھی ہوتا تھا مسٹر اسمتھ ہمارے پرنسپل تھے لیکن ایک سال کے اندر وہ ریٹائر ہو کر انگلستان چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد کوئی اور پرنسپل مقرر نہیں کیا گیا۔ پروفیسر سدھانت، جو انگریزی ادبیات کے پروفیسر

تھے، ڈین فیکلٹی آف آرٹس مقرر کر دیئے گئے، اور وہی انتظامی معاملات کی دیکھ بھال کرنے لگے۔

اسمتھ صاحب کو میں نے دیکھا۔ وہ باقاعدگی سے دفتر میں بیٹھتے تھے۔ ایک چپراسی بھی ان کے دفتر کے دروازے پر بیٹھا رہتا تھا لیکن پروفیسر سدھانت ڈین کی حیثیت سے اپنے دفتر میں صبح کو آتے تھے اور ضروری کاغذات دیکھ کر لیکچر دینے کے لیے اوپر کی منزل میں چلے جاتے تھے۔ لیکچر کے بعد تھوڑی دیر کے لیے پھر دفتر میں بیٹھتے تھے اور کوئی ڈیڑھ بجے کے قریب واپس گھر چلے جاتے تھے۔ گھر ان کا یونیورسٹی ہی میں تھا۔ ان کے دفتر کے سامنے ایک چپراسی بیٹھا رہتا تھا اور جب وہ دفتر میں نہیں ہوتے تھے تو وہ دروازہ بند رہتا تھا لیکن جب وہ دفتر میں آتے تھے تو دروازے کے دونوں پٹ کھول دیئے جاتے تھے۔ چپراسی الگ ہٹ جاتا تھا، اور ہر طالب علم بغیر کسی روک ٹوک کے اُن کے دفتر میں جا سکتا تھا۔ طالب علموں کا جو بھی کام ہو وہ ایک منٹ میں کر دیتے تھے۔ داخلے کا مسئلہ ہو یا دیر میں فیس وغیرہ جمع کرنے کی وجہ سے جرمانے کا معاملہ، سدھانت صاحب اس کی درخواست پر لکھتے تھے FINES EXCUSED غرض سدھانت صاحب ہر ایک کی مدد کرتے تھے نیکی اور شرافت کا مجسمہ تھے کسی کے کام کو روکنا انھیں نہیں آتا تھا۔ لٹریچر کے آدمی تھے اس لیے انسان کی مجبوریوں اور محرومیوں کے شدید احساس نے ان میں وہ رحم دلی اور دل سوزی پیدا کر دی تھی جس سے ادبیات کے پروفیسر پہچانے جاتے ہیں۔

لکھنؤ یونیورسٹی میں جب میں داخل ہوا تو سب سے پہلے یہ مناظر دیکھے اور میں ان سے بہت متاثر ہوا۔ میں نے دیکھا کہ ان کے دفتر میں کوئی کسی کا راستہ نہیں روکتا، کوئی کسی کو نفی میں جواب نہیں دیتا کوئی کسی کو پریشان نہیں کرتا، کوئی کسی سے کج بحثی نہیں کرتا۔ کوئی کسی کے ساتھ چھوٹی چھوٹی باتوں میں نہیں اُلجھتا۔ دفتر کے عملے کے لوگ ہر ایک سے خندہ پیشانی کے ساتھ پیش آتے تھے۔ دور دور تک مجھے وہاں کوئی آزار نظر نہیں آتا تھا اور اس لیے یہ جگہ میرے سامنے بہشت کا منظر پیش کرتی تھی اور میں اس منظر کو دیکھ کر دل ہی دل میں فارسی کا یہ شعر پڑھتا تھا ؎

بہشت آں جا کہ آزارے نہ باشد
کسے را با کسے کارے نہ باشد

لکھنؤ یونیورسٹی اپنے محلِ وقوع کے لحاظ سے بھی جنت سے کسی طرح کم نہ تھی۔ یہ علاقہ بادشاہ باغ کہلاتا تھا۔ دریائے گومتی اس کے پاس سے گزرتا تھا۔ ایک طرف چھتر منزل کی شاندار عمارت تھی۔ اس کے دائیں جانب روشن الدولہ کی کچہری تھی، ساتھ ہی سعادت علی خاں کا مقبرہ تھا۔ اس کے پہلو میں قیصر باغ کی عمارتیں تھیں اور آگے چل کر حضرت گنج کا بازار تھا، جہاں کیفے، ریستوران، کافی ہاؤس اور مغربی طرز کی صاف ستھری دوکانیں تھیں جہاں طالب علم، ادیب، شاعر، نواب زادے، تعلقے دار اور مہوشانِ عشوہ کار چہل قدمی کرتے ہوئے نظر آتے تھے۔ اس پورے علاقے کو املی کے سربفلک درختوں نے جنت کا نمونہ بنا دیا تھا۔ دریا کے دوسری طرف یونیورسٹی تھی۔ اس علاقے سے گزر کر موتی محل کے پل کو پار کر کے یونیورسٹی جانا پڑتا تھا۔ موتی محل کے پل سے بھی یونیورسٹی کی عمارتوں کا فاصلہ کوئی چار چھ فرلانگ ضرور تھا۔ یونیورسٹی کی سڑک پر دونوں طرف جامن، شیشم اور یوکلپٹس کے گھنے درخت تھے اور حدِ نظر تک سبزہ ہی سبزہ نظر آتا تھا۔ پھر آگے چل کر کیننگ کالج کی پرشکوہ عمارت کے سامنے ایک بہت بڑا سبزہ زار تھا جو کھیلوں کی گراؤنڈ کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ دوسری طرف یونیورسٹی کے سب سے بڑے ہوسٹل بیوٹ ہوسٹل کی شاندار عمارت تھی۔ اس کے ساتھ اساتذہ کے بنگلے تھے۔ پیچھے لائبریری کی عمارت تھی، اور محمود آباد ہوسٹل اور حبیب اللہ ہوسٹل اور بٹلر ہوسٹل کی عمارتیں تھیں۔ یونیورسٹی اتنی وسیع و عریض تھی کہ اس کے بذاتِ خود ایک دنیا ہونے کا احساس ہوتا تھا۔

جب ۱۸ر جولائی کو باقاعدہ کلاسیں شروع ہوئیں اور میں یونیورسٹی کی عمارت میں پہلی دفعہ داخل ہوا تو خاصا گھبرایا ہوا تھا لیکن چند روز ہی میں یہ گھبراہٹ ختم ہو گئی کیونکہ بڑے بڑے پروفیسر جو بین الاقوامی شہرت کے مالک تھے جب میں ان سے ملا تو وہ سب کے سب مجھے انسانیت کے پتلے نظر آئے۔ ان میں سے ہر ایک میں میں نے شرافت دیکھی۔ کام کی لگن، ذمے داری کا احساس، اور فرض شناسی کا خیال سب میں کوٹ کوٹ کر بھرا پایا۔ خوش مزاجی ان کے ایک ایک انداز سے چھلکتی نظر آئی۔ سنجیدگی کے باوجود خوش مزاجی کو ان کے ایک ایک انداز

میں جلوہ گر دیکھا۔ عاجزی اور انکساری کے رنگ ان میں سے ہر ایک کی شخصیت میں نمایاں نظر آئے۔

اس زمانے میں لکھنؤ یونیورسٹی میں بین الاقوامی شہرت رکھنے والے پروفیسروں کی تعداد خاصی تھی۔ انگریزی کے پروفیسر سدھانت، پروفیسر دیا موائے مترا، ڈاکٹر راؤ، شیام کرشن نارائن، ڈاکٹر ایف۔ بی۔ رائے، ڈاکٹر رستوگی، ڈاکٹر رام بلاس شرما اور پروفیسر احمد علی دور دور مشہور تھے۔ معاشیات میں ڈاکٹر رادھا کمل مکرجی، پروفیسر ڈی۔ پی۔ مکرجی اور ڈاکٹر موجمدار کا اس زمانے میں بڑا نام تھا۔ سیاسیات میں ڈاکٹر رام، ڈاکٹر سلطان اور پشپا وتی نارائن کو بھی ہر شخص جانتا اور ان کی عزت کرتا تھا۔ فلسفے اور نفسیات میں پروفیسر کالی پرشاد کی بڑی شہرت تھی۔ مشرقی علوم میں ڈاکٹر محمد وحید مرزا، ڈاکٹر عبدالعلیم، پروفیسر سید مسعود حسن رضوی ادیب، مولانا محمد حسین، اور پروفیسر سید احتشام حسین بڑے محترم سمجھے جاتے تھے۔ سائنس میں ڈاکٹر سید حسین ظہیر، ڈاکٹر ولی محمد، ڈاکٹر ساہنی اور ڈاکٹر چٹرجی کا بڑا نام تھا۔ قانون میں ڈاکٹر آر۔ یو۔ سنگھ اور نعمت اللہ صاحب بڑے اہم پروفیسر سمجھے جاتے تھے۔ ان سب نے اپنے علمی، ادبی اور فنی کارناموں سے ایسی روشنی پھیلائی تھی جس نے لکھنؤ یونیورسٹی کو مینارۂ نور بنا دیا تھا۔

میں نے بی۔ اے میں انگریزی ادب، تاریخ اور اردو ادب کے مضامین لیے۔ شروع شروع میں انگریزی ادب سے دلچسپی کے پیش نظر انگریزی ادب میں آنرز بھی لے لیا۔ اس طرح مجھے یونیورسٹی کے کئی اہم پروفیسروں کے سامنے زانوئے ادب تہ کرنے کا موقع ملا۔

انگریزی کے پروفیسر سدھانت اس زمانے میں پروفیسر اور ڈین ہونے کے باوجود بی۔ اے فرسٹ ایئر کو بھی ہفتے میں دو تین لیکچر دیتے تھے۔ بڑی کلاس ہوتی تھی۔ کوئی اسی نوے کے قریب لڑکے لڑکیاں ایک بڑے کمرے میں جمع ہو جاتے تھے اور پروفیسر سدھانت کا انتظار کرتے تھے۔ پروفیسر سدھانت وقت پر کمرے میں داخل ہوتے تھے اور پاؤں لٹکا کر میز پر بیٹھ جاتے تھے۔ حاضری کی انھیں پروا نہیں ہوتی تھی۔ بس لیکچر شروع کر دیتے تھے۔ سمندر موجیں مارنے لگتا تھا، دریا امنڈنے لگتے تھے۔ ان کی رس بھری آواز فضا میں گونجتی تھی اور یوں محسوس ہوتا تھا جیسے ان کے منہ سے پھول جھڑ رہے ہیں یا موتی بکھر رہے ہیں۔

شعبۂ انگریزی کے ایک اور استاد دیا موئے مترا تھے جو ہمیں شاعری اور ڈراما پڑھاتے تھے دبلے پتلے آدمی تھے۔ کسی سے ملتے جلتے نہیں تھے۔ یا تو پڑھاتے تھے یا خود پڑھتے تھے۔ بالکل تنہا آدمی تھے۔ نہ بیوی نہ بچے نہ کوئی عزیز، نہ دوست۔ راما کرشنا آشرم میں رہتے تھے۔ تانگے میں یونیورسٹی آتے تھے، پڑھاتے تھے اور اس کے بعد اپنے آشرم واپس چلے جاتے تھے۔ وہاں اکثر انھیں مراقبے میں دیکھا گیا۔ کمرہ بند کر کے چپ چاپ بیٹھ جاتے تھے۔ میں ان سے بہت جلد مانوس ہو گیا۔ اس حد تک کہ ایک شام میں ان سے ملنے کے لیے ان کے آشرم چلا گیا۔ باہر سے میں نے دیکھا کہ اپنے کمرے میں دروازے بند کیے چپ چاپ بیٹھے ہیں۔ آنکھیں بند ہیں اور نہ جانے کہاں پہنچے ہوئے ہیں۔ میں نے آہستہ سے دروازے پر دستک دی تو اٹھے، دروازہ کھولا اور بڑی محبت سے مجھے اندر لے گئے۔ بٹھایا، حالات پوچھے، کچھ اپنے بارے میں باتیں کیں۔ پھل اور بنگالی مٹھائی سے تواضع کی اور دیر تک ادب، شاعری اور ڈرامے پر باتیں کرتے رہے اور چلتے وقت مجھے ٹیگور کے بارے میں اپنے ایک مطبوعہ مقالے کا آف پرنٹ دیا۔ اس پر اپنے قلم سے میرا نام لکھا۔ وہ مضمون آج تک میرے پاس محفوظ ہے۔ اردو نہیں بول پاتے تھے اس لیے صرف انگریزی میں باتیں کرتے تھے۔ شاعری اور ڈراما پڑھانے میں ان کا جواب نہیں تھا۔ انھوں نے ہمیں شیلے، کیٹس اور بائرن پڑھایا اور شیکسپیئر کے دو ڈرامے جولیس سیزر اور میکبتھ اس طرح پڑھائے کہ ڈرامے کا صحیح لطف آگیا۔ ان کی خوبی یہ تھی کہ انگریزی نظمیں بڑے دھیمے انداز میں مترنم لے کے ساتھ پڑھاتے تھے اور ڈرامے کے کرداروں کو پیش کرتے ہوئے تو وہ اپنی آواز تک بدل لیتے تھے۔ ان سے میں نے شاعری کا صحیح ذوق حاصل کیا اور ڈرامے کی تو ایسی تربیت ہوئی کہ اس فن سے دلچسپی میرے مزاج کا جز بن گئی۔ کلاس میں دو ایک لڑکے مترا صاحب کے خاص منظور نظر ہوتے تھے۔ ان پر وہ کبھی کبھی فقرے بھی کستے تھے۔ اور ان کے بارے میں کچھ کہہ کر ہنستے ہنساتے بھی تھے۔ ان میں ایک چھوٹے قد کا لڑکا پرتاب چندر تھا اور دوسرا سریو پرشاد تھا۔ پرتاب چندر کو وہ اس کے قد کی وجہ سے ہمیشہ ٹنی بوائے کہتے تھے اور سریو پرشاد کی طرف دیکھ کر کہتے تھے کہ یہ انگریزی ادب کا حافظ ہے۔ اپنی طرف سے کچھ نہیں لکھتا، صرف دوسروں

کے 'کوشش' دیتا ہے لیکن جو اب مکمل ہوتا ہے "ہی از اے ونڈرفل مین"۔ سرویر پرشاد بعد میں لکھنؤ یونیورسٹی کے شعبۂ انگریزی میں لیکچرار ہو گئے اور انگریزی ادب پڑھانے میں بڑا نام پیدا کیا۔

رستوگی صاحب اور ڈاکٹر رام بلاس شرما صاحب ہمیں انگریزی نثر پڑھاتے تھے۔ دونوں بہت پڑھے لکھے آدمی تھے۔ رستوگی صاحب بہت سی کتابیں لے کر کلاس میں آتے تھے اور بے شمار حوالوں کے ساتھ پڑھاتے تھے۔ رام بلاس شرما کا مزاج تجزیاتی تھا اور وہ پڑھاتے ہوئے ہر پہلو کو آئینہ بنا دیتے تھے۔ ڈاکٹر شرما بعد میں ہندی کے بہت بڑے نقاد تسلیم کئے گئے۔ انھوں نے ہندی میں بہت کچھ لکھا اور جلد ہی ایک عظیم نقاد کی حیثیت سے اپنی جگہ بنا لی۔ بہت سادہ آدمی تھے۔ انھیں اپنی بڑائی کا احساس بالکل نہیں تھا۔ ہر ایک سے اچھی طرح ملتے تھے۔ کئی سال بعد جب میں اینگلو عربک کالج دہلی میں لیکچرر ہو گیا تو وہ آگرے سے دلی آئے اور میرے بارے میں پوچھتے پوچھتے کالج پہنچ گئے اور میرے کمرے میں آ گئے۔ استاد محترم کو دیکھ کر میں تو پریشان ہو گیا۔ انہیں بٹھایا، پھلوں اور چائے سے تواضع کی، دیر تک باتیں کرتے رہے، کچھ نصیحتیں کر کے رخصت ہوئے۔

میں نے ان دونوں استادوں سے بھی زندگی میں بہت کچھ سیکھا۔ پڑھانے کا صحیح طریقہ، پڑھنے لکھنے کی لگن، کام کرنے کی دھن، شاعری اور نثر نگاری کے مطالعے کے طور طریقے، طالب علموں کے ساتھ شفقت اور محبت سے پیش آنا اور ان سے اپنے بچوں کی طرح برتاؤ کرنا۔

اور یہ سب باتیں آج میری شخصیت کا حصہ ہیں۔

ن ساتذہ نے انگریزی ادب کے ساتھ میرے اندر جو دلچسپی پیدا کی اس کی وجہ سے میں نے انگریزی ادب میں بی۔ اے آنرز کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اور آنرز کی کلاس کے ابتدائی لیکچروں میں باقاعدگی سے شریک ہونے لگا۔ انگریزی آنرز کی کلاس ذرا چھوٹی ہوتی تھی۔ اس لئے ان اساتذہ کے لیکچروں میں کچھ اور بھی لطف آتا تھا۔ لیکن افسوس ہے کہ میں انگریزی میں بی۔ اے آنرز نہ کر سکا اور اپنے بعض اساتذہ کے مشورے پر عمل کر کے اردو آنرز میں چلا گیا۔ البتہ انگریزی آنرز کی کلاسوں میں شریک ہونے کی وجہ سے مجھے فائدہ بہت ہوا۔

انگریزی ادب کے ایک اور استاد مشہور افسانہ نگار اور ناول نگار احمد علی صاحب تھے۔ احمد علی صاحب نے ہمیں پڑھایا نہیں۔ وہ کسی دوسرے سیکشن کو پڑھاتے تھے۔ ہم اکثر ان کو پڑھاتے ہوئے دور سے دیکھا کرتے تھے اور میں تو کبھی کبھی ان کے لیکچر میں چپکے سے جاکر پیچھے بیٹھ جاتا تھا۔ احمد علی صاحب میز پر پاؤں رکھ لیتے تھے۔ پائپ سلگا لیتے تھے، پائپ پیتے جاتے اور پڑھاتے جاتے تھے۔ ان کے اس والہانہ انداز کو دیکھ کر لطف آتا تھا۔ سرخ سفید رنگ تھا، جاذب نظر شخصیت تھی۔ لباس کا کوئی خیال نہیں رکھتے تھے۔ بال بکھرے ہوئے اور الجھے ہوئے رہتے تھے۔ ایک ترقی پسند افسانہ نگار کی حیثیت سے ان کی بڑی شہرت تھی اور یونیورسٹی میں انھیں عزت اور احترام کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ وہ لیکچرار تھے لیکن پروفیسر تک ان کی عزت کرتے تھے۔ میرے یونیورسٹی میں داخل ہونے کے چند مہینے بعد ہی وہ انگلستان چلے گئے۔ وہاں انھوں نے تخلیقی کام کیا اور انگریزی میں کئی ناول لکھنے کے منصوبے بنائے۔ اس وقت کے انگریزی کے بیشتر ادیبوں سے ان کے ذاتی تعلقات تھے اور ان کی تحریریں اس زمانے کے معیاری انگریزی رسالوں میں شائع ہوتی تھیں۔ ان کے انگلستان جانے کے چند مہینے بعد ہی دوسری جنگ عظیم چھڑ گئی اور اس کی وجہ سے انھیں لندن میں خاصی پریشانی کا سامنا کرنا پڑا لیکن اس کے باوجود یہ معلوم ہوا کہ ان کی ادبی سرگرمیاں جاری رہیں اور بہت تھوڑے عرصے میں انھوں نے اردو کے ساتھ ساتھ انگریزی ادب میں بھی ایک مقام پیدا کر لیا۔ مشہور ناول TWILIGHT IN DELHI اسی زمانے کی یادگار ہے۔

اردو فارسی میں میرے استاد تھے پروفیسر سید مسعود حسن رضوی ادیب، مولانا محمد حسین صاحب اور پروفیسر سید احتشام حسین صاحب۔

پروفیسر سید مسعود حسن رضوی صاحب ہمیں فارسی ادب پڑھاتے تھے اور اردو میں غالب اور انیس کا درس دیتے تھے۔ ہفتے میں ان کے دو تین لیکچر ہوتے تھے۔ نہایت نستعلیق آدمی تھے۔ بہت لیے دیے رہتے تھے۔ یونیورسٹی میں صرف پڑھاتے تھے، زیادہ لوگوں سے ملتے جلتے نہیں تھے۔ لباس کا بہت خیال رکھتے تھے۔ عمدہ سوٹ پہنتے تھے۔ گرمیوں میں بھی اور سردیوں میں بھی۔ زیادہ تر اپنے بیٹھنے کے کمرے میں ہی پڑھاتے تھے۔ ان کے کمرے کے سامنے ایک چپراسی بیٹھا رہتا تھا لیکن کمرے کے اندر جانے سے کسی کو روکتا

نہیں تھا۔ پانی کی دو تین صراحیاں ان کے کمرے میں ایک طرف رکھی رہتی تھیں اور جس کا جی چاہے کمرے میں جا کر پانی پی سکتا تھا۔ مسعود صاحب نے کبھی کسی کو منع نہیں کیا۔ لیکچر جاری رہتا تھا اور لوگ پانی پینے کے لیے اندر آتے جاتے رہتے تھے۔ غالباً مسعود صاحب کا خیال تھا کہ پانی پلانا ثواب کا کام ہے۔ اس لیے اُن کے ہاں اس معاملے میں کوئی روک ٹوک نہیں تھی۔ سبیل انھوں نے اپنے کمرے میں بنا رکھی تھی۔

مسعود صاحب لیکچر شروع کرنے سے پہلے ٹوائلٹ ضرور جاتے تھے۔ ہم لوگ ان کی میز کے آس پاس جمع ہو جاتے تھے۔ جب وہ کمرے سے باہر جاتے تھے تو میں ان کی میز کی دراز کا جائزہ لیتا تھا۔ پانوں کی ڈبیا ایک دراز میں رکھی رہتی تھی۔ میرے کلاس فیلو دلارے لال ماتھر اور میں دونوں جلدی جلدی ڈبیہ سے پان نکال کر کھاتے تھے اور منھ بند کر لیتے تھے۔ مسعود صاحب اتنے میں آجاتے تھے۔ ہم لوگ منھ بند کر کے اپنی اپنی نشستوں پر بیٹھ جاتے تھے جیسے ہم نے کچھ کیا ہی نہیں۔ مسعود صاحب بھی ہاں کی کر اپنا لیکچر شروع کر دیتے تھے۔ یہ تو ناممکن ہے کہ انھیں یہ علم نہ ہوا ہو کہ یہ لڑکے ان کے پان کھاتے ہیں لیکن انھوں نے کبھی کچھ کہا نہیں۔ بلکہ اس کا اثر یہ ہوا کہ جب کبھی اتوار کے دن میں دین دیال روڈ پر واقع ان کی کوٹھی پر جاتا تھا تو وہ میرے لیے پانوں کا خاصدان اندر سے ضرور منگواتے تھے اور کہتے تھے "پان کھائیے"۔ یہ سن کر مجھ پر گھڑوں پانی پڑ جاتا تھا لیکن مسعود صاحب کے ہاں کے پان اتنے مزے دار ہوتے تھے کہ میں ان کے سامنے دو تین پان ضرور کھا لیتا تھا۔

مسعود صاحب کا لیکچر نہایت دلچسپ ہوتا تھا۔ شعر و شاعری کے بارے میں ایسے ایسے پہلو نکالتے تھے کہ سن کر طبیعت باغ باغ ہو جاتی تھی۔ پھر ان کے بولنے کا انداز اتنا لطیف اور ان کا لہجہ اتنا دل کش ہوتا تھا کہ جی چاہتا تھا ان کا لیکچر کبھی ختم نہ ہو۔ نہایت خوش گفتار آدمی تھے۔ لیکچر میں گل افشانیٔ گفتار کا یہ عالم دیکھنے اور سننے سے تعلق رکھتا تھا۔ لکھنوی تہذیب کے پرستار تھے۔ اس لیے اکثر پڑھاتے ہوئے لکھنوی شعرا اور لکھنوی تہذیب کے حوالے ضرور دیتے تھے اور اس سے ہماری معلومات میں بہت اضافہ ہوتا تھا اور دلوں میں زیادہ سے زیادہ مطالعے کی آتشِ شوق بھڑک گئی تھی۔ مسعود صاحب تہذیب و شائستگی کے پیکر تھے۔ بہت لیے دیے رہتے تھے۔ طالب علم ان سے

کبھی بے تکلف نہیں ہو سکتے تھے۔ اُن کے سامنے ہنسنا اور مسکرانا تک ناممکن تھا ہر ایک پر سنجیدگی طاری رہتی تھی۔ وہ طالب علموں کی مکمل توجہ چاہتے تھے۔ یہ فضا ہو تو پھر وہ بولتے تھے اور بولتے جاتے تھے۔ الفاظ جو اُن کی زبان سے نکلتے تھے ان کی تراش خراش اور چمک دمک دیکھنے اور سننے سے تعلق رکھتی تھی وہ الفاظ کے جوہری تھے اور ان الفاظ کی مزاج دانی کا شعور ان کے پاس بدرجۂ اتم موجود تھا۔ لکھنے اور بولنے میں بڑی احتیاط برتتے تھے۔

اس احتیاط ہی کا یہ اثر تھا کہ ان کے بہت سے علمی کام ادھورے رہ گئے۔ وہ فارسی اور اردو شعر و ادب کے بہت بڑے عالم تھے۔ انھوں نے نادر و نایاب کتابوں کا ایک بیش بہا خزانہ جمع کیا تھا۔ زندگی بھر وہ نادر و نایاب قلمی اور مطبوعہ کتابوں کے نسخے جمع کرتے رہے۔ ان کی دلچسپی کے موضوعات سے متعلق ہر چیز ان کی دست رس میں تھی، لیکن اس احتیاط ہی کی وجہ سے زیادہ کام نہ کر سکے۔ پھر بھی جو علمی کام انھوں نے کیا ہے اور جو کتابیں اُن کی شائع ہوئی ہیں وہ تحقیق و تنقید کا اعلیٰ نمونہ ہیں کیونکہ وہ ہر اعتبار سے مکمل ہیں۔

پروفیسر صاحب علمی کاموں میں بہت مصروف رہتے تھے لیکن اخلاق کا یہ عالم تھا کہ کوئی بھی گھر پر ملنے کے لیے پہنچ جائے فوراً باہر تشریف لے آتے تھے اور گھنٹوں باتیں کرتے تھے۔ کوٹھی کے برآمدے میں ایک گول سی میز پڑی رہتی تھی۔ اس کے گرد چار کرسیاں، بس انھیں کرسیوں پر ملنے والے آکر بیٹھتے تھے۔ ان کا ڈرائنگ روم بہت کم کھلتا تھا۔ چائے بھی نہیں ملتی تھی۔ البتہ پانوں سے کبھی کبھی تواضع کرتے تھے۔ اس معاملے میں ان کے مزاج میں ایک طرح کی بے نیازی تھی۔

میں اکثر اتوار کو صبح کے وقت ان کی خدمت میں حاضر ہوتا تھا۔ فوراً باہر تشریف لے آتے تھے اور خوب باتیں کرتے تھے۔ دورانِ گفتگو کبھی کبھی ان کے چھوٹے بھائی آفاق صاحب بھی باہر آجاتے تھے۔ وہ ہاکی کے کھلاڑی تھے اور اس کھیل میں ہمارے بھی استاد تھے۔ ہومیو پیتھک ڈاکٹر بھی تھے۔ ورزش کا بہت شوق تھا۔ باتیں آفاق صاحب بھی خوب کرتے تھے۔ اس طرح ایک دو گھنٹے گزار کر میں اپنے گھر واپس آتا تھا۔ برسوں میرا یہ معمول رہا، لیکن مسعود صاحب کی طرف سے کبھی یہ شائبہ تک نہیں ہوا

کہ وہ مصروف ہیں اور ملنے اور باتیں کرنے کے لیے ان کے پاس وقت نہیں ہے۔

مسعود صاحب بڑے وضعدار اور با اصول آدمی تھے۔ امتحان کی کاپیاں بڑی سختی سے دیکھتے تھے۔ ان کے ہاتھ سے فرسٹ کلاس خوش قسمتوں ہی کو ملتا تھا۔ ہر چیز کو صیغۂ راز میں رکھتے تھے۔ اور سفارش کا لفظ ان کی لغت میں نہیں تھا۔

صبح کو ناشتے کے بعد سوٹ میں ملبوس ہو کر اپنے ذاتی رئیسی تانگے میں بیٹھتے اور یہ تانگہ وکٹوریہ روڈ، شاہ مینا روڈ، ریور بینک روڈ، چھتر منزل اور موتی محل کے پل پر سے ہوتا ہوا ساڑھے نو بجے کے قریب یونیورسٹی پہنچتا تھا۔ مسعود صاحب راستے میں کچھ نہ کچھ پڑھتے جاتے تھے۔ کبھی انھیں تانگے میں بغیر کتاب کے نہیں دیکھا گیا۔ یونیورسٹی پہنچ کر وہ سیدھے اپنے کمرے میں تشریف لے جاتے تھے اور تدریس کا کام شروع کر دیتے تھے۔ میں نے انھیں کبھی کسی افسر کی طرح دفتری کام کرتے ہوئے نہیں دیکھا حالانکہ وہ فارسی اور اردو دونوں شعبوں کے سربراہ تھے۔ خدا جانے دفتری کام وہ کس وقت کرتے تھے۔ ایک بجے ان کی واپسی ہوتی تھی۔ اسی طرح تانگے میں پڑھتے ہوئے گھر واپس تشریف لے جاتے تھے۔

اودھ کی تاریخ، لکھنؤ کی تہذیب اور شاہانِ اودھ کے حالات پر وہ ایک اتھارٹی کی حیثیت رکھتے تھے۔ میری طالب علمی کے زمانے میں انھوں نے اودھ کے آخری بادشاہ واجد علی شاہ پر یونیورسٹی ہال میں ایک لیکچر دیا تھا اور اس لیکچر میں نئی معلومات فراہم کی تھیں اور ایسے ایسے نکتے بیان کیے تھے جو کسی کے خواب و خیال میں بھی نہیں آسکتے تھے۔ انگریزوں نے اپنے مقصد سے واجد علی شاہ کی جو تصویر پیش کی تھی، مسعود صاحب نے اپنی تحقیق سے اس کو غلط ثابت کر دیا تھا اور یہ معلومات فراہم کی تھیں کہ واجد علی شاہ انگریزوں کے سخت خلاف تھے۔ انھوں نے اپنی فوجوں کو منظم کرنا شروع کر دیا تھا اور خود فوجوں کی کمان کرتے تھے۔ ان کی عیاشی کے واقعات صرف داستانیں ہیں۔ جو شخص اپنی زندگی میں ایک سو چالیس کتابیں تصنیف کرے وہ عیاشی کے لیے وقت کس طرح نکال سکتا ہے۔ یہ لیکچر شائع نہیں ہوا۔ مسعود صاحب کی احتیاط پسندی مانع رہی۔ آخر عمر میں وہ صرف "لکھنؤ کا عوامی اسٹیج"

اور "لکھنؤ کا شاہی اسٹیج" ملکر شائع کر سکے اور یہ دونوں کتابیں ان کا بہت بڑا علمی کارنامہ ہیں۔

مسعود صاحب نے ہم لوگوں کو علمی، تعلیمی، تہذیبی اور ادبی اور ادبی اعتبار سے بہت کچھ دیا۔ تھوڑی سی علم کی لگن اور ادبی تحقیق سے دلچسپی جو میرے نصیب میں آئی وہ استاد محترم مسعود صاحب کی عظیم شخصیت ہی کی دین ہے۔

شعبۂ اردو کے سینیئر اساتذہ میں میرے ایک اور استاد مولانا محمد حسین صاحب مرحوم تھے۔ پنجاب یونیورسٹی، علی گڑھ یونیورسٹی اور الٰہ آباد یونیورسٹی کے فاضل تھے۔ عربی فارسی کے بہت بڑے عالم تھے لیکن استاد اردو کے تھے اور ہمیں صرف اردو پڑھاتے تھے۔

ہم لوگ انھیں مولانا کہتے تھے۔

مولانا کی نہ تو داڑھی تھی نہ مونچھیں۔ مونچھیں اگر تھیں تو برائے نام کتری ہوئی۔ لمبا قد، بھرا بھرا گٹھا ہوا جسم، گندمی رنگ، چوڑا چہرہ اور اس پر چیچک کے داغ۔ بس مولانا اس صورت شکل اور قد و قامت سے پہچانے جاتے تھے۔ علی کٹ کے تنگ پاجامے پر شیروانی اور اودھ کی کشتی نما ٹوپی پہنتے تھے اور ہر وقت رواں دواں رہتے تھے۔ یا تو کلاس پڑھاتے تھے یا سگریٹ پیتے اور طالب علموں سے باتیں کرتے تھے۔ طالب علموں سے انھیں اتنی محبت تھی کہ بعض اوقات ان کی بہتری کے لیے اپنے بنیادی اصولوں تک کو توڑ دیتے تھے۔ طبیعت میں تھوڑی سی بذلہ سنجی اور حاضر جوابی بھی تھی۔

کلاس میں لیکچر شروع کرنے سے قبل کچھ ادھر ادھر کی باتیں ضرور کرتے تھے۔ لڑکے بھی ان سے کسی حد تک بے تکلف تھے حالانکہ ان کا احترام ہر ایک کے دل میں تھا۔

ایک دن ایک لڑکے نے کہا "مولانا! میں نے آپ کو خواب میں دیکھا"

مولانا نے فوراً جواب دیا "تو میاں ڈر تو گئے ہوگے ... مجھے دیکھ کر!"

اس پر تمام لڑکوں نے زوردار قہقہہ لگایا۔

مولانا بھی خوب ہنسے۔

مولانا حاضری کے معاملے میں بہت نرم تھے۔ اگر کوئی لڑکا غیر حاضر ہوتا اور انھیں "یس سر" کی آواز نہ آتی تو کہتے: "بھئی کہیں مل جائے تو کہہ دینا مجھ سے مل لے تاکہ میں حاضری لگا دوں کہیں حاضریاں کم نہ ہو جائیں۔"

اور واقعی وہ غیر حاضر ہونے والے کی بھی حاضری لگا دیتے تھے۔

ٹینس کے عالمی چیمپین غوث محمد خاں ملیح آبادی ہمارے کلاس فیلو تھے۔ بی۔ اے۔ میں داخل ہو گئے تھے لیکن کلاسوں میں کم جاتے تھے۔ یونیورسٹی میں آتے تھے، ریکیٹ اُن کے ہاتھ میں ہوتا تھا۔ دن رات ٹینس کھیلتے تھے۔ کبھی کبھی وہ مولانا کے لیکچر میں ضرور آجاتے تھے، اور چند منٹ پیچھے چھپ کر بیٹھتے تھے۔

مولانا انھیں دیکھتے ہی کہتے تھے: "بھئی آج تو غوث محمد خاں آئے ہیں۔ اس کلاس کی عزت افزائی ہے۔"

اس پر غوث محمد خاں کہتے: "مولانا! میں آپ کا خادم ہوں۔ اردو کی کلاس میں ضرور حاضر ہوتا ہوں۔"

یہ کہہ کر جب وہ چپکے سے نکل کر باہر چلے جاتے تو مولانا فرماتے تھے "اُنھوں نے یونیورسٹی کا نام ساری دنیا میں روشن کیا ہے۔ انھیں تو اعزازی ڈگری دے دینی چاہیے۔"

جب وہ کلاس میں حاضر نہیں ہوتے تھے اور مولانا ان کا نام پکارتے تھے تو لڑکوں سے پوچھتے تھے: "بھئی غوث محمد خاں ہندوستان میں ہیں یا نہیں؟ ہندوستان میں ہوں تو ان کی حاضری لگا دوں۔"

کلاس میں سے کسی لڑکے کی آواز آئی: "وہ انگلستان میں ہیں۔"

مولانا یہ سن کر چپ ہو جاتے۔

مولانا بی۔ اے۔ میں ہمیں اقبالؔ کا شکوہ اور جواب شکوہ، انیس کے مراثی اور حالی کی کچھ نظمیں پڑھاتے تھے اور خوب پڑھاتے تھے۔ لطف آجاتا تھا۔

بی۔ اے آنرز اور ایم۔ اے میں مولانا ہمیں لسانیات، تنقید اور نثر کے پرچے پڑھانے لگے۔ ان کلاسوں میں لڑکوں کی تعداد زیادہ نہیں تھی اس لیے مولانا لیکچر سے قبل بڑی دلچسپ باتیں کرتے تھے۔ سگریٹ سلگا لیتے تھے۔ پاؤں سامنے کی کرسی پر رکھ لیتے تھے، سگریٹ پیتے جاتے تھے اور باتیں کرتے جاتے تھے۔

میں کلاس شروع ہونے سے چند منٹ پہلے ہی ان کے پاس چلا جاتا تھا۔ مجھے بڑی محبت سے بٹھاتے تھے اور خوب باتیں کرتے تھے۔

ایک دن کہنے لگے "میری تین باتیں یاد رکھنا۔ اول تو اپنا قلم کبھی کسی کو نہ دینا ورنہ اس قلم سے پھر خود نہیں لکھ پاؤ گے۔ دوسرے اپنی سواری کبھی کسی کر نہ دینا ورنہ جب واپس آئے گی تو وہ تمہیں اپنی سواری نہیں معلوم ہوگی۔ تیسرے اپنی کتاب کبھی کسی کو نہ دینا ورنہ وہ تمہیں واپس نہیں ملے گی اور اگر مل بھی گئی تو اس کا حلیہ بگڑ چکا ہوگا

مولانا کی یہ باتیں میں چپ چاپ سنتا، اثبات میں سر ہلاتا اور یہ ظاہر کرتا کہ مولانا صحیح فرما رہے ہیں اس پر عمل کرنا ضروری ہے۔

لیکن جب لیکچر شروع ہوتا تو میں شرارتاً کہتا "مولانا! آج میں اپنا قلم بھول آیا ہوں، پنا قلم مجھے عنایت فرمائیے!"

اور مولانا یہ کہہ کر کہ "تم لوگ بڑے شریر ہو، میری باتوں پر نہ خود عمل کرتے ہو اور نہ مجھے عمل کرنے دیتے ہو" اور یہ کہہ کر لال رنگ کا اپنا قیمتی قلم میری طرف بڑھا دیتے۔

اور میں اپنے بیشتر نوٹس مولانا کے قلم سے لکھتا

شرارت کی بات اور ہے لیکن مولانا کی یہ باتیں آج بھی صحیح معلوم ہوتی ہیں اور ان پر عمل کرنے میں عافیت کا احساس ہوتا ہے۔

مولانا خاصے مذہبی آدمی تھے ان کا زیادہ وقت محلے کی مسجد میں گزرتا تھا۔ اس مذہبیت کے زیر اثر کبھی کبھی مجھ سے پوچھتے تھے "اماں، یہ ترقی پسند ادیب مذہب سے کیوں برگشتہ ہیں؟"

میں کہتا "مولانا! ایسا تو نہیں ہے۔ مذہبی لوگ بھی ترقی پسند ہیں اور ہو سکتے ہیں کچھ غلط فہمیاں پیدا کی گئی ہیں۔"

اس پر مولانا کہتے "معلوم ہوتا ہے تم پر بھی ترقی پسندوں کا اثر ہو رہا ہے کیوں نہ ہو میاں! جوان ہو، لیکن میں تمہارے والد صاحب سے ضرور کہوں گا کہ لڑکا گمراہ ہو رہا ہے۔"

میں سنجیدہ ہو کر کہتا "مولانا! خدا کے لیے والد صاحب سے کچھ نہ کہیے گا۔ وہ مذہبی معاملات میں بہت سخت ہیں، اگر آپ نے کچھ کہہ دیا تو خدا جانے میرا کیا حال کریں گے قیامت ہی برپا ہو جائے گی۔" مولانا فرماتے "نہیں میاں! میں تو مذاق میں یہ سب کچھ کہہ رہا تھا۔ میں کچھ نہیں کہوں گا کوئی کیا کر سکتا ہے۔ زمانہ بدلتا جا رہا ہے۔ لوگ مذہب سے برگشتہ ہوتے جاتے ہیں۔

AFTER ALL EBADAT YAR KHAN! I AM A RELIGIOUS MAN.
میں ترقی پسند نہیں ہو سکتا۔"

اور میں خاموشی سے ان کی یہ معصومانہ باتیں سنتا رہتا۔ مولانا یونیورسٹی کے سینیر اساتذہ میں سے تھے لیکن لیکچرر تھے۔ ریڈر یا پروفیسر کی کوئی جگہ اس وقت اردو کے شعبے میں نہیں تھی۔ مولانا اس صورت حال کے شکوہ سنج تھے اور ناسازگار حالات کا ذکر کر کے کہتے تھے۔

"عبادت یار خاں I SHALL DIE A LECTURER۔ مجھے یہ سن کر بہت افسوس ہوتا اور میں ہمیشہ یہ کہتا کہ مولانا! آپ اس طرح نہ کہا کیجیے۔ آپ تو ضرور پروفیسر ہوں گے یونیورسٹی کو کبھی نہ کبھی تو عقل آئے گی ـــــ لیکن یونیورسٹی کو عقل نہیں آئی ـــــ یونیورسٹی نے ریڈر کی اسامی اس وقت منظور کی جب مولانا کی صحت خراب ہو گئی اور وہ بیمار رہنے لگے۔ جب سے ان کی بیگم کا انتقال ہوا تھا وہ دنیا سے کچھ دل برداشتہ ہو گئے تھے بے چاری جل کر مری تھیں۔ کپڑوں تک آگ لگ گئی تھی۔ مولانا ہر وقت انھیں یاد کرتے تھے۔ چنانچہ ریڈر ہونے سے پہلے ہی ان کا انتقال ہو گیا اور جو بات بار بار ان کی زبان سے نکلتی تھی وہ پوری ہو گئی۔

پروفیسر سید احتشام حسین صاحب بھی ہمیں بی۔ اے میں اردو پڑھاتے تھے۔ میں جس سال یونیورسٹی

میں داخل ہوا ہوں، اسی سال سینیر لیکچرر کی حیثیت سے شعبۂ اردو میں ان کا تقرر ہوا تھا۔ الہ آباد یونیورسٹی سے فرسٹ کلاس بی۔ اے اور اردو میں فرسٹ کلاس میں ایم۔ اے کر کے آئے تھے۔ الہ آباد یونیورسٹی کے شفیق استاد اعجاز حسین صاحب کے خاص شاگردوں میں تھے۔ ادیب اور شاعر کی حیثیت سے بھی ان کی بڑی شہرت تھی۔ ہندوستان کے معیاری اردو رسالوں میں ان کے تنقیدی مقالات اور افسانے چھپتے تھے۔ شاعری کرتے تھے اور اپنی نظمیں اور غزلیں دل نشین ترنم کے ساتھ سناتے تھے اس لیے یونیورسٹی اور یونیورسٹی کے باہر ادبی دنیا میں ان کو عزت و احترام سے دیکھا جاتا تھا۔

احتشام صاحب گورے چٹے آدمی تھے۔ سرخ سفید رنگ، گول چہرہ، کشادہ ماتھا، چہرے پر معمولی سے چیچک کے داغ لیکن اس کے باوجود صورت شکل میں دل کشی۔ بڑے پائچوں کا لکھنوی انداز کا پاجامہ، اس پر گلے تک بند شیروانی اور تعلقہ دارانِ اودھ کی کشتی نما ٹوپی، یہ ان کا لباس تھا۔ ٹوپی سر پر ذرا ٹیڑھی رہتی تھی جس کو کج کلاہی سے تعبیر کرنا چاہیے لیکن مزاج میں اس کج کلاہی کا انداز نہیں تھا۔ نہایت سیدھے سادے، نیک اور شریف انسان تھے۔ طالب علموں سے محبت کرنے والے، ان کا خیال رکھنے والے، ان سے نجی معاملات تک میں باتیں کرنے والے، ان کے مسائل کو حل کرنے والے، ان کے مستقبل کا خیال رکھنے والے۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو احتشام صاحب کی شخصیت میں فرشتوں کی سی خصوصیات تھیں اور حقیقت یہ ہے کہ وہ ایک فرشتے سے کسی طرح کم نہ تھے۔

پڑھانے میں ان کا جواب نہیں تھا۔ اعلیٰ درجے کے مقرر تھے بلکہ انھیں خطیب کہا جائے تو بے جا نہیں۔ بی۔ اے کو پڑھانے میں بھی ان کا معیار ایم۔ اے کے معیار سے کسی طرح کم نہیں تھا۔ وہ اردو، انگریزی، فارسی اور ہندی ادب کے ماہر تھے۔ ان کا علم حاضر تھا۔ شاید ہی کوئی اہم ادبی تحریر ہو جو ان کی نظر سے نہ گزری ہو۔ اپنے لیکچروں میں نہ صرف ادب بلکہ فلسفہ، نفسیات، تاریخ اور عمرانیات وغیرہ کے حوالے دیتے تھے اور ان تمام علوم کو سامنے رکھ کر ادب پڑھاتے تھے۔ ان کے

ایک گھنٹے کے لیکچر کے بعد ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ہم نے مختلف علوم کی بہت سی کتابیں پڑھ لی ہیں اور ان کا ہر پہلو ہمارے سامنے آئینہ ہو گیا ہے۔

لیکچر کے بعد بھی احتشام صاحب طالب علموں کو خاصا وقت دیتے تھے خالی گھنٹوں میں ہم احتشام صاحب کو گھیر لیتے تھے۔ کسی خالی کمرے میں بیٹھ جاتے تھے اور پھر ہمارے آس پاس علم کا سمندر موجیں مارتا تھا۔ روسی، فرانسیسی، یونانی، جرمن اور انگریزی ادب اور ادیبوں کا ذکر اردو ادب اور ادیبوں کے ساتھ ضرور آجاتا تھا اور اس طرح ان کی باتوں سے ادبیات کے تقابلی مطالعے کی فضا پیدا ہوتی تھی۔ کبھی کبھی بین الاقوامی سیاست کا ذکر بھی چھڑ جاتا تھا۔ احتشام صاحب ان معاملات کا بھی خوب تجزیہ کر کے حقائق کو اس طرح ہمارے سامنے پیش کرتے تھے کہ ان کی باتیں ہمارے دلوں میں اتر جاتی تھیں۔

باتیں کرنے اور مشورہ لینے کی غرض سے احتشام صاحب نے ہم لوگوں کو گھر پر آنے کی اجازت بھی دے رکھی تھی۔ شام کو ہم لوگ اکثر ان کے ہاں پہنچ جاتے تھے۔ اطلاع ہوتے ہی احتشام صاحب دو منٹ میں باہر کے کمرے میں آجاتے تھے۔ چائے سے ہماری تواضع ہوتی تھی۔ احتشام صاحب خود پان نہیں کھاتے تھے لیکن ہم لوگوں کے لیے پان بھی منگواتے تھے کیونکہ شاید انھیں بھی یہ علم ہو گیا تھا کہ ہم لوگ پان کے شوقین ہیں اور مسعود صاحب کے پان چپکے چپکے ان کی ڈبیا میں سے نکال کر کھاتے ہیں۔ احتشام صاحب کا گھر ہمیشہ مہمانوں سے بھرا رہتا تھا۔ ان کے مہمان اور خاص طور پر ان کے بچے ان کے پاس آجاتے تھے۔ کبھی گود میں بیٹھتے تھے کبھی ادھر ادھر دوڑتے بھاگتے تھے لیکن احتشام صاحب کا کام جاری رہتا تھا۔ کبھی انھوں نے کسی ملنے والے کو یہ احساس نہیں ہونے دیا کہ وہ مصروف ہیں یا کوئی الجھن یا پریشانی انھیں درپیش ہے۔

احتشام صاحب بڑے ہی انسان دوست آدمی تھے۔ انسان کے دکھ کا انھیں شدید احساس رہتا تھا چنانچہ وہ ہر ایک کی مدد کرتے تھے اور مدد کرنے میں بعض اوقات بنیادی اصولوں تک کو خیرباد کہہ دیتے تھے۔ میرے خیال میں یہ انسانی عظمت کی انتہائی بلندی تھی جس کو انھوں نے چھویا تھا۔

میرے ایک عزیز دوست اور بچپن کے ساتھی تھے جو انٹرمیڈیٹ میں کئی سال فیل ہوتے رہے۔ جب چوتھے سال انھوں نے امتحان دیا تو انگریزی کا ایک پرچہ خراب ہو گیا۔ انھوں نے فیصلہ کر رکھا تھا کہ اگر اس سال بھی فیل ہوئے تو پڑھنے لکھنے سے قطع تعلق کر لیں گے۔ مجھ سے ہر معاملے میں مشورہ کرتے تھے۔ پرچہ خراب ہوا تو میرے پاس آئے اور یہ بری خبر سنائی۔ میں نے ان سے کہا کہ احتشام صاحب کے پاس چلتے ہیں وہ صحیح رائے دیں گے کہ کیا کرنا چاہیے۔ چنانچہ ہم لوگ احتشام صاحب کے پاس پہنچے۔ میں نے اپنے دوست کا تعارف کرایا۔ اور پھر پوری کہانی سنائی۔

احتشام صاحب نے ایک منٹ میں فیصلہ کیا اور پوچھا کہ "کیا آپ کل دہرہ دون جا سکیں گے؟" پرچہ دہرہ دون میں کسی صاحب کے پاس تھا۔ میرے دوست نے کہا "ضرور چلا جاؤں گا۔"

احتشام صاحب نے اپنے لیٹر پیڈ پر اپنے ایک دوست کو جو دہرہ دون میں تھے، یہ خط لکھا۔ "دوست وہ ہے جو دوست کے کام آئے ـــ یہ صاحب ـــ آپ کے پاس آ رہے ہیں خود نہیں آ رہے ہیں میں انھیں بھیج رہا ہوں۔ ان کی روداد سنیے اور ان کا کام کروا دیجیے۔"

یہ تیر نشانے پر لگا اور جو کمی ان کے پرچے میں تھی وہ پوری کر دی گئی۔ وہ پاس ہو گئے اور پھر انھوں نے زندگی میں بڑی ترقی کی اور اس وقت بہت بڑے آدمی ہیں اور بین الاقوامی شہرت کے مالک۔ اگر احتشام صاحب اصول توڑ کر ان کی مدد نہ کرتے تو خدا جانے ان کا کیا حشر ہوا ہوتا۔ کم از کم زندگی میں ترقی کی اس منزل سے تو ہمکنار نہ ہو سکتے جس سے وہ آج ہمکنار ہیں۔

احتشام صاحب طالب علموں کی مدد تو کرتے ہی تھے لیکن ویسے کوئی شخص بھی دست سوال دراز کرے تو ممکن نہیں تھا کہ ان کے در سے خالی ہاتھ واپس چلا جائے۔

میں نے احتشام صاحب کی شخصیت میں ایک فرشتے کو دیکھا اور وہ واقعی ایک فرشتہ تھے۔

لکھنؤ یونیورسٹی میں اپنے مضامین کے اساتذہ کے علاوہ دو شخصیتیں ایسی تھیں جن کو

میں کبھی بھلا نہیں سکتا۔ ایک تو عربی اور اسلامیات کے پروفیسر ڈاکٹر محمد وحید مرزا اور دوسرے عربی اور اسلامیات کے ریڈر ڈاکٹر عبدالعلیم۔

وحید مرزا صاحب انسانیت اور شرافت کے پتلے تھے۔ عربی، فارسی اور اسلامیات کے بہت بڑے عالم تھے۔ حضرت امیر خسروؒ پر انھوں نے جو تحقیقی کام کیا تھا اس کو بین الاقوامی شہرت نصیب ہوئی۔ ۹ بجے سے قبل اپنے کمرے میں آکر بیٹھ جاتے تھے۔ اسی کمرے میں پڑھاتے تھے اور اسی میں دفتر کا کام کرتے تھے۔ کبھی انھیں یونیورسٹی میں ادھر ادھر جاتے ہوئے نہیں دیکھا گیا۔ ساڑھے بارہ بجے چپکے سے نکل کر گھر چلے جاتے تھے۔ ان سے ہر شخص ہر وقت مل سکتا تھا اور وہ ہر شخص کی مدد کے لیے تیار رہتے تھے۔

ان کے مزاج میں باقاعدگی بہت تھی۔ گھر پر بھی کوئی جائے، اطلاع کرائے تو پانچ منٹ کے بعد سوٹ اور ٹائی میں ملبوس پروفیسر صاحب باہر آجاتے تھے اور کبھی کسی کام کے لیے نفی میں جواب نہیں دیتے تھے۔ شرافت کا یہ عالم تھا کہ طالب علموں تک سے آنکھ ملا کر بات نہیں کرتے تھے۔ باتیں کرتے ہوئے بھی شرماتے تھے۔

میں اکثر یونیورسٹی کے دورانِ قیام میں ان کی خدمت میں حاضری دیتا تھا اور وہ میرے لیے ہر جاننے والے کو سفارشی خط لکھ دیتے تھے۔

ڈاکٹر وحید مرزا صاحب کے روپ میں بھی میں نے ایک اور فرشتے کو دیکھا۔

ڈاکٹر عبدالعلیم اصول کے سخت تھے لیکن مفید مشورے دینے میں ان کا ثانی نہیں تھا۔ اسلامیات اور عربی کے پروفیسر تھے لیکن مارکسی فلسفے کا ان پر گہرا اثر تھا۔ جرمنی کے تعلیم یافتہ تھے اور وہیں طالب علمی کے زمانے میں ان پر یہ رنگ چڑھا تھا۔ انھوں نے اردو میں تنقید پر جو مقالات لکھے ہیں وہ اپنی مثال آپ ہیں۔

جب کوئی مسئلہ پیش آجاتا تھا اور فیصلہ کرنے میں دقت ہوتی تھی تو ہم لوگ علیم صاحب کے پاس جاتے تھے اور وہ تجزیہ کر کے ایسی رائے دیتے تھے جو نہایت صائب ہوتی تھی۔

اصول کی سختی کا یہ عالم تھا کہ جب میں نے پی۔ ایچ۔ ڈی کا کام مکمل کر لیا اور ممتحنوں کی رپورٹیں بھی آگئیں لیکن ڈگری کئی سال نہیں ملی کیونکہ میں نے جرمن، فرانسیسی یا روسی زبان کا کوئی امتحان پاس نہیں کیا تھا اور پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کرنے کے لیے یونیورسٹی کے قواعد کے مطابق انگریزی کے علاوہ ایک اور یورپی زبان کا جاننا ضروری تھا۔ میں نے درخواست دی اور یہ موقف اختیار کیا کہ اردو کے لیے جرمن، فرانسیسی یا روسی زبان کا جاننا ضروری نہیں عربی فارسی جاننے کی ضرورت زیادہ ہے لیکن جب یہ معاملہ کمیٹیوں میں پیش ہوا تو سب سے زیادہ اس کی مخالفت علیم صاحب نے کی اور کہا کہ جب تک جرمن یا فرانسیسی کا امتحان پاس نہ کر لیں ڈگری نہ دی جائے۔ چنانچہ مجھے جرمن کا امتحان پاس کرنا پڑا۔ اس کے بعد مجھے ڈگری ملی۔ علیم صاحب بہت خوش ہوئے۔ مبارک باد دی اور مستقبل کے لیے منصوبے بنا کر مجھے دیئے جن پر میں نے عمل کیا اور جس کے نتیجے میں مجھے زیست کرنے اور زندہ رہنے کا سلیقہ آیا۔

لکھنؤ یونیورسٹی میں مجھے کوئی چھ سات سال گزارنے پڑے۔ یہ زمانہ سیاسی اعتبار سے بڑا ہی ہیجان انگیز اور طوفان خیز تھا۔ آزادی کی تحریک اس زمانے میں اپنے شباب پر تھی۔ دوسری جنگ عظیم اسی زمانے میں شروع ہوئی۔ مسلم لیگ کی تحریک نے اسی زمانے میں زور پکڑا۔ پاکستان کی تحریک کی عملی جدوجہد اسی زمانے میں تیز سے تیز تر ہوئی QUIT INDIA MOVEMENT اسی زمانے میں شروع ہوا۔ یونیورسٹی میں ان تمام تحریکوں کے اثرات نظر آتے تھے لیکن ان کی عملی صورتیں یونیورسٹی میں کوئی خاص نظر نہیں آتی تھیں۔ ہم سب ان تحریکوں کے خاموش تماشائی تھے۔ کیونکہ یونیورسٹی میں ماحول بنیادی طور پر اکیڈمک تھا۔ لوگ غور زیادہ کرتے تھے، سوچتے زیادہ تھے۔ بحثیں زیادہ کرتے تھے۔ تبادلۂ خیال زیادہ ہوتا تھا اور بحثوں وغیرہ میں جذباتیت بالکل نہیں ہوتی تھی برخلاف اس کے تجزیاتی اور علمی انداز میں ملک کے معاملات و مسائل کے مختلف پہلوؤں پر غور و خوض ہوتا تھا۔

ان دنوں یونیورسٹی میں جلسے ہوتے رہتے تھے۔ مختلف خیالات و نظریات رکھنے والے سیاسی لیڈر یونیورسٹی میں آتے رہتے تھے اور ان کی دھواں دھار تقریریں ہوتی رہتی تھیں۔ میں نے

گاندھی جی، پنڈت جواہر لال نہرو، مولانا ابوالکلام آزاد، رفیع احمد قدوائی، سبھاش چندر بوس، ایم این رائے، آچاریہ نریندر دیو، رام منوہر لوہیا، سی بی گپتا، پنڈت گوبند بلبھ پنتھ، مولانا حسرت موہانی، مسز سروجنی نائیڈو، سید سجاد ظہیر، قائد اعظم محمد علی جناح، نواب زادہ لیاقت علی خاں، چودھری خلیق الزماں، بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق اور عبدالرحمٰن صدیقی وغیرہ کو انھیں جلسوں میں سنا۔ جلسے مہذب فضا میں ہوتا تھے۔ کبھی مخالف گروپ کسی قسم کا ہنگامہ نہیں کرتا تھا۔

یونین اس زمانے میں ترقی پسندوں کی تھی۔ صدر درگا پرشاد دھر تھے جو بعد میں مقبوضہ کشمیر اور ہندوستان کی حکومت میں وزیر رہے۔ جنرل سکریٹری علی سردار جعفری تھے جو بعد میں ایک شاعر اور نقاد کی حیثیت سے بہت مشہور ہوئے۔ اس یونین کے زیر اہتمام مختلف خیالات و نظریات رکھنے والے سیاسی لیڈر بلائے جاتے تھے۔ تقریریں ہوتی تھیں، سیمینار ترتیب دیئے جاتے تھے اور طالب علم سب کو روشن خیالی کے ساتھ سنتے تھے۔ کبھی کسی جلسے میں کوئی بدمزگی نہیں ہوتی تھی۔ طالب علموں میں سیاسی شعور بہت تھا۔ حصول آزادی کے معاملے میں سب متفق تھے۔ انگریزوں سے نفرت سب کو تھی۔ نوآبادیاتی نظام کی بیخ کنی کے سب ہی قائل تھے۔ ایک نئے نظام اقدار کے قیام سے سب ہی کو دلچسپی تھی۔ ذہنوں کے دریچے سب ہی کے کھلے ہوئے تھے۔

آزادی بہت تھی۔ ذہنوں پر پہرے نہیں تھے۔ ہنگاموں کا دور تھا، لیکن کبھی پولیس یا فوج یونیورسٹی کے اندر داخل نہیں ہوئی۔ جنگ کے زمانے میں بعض استادوں اور طالب علموں کے وارنٹ بھی جاری ہوئے تھے لیکن ان کی تعمیل کے لیے کبھی کوئی پولیس والا یونیورسٹی میں داخل نہیں ہوا۔ "ہندوستان چھوڑ دو" تحریک کے زمانے میں بھی پولیس اور فوج یونیورسٹی کے باہر خاصے فاصلے پر موتی محل کے پل کے نیچے رہتی تھی۔ یونیورسٹی میں کچھ ہوتا رہے، انھیں اس سے کوئی سروکار نہیں تھا۔

دوسری جنگ عظیم شروع ہوئی تو انگریزوں کی حکومت نے چند پروفیسروں اور طالب علموں کو بھی گرفتار کر لیا۔ ڈاکٹر سید حسین ظہیر کیمسٹری کے پروفیسر اور سائنس فیکلٹی کے ڈین بھی گرفتار ہوئے کیونکہ وہ سیاست میں بھی حصہ لیتے تھے اور آزادی کی تحریک میں پیش پیش تھے۔ انھوں نے یونیورسٹی کو یہ

درخواست دی کہ میں جیل جا رہا ہوں مجھے ایک سال کی چھٹی دی جائے۔ معاملہ سنڈیکیٹ میں پیش ہوا اور متفقہ طور پر انھیں سال بھر کی چھٹی دے دی گئی لیکن حکومت نے انھیں تین مہینے کے بعد چھوڑ دیا۔ انھوں نے پھر درخواست دی کہ میں جیل سے واپس آ گیا ہوں میری چھٹی منسوخ کی جائے۔ معاملہ پھر سنڈیکیٹ میں پیش ہوا متفقہ طور پر ان کی چھٹی منسوخ کی گئی۔ انھیں یونیورسٹی میں کام کرنے کی اجازت دی گئی اور وہ عرصے تک کیمسٹری کے پروفیسر اور سائنس کے ڈین کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔

انگریزوں کی حکومت اس معاملے میں خاصی روشن خیال تھی۔ حالانکہ سے اس بات کا علم تھا کہ یونیورسٹی میں کیا استاد اور کیا طالب علم سب اس کے دشمن ہیں۔

اس دشمنی کا اظہار کانووکیشن کے موقع پر ضرور ہوتا تھا لیکن نہایت سلیقے سے۔ چانسلر یعنی گورنر کانووکیشن کے موقع پر ضرور آتا تھا۔ جیسے ہی وہ کانووکیشن کے پنڈال میں داخل ہوتا تھا، لڑکے چھتوں پر چڑھ کر سامنے قومی جھنڈے ضرور لہراتے تھے اور انقلاب زندہ باد کے نعرے ضرور لگتے تھے لیکن کانووکیشن میں کبھی کوئی گڑبڑ نہیں ہوتی تھی۔ مقصد صرف برطانوی حکومت کے خلاف مظاہرہ ہوتا تھا۔

میں کوئی چھ سات سال یونیورسٹی میں رہا اور میں نے چار کانووکیشنوں میں چار ڈگریاں حاصل کیں۔ سنہ ۱۹۴۰ء میں بی۔اے کی ڈگری ملی، سنہ ۱۹۴۱ء میں بی۔اے آنرز کی، سنہ ۱۹۴۲ء میں ایم۔اے کی اور سنہ ۱۹۴۸ء میں پی۔ایچ۔ڈی کی۔ پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگری ملنے میں دو ڈھائی سال کی تاخیر اس لیے ہوئی کہ اس ڈگری کے حاصل کرنے کے لیے ایک یورپی زبان کی سند کا حاصل کرنا ضروری تھا چنانچہ مجھے جرمن پڑھنی پڑی اور اس کی سند حاصل کرنے کے لیے باقاعدہ امتحان بھی دینا پڑا۔ پھر سنہ ۱۹۴۷ء میں ہندوستان آزاد ہو گیا اور یہ آخری کانووکیشن جس میں مجھے پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگری ملی، پہلی ہندوستانی گورنر یعنی چانسلر مسز سروجنی نائیڈو کی صدارت میں منعقد ہوا۔ یہ کانووکیشن اس اعتبار سے اہم تھا کہ اس میں ہندوستان کے وزیر اعظم جواہر لال نہرو، مقبوضہ کشمیر کے وزیر اعلیٰ شیخ محمد عبداللہ، علی گڑھ یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب، یوپی کے وزیر تعلیم سمپورنانند جی کو بھی آنریری ڈاکٹریٹ کی ڈگریاں پیش کی گئیں۔ باقاعدہ پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگریاں حاصل کرنے والے اس سال صرف دو تھے۔ ایک میں، جس کو اردو میں یونیورسٹی کی پہلی

ڈگری ملی اور دوسرے ایک اور صاحب جو سائنٹسٹ تھے۔

مسز سروجنی نائیڈو نے یہ ڈگریاں تقسیم کرتے ہوئے اپنی خطابت اور شاعری کے جوہر دکھائے۔ اور فرداً فرداً ڈاکٹریٹ کی ڈگریاں حاصل کرنے والے تمام لوگوں کو اس طرح کی نصیحتیں کیں جن میں مزاح کا پہلو غالب تھا اور جس کی وجہ سے کانووکیشن زعفران زار بن گیا۔

لکھنؤ یونیورسٹی میں پڑھنے لکھنے کا ماحول خاصا تھا۔ اساتذہ پڑھنے لکھنے میں کھوئے ہوئے نظر آتے تھے۔ ان کی دیکھا دیکھی طالب علم بھی لکھنے پڑھنے ہی میں زیادہ وقت گزارتے تھے۔ لائبریری صبح سے شام تک کھلی رہتی تھی۔ صبح آٹھ بجے سے ساڑھے نو بجے تک طالب علموں کو خود کتابیں نکالنے کی اجازت تھی۔ اس کے بعد نمبر دے کر کتابیں نکلوائی جا سکتی تھیں۔ ریڈنگ روم بہت بڑا تھا بیک وقت ایک ہزار سے زیادہ طالب علم وہاں بیٹھ کر پڑھ سکتے تھے۔ میں نے یونیورسٹی کے دورانِ قیام میں اس لائبریری سے بہت استفادہ کیا۔ پڑھنے کی ایک پیاس تھی جو کسی طرح بجھتی ہی نہیں تھی۔ چونکہ میں لائبریری میں زیادہ وقت گزارتا تھا اس لیے انگریزی اور اردو سے متعلق ہر کتاب کا مجھے علم تھا کہ وہ کہاں رکھی ہے۔ پرانے رسالوں کی فائلوں کی ورق گردانی پر بھی میں نے خاصا وقت صرف کیا تھا اور مجھے مخزن، اردوئے معلیٰ، تہذیب الاخلاق اور دوسرے پرانے اور نئے رسالوں سے بھی پوری طرح واقفیت تھی۔ اس زمانے میں مجھے پڑھنے کے مواقع خوب ملے۔ ادب اور شاعری کے ساتھ ساتھ فلسفہ نفسیات، عمرانیات، معاشیات، سیاسیات وغیرہ کا تعلق ہے، دنیا کے مختلف ملکوں میں بین الاقوامی شہرت رکھنے والے ان فنون کے علمبرداروں سے تو میں انڈر گریجویٹ اسٹیج ہی پر آشنا ہو گیا تھا۔ روس فرانس، جرمنی، ترکی اور انگلستان کے ادیب، شاعر، افسانہ نگار اور ناول نگار میری دلچسپی کا باعث بنے اور میں نے ان کی تخلیقات کا بڑے ذوق و شوق سے مطالعہ کیا۔ اس کی محرک یونیورسٹی کی وہ علمی فضا تھی جو دوسری یونیورسٹیوں میں ذرا کم ہی نظر آتی ہے۔

میں نے لکھنؤ یونیورسٹی کے دورانِ قیام میں کوئی چار وائس چانسلروں کا زمانہ دیکھا لیکن اس زمانے میں نہ تو کبھی وائس چانسلر کے دفتر کی طرف طالب علم جاتے تھے نہ وائس چانسلر کبھی اکیڈمک

بلاک میں آتے تھے۔ وائس چانسلر دو تین گھنٹے کے لیے اپنے دفتر میں آتے تھے اور ضروری دفتری کام کر کے چلے جاتے تھے۔ ان کا سکریٹری تمام دن دفتر میں البتہ موجود رہتا تھا۔ بہت کم لوگ وائس چانسلر سے ملنے آتے تھے کیونکہ بیشتر مسائل پروفیسروں ہی کی سطح پر حل کر دیئے جاتے تھے۔ دفتر میں بڑی پرسکون سی فضا تھی۔

میں جب یونیورسٹی میں داخل ہوا تو ڈاکٹر پارنجپائی کی وائس چانسلری کا زمانہ ختم ہو رہا تھا۔ تھوڑے ہی دن کے بعد معلوم ہوا کہ شیخ محمد حبیب اللہ صاحب یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہو گئے۔ شیخ صاحب راجہ صاحب محمود آباد کی ریاست کے منصرم تھے اور خود اودھ کے اچھے خاصے تعلق دار تھے۔ بوڑھے خاصے تھے۔ اس وقت بھی ان کی عمر پچھتر سال سے اوپر تھی۔ شیخ صاحب جب وائس چانسلر ہوئے تو سب سے پہلے انھوں نے یہ کہا کہ میں تنخواہ نہیں لوں گا مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے لیکن بعض احباب نے انھیں مشورہ دیا کہ اگر آپ تنخواہ کی رقم وظیفے کے طور پر چند طالب علموں کو دیں گے تو اس سے طالب علموں کو بہت فائدہ ہوگا چنانچہ وہ اس پر تیار ہو گئے اور تنخواہ کی رقم کچھ طالب علموں کو وظیفے کے طور پر دے دی۔ ہر مہینے طالب علموں کو یہ وظیفہ مل جاتا تھا اور اس طرح ان کی مدد ہو جاتی تھی۔ شیخ صاحب بڑے ہی مرنجاں مرنج، مہذب اور شائستہ آدمی تھے۔ یونیورسٹی میں ان کا بڑا احترام کیا جاتا تھا اور وہ خود یونیورسٹی کے لوگوں کا بہت احترام کرتے تھے

شیخ محمد حبیب اللہ صاحب تین سال وائس چانسلر رہے۔ ان کے بعد راجہ بشیشر دیال سیٹھ وائس چانسلر ہو گئے۔ راجہ صاحب اودھ کے تعلقہ داروں میں سے تھے۔ انھیں لکھنوی تہذیب کا نمونہ کہا جائے تو بے جا نہیں۔ پانوں کا خاصدان ہمیشہ ان کے ساتھ ہوتا تھا جب وہ دفتر آتے تھے تو ان کا اردلی خاص طور سے موٹر سے خاصدان نکال کر ان کے پیچھے پیچھے جاتا تھا۔ بھاری بھرکم جسم کے وجیہہ آدمی تھے۔ سرخ و سفید رنگ تھا۔ باتیں کم کرتے تھے لیکن کام ہر ایک کا کر دیتے تھے۔

تیسرے وائس چانسلر آچاریہ نریندر دیو تھے جو اپنے زمانے کے مشہور سوشلسٹ لیڈر اور سنسکرت، عربی، فارسی، ہندی اور اردو کے بہت بڑے عالم تھے۔ ان کے مزاج میں بڑی سادگی تھی۔ کھدر کا کر

اور کھدر کا پاجامہ پہنتے تھے اور کارلٹن ہوٹل کے ایک کمرے میں رہتے تھے۔ مجھے ان سے اپنے جرمن کے امتحان کے سلسلے میں کئی بار ملنا پڑا۔ میرے لیے انھوں نے خاص طور پر جرمن زبان کا امتحان لینے کے لیے امتحان کے دفتر کو ہدایت کی تاکہ مجھے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری جلد مل جائے۔ یہ ڈگری ایک یورپی زبان کی سند نہ ہونے کی وجہ سے دو سال سے رُکی ہوئی تھی۔ آچاریہ جی مجھ سے کہنے لگے "میں چاہتا تھا کہ اس کے بغیر آپ کو ڈگری مل جائے کیونکہ اردو کی ڈاکٹریٹ کے لیے جرمن زبان کی قید بے معنی ہے لیکن میں کیا کروں ڈاکٹر علیم صاحب نے خاص طور پر کہا کہ یہ شرط اردو کے لیے بھی لازمی رکھی جائے اس لیے میں مجبور ہو گیا۔ بہر حال اب میں نے آپ کے امتحان کا انتظام کروا دیا ہے۔ آپ امتحان دے دیجیے اور سند لے لیجیے۔ جرمن کے پروفیسر ڈاکٹر چترجی سے بھی میں نے کہہ دیا ہے کہ آپ کی مدد کریں آپ اُن سے مل لیجیے۔" یہ آچاریہ جی کی انسان دوستی تھی جس کی وجہ سے میں خصوصی امتحان دے سکا اور مجھے جرمن کی سند ملی ورنہ باقاعدہ پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری ملنے میں کم از کم دو سال اور لگ جاتے۔

آچاریہ جی وائس چانسلر ہونے سے چند ماہ قبل ہندی کے شعبے میں تقریر کرنے کے لیے آئے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ انھوں نے آسان اردو زبان میں تقریر شروع کی تھی۔ پیچھے سے کسی طالب علم کی آواز آئی۔ "ہندی میں بولیے۔" آچاریہ جی کہنے لگے "میں ہندی ہی بول رہا ہوں۔ کہیے تو ہندی کی جگہ سنسکرت میں تقریر کروں؟ یا پھر فارسی بولوں۔" چنانچہ انھوں نے شدھ ہندی میں اور پھر سنسکرت میں تقریر شروع کر دی۔ سناٹا چھا گیا۔ پھر اس کے بعد وہ فارسی میں تقریر کرنے لگے، سناٹا چھایا رہا۔ لڑکے شرمندہ ہوئے۔ معذرت کی آواز آئی۔ آچاریہ جی نے کہا "میں ہر زبان میں تقریر کر سکتا ہوں لیکن بولنے اور سمجھنے والی زبان وہی ہے جس میں پہلے تقریر کر رہا تھا۔ اس کو آپ ہندی کہہ لیجیے یا اردو۔ ہم سب یہی زبان بولتے اور سمجھتے ہیں۔"

آچاریہ جی بڑے ہی روشن خیال اور کشادہ دل آدمی تھے۔ سچائی اور خلوص کے عناصر ان میں کوٹ کوٹ کر بھرے ہوئے تھے۔ کھری اور صاف بات کہتے تھے۔ کوئی لگی لپٹی نہیں رکھتے تھے۔ علم کا

مجسمہ تھے۔ ہفت زبان تھے لیکن انھیں بڑائی کا احساس بالکل نہیں تھا اور اسی میں ان کی بڑائی تھی

لکھنؤ یونیورسٹی میں طالب علم دور دور سے آتے تھے۔ کشمیر، پنجاب، بنگال، مدراس، بمبئی، سندھ، بلوچستان اور صوبۂ سرحد کے طالب علموں کی تعداد بھی خاصی تھی۔ یہ لوگ اپنی اپنی زبان، لہجے اور رہن سہن کے انداز سے پہچانے جاتے تھے۔ اودھ اور یو۔ پی کے دوسرے اضلاع کے طالب علموں کی تعداد بہت زیادہ ہوتی تھی۔ ہندو طالب علموں کے مقابلے میں مسلمان طالب علم کم ہوتے تھے لیکن اس صورت حال کے باوجود وہاں تعصب نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ یہ خیال بھی نہیں ہوتا تھا کہ کون کہاں کا رہنے والا ہے یا کس قسم کے عقائد رکھتا ہے۔ انسان کو جانچنے کا معیار یہ تھا کہ کس میں کتنی انسانیت ہے، کون کتنا روشن خیال ہے اور کس میں کتنی تہذیب و شائستگی ہے! انسانی قدروں کے احساس کو معیار تصور کیا جاتا تھا۔ صرف ترقی پسندی کو اہمیت دی جاتی تھی۔

گزشتہ نصف صدی میں جو طالب علم لکھنؤ یونیورسٹی سے نکلے ان میں سے بہت سے لوگوں نے زندگی کے مختلف شعبوں میں بڑا نام پیدا کیا۔ حضرت مولانا عبدالماجد دریابادی نے فلسفہ نفسیات اور دینی علوم میں قابل قدر کام کیا اور اردو میں انشا پردازی کا ایک نیا رنگ نکالنے میں بڑی ناموری حاصل کی۔ پروفیسر سید مسعود حسن رضوی ادیب ایک اہم محقق اور ادیب کی حیثیت سے بہت مشہور ہوئے۔ سید ہاشم رضا بہت بڑے آئی۔ سی۔ ایس افسر ثابت ہوئے۔ مرزا جعفر علی خاں اثر نے شاعری اور تنقید میں بڑا نام پیدا کیا۔ انور جمال قدوائی بہت بڑے سفارت کار اور ماہر تعلیم بنے۔ ڈاکٹر احسن فاروقی نے ایک ناول نگار اور تنقید نگار کی حیثیت سے بڑی شہرت حاصل کی۔ حبیب الرحمٰن خاں بہت بڑے صحافی بنے اور ترجمے کی دنیا میں ایسی مہارت حاصل کی کہ روس میں ترجمے کرنے کے لیے ان کا انتخاب ہوا۔ عبدالحفیظ خاں اور سید مہدی حسنین ہندوستانی فوج میں اعلیٰ ترین عہدوں پر فائز ہوئے اور رمضان اللہ بیگ نے پاکستان کی فوج میں نام پیدا کیا اور ساتھ ہی ادب و شعر کی دنیا میں بھی ہنگامے برپا کرتے رہے۔ ممتاز حسن عابدی نے بینکنگ کی دنیا میں ایک انقلاب برپا کر دیا۔ غوث محمد خاں برسوں تک ٹینس کی دنیا میں ہندوستان کے نمبر ایک کھلاڑی رہے اور انھوں نے اپنے زمانے میں بہت سے ریکارڈ توڑے اور سید نورالحسن اور

درگاپرشاد دھر نہ صرف علم و ادب کے ستون ثابت ہوئے بلکہ ہندوستان میں وزیروں کی حیثیت سے بھی انھوں نے بڑا نام پیدا کیا اور پاکستان میں ایڈمرل آصف علوی اور ایڈمرل مظفر حسن نے پاکستانی بحریہ میں بڑے اہم کارنامے انجام دیے اور مسیح الدین احمد صدیقی نے اکادمی ادبیات پاکستان کے ڈائرکٹر جنرل کی حیثیت سے ادب اور ادیبوں کے لیے اپنی خداداد صلاحیتوں سے بڑا کام کیا۔

لیکن یہ تو صرف چند نام ہیں۔ ان کے علاوہ ہزاروں کی تعداد میں لکھنؤ یونیورسٹی کے فرزند ایسے ہیں جنھوں نے نہ صرف ہندوستان، پاکستان بلکہ برعظیم کے باہر بھی بڑا نام پیدا کیا۔

لکھنؤ یونیورسٹی میں ایک ادارہ یو۔ٹی۔سی (یونیورسٹی ٹریننگ کور) بھی تھا جس میں طالب علموں کو فوجی تربیت دی جاتی تھی۔ حکومت کی طرف سے ایک انگریز فوجی افسر کرنل یا لفٹیننٹ کرنل اس ادارے کے کام کو چلانے کے لیے مقرر کیا جاتا تھا۔ طالب علموں کو وردی اور رائفل وغیرہ حکومت کی طرف سے مہیا کیے جاتے تھے۔ ہفتے میں تین دن ایک دو گھنٹے کی پریڈ ہوتی تھی۔ بعض ساتھیوں نے مجھے بھی سبز باغ دکھایا، اور میں بھی یو۔ٹی۔سی میں داخل ہو گیا۔ یو۔ٹی۔سی انگریزوں کی فوج کا ایک حصہ تھا لیکن ہم لوگ اس میں ہوتے ہوئے بھی انگریزوں کے سخت مخالف تھے۔ کبھی کبھی پریڈ کے بعد انگریز فوجی افسر کے سامنے اس کا اظہار بھی ہو جاتا تھا۔ ہم لوگوں کی باتیں وہ غور سے سنتا تھا، اور بالآخر کہتا تھا "تم لوگوں کے خیالات بڑے انقلابی ہیں۔" آدمی معاملہ فہم اور باذوق تھا۔ مزاح کی حس بھی اس کے یہاں خاصی بیدار تھی۔ اس لیے اپنے دفتر کے عملے سے کبھی کبھی مذاق میں کہتا تھا کہ یہ لڑکے بڑے خطرناک ہیں۔ ان کے مزاج انقلابی ہیں۔ ان سے ذرا بچ کر رہنا، احتیاط کرنا، ان کی انقلاب پسندی کوئی نہ کوئی گل ضرور کھلائے گی۔ دلچسپ آدمی تھا۔ معاملہ فہمی اس کے مزاج میں تھی۔ یونیورسٹی کی فضا کو خوب سمجھتا تھا۔ ہندوستان کی سیاست سے اسے خوب واقفیت تھی۔ اس لیے وہ ہم سے بحث بھی کر لیتا تھا ورنہ اس زمانے کے انگریز فوجی افسر بھلا اس کو کب گوارا کر سکتے تھے۔

سال میں ایک دفعہ نومبر کے مہینے میں پندرہ دن کا یو۔ٹی۔سی کیمپ ہندوستان کے کسی اور شہر میں ہوتا تھا۔ یو۔پی کی تمام یونیورسٹیوں کی یو۔ٹی۔سی کمپنیاں ایک جگہ جمع ہوتی تھیں۔ فوجی مشقوں کا سلسلہ پندرہ روز تک جاری رہتا تھا۔ شام کو سب لوگ آپس میں مل بیٹھتے تھے۔ خوش گپیاں ہوتی تھیں۔

شعر پڑھے جاتے تھے، لطیفے سنائے جاتے، غرض نہایت پُرلطف ماحول ہوتا تھا اور اسی اجتماع یعنی "گیٹ ٹوگیدر" کو اس کیمپ میں شریک ہونے والے اہمیت دیتے تھے۔

کیمپ کے موقع پر ایک دن یونیورسٹی کا کوئی پروفیسر بھی پورے بٹالین کو پریڈ کرواتا اور سلامی لیتا تھا۔ اس زمانے میں الٰہ آباد یونیورسٹی کے پروفیسر کیپٹن سید ضامن علی صاحب بھی یو ٹی سی میں تھے۔ وہ کہتے تھے "کمپنی لفٹ ٹرن" ـــ لیکن کبھی بھول جاتے تھے لفٹ ٹرن کی جگہ رائٹ ٹرن کہہ جاتے تھے۔ احساس ہوتا تھا تو زور کہتے تھے "لاحول ولا قوۃ، رائٹ ٹرن" اس پر سب کو ہنسی آجاتی تھی۔

ہمارا پہلا کیمپ دلی کے قریب تغلق آباد میں ہوا۔ اس زمانے میں تغلق آباد ایک بہت بڑا ویرانہ تھا جہاں کیمپ لگایا گیا تھا، وہاں حد نظر تک ریت ہی ریت نظر آتی تھی۔ سبزہ بہت کم تھا۔ درخت کہیں کہیں نظر آتے تھے۔ قریب ہی غیاث الدین تغلق کا مقبرہ تھا اور سامنے میلوں میں پھیلا ہوا تغلق آباد کا قلعہ جس کی فصیلیں تو ابھی تک محفوظ تھیں لیکن اس کے اندر کتنے ہی گاؤں آباد تھے۔ پندرہ روز کے قیام میں ہم نے وہاں فوجی مشقوں کے ساتھ ساتھ آس پاس کی تاریخی عمارتیں دیکھیں۔ چھٹی کے دن دلی کی سیر کی، حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ، حضرت امیر خسروؒ، حضرت خواجہ بختیار کاکیؒ، اور حضرت کلیم اللہ جہاں آبادیؒ کے مزاروں پر حاضری دی۔ تاریخی عمارتوں کو دیکھا، بازاروں اور گلیوں میں گھومے، جامع مسجد پر مزے دار کھانے کھائے، چاندنی چوک اور کناٹ پلیس میں کچھ وقت گزارا اور کوئی دو ہفتے کے بعد تغلق آباد اور دلی کی سیر کرکے واپس لکھنؤ پہنچے۔

دوسرا کیمپ لکھنؤ کے قریب اٹریا میں ہوا۔ اس میں بھی وہی ماحول تھا البتہ ایک واقعہ اس زمانے میں ایسا ہوا جسے میں کبھی بھول نہیں سکتا۔ ہوا یوں کہ کیمپ کے زمانے میں عید ہوئی۔ عید کرنے کے لیے بیشتر لڑکے اٹریا کے کیمپ سے لکھنؤ آئے۔ دن بھر عید کی مصروفیت رہی۔ طے پایا کہ رات کو دس بجے سے قبل سب لڑکے سٹی ریلوے اسٹیشن پر جمع ہو جائیں گے اور اس ٹرین میں اٹریا چلیں گے جو لکھنؤ سے بریلی جاتی ہے چنانچہ سب لوگ حسب وعدہ اسٹیشن پر جمع ہو گئے۔ گاڑی آئی ہم نے گارڈ سے پوچھا کیا یہ گاڑی اٹریا رکتی ہے؟ اس نے کہا اٹریا رکتی تو نہیں لیکن آپ طالب علم ہیں اس لیے کیمپ کے قریب ٹرین کو آہستہ کر دوں گا۔ دو تین

منٹ رک بھی جائے گی آپ لوگ اتر سکتے ہیں لیکن سب لوگ ٹکٹ لے لیں ٹکٹ لڑکوں نے پہلے ہی خرید لیے تھے۔ ٹرین میں بیٹھ گئے جب گاڑی اٹریا کے قریب پہنچی تو بجائے رکنے یا آہستہ ہونے کے اور تیز ہو گئی اور سدھولی کے اسٹیشن پر جا کر رکی۔ لڑکوں کو بہت غصہ آیا گارڈ کو زد و کوب کرنا شروع کر دیا۔ گاڑیوں کے شیشے توڑ ڈالے۔ کوئی تین چار گھنٹے یہ ہنگامہ جاری رہا۔ بالآخر گارڈ نے کہا کہ وہ ڈبے آپ لوگوں کو کیمپ تک لے جائیں گے اس وعدے پر ہنگامہ ختم ہوا۔ تین چار بجے صبح کو ہم لوگ کیمپ پہنچے، گارڈ روم میں رپورٹ کی۔ گیارہ بجے رات تک پہنچنا چاہیے تھا۔ چار بجے صبح کو پہنچے۔ صبح کو پیشی ہوئی حساب کے پروفیسر کرنل اسٹرانگ ہمارے سی۔ او۔ تھے۔ ان کا قد چھوٹا تھا اس لیے لڑکے انھیں "ادھا" کہتے تھے۔ وہ خود آئے لڑکوں کو سرزنش کی اور سزا کے طور پر فائننگ کا اعلان کیا لیکن ہمارے ایڈجوٹنٹ کرنل ولیم نے یہی موقف اختیار کیا کہ ہمارے لڑکوں نے کوئی زیادتی نہیں کی ہے۔ گارڈ کو وعدے کے مطابق کیمپ کے قریب ٹرین روک لینی چاہیے تھی۔ اس طرح ہماری جان کچھ بچ گئی صرف بیس بیس روپے جرمانے کے دینے پڑے تاکہ ریلوے کے ارباب اختیار کو ان ڈبوں کا کرایہ دیا جا سکے جن میں لڑکوں کو کیمپ تک بھیجا گیا تھا۔ جان بچی لاکھوں پائے ــــ آج مجھے یہ حرکت طفلانہ معلوم ہوتی ہے لیکن اس وقت میں اس کو صحیح سمجھتا تھا۔ وقت بھی انسان کو کیا سے کیا بنا دیتا ہے

اس مادر علمی کی آغوش میں چھ سات سال آنکھ جھپکاتے گزر گئے لیکن اس عرصے میں ہم نے یونیورسٹی سے بہت کچھ بلکہ سب کچھ حاصل کیا یہاں زندگی اور اس کے معاملات و مسائل کے سمجھنے کا شعور پیدا ہوا۔ زندگی بسر کرنے کے آداب آئے، پڑھنے پڑھانے کا ذوق و شوق پیدا ہوا، علمی، ادبی کام کرنے کی لگن پیدا ہوئی، ادبی ذوق میں نکھار آیا، روشن خیالی اور کشادہ دلی نے دل میں جگہ بنالی۔ نظریات پختہ ہوئے، آزادی کی دولت بیش بہا کا احساس پیدا ہوا، اخوت و محبت کی شمعیں دلوں میں فروزاں ہوئیں اور دشمنوں تک سے محبت کرنے کے آداب آئے ــــ اور یہ ایسی دولت بیش بہا تھی جو لازوال ہے۔

آٹھواں باب

تلاشِ معاش

سن ۱۹۴۲ء میں ایم۔اے پاس کرنے کے بعد میں نے پی۔ایچ۔ڈی میں داخلہ لیا اور اردو تنقید کے ارتقا کے موضوع پر کام شروع کر دیا لیکن اس ریسرچ کے کام کے لیے نہ کوئی فیلو شپ، نہ اسکالر شپ، چند مہینے بھی نہ گزرے تھے کہ ریسرچ کا یہ کام عیاشی معلوم ہونے لگا اگرچہ ریسرچ اسکالر کی حیثیت سے یونیورسٹی نے پڑھانے کا کچھ کام میرے سپرد کیا تھا اور خیال تھا کہ اس کا کچھ معاوضہ بھی ملے گا، لیکن جس دن میں نے پڑھانا شروع کیا اسی دن یونیورسٹی کے آس پاس گولی چلی۔ "ہندوستان چھوڑ دو" کی تحریک اس زمانے میں زوروں پر تھی۔ سارے ملک میں ہنگامے ہو رہے تھے۔ یونیورسٹی کے قریب بھی خاصا ہنگامہ ہوا اور اس کے نتیجے میں پولیس نے گولی چلائی۔ کچھ لوگ ہلاک اور زخمی ہوئے اور یونیورسٹی غیر معینہ مدت کے لیے بند کر دی گئی ع

آں قدح بشکست و آں ساقی نماند

اب مجھے بے کاری اور بے روزگاری کا احساس کچھ زیادہ ہی ہونے لگا۔ دوسری جنگِ عظیم نے ساری دنیا میں قیامت برپا کر رکھی تھی۔ سارا نظامِ حیات درہم برہم ہو گیا تھا۔ ہزاروں، لاکھوں کی تعداد میں لوگ بھرتی ہو ہو کر لام پر جا رہے تھے۔ یورپ میں جنگ، ایشیا میں جنگ، افریقہ میں جنگ۔ ہر طرف جنگ ہی جنگ نظر آتی تھی۔ جنگ نے غیر یقینی کیفیت اور کساد بازاری کو جنم دیا تھا۔ ضرورت کی چیزیں نایاب ہو گئی تھیں، گرانی انتہا کو پہنچ گئی تھی اور کاروبار ٹھپ ہو گئے

تھے۔ پڑھے لکھے لوگوں کو خاص طور پر بے کاری کا سامنا تھا۔ سوائے فوج کے کوئی اور ملازمت ملتی ہی نہیں تھی اور میری نسل کے تمام لوگ بے کاری اور بے روزگاری کی اس صورت حال کا شکار تھے۔

ایم۔ اے تو میں پاس کر ہی چکا تھا۔ اب مجھے کسی کالج میں لیکچر شپ مل سکتی تھی لیکن اس کے لیے سفارش، دوڑ دھوپ اور جان پہچان کی ضرورت تھی۔ اور یہ کام مجھے نہیں آتا تھا۔ میرے مزاج میں ایک طرح کی گوشہ نشینی تھی۔ سوچتا تھا لکھنؤ میں کوئی سو دو سو روپے کی لیکچراری مل جائے تو لکھنے پڑھنے کا موقع ملے گا اور اس طرح میں پی۔ ایچ۔ ڈی کا کام بھی مکمل کر سکوں گا لیکن اردو کی لیکچر شپ کا اس زمانے میں ملنا بادشاہت کا ملنا تھا۔ لکھنؤ سے باہر جانے کو جی اس لیے نہیں چاہتا تھا کہ وہاں پڑھنے لکھنے کا ماحول نہیں ہوگا اور جو تھوڑا بہت پڑھا لکھا ہے وہ بھی بھول جاؤں گا لیکن لکھنؤ سے باہر بھی لیکچر شپ کا ملنا آسان نہ تھا۔ ہندی کا زور تھا۔ تعصب انتہا کو پہنچ گیا تھا۔ اردو کو ختم کرنے کے منصوبے بنائے جا رہے تھے۔ اردو کو بھلا کون پوچھتا تھا۔ اسّی، نوّے فی صد آبادی کے لیے اردو کوئی زبان ہی نہیں تھی پھر بھی اندھیرے میں تیر چلاتا رہا۔ سیکڑوں کی تعداد میں ہندوستان کے دور دراز علاقوں تک میں میں نے درخواستیں بھیجیں لیکن کہیں سے رسید کی اطلاع تک نہیں آئی اور میں لکھنؤ کی سڑکوں پر جوتیاں چٹخاتا پھرتا رہا۔

اسی زمانے میں کسی نے یہ مژدۂ جاں فزا سنایا کہ کالون تعلقے دار کالج میں اردو پڑھانے کی ایک جگہ ہے۔ یہ کالج لکھنؤ یونیورسٹی کے سامنے سڑک کے دوسری طرف میلوں کے رقبے میں پھیلا ہوا تھا۔ اس میں کالج کی سی تو کوئی بات نہیں تھی۔ یہ ایک پبلک اسکول تھا جس میں چھوٹی جماعتوں سے انٹرمیڈیٹ تک تعلیم دی جاتی تھی اور زیادہ تر بڑے بڑے تعلقے داروں، امیروں، رئیسوں اور سرمایہ داروں کے لڑکے اس میں دور دراز علاقوں سے پڑھنے کے لیے آتے تھے۔ فیسیں وغیرہ بہت زیادہ تھیں اس لیے متوسط گھرانوں کے لڑکے اس کالج میں داخل نہیں ہو سکتے تھے۔ پڑھائی کے ساتھ ساتھ گھڑسواری، تیر اندازی، شمشیر زنی وغیرہ کے فن بھی لڑکوں کو سکھائے جاتے تھے

کہ یہ لڑکے اپنی خاندانی روایات اور نسلی خصوصیات کو برقرار رکھ سکیں۔

پرنسپل اس کالج کا ہمیشہ انگریز ہوتا تھا جس کو خاص طور پر انگلستان سے بلا کر کالج کے سیاہ و سفید کا مالک بنا دیا جاتا تھا۔

خیر تو میں نے اس کالج میں اردو میں لیکچر شپ کے لیے درخواست دے دی۔ مسٹر ڈیوڈسن اس زمانے میں کالون کالج کے پرنسپل تھے۔ آکسفورڈ سے نئے نئے آئے تھے۔ انھوں نے نہ صرف یہ کہ اس زمانے کے معقول انگریزوں کی طرح فوراً درخواست کی رسید بھیجی بلکہ ذاتی خط لکھ کر مجھے انٹرویو کے لیے بھی بلایا۔ میں بہت خوش ہوا اور مقررہ وقت پر کالج میں ڈیوڈسن صاحب سے ملنے کے لیے پہنچا۔ ساتھ میں کتابوں اور رسالوں کا وہ پلندہ بھی لیتا گیا جن میں اب تک میرے مضامین چھپے تھے۔

ڈیوڈسن صاحب کو اطلاع کرائی تو انھوں نے مجھے فوراً اندر بلایا۔ نہایت خندہ پیشانی سے ملے کرسی سے اُٹھ کر ہاتھ ملایا اور بیٹھنے کے لیے کہا۔

میں بیٹھ گیا۔

وہ حال احوال پوچھنے لگے میں نے تفصیل بیان کی۔ اپنا مطبوعہ ادبی کام انھیں دکھایا۔ اس سے وہ بہت متاثر ہوئے۔

کہنے لگے "آپ نے تو بہت زیادہ کام کیا ہے۔ آپ کو تو کسی یونیورسٹی میں ہونا چاہیے تاکہ آپ کو علمی کام کرنے کا زیادہ سے زیادہ موقع ملے۔ کالون کالج تو جیسا کہ آپ جانتے ہیں، پبلک اسکول ہے۔ کالج تو صرف نام کا ہے۔ یہاں کوئی علمی فضا نہیں ہے۔ سارا دن لڑکوں کی دیکھ بھال میں صرف ہو جاتا ہے۔ آپ کی جگہ تو یونیورسٹی میں ہونی چاہیے۔"

یہ سن کر میری زبان سے نکلا "اے روشنیِ طبع تو برمن بلا شدی"۔

ڈیوڈسن صاحب نے پوچھا "آپ کو ان تحریروں کا معاوضہ کتنا مل جاتا ہے؟"

میں نے کہا "کچھ بھی نہیں۔"

اس پر وہ بہت حیران ہوئے۔ نئے نئے آکسفورڈ سے آئے تھے اس لیے وہ سوچ بھی نہیں سکتے

تھے کہ ادبی اور علمی تحریریں بغیر کسی معاوضے کے بھی شائع کی جا سکتی ہیں۔

کہنے لگے: ”آکسفورڈ میں میرے دو کلاس فیلو تھے۔ ایک ان میں سے بہت اچھا ادیب تھا، دوسرے نے نشر و اشاعت کا پیشہ اختیار کیا۔ دونوں کی آپس میں گہری دوستی تھی، لیکن جب ادیب دوست کی تحریریں شائع کرنے کا معاملہ سامنے آیا تو دونوں نے ایک دوسرے سے کوئی رعایت نہیں کی۔ ادیب نے اپنے دوست سے اصول کے مطابق اپنی رائلٹی وصول کی۔“

میں نے کہا: ”یہاں اس ملک میں یہ سب کچھ نہیں ہوتا۔“

کوئی ایک گھنٹے تک اسی طرح کی باتیں ہوتی رہیں۔ بالآخر یہ طے ہوا کہ ڈیوڈسن صاحب اپنے دوست کیپٹن کینیڈین والا کو میرے بارے میں خط لکھیں گے تاکہ وہ ایجوکیشن کور میں مجھے ملازم رکھ لیں۔ چنانچہ انھوں نے اسی وقت اپنے ہاتھ سے خط لکھ کر مجھے دیا لیکن میں اس سے کوئی فائدہ نہ اٹھا سکا کیوں کہ مجھ پر لکھنؤ یونیورسٹی سے پی۔ ایچ۔ ڈی کرنے کا بھوت سوار تھا، اور اس کام کے لیے میرا لکھنؤ میں قیام ضروری تھا۔

کاؤن تعلقے دار کالج میں ناکامی کے بعد میرے حوصلے پست تو نہیں ہوئے لیکن یہ احساس ضرور پیدا ہوا کہ ملازمت کا حاصل کرنا آسان کام نہیں ہے بلکہ ٹیڑھی کھیر ہے۔

اب میں نے یہ سوچا کہ یونیورسٹی یا کالج میں تو ملازمت ملنا مشکل ہے۔ اس لیے دوسرے محکموں میں ملازمت کی کوشش کرنی چاہیے۔ چنانچہ میں نے سکریٹریٹ کی طرف رخ کیا۔ ایک دن اسمبلی چیمبرز میں جا کر سید عبدالحسن صاحب سے ملا جو اسٹبلشمنٹ کے ڈپٹی سکریٹری تھے۔ سکریٹریٹ کی نیچے درجے کی ملازمتیں دینے کا انھیں پورا اختیار تھا۔ عبدالحسن صاحب نے درخواست لکھوائی اور اس پر اپنے قلم سے اسی وقت لکھا: ”اپوائنٹڈ“۔ یہ درخواست ان کے دفتر میں جا کر دی اور ان کے سپرنٹنڈنٹ نے اسی وقت مجھے تقرری کا خط دے دیا۔ اس طرح مجھے یوپی سکریٹریٹ میں ملازمت مل گئی۔ یوپی میں مسلمانوں کا کوٹا ملازمت کے لیے ۳۳ فی صد تھا لیکن سکریٹریٹ میں مسلمان ملازم پندرہ بیس فی صد سے زیادہ نہیں تھے۔ عبدالحسن صاحب اس کو ۳۳ فی صد کرنا چاہتے تھے اس لیے جو مسلمان ملازمت کے لیے درخواست لے کر جاتا تھا اس کو فوراً ملازم رکھ لیتے تھے۔

بہرحال اس طرح مجھے ملازمت مل گئی۔ دس سے چار بجے تک دفتر میں حاضر رہنا ہوتا تھا۔ وقفے میں گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے کے لیے یونیورسٹی کا چکر لگا لیتا تھا، اساتذہ سے مل لیتا تھا اور لائبریری سے کتابیں بھی لے آتا تھا۔ اس طرح اس ملازمت کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ لکھنؤ میں رہنے کا موقع ملا۔ بے کاری کا احساس بھی ختم ہوا اور یونیورسٹی سے رابطہ بھی قائم رہا۔ سب سے بڑا فائدہ اس ملازمت سے یہ ہوا کہ انگریزوں کے دفتری نظام سے پوری طرح آشنا ہونے کے مواقع ملے۔ مجھے شروع شروع ایک ایسے شعبے میں بٹھایا گیا جہاں پرانے ریکارڈ تھے۔ میں دن بھر نہایت دلچسپی کے ساتھ اپنی دلچسپی کی پرانی فائلوں کی ورق گردانی کرتا تھا اور اس کام میں مجھے بہت لطف آتا تھا۔ بعض اہم فائلیں چھاپ دی گئی تھیں۔ ان کے پڑھنے سے نہ صرف یہ کہ تاریخی مواد سے واقفیت ہوئی بلکہ انگریز آئی۔ سی۔ ایس افسروں کے احکامات کو پڑھ کر ان کی ذہانت و فطانت کا اندازہ بھی ہوا۔

یہ ملازمت میں نے اس خیال سے بھی کی تھی کہ اس سے دفتری کام کا سلیقہ آجائے گا کیوں کہ میرے والدین کی یہ خواہش تھی کہ میں آئی۔ سی۔ ایس اور پی۔ سی۔ ایس کے امتحانوں میں بیٹھ کر کسی طرح کلکٹر ڈپٹی کمشنر یا ڈپٹی کلکٹر ہوجاؤں۔ میں خود اس قسم کی ملازمت کو اچھا نہیں سمجھتا تھا اور طبیعت اس کی طرف راغب نہیں ہوتی تھی لیکن والدین کا دل رکھنا بھی ضروری تھا۔ اس لیے مجھے آئی۔ سی۔ ایس کے امتحان میں بیٹھنا پڑا۔ یہ اور بات ہے کہ میں بے دلی کی وجہ سے اس امتحان میں اچھی پوزیشن حاصل نہ کرسکا۔ کون ڈپٹی کمشنر بن کر انگریز کی غلامی کرتا اور آزادی کے سپاہیوں پر گولیاں برسانے کے احکامات صادر کرتا

میری والدہ کو مجھے ڈپٹی کمشنر بنانے کا بڑا شوق تھا۔ گھنٹوں وہ مجھ سے اس موضوع پر باتیں کرتی تھیں اور مجھے اس ملازمت کی برکتوں کا احساس دلاتی تھیں، لیکن میری طبیعت پھر بھی اس جانب مائل نہ ہوتی تھی۔

میرے مزاج کی اس کیفیت کو دیکھ کر انھوں نے بعض ایسے پہنچے ہوئے بزرگوں سے اس کا ذکر کیا جن کی وہ مرید تھیں اور جن سے انھیں بڑی عقیدت اور ارادت تھی۔

ان میں سے ایک بزرگ خیرآباد والے مقبول میاںؒ بھی تھے۔ مقبول میاںؒ پر اکثر اوقات جذب

کا عالم طاری رہتا تھا۔ صرف جمعے کے دن وہ کسی قدر ہوش میں آتے تھے۔ نہاتے دھوتے اور وضو کرتے اور کپڑے بدل کر جمعے کی نماز کے لیے مسجد میں جایا کرتے تھے۔ اس علاقے میں دور دور تک لوگوں کو اس بات کا علم تھا کہ عالم جذب میں ہونے کی وجہ سے جو کچھ ان کے منھ سے نکل جاتا تھا وہ ہو جاتا تھا۔

"مستوں میاں" کا یہ واقعہ بہت مشہور تھا کہ خیرآباد میں ایک غریب شخص جذام کی ایسی مہلک بیماری میں مبتلا تھا۔ وہ میاں سے بار بار کہتا کہ "میاں! میرے لیے دعا کیجیے۔" لیکن میاں خاموش رہتے تھے۔ ایک دن کہ جمعے کا روز تھا، میاں صاحب حسب معمول نہا دھو کر اور کپڑے بدل کر جمعے کی نماز کے لیے مسجد کی طرف جا رہے تھے کہ وہ شخص میاں سے لپٹ گیا، اور یہ کہتا رہا کہ "میاں! آج تو میرے لیے دعا کر ہی دیجیے۔ میں آج آپ سے لپٹا ہی رہوں گا، چھوڑوں گا نہیں۔" میاں کے کپڑے خراب ہوئے اور انھوں نے اس کو اس حرکت پر خوب مارا لیکن آخر میں ان کے منھ سے یہ نکلا کہ "جا ٹھیک ہو جائے گا۔" اور وہ شخص اسی دن سے ٹھیک ہونا شروع ہو گیا اور چند روز کے اندر بالکل صحت مند ہو گیا۔

یہ سب کچھ عالم جذب میں مجذوب کی زبان سے نکلے ہوئے اس فقرے کا نتیجہ تھا کہ "جا ٹھیک ہو جائے گا۔"

میری والدہ بھی اکثر لکھنؤ سے خیرآباد جاتیں، اور میاں کی خدمت میں حاضری دیتی تھیں۔ ایک دن انھوں نے میاں کی خدمت میں عرض کیا کہ "میاں دعا کیجیے میرا بیٹا کسی طرح کلکٹر یا ڈپٹی کمشنر ہو جائے۔" میاں نے یہ سن کر تین دفعہ صرف یہ کہا "کالج کی نوکری بہت اچھی"، "کالج کی نوکری بہت اچھی"، "کالج کی نوکری بہت اچھی۔"

اور یہ کہہ کر خاموش ہو گئے۔

میری والدہ نے لکھنؤ آ کر اس ملاقات کی تفصیل مجھے سنائی اور مجھے یہ سن کر یقین ہو گیا کہ ان شاء اللہ جلد ہی کسی یونیورسٹی یا کالج میں مجھے لیکچرر شپ مل جائے گی۔ چنانچہ اس کو حاصل کرنے کے لیے کچھ زیادہ ہی سرگرم عمل ہو گیا۔

سب سے پہلے تو میں نے یہ سوچا کہ اگر کالج یا یونیورسٹی میں ملازمت حاصل کرنی ہے تو جلد سے

جلد پی. ایچ. ڈی کر لینا چاہیے۔ چنانچہ اپنے اساتذہ کے مشورے سے تحقیق کے موضوع کا انتخاب کیا۔ مسعود صاحب مرحوم کی خواہش تھی کہ میں سید انشا پر کام کروں اور میں اس پر کام کرنے کے لیے آمادہ بھی تھا لیکن احتشام صاحب چاہتے تھے کہ میں اردو تنقید کے ارتقا پر کام کروں، کیونکہ اس میں جدید دور کا تحقیقی اور تنقیدی مطالعہ بھی ہو جائے گا اور اس طرح ایک اچھی کتاب اردو ادب کے جدید دور کے متعلق سامنے آ جائے گی جس کا مطالعہ ادب کے طالب علموں کے لیے بھی مفید ثابت ہوگا۔

اس سلسلے میں میں نے یہ سوچا کہ بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب سے بھی مشورہ کر لوں۔ چنانچہ میں نے انھیں خط لکھا۔ تین چار دن کے بعد اُن کا جواب آ گیا۔ لکھا تھا۔

۱۰ دریا گنج دہلی

۱۱؍ جولائی سنہ ۱۹۴۳ء

مکرمی سلمہ

آپ کا خط پہنچا۔ آپ نے بہت اچھے موضوع سوچے تھے۔ تعجب ہے آپ کے اساتذہ نے منظور نہیں کیے۔ بہرحال دوسرے موضوع بھی خوب ہیں اور ان پر تحقیق کا کام بہت اچھا ہو سکتا ہے۔ انشا مجھے بھی پسند نہیں۔ بات یہ ہے کہ آپ کو اپنے پروفیسروں کی نگرانی میں کام کرنا ہے اور ان کے مشورے کے خلاف کوئی موضوع انتخاب کرنا نامناسب ہوگا۔ اگر میر تقی میر یا تنقید والے موضوع کو پسند کریں تو اس پر دل لگا کر کام کیجیے۔ اگر مجبوری ہو اور وہ کسی طرح رضامند نہ ہوں تو پھر انشا ہی سہی۔ علاوہ شاعر کے اس کی دوسری حیثیت بھی تو ہے۔

خیر طلب

عبدالحق

مولوی صاحب کے خط سے مجھے بڑا اطمینان ہوا۔ میں نے تو انھیں یوں ہی خط لکھ دیا تھا اور خیال یہی تھا کہ وہ مصروف آدمی ہیں، جواب نہیں دیں گے۔ لیکن چار دن کے اندر جب ان کا شفقت اور محبت سے بھرا خط موصول ہوا تو مجھے بڑی طمانیت نصیب ہوئی اور ان کی بڑائی کا نقش دل پر

ہمیشہ کے لیے ثبت ہوگیا۔

بہرحال پروفیسر سید احتشام حسین صاحب نے مسعود صاحب سے مشورہ کرکے یہ فیصلہ کرلیا کہ میں اردو تنقید کے ارتقا کے موضوع پر کام کروں گا۔

چنانچہ میں نے احتشام کی نگرانی میں اس موضوع پر پی۔ ایچ۔ ڈی کے لیے کام شروع کردیا۔ خاکہ بنا کر دیا اور کمیٹی میں اس کو بہت پسند کیا گیا۔ اس پر کام کرنے کی باقاعدہ منظوری دی گئی اور اب میں باقاعدہ یونیورسٹی میں ریسرچ اسکالر ہوگیا۔

اسی زمانے میں یہ اطلاع ملی کہ الٰہ آباد یونیورسٹی میں مسیح الزماں صاحب بھی اس موضوع پر کام کررہے ہیں لیکن جب احتشام صاحب نے ان کے تحقیقی مقالے کا خاکہ وغیرہ منگوایا تو اندازہ ہوا کہ ان کا کام میرے کام سے مختلف ہے۔ اس لیے اب میرے لیے اردو تنقید پر کام کرنے میں کوئی رکاوٹ باقی نہ رہی۔ میں نے کام شروع کردیا۔ لکھنؤ کی تمام لائبریریوں میں خاصا وقت گزارا، قلمی نسخے دیکھے، غیر مطبوعہ نسخوں کی ورق گردانی کی۔ فن تنقید پر انگریزی، فرانسیسی، جرمن، عربی، فارسی اور اردو ہندی کی کتابوں کا مطالعہ کیا۔ بے شمار غیر مطبوعہ اور مطبوعہ نسخوں کی ورق گردانی کی۔ تنقید سے متعلق اردو کتابوں کو بغور پڑھا۔ اس موضوع سے جن لوگوں کو دلچسپی تھی اور جنھوں نے اس کے مختلف پہلوؤں پر کچھ کام کیا تھا ان سے ملاقاتیں کیں، تبادلۂ خیال کیا، مدد لی اور سال ڈیڑھ سال میں اس موضوع پر میں قلم اٹھانے کے قابل ہوگیا۔ جن لوگوں نے اس کام میں میری مدد کی اور مجھے مفید مشورے دیے ان میں بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق، پروفیسر سید مسعود حسن رضوی ادیب، پروفیسر سید احتشام حسین، ڈاکٹر عبدالعلیم، پروفیسر عزیز احمد (عثمانیہ یونیورسٹی)، پروفیسر مجنوں گورکھپوری، نیاز فتحپوری، پروفیسر حامد اللہ افسر، پروفیسر رشید احمد صدیقی، پروفیسر آل احمد سرور، پروفیسر حامد حسن قادری اور علی عباس حسینی صاحب کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان بزرگوں اور دوستوں کی مدد اور مفید مشوروں نے میرے کام کو آسان کردیا، اور مجھے یہ محسوس ہونے لگا کہ جب کام مکمل ہوکر سامنے آئے گا تو وہ خاصا وزنی ہوگا۔

سنہ ۱۹۴۳ء میں میں نے مواد جمع کرکے مقالے کو لکھنا شروع کیا اور تقریباً دو سال میں اس کو مکمل

کر لیا۔ اس زمانے میں اردو ٹائپ کا رواج زیادہ نہیں تھا اس لیے اس میں خاصا وقت لگا۔

بہر حال سنہ ۱۹۴۲ء میں میں نے یہ کام یونیورسٹی میں پیش کر دیا۔ ممتحنوں کی رپورٹیں جلدی آگئیں۔ مولانا حامد حسن قادری مرحوم نے لکھنؤ آکر میرا زبانی امتحان لیا اور سنہ ۱۹۴۳ء کے شروع میں مجھے لکھنؤ یونیورسٹی سے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری مل گئی۔

اس عرصے میں سکریٹریٹ کی ملازمت کا سلسلہ جاری رہا۔ کوئی ایک سال میں نے یوپی گورنمنٹ کے اکنامکس ڈیپارٹمنٹ میں گزارا جس کے سربراہ اس وقت پروفیسر ایس۔ کے۔ رودر تھے۔ رودرا صاحب جنگ کے زمانے میں الہ آباد یونیورسٹی سے ڈپوٹیشن پر معاشیات کے سکریٹری کی حیثیت سے یوپی کی حکومت میں آگئے تھے۔ لمبے چوڑے آدمی تھے لیکن نیکی، شرافت اور محبت ان پر ختم تھی۔ اپنے ماتحتوں تک سے اس طرح ملتے تھے جیسے کوئی باپ اپنے بیٹے سے ملتا ہے۔ راستے میں کوئی مل جائے اور رودرا صاحب موٹر میں جا رہے ہوں تو موٹر روک کر اسے بٹھا لیتے تھے۔ الہ آباد یونیورسٹی میں یونیورسٹی کے طالب علموں کے ساتھ بھی ان کا یہی انداز تھا اور لکھنؤ میں اپنے ماتحتوں کے ساتھ بھی وہ اسی طرح پیش آتے تھے۔ معاشیات کے بہت بڑے عالم تھے اور ہندوستان سے باہر بھی ان کی بڑی شہرت تھی۔ ان کا کمرہ ہر وقت ہمارے لیے کھلا رہتا تھا۔ میں اکثر ان کے پاس جاتا تھا۔ وہ ذاتی سطح پر میرے بارے میں دریافت کرتے رہتے تھے۔

جب انھیں یہ معلوم ہوا کہ میں اردو ایم۔ اے فرسٹ ڈویژن میں کر چکا ہوں و پی۔ ایچ۔ ڈی کر رہا ہوں تو ان کی شفقت مجھ پر کچھ زیادہ ہی ہو گئی۔ اکثر کہتے تھے کہ تمھیں تو یونیورسٹی میں ہونا چاہیے۔ کبھی کوئی ایسا موقع آئے تو مجھے بتانا، میں مدد کروں گا۔ پروفیسر سدھانت اور ڈاکٹر رادھا کمل مکرجی میرے جاننے والے ہیں، میں ان سے خاص طور پر کہوں گا۔

اتفاق ایسا ہوا کہ اسی زمانے میں لکھنؤ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں لیکچرار کی ایک اسامی خالی ہوئی۔ اشتہار دیا گیا۔ میں نے بھی اس کے لیے درخواست دی۔

پروفیسر رودرا نے سلیکشن کمیٹی کے کئی ممبروں کو میرے لیے ذاتی خط لکھے۔ میری تعریفیں کیں

اور ان الفاظ کے ساتھ سفارش کی اگر ان کو منتخب کر لیا گیا تو اس سے یونیورسٹی کو فائدہ ہوگا اور یہ اپنے مضمون میں مفید علمی کام کر سکیں گے۔ یہ وائس چانسلر رامیشر دیال سیٹھ، ڈین، پروفیسر سدھانت اور معاشیات کے عالمی شہرت رکھنے والے پروفیسر ڈاکٹر رادھا کمل مکرجی کو لکھے گئے۔ ساتھ ہی رودر صاحب نے اسٹینوگرافر کو بلا کر دو صفحے کا سرٹیفکیٹ میرے لیے لکھوایا جس میں میرے متعلق نہایت عمدہ تعریفی کلمات تھے بعض ایسی خوبیوں کی بھی وضاحت کی جو شاید میرے اندر نہیں تھیں۔ ان تحریروں کا اثر تو ہوا۔ سلیکشن بورڈ کے ممبروں میں سے بیشتر نے میری حمایت کی لیکن مسعود صاحب با اصول آدمی تھے، انھوں نے میرے سامنے بورڈ کے ممبروں سے یہ بات کہی کہ ابھی انھوں نے پی ایچ ڈی نہیں کیا اور ایک امیدوار یعنی ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی، ایسے تھے جو سینیئر ہیں اور علی گڑھ یونیورسٹی سے پی۔ ایچ۔ ڈی کر چکے ہیں۔ اس پر بعد میں خاصی بحث ہوئی۔ سب ممبر میرے حق میں بولے اور کہا کہ چند مہینے میں یہ پی۔ ایچ۔ ڈی ہو جائیں گے۔ لیکن مسعود صاحب نہیں مانے اور اپنی بات پر اڑے رہے اور انھوں نے ہاشمی صاحب کا تقرر کروا لیا۔

اور میں احساسِ شکست کا شکار ہو گیا۔ طبیعت پریشان رہنے لگی اور یہ خیال ہوا کہ اب لیکچرشپ کا ملنا جوئے شیر لانے سے کسی طرح کم نہیں ہے، کیوں کہ اس زمانے میں ہر یونیورسٹی اپنے طالب علموں کو ملازم رکھتی تھی۔ ظاہر ہے کہ علی گڑھ، الہ آباد یا کسی اور یونیورسٹی میں تو میرا تقرر اب ہو نہیں سکتا تھا۔ اس لیے مجھے ہر طرف تاریکی ہی تاریکی نظر آنے لگی

اس کے بعد میں اپنے علمی ادبی کام میں کچھ زیادہ ہی دلچسپی لینے لگا اور اردو، زمانہ، نگار، ادبی دنیا، ادبِ لطیف، عالمگیر اور ساقی وغیرہ میں میرے مضامین شائع ہونے لگے۔ ان مضامین و مقالات میں کوئی خاص بات نہیں تھی۔ اردو ادب کے مختلف پہلوؤں پر مدرسانہ قسم کے مضامین تھے لیکن انھیں دلچسپی کے ساتھ پڑھا گیا اور قدیم اور جدید اردو ادب سے دلچسپی رکھنے والے مجھے تھوڑا بہت جاننے پہچاننے لگے۔ یونیورسٹیوں میں خاص طور پر پڑھا جانے لگا اور ان پر بحثیں ہونے لگیں۔

اس زمانے میں ایک مضمون تو میں نے ایسا لکھا جس نے کچھ عرصے کے لیے ادبی دنیا میں تہلکہ مچا دیا۔ یہ مضمون تھا "اردو ادب ۱۹۴۳ء میں"۔ اور یہ طویل مضمون جو چھوٹے سائز کے کوئی پچاس صفحات

پر مشتمل تھا۔ ادب لطیف" لاہور کے سالنامے میں شائع ہوا۔ یہ مضمون فرمائش کر کے مجھ سے لکھوایا گیا تھا۔ مقصد اس کا یہ تھا کہ سال میں جو ادبی رجحانات نمایاں رہے ہیں ان کا جائزہ لیا جائے اور جو لکھنے والے ادبی تخلیق میں پیش پیش رہے ہیں، ان کی ادبی تخلیقات کا جائزہ لیا جائے۔ میں نے اس مضمون میں تفصیل سے ان رجحانات کا جائزہ لیا اور ہر صنف کے علمبرداروں کی ادبی تخلیقات پر بے لاگ تبصرے کیے۔ اس پر اس وقت کا ہر ادیب چونکا، کیوں کہ اس قسم کا جائزہ اس سے پہلے نہیں لیا گیا تھا۔ کچھ بزرگ لکھنے والے ناراض ہوئے، کچھ نئے لکھنے والے خوش ہوئے۔ اساتذہ میں سے بعض نے میری ہمت افزائی کی، بعض نے ڈانٹا اور سرزنش کی۔ نوجوانی کا جوش تھا۔ اپنے ادب سے غیر معمولی دلچسپی تھی۔ اس لیے میں نے یہ مضمون لکھ دیا لیکن آئندہ کے لیے توبہ کی کہ ہم عصروں پر اس طرح بیباکی اور صاف گوئی کے ساتھ قلم نہیں اٹھاؤں گا۔

نیاز صاحب اس زمانے میں لکھنؤ سے "نگار" نکالتے تھے اور ان کے خاص نمبروں کی بڑی شہرت تھی۔ ہر سال ایک نمبر کسی خاص موضوع پر شائع کرتے تھے۔ نیاز صاحب کا مزاج علمی تھا۔ وہ بہت کم لوگوں سے ملتے تھے۔ ادبی محفلوں میں نہیں جاتے تھے۔ کسی قسم کی تقریب میں شرکت نہیں کرتے تھے۔ گھر میں رہتے تھے۔ "نگار" کا دفتر بھی گھر ہی میں تھا۔ میں اس زمانے میں اکثر ان کی خدمت میں حاضری دیتا تھا۔ بڑے ہی خوش گفتار آدمی تھے۔ علمی گفتگو شروع ہو جائے تو معلومات کا دریا بہا دیتے تھے۔ بیباک اور صاف گو بھی بہت تھے۔ کسی سے لگی لپٹی نہیں رکھتے تھے۔ آخر پٹھان تھے۔ مولانا عبدالماجد دریابادی، جگر صاحب، جوش صاحب، اثر صاحب اور ایسے ہی نہ جانے کتنے ادیبوں اور شاعروں کے لیے نیاز صاحب کی تحریریں شمشیر برہنہ کا کام کرتی تھیں۔ گرما گرم بحثوں کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ سب کچھ "نگار" میں چھاپ دیتے تھے۔

میں نیاز صاحب کا ممنون ہوں کہ انھوں نے مجھے علمی، ادبی کام کرنے کے گر سکھائے، جرأت مندی کا سبق پڑھایا اور تصنیف و تالیف کے آداب سے مجھے آشنا کیا۔ میں نے جب شروع شروع اپنے تھیسس کا کام ہاتھ میں لیا تو مجھ سے لکھا نہیں جاتا تھا۔ شاید اس وجہ سے کہ لکھنے کی عادت اور مشق نہیں تھی یا پھر اپنے اوپر اعتماد نہیں تھا۔ میں نے یہ مسئلہ نیاز صاحب کے سامنے پیش کیا۔ نیاز صاحب

لکھنے لگے۔

”بس آپ لکھتے جایے، بغیر کسی حساب کے لکھیے۔ بعد میں جب اس پر نظرِ ثانی کریں گے تو خود بخود اس کی ایک شکل بن جائے گی۔

میں نے ان کے اس نسخے پر عمل کیا اور میرا کام چل نکلا۔ کاٹ چھانٹ کرنی پڑی لیکن اس سے تحریر میں روانی اور ہم آہنگی پیدا ہو گئی۔

اس زمانے میں لکھنؤ کا ریڈیو اسٹیشن صرف ریڈیو اسٹیشن ہی نہیں تھا۔ ادیبوں اور فن کاروں کا وہاں جمگھٹا بھی تھا۔ عشرت رحمانی، شوکت تھانوی، کرشن چندر، وشوامتر عادل اور گرپالکا راٹھر وغیرہ کی وجہ سے وہاں خاصی ادبی فضا پیدا ہو گئی تھی۔ ان سب سے ریڈیو اسٹیشن پر ملاقاتیں ہوتی تھیں۔ کیوں کہ تقریریں کرنے کے لیے میں اکثر وہاں جاتا تھا۔ خدا جانے کتنی تقریریں اس زمانے میں میں نے لکھنؤ ریڈیو سے کیں۔ ان لوگوں سے میرے ذاتی تعلقات بھی تھے، اس لیے بے تکلفی سے باتیں ہوتی تھیں اور ان کے ساتھ اچھا وقت گزرتا تھا۔

”دانش محل“ میں اکثر ہم لوگ شام کو جمع ہوتے تھے۔ ”دانش محل“ امین الدولہ پارک کے سامنے سنٹرل ہوٹل کی عمارت کے نیچے کے حصے میں بظاہر تو کتابوں کی دوکان تھی لیکن درحقیقت یہ ادیبوں اور دانشوروں کے بیٹھنے، آپس میں ملنے جلنے اور باتیں کرنے کا ایک مرکز تھا۔ مشہور افسانہ نگار اعظم کریوی کے چھوٹے بھائی حکیم اسرار احمد کریوی نے یہ ادارہ قائم کیا تھا۔ نسیم احمد صاحب اس کے منیجر تھے جو نہایت شائستہ، نیک، شریف، مخلص، محنتی اور جفاکش انسان تھے۔ پہلے مکتبہ جامعہ میں منیجر تھے لیکن جب ”دانش محل“ قائم ہوا تو جامعہ کی ملازمت چھوڑ کر منیجر کی حیثیت سے دانش محل میں آ گئے تھے اور انھوں نے دانش محل کو ایک اشاعتی ادارے اور کتابوں کی دوکان سے زیادہ ادیبوں اور دوستوں کے باہم مل بیٹھنے کا ایک مرکز بنا دیا تھا۔ چاروں طرف کتابوں کی الماریاں تھیں جو نہایت سلیقے سے لگائی گئی تھیں۔ درمیان میں انھوں نے دو بڑے بڑے صوفے ڈال دیے تھے جن کی وجہ سے دانش محل ایک اچھا خاصا ڈرائنگ روم معلوم ہوتا تھا۔ لوگ آتے تھے، بیٹھتے تھے، باتیں کرتے تھے۔ نسیم صاحب سب کا خیال رکھتے تھے لیکن

صبح سے شام تک اپنے کام میں مصروف رہتے تھے۔

میرے کلاس فیلو مجیب، حبیب الرحمٰن، باقر حسنین اور خورشید میاں باقاعدگی سے آتے تھے۔ ادیبوں اور شاعروں میں احتشام صاحب، سرور صاحب، نورالحسن ہاشمی، علی جواد زیدی، نجم الدین شکیب، یاس یگانہ چنگیزی، مولانا حسرت موہانی، جگر صاحب، مولانا علی میاں، ہاشم قدوائی، ڈاکٹر اعظم کریوی، حیات اللہ انصاری، رضا انصاری، عشرت رحمانی، یونس خالدی، اسرارالحق مجاز، کرشن چندر، وشوامتر عادل وغیرہ بھی "دانش محل" میں اکثر آتے تھے۔ حلقۂ ارباب دانش کے جلسے بھی یہیں ہوتے تھے۔ ان جلسوں میں مقالے اور افسانے بھی پڑھے جاتے تھے۔ غرض "دانش محل" نے اس زمانے میں ایک ادبی مرکز کی حیثیت حاصل کر لی تھی۔

میں شام کو دو تین گھنٹے یہیں گزارتا تھا۔

ایک دن میں سہ پہر کے وقت کوئی کتاب پڑھ رہا تھا کہ وشوامتر عادل آ گئے۔ ان کے پاس ریڈیو اسٹیشن کی گاڑی تھی۔ آتے ہی کہنے لگے "چلیے آپ کو لکھنؤ کے پرانے شہر میں ایک جگہ لے چلتا ہوں بعد میں بتاؤں گا کہ کہاں جانا ہے۔"

میں ساتھ ہو لیا۔

گاڑی نادان محل روڈ، وکٹوریہ اسٹریٹ، اکبری دروازے سے ہوتی ہوئی حکیموں کے محلے جھوائی ٹولہ میں جا کر رکی۔ آگے تنگ گلیاں تھیں، اس لیے گاڑی کو کچھ فاصلے پر چھوڑ کر پیدل چلنا پڑا۔ کئی گلیوں کو پار کر کے ہم ایک مکان پر پہنچے۔ وشوامتر عادل نے دستک دی۔ ایک بچی باہر نکلی۔ اس نے عادل کو پہچان لیا، اندر لے گئی۔ بیٹھنے کے کمرے میں ہمیں بٹھا دیا گیا۔ وہاں درمیان میں سفید چادر کا ایک پردہ پڑا ہوا تھا۔ اس کے پیچھے سے نسوانی آواز آئی "آپ کو یہاں تک آنے میں کوئی دقت تو نہیں ہوئی؟" "کوئی خاص نہیں" عادل نے جواب دیا۔

ریڈیو، افسانہ نگاری، براڈکاسٹنگ پر باتیں ہوتی رہیں اور میں چپ چاپ بیٹھا رہا۔ بالآخر عادل نے کہا "میرے ساتھ ایک اور صاحب بھی ہیں عبادت بریلوی۔"

آواز آئی: "یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ آپ ہمارے ہاں تشریف لائے۔ میں ہاجرہ مسرور ہوں، اور میرے ساتھ میری بہن خدیجہ مستور ہیں۔"

میں نے کہا: "آپ سے مل کر بے حد مسرت ہوئی۔ عادل صاحب کا شکر گزار ہوں کہ انھوں نے آپ لوگوں سے ملاقات کرائی۔"

یہ گفتگو ہوتی رہی لیکن پردہ درمیان میں حائل رہا۔ تھوڑی دیر باتیں کرنے کے بعد ہم لوگ رخصت ہوئے۔ عادل نے ریڈیو کے کنٹریکٹ پر دستخط کر دیے۔ ان کا کام ختم ہو گیا۔ راستے میں ہم لوگ ان دونوں افسانہ نگار خواتین کی افسانہ نگاری پر باتیں کرتے رہے۔ میں نے اپنے "ادب لطیف" والے مضمون میں اختصار کے ساتھ ان کے افسانوں کا ذکر کیا تھا۔ عادل اسی حوالے سے باتیں کرتے رہے۔ اور ہم واپس "دانش محل" پہنچ گئے۔

غرض "دانش محل" کے توسط سے پرانے اور نئے ادیبوں سے اس طرح ملاقات کی صورتیں نکل آتی تھیں۔

اس زمانے میں لکھنؤ میں ادیبوں کا ایک اور مرکز لال باغ میں ڈاکٹر رشید جہاں کا مکان تھا۔ وہ اس مکان میں مطب بھی کرتی تھیں، لیکن یہاں ادیبوں کے جلسے بھی ہوتے تھے۔ مقالے پڑھے جاتے تھے اور خوب گرما گرم بحثیں ہوتی تھیں۔ کوئی کسی کی رعایت نہیں کرتا تھا۔ جمع ہونے والے لوگ خاصے روشن خیال اور پڑھے لکھے تھے اس لیے تنقید کا معیار علمی رہتا تھا۔ رضا انصاری فرنگی محلی ان جلسوں کے روح رواں تھے۔ مجھے انھوں نے سکریٹری بنا دیا تھا۔ مولانا حسرت موہانی، جوش صاحب، سید سجاد ظہیر، ڈاکٹر عبدالعلیم، محمود الظفر، سبط حسن، احتشام حسین، مجاز، جذبی، جاں نثار اختر، مجروح سلطان پوری وغیرہ ان جلسوں میں شریک ہوتے تھے۔

رضا انصاری فرنگی محل کے علما کے خاندان سے تھے اور دینی علوم کے فاضل تھے۔ اخبار "قومی آواز" میں کام کرتے تھے۔ رسالہ "منزل" بھی انھوں نے نکالا تھا جس میں اس وقت کے نامور ادیبوں کی تخلیقات شائع ہوتی تھیں۔ رضا انصاری سیاست میں مسلم لیگ کے حامی تھے۔ قیام پاکستان کی تحریک میں پیش پیش تھے اور اس حد تک جذباتی تھے کہ انھوں نے کاہی رنگ کی لیتی

دگرے سبز رنگ کی اشیروانی بنوالی تھی۔ اس مناسبت سے کہ یہ مسلم لیگ، پاکستان اور مسلمانوں کا رنگ تھا۔ بڑے ہی معصوم آدمی تھے۔ تقریر اور خطابت کا فن انھیں خوب آتا تھا اور ان کی تحریر میں بھی شادابی تھی۔ رسالے کو ترتیب دینے کا بڑا سلیقہ تھا۔ طٰہٰ حسین کی کتابوں کا ترجمہ بھی انھوں نے اردو میں براہ راست عربی سے کیا تھا۔ نفاست اور لطافتِ ان میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ لکھنوی تہذیب کا نمونہ تھے۔ ہر وقت ہنستے اور مسکراتے رہتے تھے۔ ادب کے بھی وہ "رنگ ماسٹر" تھے۔

غرض اس قسم کے لوگوں کے ساتھ بے کاری کے اس زمانے میں میرا وقت گزر رہا تھا۔ لکھنے پڑھنے کی فضا تھی، اس لیے لکھنے کی طرف طبیعت مائل ہوتی تھی۔ اور میں اس زمانے میں زیادہ وقت لکھنے میں گزارتا تھا۔ بلا مبالغہ ہزاروں صفحے میں نے اس زمانے میں ادبی موضوعات پر لکھے جو رسالوں میں شائع بھی ہوئے اور پھر انھوں نے کتابوں کی شکل بھی اختیار کی، اور اس لکھنے کی بدولت ہندوستان میں لوگ مجھے ایک لکھنے والے کی حیثیت سے کچھ جاننے پہچاننے لگے اور یہ جان پہچان اور شناسائی میرے لیے ایک دولت گراں بہا ثابت ہوئی۔

سیاست اس زمانے میں اپنے شباب سے ہم کنار تھی۔ لکھنؤ کانگریس اور مسلم لیگ کی سیاست کا گڑھ تھا۔ جنگ عظیم ختم ہونے کا نام نہیں لیتی تھی۔ جگہ جگہ بھرتی کے دفتر کھلے ہوئے تھے اور پیٹ کے دوزخ کو بھرنے کے لیے لوگ انگریزی فوج میں سپاہیوں کی حیثیت سے بھرتی ہو رہے تھے۔ صرف چند مہینے کی ٹریننگ کے بعد انھیں لام پر بھیج دیا جاتا تھا۔ جو ذرا پڑھے لکھے تھے انھیں فوج میں کمیشن مل جاتا تھا۔ میرے بعض یونیورسٹی کے ساتھیوں نے بھی مجبوراً کمیشن لے لیا۔ ان میں منان اللہ بیگ، چودھری سعید الرحمٰن خاں، حفیظ الرحمٰن خاں اور عبدالحفیظ خاں کمیشن حاصل کر کے جنگ میں دنیا کے مختلف محاذوں پر لڑنے کے لیے گئے۔ بالآخر قیام پاکستان کے بعد پاکستانی فوج میں اعلیٰ عہدوں پر فائز ہوئے۔ میں اگر اس وقت کمیشن لے کر فوج میں چلا جاتا تو اس وقت کم از کم میجر جنرل یا لیفٹیننٹ جنرل ضرور ہوتا، لیکن طبیعت اس طرف راغب نہیں ہوئی۔ یہی سوچا کہ انگریزوں کی غلامی کون کرے۔

ہندوستان کی برطانوی حکومت زیادہ سے زیادہ ہندوستانیوں کو فوج میں بھرتی کرنے اور مختلف محاذوں پر لڑنے کے لیے زمین آسمان کے قلابے ملا رہی تھی۔ اس نے ایک ادارہ قایم کیا تھا جس کا نام تو "سانگ پبلسٹی" تھا لیکن جس کا مقصد برطانوی فوج میں ہندوستانیوں کی تعداد کو زیادہ سے زیادہ بڑھانا تھا۔ اس کے سربراہ مشہور شاعر حضرت ابوالاثر حفیظ جالندھری تھے اور ان کے معاون اردو کے مشہور مزاح نگار شوکت تھانوی تھے۔ یہ لوگ حکومت کے لیے جو کچھ کرتے تھے وہ تو صیغۂ راز میں رہتا تھا لیکن ان کی کارگزاری سے سب ہی واقف تھے۔ یہ لوگ نہایت سستے طریقے سے انگریزوں کا پروپیگنڈا کرکے اپنا مقصد نکالنے کی کوشش کرتے تھے۔ مشاعروں اور ادبی جلسوں کا اہتمام بھی ان کی طرف سے کیا جاتا تھا۔ لیکن ان مشاعروں اور ادبی جلسوں کا مقصد کچھ اور ہی تھا۔

حفیظ صاحب اس زمانے میں اکثر ہندوستان کے مختلف مقامات کا دورہ کرتے تھے اور کبھی کبھی لکھنؤ بھی آتے تھے۔ قیام ان کا شوکت تھانوی صاحب مرحوم کے ہاں رہتا تھا۔ شوکت صاحب انھیں لیے لیے سارے شہر میں پھرتے تھے اور حفیظ صاحب کی صحبتوں سے نہ صرف خود لطف اندوز ہوتے تھے بلکہ دوسروں کو بھی لطف اندوز ہونے کے مواقع فراہم کرتے تھے۔

اسی زمانے کا ایک واقعہ شوکت صاحب مرحوم مزے لے لے کر سنایا کرتے تھے۔ حفیظ صاحب کا کام تو اس زمانے میں تعلقات عامہ کو فروغ دینا تھا۔ چنانچہ ایک دن وہ شوکت صاحب سے کہنے لگے: "سنا ہے یہاں لکھنؤ میں ٹنڈا کبابی ہے۔ میں اس کے پاس جانا چاہتا ہوں۔ کباب بھی کھائیں گے باتیں بھی کریں گے۔ پبلک ریلیشننگ بھی ہو جائے گی۔"

شوکت صاحب نے ان کے حکم کی تعمیل کی اور انھیں اکبری دروازے کے قریب چوک میں ٹنڈے کبابی کی دوکان پر لے گئے۔ ٹنڈا اپنے کام میں مصروف تھا۔ حفیظ صاحب سڑک پر کھڑے ہو کر خود اپنا تعارف کرانے لگے۔ کہنے لگے "ہم لوگ تمھارے کبابوں کی شہرت سن کر آئے ہیں۔ کباب کھائیں گے اور یہیں سڑک پر کھڑے ہو کر کھائیں گے۔ میں ہندوستان کا مشہور

شاعر ابوالاثر حفیظ جالندھری ہوں!"

یہ سن کر تنڈے کبابی کی زبان سے دو معنی خیز لفظ نکلے: "اماں نہیں!"

اور حفیظ صاحب کو اس حاضر جوابی نے خاموش کر دیا۔ شوکت صاحب بھی خاموش رہے۔ حفیظ صاحب اس زمانے میں جہاں تک ان کی شاعری اور ترنم سے پڑھنے کا تعلق ہے، لکھنؤ میں بہت مقبول تھے۔ جب وہ لکھنؤ آتے تو ان کے اعزاز میں ادبی تقریبات ہوتی تھیں اور مشاعرے بھی ترتیب دیئے جاتے تھے۔ اسلامیہ کالج لکھنؤ میں ہر سال بڑا شاندار مشاعرہ ہوتا تھا۔ میں نے حفیظ صاحب کو سب سے پہلے اسی مشاعرے میں سنا۔ خوب کہتے اور خوب پڑھتے تھے۔ سماں باندھ دیتے تھے۔ ایک دفعہ تو مجھے یاد ہے کہ حاضرین نے شاہنامۂ اسلام پڑھنے کی فرمائش کی اور حفیظ صاحب کوئی تین گھنٹے شاہنامہ سناتے رہے اور حاضرین دلچسپی سے سنتے رہے۔

حفیظ صاحب کے علاوہ ان مشاعروں میں سیماب اکبرآبادی، فراق گورکھپوری، مرزا جعفر علی خاں اثر، صفی لکھنوی، مولانا حسرت موہانی، جگر مرادآبادی، جوش صاحب (جو ان دنوں دلی میں تھے)، یگانہ، احسان دانش، روش صدیقی، ساغر نظامی، فیض، مخدوم، جذبی، جاں نثار اختر، مجاز، مسعود اختر جمال، سکندر علی وجد، شکیل بدایونی اور راز مرادآبادی وغیرہ بھی شریک ہوتے تھے۔ میں نے ان تمام شاعروں کا کلام اسلامیہ کالج کے مشاعروں ہی میں سنا۔ ان سے ملنے کے مواقع بھی ملے اور بیشتر سے نیاز مندی کا شرف بھی حاصل ہوا۔

ادب و شعر کی اس فضا کے ساتھ ساتھ اس زمانے میں لکھنؤ سیاسی ہنگامہ آرائیوں کا بھی ایک اہم مرکز تھا۔ کانگریس آزادی کی تحریک میں زیادہ سے زیادہ خون دوڑا رہی تھی۔ حکومت اور کانگریس کے درمیان مذاکرات شروع ہو گئے تھے۔ اسیران قلعہ احمد نگر نے کئی سال کے قید و بند کے بعد اب رہائی حاصل کی تھی۔ کانگریس کے یہ لیڈر لکھنؤ آتے تھے اور امین آباد پارک میں عام جلسوں سے خطاب کرتے تھے۔ جواہر لال نہرو، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا حسین احمد مدنی وغیرہ کی تقریریں ان عام جلسوں میں ہوتی تھیں۔ انگریزوں کی مخالفت

ان کے ظلم و ستم، اور جبر و استبداد کا حال تفصیل سے بیان کیا جاتا تھا۔ ہندو مسلم مسئلے کے حل کے لیے تمام لیڈر اظہار خیال کرتے تھے۔ ادھر مسلم لیگ کا زور بھی روز بروز بڑھتا جاتا تھا۔ قیام پاکستان کے مطالبے نے مسلمانوں میں ایک عوامی تحریک کی صورت اختیار کر لی تھی۔ بڑے بڑے جلوس نکلتے تھے۔ عظیم الشان جلسے ہوتے تھے۔ قائد اعظم محمد علی جناح، نواب زادہ لیاقت علی خاں، چودھری خلیق الزماں مولانا حسرت موہانی، عبدالوحید خاں، مولانا جمال میاں فرنگی محلی اور راجہ صاحب محمود آباد ان جلسوں میں تقریریں کرتے تھے اور اسلامیانِ ہند کے معاملات و مسائل پر روشنی ڈال کر پاکستان کے قیام کی حمایت میں دلائل دیتے تھے۔ کانگریس کی عارضی وزارتوں نے بعض صوبوں میں مسلمانوں پر جو ظلم و ستم کیا تھا اس کی تفصیل پیش کی جاتی تھی۔ ہزارہا مسلمان جلسوں اور جلوسوں میں شریک ہوتے تھے۔ بڑی ہی ہیجان انگیز سی فضا تھی۔ ہر طرف ایک غیر یقینی کیفیت کے بادل چھائے ہوئے تھے۔ کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا تھا کہ کیا ہونے والا ہے!

میری دلچسپی سیاست میں اکیڈمک نوعیت کی تھی۔ جلسوں میں بعض احباب کے ساتھ چلا جاتا تھا۔ مختلف خیالات و نظریات رکھنے والے سیاست دانوں کی تقریریں سنتا تھا۔ آپس میں ہم لوگ سیاست پر اکیڈمک نوعیت کی بحثیں بھی کرتے تھے اور نظریاتی اختلافات کے باوجود ہم سب اس یک ت پر متفق کہ بہت بڑا طوفان اٹھنے والا ہے جو بنی بنائی چیزوں کو خس و خاشاک کی طرح بہا لے جائے گا۔

اس ادبی اور سیاسی فضا میں دلچسپی کے ساتھ ساتھ تلاشِ معاش کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ ڈیڑھ دو سال گزر گئے تھے لیکن ابھی تک کسی معقول ملازمت کی صورت نظر نہیں آتی تھی۔ سیاسی انتشار اور کساد بازاری کا دور تھا جس کی وجہ سے پڑھے لکھے نوجوانوں کی بیکاری بہت بڑھ گئی تھی۔ صرف فوج میں ملازمتوں کے دروازے کھلے ہوئے تھے لیکن اس کی طرف کم از کم میری طبیعت راغب نہیں ہوتی تھی۔

ریڈیو پر میں اس زمانے میں کبھی کبھی تقریریں کرنے جاتا تھا۔ وہاں کسی کی زبانی یہ اطلاع ملی کہ

ریڈیو میں کچھ سینیئر پروگرام پروڈیوسر کی آسامیاں خالی ہیں، اور درخواستیں دینے کے لیے اشتہار نکلا ہے۔ میں نے بھی اس جگہ کے لیے درخواست دے دی۔ اس خیال سے کہ براڈکاسٹنگ کا مجھے خاصا تجربہ ہے، ہو سکتا ہے اس بنیاد پر کامیابی کی کوئی صورت نکل آئے۔ چنانچہ میں نے ڈائرکٹر جنرل براڈکاسٹنگ نئی دہلی کو درخواست بھیج دی۔ چند روز کے بعد انٹرویو کے لیے خط آیا۔ میں دہلی گیا۔ براڈکاسٹنگ ہاؤس میں انٹرویو ہوا۔ احمد شاہ بخاری صاحب (پطرس) ڈائرکٹر جنرل آل انڈیا ریڈیو نے خود انٹرویو لیا۔ امیدواروں کی خاصی تعداد تھی۔ بیشتر کو پانچ پانچ سات سات منٹ میں فارغ کر دیا گیا مجھ سے کوئی پینتالیس منٹ تک باتیں ہوئیں۔ بخاری صاحب نے ادب، شاعری، تنقید، زبان، تہذیب و ثقافت پر نہ جانے کتنے سوال کیے۔ میں بولتا رہا، خود بھی بولتے رہے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ اپنی خطابت کا مظاہرہ کرتے رہے۔ میں ان کے زورِ خطابت سے واقعی بہت متاثر ہوا اور اُن کی باتیں میرے دل میں اُتر گئیں۔ آخر قابل اور تجربہ کار پروفیسر تھے، بولنے کا فن انھیں آتا تھا۔ بعض معاملات میں ہمارا اختلاف بھی ہوا لیکن جو باتیں بخاری صاحب نے کیں ان کی اہمیت میرے دل میں کسی طرح کم نہیں ہوئی ان میں میں نے یہ خوبی دیکھی کہ اپنی ذہانت اور شگفتہ بیانی سے ہر ایک کو قائل کر سکتے ہیں۔ ان کی شخصیت میں بلا کی کشش تھی۔ لمبے چوڑے، سرخ و سفید، وجیہہ آدمی تھے۔ اور یہ وجاہت ان کی خطابت کیلیے سونے پر سہاگے کا کام کرتی تھی۔

بخاری صاحب نے انٹرویو کے دوران مجھ سے بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق کی تنقید نگاری فیض کی رومانی شاعری، ن۔ م۔ راشد کی آزاد نظم عصمت چغتائی کی افسانہ نگاری، جوش کی انقلابی شاعری اور آغا حشر کے ڈراموں پر باتیں کیں، اور میں نے اپنی بے لاگ رائے کا اظہار کیا۔ کیونکہ ماحول افسرانہ سے زیادہ دوستانہ بلکہ ادبی تھا۔ بخاری صاحب میری باتوں سے متاثر بھی ہوئے۔ انھوں نے اس کا اعتراف بھی کیا، لیکن صاف صاف کہہ دیا کہ وہ مجھے ریڈیو میں نہیں لے سکتے اس وجہ سے کہ میرا مزاج تخلیقی سے زیادہ تنقیدی ہے اور یہ کہ میرا کسی یونیورسٹی ہی میں ہونا مناسب ہے کیوں کہ میری صلاحیتوں کے جوہر کسی یونیورسٹی ہی میں کھل سکتے ہیں بچے

اے روشنیِ طبع تو بر من بلا شدی

میں دلی میں حکیم رشید احمد ندوی کا مہمان تھا۔ وہ اس زمانے میں انجمن ترقی اردو کے ساتھ منسلک تھے اور بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق جو لغت تیار کر رہے تھے، اس میں ان کے مددگار تھے۔ رشید صاحب اور ان کی بیگم نے میری بڑی خاطر تواضع کی اور دلی میں ہر طرح میرا خیال رکھا۔ مزے دار کھانے مجھے کھلائے اور مجھ سے دلچسپ باتیں کیں، دلی کی سیر کرائی۔ ادیبوں سے ملاقاتوں کا اہتمام کیا اور بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب سے پہلی ملاقات کے لیے وسیلہ بنے۔ انھیں دنوں ان کے ہاں خواجہ عبدالوحید بھی مہمان تھے جو مشہور دانشور صحافی تھے۔ رشید صاحب نے خواجہ صاحب سے میرا تعارف کرایا اور ہم دیر تک باتیں کرتے رہے۔ خواجہ صاحب دنیا دیکھے ہوئے تھے۔ اپنے ہم عصروں، دانشوروں، ادیبوں، صحافیوں اور اہم سیاست والوں سے ان کے روابط تھے۔ ان سب کے بارے میں باتیں ہوئیں اور خواجہ صاحب نے ان کے بارے میں بڑی دلچسپ باتیں بیان کیں۔ خواجہ صاحب کو میں نے دیکھا کہ وہ باتیں کرتے ہوئے بھی کام کرتے جاتے ہیں۔ بے شمار اخبار اور رسالے ان کے سامنے تھے اور ان کے تراشے کاٹ کاٹ کر موضوعات کے اعتبار سے انھیں مختلف فائلوں میں ڈالتے جاتے تھے۔ سن رسیدہ ہونے کے باوجود اتنی محنت سے اس طرح کا کام کرنا خواجہ صاحب ہی کا حصہ تھا۔ ڈوبے ہوئے آدمی تھے اور حالات حاضرہ پر کام کرنا اور اس کام کے لیے زیادہ سے زیادہ مواد جمع کرنا انھیں کا حصہ تھا۔

ایک دن سہ پہر کو رشید صاحب مجھے انجمن ترقی اردو کے دفتر، دریا گنج لے گئے۔ بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب سے انھوں نے میرے لیے وقت مقرر کر لیا تھا۔ ہم لوگ مقررہ وقت سے کچھ پہلے ہی دریا گنج پہنچ گئے۔ انھوں نے مولوی صاحب کو اطلاع دی اور انھوں نے فوراً مجھے اندر بلا لیا۔ بہت اچھی طرح ملے۔ اس طرح جیسے برسوں کی ملاقات ہو۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ مولوی صاحب کو میں اکثر خط لکھتا رہتا تھا اور وہ باقاعدگی سے مجھے جواب بھی دیتے رہتے تھے۔ چائے کا وقت تھا۔ اس لیے مولوی صاحب ہمیں اپنے کھانے کے کمرے میں لے گئے جہاں طرح طرح کی نمکین

چیزیں نہایت اہتمام سے چنی ہوئی تھیں۔ بادام، بھنے ہوئے چنے، مونگ کی دال، پاپڑ کے پاپڑ، دو قسم کے بسکٹ اور پھل وسیع و عریض کھانے کی میز پر سجے ہوئے تھے۔ مولوی صاحب نے خود تو ذرا سے بھنے ہوئے چنے اور پاپڑ کے دو ایک ٹکڑے کھائے اور چائے کی ایک پیالی پی۔ مولوی سید ہاشمی فرید آبادی، پنڈت کیفی اور عبدالرحمٰن صدیقی بھی کھانے کے کمرے میں آ گئے اور انھوں نے بھی ہمارے ساتھ چائے پی۔

چائے سے فارغ ہو کر مولوی صاحب برآمدے میں بیٹھ گئے جہاں ان کا حقہ تیار تھا۔ ہم لوگ بھی ان کے ساتھ ہی اٹھ کر برآمدے میں آ گئے۔ مولوی صاحب حقہ پیتے رہے اور ہم سے باتیں کرتے رہے۔

مولوی صاحب نے پنڈت کیفی سے اب میرا مفصل تعارف کرایا۔ کہنے لگے "آپ نے ان کے مضامین رسائل میں پڑھے ہوں گے۔ اچھا لکھتے ہیں۔ حال ہی میں انھوں نے آزاد نظم پر مفصل مضمون لکھا ہے۔ اس میں اچھی معلومات فراہم کی ہے اور آزاد نظم لکھنے والوں پر بہت اچھا تبصرہ کیا ہے۔"

پنڈت جی کہنے لگے "میں نے وہ مضمون پڑھا ہے لیکن اس میں میری آزاد نظموں کا ذکر نہیں ہے۔ سب سے پہلے تو آزاد نظم میں نے لکھی تھی۔" پھر میری طرف مخاطب ہو کر کہنے لگے "آپ نے میرا مجموعۂ کلام 'واردات' نہیں دیکھا؟"

میں نے کہا "مجھے باوجود کوشش کے دستیاب نہیں ہوا۔"

پنڈت جی کہنے لگے "میں آپ کو دکھاتا ہوں۔"

یہ کہہ کر وہ اٹھے اور اپنے کمرے میں جا کر "واردات" کی ایک ضخیم جلد لا کر میرے سامنے رکھ دی۔ میں نے اس کو دیکھا تو واقعی اس میں کئی آزاد نظمیں تھیں۔

میں شرمندہ ہوا اور پنڈت جی سے معذرت کی۔

مولوی صاحب ان باتوں سے لطف لیتے رہے، ہنستے اور مسکراتے رہے۔ اور کبھی کبھی پنڈت جی پر کوئی فقرہ کستے رہے۔

پنڈت جی کو کسی جلسے میں جانا تھا اس لیے وہ تو اٹھ کر چلے گئے اور مولوی صاحب اب میری طرف

متوجہ ہوئے۔ ریڈیو کے انٹرویو کی داستان سنی، لکھنؤ یونیورسٹی کے حالات پوچھے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی کے کام کی رفتار کے بارے میں دریافت کیا۔

میں نے اختصار کے ساتھ جواب دیے۔ دورانِ گفتگو یہ معلوم ہوا کہ مولوی صاحب آل انڈیا ریڈیو کے ارباب، خصوصاً بخاری صاحب کے سخت خلاف ہیں۔ ایک تو اس وجہ سے کہ یہ زمانے کی رفتار کو دیکھتے ہیں، مصلحت کے دھارے پر اپنے آپ کو بہاتے ہیں، ہندوؤں سے دب کر رہتے ہیں، اردو کا کام نہیں کرتے، اور یہ کہ خوشامد میں ہندی کو فروغ دے رہے ہیں۔ مولوی صاحب نے یہ بھی کہا کہ ریڈیو میں قابل لوگوں کو ملازم رکھنے سے گریز کرتے ہیں، معمولی صلاحیت کے لوگوں کا انتخاب کرتے ہیں اور وہاں دوست نوازی بہت ہے۔

میں چپ چاپ یہ سب باتیں سنتا رہا۔ میرے علم میں یہ باتیں نہیں تھیں اس لیے میں نے خاموش رہنا ہی مناسب سمجھا۔

کوئی گھنٹہ بھر مولوی صاحب سے باتیں ہوئیں۔ دورانِ گفتگو انھوں نے ناگپور اردو کانفرنس میں شرکت کی دعوت دی اور یہ بھی وعدہ کیا کہ وہ جلد کوئی نہ کوئی صورت نکال کر مجھے دلی بلا لیں گے۔ انھوں نے مجھے یقین دلایا کہ دلی یونیورسٹی میں کوئی نہ کوئی انتظام ہو جائے گا۔

میں اس خوش خبری کو سن کر پھولا نہ سمایا۔ مغرب کے وقت خوش خوش وہاں سے رخصت ہو کر رشید صاحب کے ساتھ اپنی جائے قیام پر واپس آیا۔

دوسرے دن میں لکھنؤ روانہ ہو گیا۔

لکھنؤ واپس پہنچ کر میں نے اس سفر کی روداد اپنے محسن و بزرگ جسٹس غلام حسن بٹ صاحب کو سنائی۔ جسٹس غلام حسن اودھ چیف کورٹ کے جج تھے۔ لکھنؤ یونیورسٹی کی سنڈیکیٹ کے ممبر تھے، اور میرے والد صاحب کے دوست تھے۔ نہایت شریف اور نیک آدمی تھے اور ہر معاملے میں مدد کرنے کے لیے تیار رہتے تھے۔ مجھ پر ان کی خاص عنایت تھی۔ میرے علمی کام سے بہت متاثر تھے۔ ہمیشہ کہتے تھے کہ "تم اتنا لکھتے ہو، تمھارے پاس ایک اسٹینوگرافر ہونا چاہیے" اور میں

ان کی یہ محبت بھری باتیں سن کر دل ہی دل میں ہنستا تھا اور ان کی شفقت، محبت اور ہمدردی پر فخر کرتا تھا۔

جسٹس غلام حسن صاحب نے مجھے تسلی دی اور کہا کہ میں تمھیں لکھنؤ یونیورسٹی میں لیکچرار کی حیثیت سے دیکھنا چاہتا ہوں اس کے لیے کوشش جاری ہے۔ تفصیل انھوں نے نہیں بتائی۔ میں نے پوچھی بھی نہیں۔

ایک مہینہ بھی نہیں گزرنے پایا تھا کہ مولوی صاحب کی طرف سے ناگپور اردو کانفرنس کا دعوت نامہ آگیا اور میں ناگپور جانے کی تیاری کرنے لگا۔ اردو زبان کے موضوع پر مقالہ بھی تیار کیا اور میں کانفرنس کی تاریخوں سے تین چار روز قبل ہی احتشام حسین صاحب اور حکیم اسرار احمد کریوی صاحب کے ساتھ ناگپور روانہ ہو گیا۔

ناگپور میں اردو کانفرنس کیا تھی، اردو کا اچھا خاصا جشن تھا۔ مولوی عبدالحق صاحب پہلے ہی سے وہاں موجود تھے۔ نواب صدر یار جنگ، مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی (علی گڑھ)، پنڈت کیفی، سید ہاشمی فرید آبادی (دہلی)، عبدالرحمٰن صدیقی (کلکتہ)، پروفیسر نجیب اشرف ندوی (بمبئی)، میجر عبدالقیوم خاں باقی (حیدرآباد دکن)، پروفیسر عبدالقادر سروری (حیدرآباد)، ڈاکٹر ابواللیث صدیقی (علی گڑھ)، فضل احمد کریم فضلی (الہ آباد)، حشیم امامی (بنگلور) اور بہت سے دوسرے ادیب اور شاعر دو ایک روز میں ناگپور پہنچ گئے۔ کانفرنس شروع ہوئی۔ افتتاحی اجلاس میں مولوی عبدالحق صاحب نے صدارتی خطبہ پڑھا۔ دوسرے دن قراردادیں پیش ہوئیں، پھر مقالات کی کئی نشستیں ہوئیں۔ میں نے بھی مقالہ پڑھا۔ موضوع ایسا تھا کہ لوگ ذرا چونکے لیکن داد دی۔ تین دن تک کانفرنس کے مختلف اجلاسوں کا سلسلہ جاری رہا۔ ہزاروں کی تعداد میں لوگ شریک ہوئے۔

ناگپور میں مسلمانوں کی آبادی پانچ سات فی صد سے زیادہ نہیں تھی لیکن یہ مسلمان اردو کے شیدائی تھے اور اس زبان کے لیے اپنا تن من دھن قربان کرنے کے لیے ہر وقت تیار رہتے تھے۔ مولوی صاحب اسی لیے ناگپور کو ہمیشہ جاگپور کہتے تھے۔ کانفرنس ختم ہوئی تو اس کے بعد کئی ادبی

جلسے ترتیب دیے گئے۔ یونیورسٹی میں بھی ایک جلسہ ہوا، اس میں ادیبوں نے شرکت کی۔ پروفیسر منظور حسین شور اس زمانے میں ناگپور یونیورسٹی میں اردو کے ریڈر تھے۔ ان سے بھی ملاقات ہوئی ان کا کلام بھی سنا۔ کئی دن ان جلسوں میں اچھے گزرے۔

ناگپور کانفرنس کا ایک واقعہ مجھے آج تک یاد ہے۔ سبجیکٹس کمیٹی کے سیشن میں دو قراردادیں ایسی تھیں جن کا ایک دوسرے سے تعلق تھا۔ کسی صاحب نے کہا، ان دونوں کو ایک دوسرے کے ساتھ نتھی کر دیجیے۔ ایک اور صاحب نے کہا "ٹانک دیجیے"۔ یہ لفظ مناسب ہے۔ مولوی عبدالحق صاحب صدارت کر رہے تھے۔ جب ٹانکنے کا لفظ سنا تو معاً ان کی زبان سے نکلا "ٹانچ لیجیے"، زیادہ مناسب ہے۔ اس پر حاضرین نے زوردار قہقہہ لگایا اور اس طرح مولوی عبدالحق صاحب کی بذلہ سنجی کی داد دی۔

کوئی ایک ہفتہ ناگپور میں گزار کر ہم لوگ لکھنؤ واپس آئے۔ کانفرنس کی روداد انجمن کے اخبار "ہماری زبان" اور اردو کے دوسرے اخباروں میں چھپتی رہی خاصی پبلسٹی ہوئی۔

میں نے چونکہ اردو زبان کے بعض مسائل پر مقالہ پڑھا تھا اس لیے لوگوں نے اس سے دلچسپی لی اور لوگ ہندوستان کے مختلف علاقوں میں اس حوالے سے مجھے کچھ جاننے لگے۔ اس کے بعد کئی کانفرنسوں اور جلسوں میں شرکت کے لیے دعوت نامے میرے پاس آنے لگے۔ چنانچہ میں نے ایک تو ضلع بستی کی اردو کانفرنس میں شرکت کی اور دوسرے پٹنہ اور مظفرپور بھی گیا جہاں اردو کے جلسے ترتیب دیے گئے تھے۔

بستی کی کانفرنس کے روحِ رواں حضرت خیر بھوروی تھے جو انجمن ترقی اردو کا کام کرتے تھے اور اردو کے بہت بڑے مجاہد تھے۔ انھوں نے اردو کا پیغام یوپی کے مشرقی اضلاع اور بہار کے ایک ایک گاؤں میں پہنچا دیا تھا۔ وہ بابائے اردو کے سچے اور مخلص رفیق کار تھے اور اردو کے لیے جہاد کرنا ان کی زندگی کا مقصد تھا۔ شہروں شہروں اور گاؤں گاؤں گھومتے تھے۔ اردو کے جلسے کرتے تھے اور اردو کانفرنسیں ترتیب دیتے تھے۔ خیر بھوروی نے بستی کی ایسی چھوٹی سی جگہ میں بھی

اردو کانفرنس کا ڈول ڈالا اور اپنی کوششوں سے بڑے بڑے ادیبوں اور اردو کے خدمت گزاروں کو اس دور افتادہ مقام پر جمع کر دیا۔ اس کانفرنس میں شرکت کے لیے علی گڑھ سے پروفیسر رشید احمد صدیقی، پروفیسر آل احمد سرور، پٹنہ سے ڈاکٹر اختر اورینوی اور جمیل مظہری، لکھنؤ سے پروفیسر سید احتشام حسین اور الٰہ آباد سے پروفیسر فراق گورکھپوری اور ڈاکٹر اعجاز حسین بستی پہنچے۔ بڑے پائے کی کانفرنس ہوئی۔ اردو کے مسائل پر قراردادیں پاس ہوئیں۔ تقریریں بھی ہوئیں۔ مقالے بھی پڑھے گئے مشاعرہ بھی ہوا اور نجی محفلوں میں شعر و شاعری بھی ہوئی۔ رشید صاحب، سرور صاحب، فراق صاحب اعجاز صاحب اور اختر اورینوی صاحب سے پہلی بار میری ملاقاتیں یہیں ہوئیں۔ اس کانفرنس میں میں نے اردو کے مستقبل پر مقالہ پڑھا جس میں آزادی کی جد و جہد کے پس منظر میں اردو کے مسائل کا جائزہ لیا اور اردو کے مستقبل کو شاندار بنانے کے لیے کچھ منصوبے پیش کیے۔ شاید اسی وجہ سے اس مقالے کو بہت پسند کیا گیا اور اس میں جو باتیں کہی گئی تھیں ان پر سیر حاصل اور مفید بحث ہوئی۔

تین دن بستی میں قیام کر کے ہم لوگ لکھنؤ واپس آئے۔ چلتے وقت میں نے خیر بھوروی صاحب سے کہا کہ ”آپ نے مجھے اردو کا لیڈر بنا دیا۔“

کہنے لگے ”اردو کا لیڈر تو آپ کو ہونا ہی چاہیے۔ آپ کی صلاحیتوں نے آپ کو لیڈر بنایا ہے۔ اردو کی خدمت کرتے رہنا کارِ ثواب ہے۔“

میں نے کہا ”میں اردو کا خادم ہوں۔ انشاءاللہ خدمت کرتا رہوں گا۔“

چند روز کے بعد ہی لکھنؤ میں پٹنہ کے بی۔ این کالج کی طرف سے دعوت نامہ ملا۔ لکھا تھا بی۔ این کالج میں آیئے اور تقریر کیجیے۔ میں نے دعوت قبول کر لی اور مقررہ تاریخ کو پٹنہ پہنچا۔ کالج کے طالب علم مجھے اسٹیشن پر لینے کے لیے آئے لیکن پہچان نہ سکے۔ میں نے لڑکوں کی چال ڈھال اور انداز سے انھیں پہچان لیا۔ لڑکوں نے معذرت کی اور نہ پہچاننے کی وجہ یہ بتائی کہ ہم تو یہ سمجھ رہے تھے کہ آپ سن رسیدہ ہوں گے۔ آپ کے چہرے پر داڑھی ہو گی لیکن آپ تو ہماری ہی

طرح سکا۔ بس، اسی لیے ہم آپ کو پہچان نہ سکے۔ آپ کے مضامین پڑھ کر آپ کی کچھ اور ہی تصویر ہمارے ذہنوں میں تھی۔ بابائے اردو سے ملتی جلتی۔

قصہ مختصر یہ لڑکے معذرت کر کے مجھے پرنسپل کی قیام گاہ پر لے گئے۔ وہاں میں نے قیام کیا شام کو کالج میں بہت بڑا جلسہ ہوا۔ میں نے بہار میں اردو زبان و ادب کے موضوع پر تقریر کی۔ تقریر چونکہ بہار کے بارے میں تھی اس لیے اس کو بہت پسند کیا گیا۔ دو تین روز پٹنے میں رہا۔ یہاں قاضی عبدالودود صاحب، ڈاکٹر سید اختر اورینوی اور پروفیسر کلیم الدین احمد سے ملاقاتیں ہوئیں۔ ان کے عالمانہ مزاج اور خوش اخلاقی نے مجھے بہت متاثر کیا۔

خدا جانے کس طرح خبیر بھوروی کو علم ہو گیا کہ میں پٹنے میں ہوں چنانچہ وہ دوسرے ہی دن پٹنہ آگئے اور مجھے مظفرپور چلنے پر مجبور کیا۔ چنانچہ وہ مجھے اور اختر اورینوی صاحب کو مظفرپور لے گئے۔ وہاں انھوں نے بہت بڑا جلسہ کیا جس میں مجھے مہمان خصوصی بنا دیا۔ تقریریں زیادہ تر اردو زبان پر ہوئیں۔ میں نے صدارتی خطبہ پیش کیا۔ جلسے کے بعد خبیر صاحب نے شہر میں میرا باقاعدہ جلوس نکال دیا۔ اردو کے بارے میں خوب نعرے لگے۔ شہر کی تمام اہم سڑکوں سے یہ جلوس گزرا۔ بہاری مسلمانوں نے گلے میں ہار ڈالے اور جگہ جگہ پھولوں کی بارش کی اور پھر دو تین دن تک دعوتوں کا سلسلہ رہا۔ آس پاس کے دیہاتوں میں بھی گئے۔ یہاں مسلمانوں نے ہمارا استقبال کیا۔ لوگوں نے ہاتھ چومے اور خوب آؤ بھگت کی۔ وہ سب سچے مسلمان اور اردو کے شیدائی تھے۔ اس لیے اردو کا ہر کام کرنے والا ان کے لیے محترم تھا۔ میرا والہانہ استقبال بھی انھوں نے اسی وجہ سے کیا۔

مظفرپور اور پٹنہ میں کوئی ایک ہفتہ قیام کر کے میں لکھنؤ واپس آیا اور اپنے کاموں میں مصروف ہو گیا۔ دن دن بھر امیرالدولہ پبلک لائبریری، گنگا پرشاد میموریل لائبریری اور جسہ تہذیب کلب کی لائبریری میں بیٹھ کر پرانے رسالوں اور کتابوں کی ورق گردانی کی۔ اردو تنقید پر پی۔ ایچ۔ ڈی کا کام کرنے کے لیے ایسا کرنا ضروری تھا۔ اس طرح تنقید سے متعلق خاصا نیا مواد مجھے دستیاب ہوا اور اس کی بدولت میرا پی ایچ۔ ڈی کا کام تیزی سے آگے بڑھنے لگا۔ میں نے لکھنا شروع کر دیا اور چند مہینے

میں کئی باب تیار کر لیے۔

دوسری جنگ عظیم ختم ہونے کا نام نہیں لیتی تھی۔ کساد بازاری کا زور روز بروز بڑھتا جاتا تھا۔ نوجوانوں میں بے کاری سرطان کی طرح پھیلتی جاتی تھی۔ خصوصیت کے ساتھ پڑھے لکھے لوگوں کی بے کاری میں اتنا اضافہ ہو گیا تھا کہ ہر شخص بے کار نظر آتا تھا سوائے اُن لوگوں کے جنھوں نے فوج کے کسی نہ کسی شعبے میں ملازمت حاصل کر لی تھی۔ سیاسی ہنگامہ آرائیوں نے عجب عجب گل کھلانے شروع کر دیئے تھے۔ کانگریس اور مسلم لیگ کا تناؤ اتنا بڑھ گیا تھا کہ سارے ہندوستان میں ہندو مسلم فسادات کی آگ بھڑکنا شروع ہو گئی تھی۔ بعض ہندو تنظیموں نے مسلمانوں کو قتل کرنے اور ان کی ہر چیز کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کے منصوبے تیار کر رکھے تھے۔ مسلم لیگ کے لیڈر کہتے تھے ہم پاکستان لے کے رہیں گے اور ان کے پیچھے ہندوستان کے تقریباً تمام مسلمان تھے۔ کانگریس کے لیڈر کہتے تھے ہم ملک کو تقسیم نہیں ہونے دیں گے۔ نیشنلسٹ مسلمان ہمارے ساتھ ہیں لیکن نیشنلسٹ مسلمانوں کا کوئی خاص اثر مسلمانوں میں باقی نہیں رہا تھا۔ مسلم لیگ مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت بن گئی تھی۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اونٹ کس کروٹ بیٹھے گا۔

مسلمان طالب علم پاکستان کی تحریک میں پیش پیش تھے۔ نیشنلسٹ مسلمانوں کا عام جلسوں میں تقریر کرنا مشکل تھا۔ لڑکے انھیں بولنے نہیں دیتے تھے۔ جلسوں میں ہنگامہ ہو جاتا تھا۔ مجلس احرار اسلام کا مرکز اگرچہ لاہور تھا لیکن اس کے خطیب لکھنؤ تک پہنچتے تھے اور اپنی خطابت کے جوہر دکھاتے تھے۔ مجلس احرار کے ایسے خطیب اور مقرر کسی اور جماعت نے پیدا نہیں کیے۔ مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری، مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی، مولانا مظہر علی اظہر، مولانا انور صابری جادو بیان مقرر تھے۔ لڑکوں کا یہ خیال تھا کہ اگر ان لیڈروں کو خطاب کرنے کا موقع مل گیا تو اس کا اثر اچھا نہیں ہوگا۔ عوام ان کی خطابت سے متاثر ضرور ہوں گے اور یہ سب کچھ انھیں منظور نہ تھا۔

ایک دفعہ مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری لکھنؤ آئے۔ مجلس احرار کی طرف سے امین الدولہ پارک میں جلسہ ترتیب دیا گیا۔ جلسہ شروع ہو گیا۔ شاہ صاحب ذرا تاخیر سے جلسے میں آئے۔ ان کو دیکھتے ہی

لڑکوں نے ہنگامہ شروع کر دیا اور کہا کہ مولانا! آپ ہندوستان کے سب سے بڑے خطیب ہیں۔ آپ کی تقریر نہایت دلکش ہوتی ہے۔ آپ اپنی اس ساحری سے رائے عامہ کو متاثر کریں گے اس لیے ہم آپ کو تقریر نہیں کرنے دیں گے، ہم مسلم لیگ اور پاکستان کے خلاف ایک لفظ سننا نہیں چاہتے۔"

مولانا کہنے لگے "خدا کی قسم اگر تو دس منٹ میری تقریر سن لے تو تو بھی میرے ساتھ ہو جائے گا۔"

ایک لڑکے نے جواب دیا "اسی لیے تو ہم آپ کو تقریر نہیں کرنے دیں گے۔ ویسے آپ کی تقریر سننے کو میرا بھی جی چاہتا ہے۔"

مولانا نے کہا "اچھا میں سیاست پر تقریر نہیں کروں گا۔ صرف دینی معاملات پر بولوں گا۔"

یہ سن کر مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے لڑکے شاہ صاحب کی تقریر سننے پر آمادہ ہو گئے۔

مولانا نے کلام پاک کی تلاوت ایسے لحن کے ساتھ کی کہ سماں بندھ گیا اور حاضرین جلسہ میں سے ہر شخص جھومنے لگا اور پھر وہ دینی معاملات پر تقریر کرنے لگے۔ تقریر تو دین اسلام کے مختلف اصولوں پر تھی لیکن اس میں قرآنی آیات کا ترجمہ، حدیثوں کا بیان، حافظ، سعدی، عرفی، نظیری، غالب اور مومن کے اشعار، حالی اور اقبال کی نظمیں، لطیفے، اور خدا جانے کیا کیا کچھ مولانا نے اپنے خطاب میں پیش کیا۔ لوگ مسحور ہو گئے اور مولانا ساری رات تقریر کرتے رہے اور ایک شخص بھی اپنی جگہ سے نہیں ہلا۔ تقریر کیا تھی اچھی خاصی ساحری تھی۔ فجر کی اذان ہوئی تو شاہ صاحب نے اپنی تقریر ختم کی۔

میں بھی رات بھر ان کی تقریر سنتا رہا اور ان کی ساحرانہ خطابت نے کچھ ایسی لذت اور لطف و انبساط سے آشنا کیا جس کو الفاظ میں بیان کرنا ممکن نہیں۔

غرض یہ کہ اس طرح اس دورِ پُرآشوب میں میرا وقت گزرتا رہا اور اس طرح کی دلچسپیوں نے سیاسی انتشار اور ہنگاموں کے نتیجے میں پیدا ہونے والی کساد بازاری اور غیر یقینی کیفیت کے مذموم اثرات کو بڑی حد تک زائل کر دیا۔ زیست کرنے کی خواہش، جینے کی آرزو اور کچھ نہ کچھ کرتے رہنے کی تمنا دل کی تاریکیوں میں روشنی کے قمقمے سے روشن کرتی رہی اور میں سوچتا رہا کہ سیاسی تبدیلی تو بہرحال رنگ لائے گی۔ پاکستان تو ہر صورت بن کر رہے گا اس لیے

اس نئی دنیا میں زندہ رہنے کے لیے اس علمی منصوبے کو عملی جامہ پہنانا ضروری ہے تاکہ اس نئی دنیا میں اپنا مقام پیدا کرنے میں کسی قسم کی دشواری کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ چنانچہ میں نے اپنا پی ایچ۔ ڈی کا کام مکمل کیا اور ساتھ ہی ہزارہا صفحات لکھ کر علم و ادب کی دنیا میں اپنی بُری بھلی جگہ بھی بنالی۔ لوگ مجھے کسی حد تک جاننے پہچاننے لگے اور اس طرح محبت و احترام کی دولت بیش بہا کا خزانہ میرے ہاتھ آگیا۔

شاید اسی صورتِ حال کا یہ اثر تھا کہ کالج میں جب لیکچر شپ ملی تو میں نے اس کے لیے درخواست تک نہیں دی۔ میرے پاس اینگلو عربک کالج دہلی کی طرف سے آرڈر آیا کہ شعبۂ اردو کی صدارت آپ کو پیش کی جاتی ہے۔ اس سلسلے میں بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب کا خط بھی ملا جس میں یہ بھی لکھا کہ "اس پیش کش کو فوراً قبول کرلو۔ میں نے تمہارا تقرر کروا لیا ہے۔ یہاں مل کر اردو کا کام کریں گے مجھے تقویت رہے گی۔"

میں نے فوراً اس پیش کش کو قبول کرلیا اور میں اینگلو عربک کالج کے شعبۂ اردو کی صدارت سنبھالنے کے لیے دہلی روانہ ہوگیا۔

اور اس طرح عالمِ جذب میں مقبول میاںؒ کی زبان سے نکلی ہوئی یہ بات صحیح ثابت ہوگئی کہ "کالج کی نوکری بہت اچھی۔ کالج کی نوکری بہت اچھی۔"

نواں باب

اینگلو عربک کالج دہلی

یہ ۱۹۴۳ء کے آخری دن تھے۔

میں رات کو لکھنؤ کے چارباغ اسٹیشن سے دلّی کی گاڑی میں بیٹھا جس نے منہ اندھیرے مجھے دلّی پہنچا دیا۔ اسٹیشن سے سیدھا بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب کے پاس نمبر ا دریا گنج دہلی گیا مولوی صاحب کو اطلاع کرائی۔ ملاقات ہوئی۔ مولوی صاحب بہت خوش ہوئے۔ نہا دھو کر ناشتہ کیا اور دریا گنج سے سیدھا اجمیری دروازہ پہنچا جہاں اینگلو عربک کالج واقع تھا۔ پرنسپل اس وقت تک واکر صاحب تھے لیکن وہ رختِ سفر باندھ رہے تھے۔ پرنسپل کی حیثیت سے کہیں اور جانے والے تھے غالباً ایڈورڈ کالج پشاور میں، عارضی طور پر اس وقت خورشید احمد چشتی صاحب کو پرنسپل بنا دیا گیا تھا۔ چشتی صاحب سے ملاقات ہوئی۔ بڑی خندہ پیشانی سے پیش آئے اور کہا کہ "میں اینگلو عربک کالج میں آپ کو خوش آمدید کہتا ہوں"۔ چائے سے میری تواضع کی اور چند منٹ میں اس طرح بے تکلّف ہو گئے جیسے برسوں کی ملاقات ہو۔ میں نے انھیں جوائننگ رپورٹ دی، اپنا پڑھانے کا ٹائم ٹیبل لیا اور اسی دن سے کام شروع کر دیا۔

چشتی صاحب رہنے والے تو کیمبل پور (موجودہ نام اٹک) کے تھے، لیکن علی گڑھ میں خاصا وقت گزارا تھا اس لیے وہاں کے تہذیبی سانچے میں ڈھل گئے تھے۔ علی گڑھ سے وہ لندن چلے گئے اور وہاں سے تاریخ میں ایم۔ اے کیا۔ واپس آ کر وہ اینگلو عربک کالج میں تاریخ کے

پروفیسر ہو گئے جنگ کے زمانے میں۔ برطانوی فوج کی ایجوکیشن کور میں بھی رہے۔ طبیعت کو وہاں کے ماحول سے مناسبت نہیں تھی، اس لیے جلد ہی عربک کالج واپس آ گئے۔ سرخ و سفید آدمی تھے۔ خوش شکل اور خوش گفتار بھی خاصے تھے۔ زیادہ تر علی گڑھ کے لباس میں ملبوس رہتے تھے۔ شیروانی اور علی گڑھ کٹ کا پاجامہ پہنتے تھے۔ نواب زادہ لیاقت علی خاں صاحب سے بڑی عقیدت تھی۔ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب کو اپنا پیر و مرشد مانتے تھے۔ نواب زادہ صاحب عربک کالج کی گورننگ باڈی کے صدر اور ڈاکٹر صاحب نائب صدر تھے۔ سرپرست قائداعظم محمد علی جناحؒ تھے۔ بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب کالج کی انتظامیہ کے ایک اہم رکن تھے۔

یہ سب باتیں چشتی صاحب نے مجھے پہلی ہی ملاقات میں بتا دیں اور ان باتوں سے کالج کے متعلق میری معلومات میں خاصا اضافہ ہوا۔ ان باتوں کے علاوہ بھی بہت سی باتیں ہوئیں۔

اینگلو عربک کالج، دہلی میں مسلمانوں کا واحد کالج تھا۔ اس کے علاوہ ہندو کالج، رامجس کالج اور اندرپرست گرلز کالج ہندوؤں کے کالج تھے۔ یہ سب دہلی یونیورسٹی کے کالج تھے جہاں بی۔ اے تک تعلیم ہوتی تھی۔ ایم۔ اے اور بی۔ اے آنرز کی کلاسز یونیورسٹی میں ہوتی تھیں۔ پڑھانے والے زیادہ تر انھیں کالجوں کے پروفیسر تھے۔ یونیورسٹی میں اس وقت تک گنتی کے چند پروفیسر تھے اور اور یونیورسٹی کا نظام کالجوں ہی کے سہارے چل رہا تھا۔ سر ماریس گائر اس زمانے میں یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے۔ انھوں نے دہلی یونیورسٹی کے لیے بڑا کام کیا۔ کالجوں کے اساتذہ کو تحفظ دیا اور پوسٹ گریجویٹ تعلیم کو یونیورسٹی کی تحویل میں لے لیا۔ یونیورسٹی میں کچھ پروفیسروں کے تقرر بھی انھوں نے کیے۔ ایک نیا نظامِ تعلیم بھی نافذ کیا تھا جس کو تین سالہ ڈگری کورس کہا جاتا تھا اور جس کے تحت طالب علم میٹرک یا سیکنڈری کے امتحان پاس کر کے براہ راست تین سال کے لیے بی۔ اے آنرز میں داخل ہو جاتا تھا۔ میٹرک پاس کرنے والے کو ایک تعلیمی سال کے لیے پریپریٹری کلاس میں داخل ہو کر ایک خاص امتحان پاس کرنا ہوتا تھا۔ اس کے بعد یہ طالب بھی بی۔ اے آنرز میں داخل ہو جاتے تھے۔ سر ماریس کی یہ اسکیم یونیورسٹی کے دائرۂ کار کو بڑھانے، کالج کے اساتذہ کو یونیورسٹی

کے کاموں میں زیادہ سے زیادہ حصہ لینے اور اس طرح انھیں تحفظ دینے کے لیے تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ طالب علموں کو جلد از جلد چھوٹی عمر ہی میں اعلیٰ تعلیم کے صحیح ماحول سے آشنا کرنا بھی اس کا مقصد تھا۔ اس منصوبے کو عملی جامہ پہنانے میں سر مارِس کو خاصی کامیابی ہوئی اور دہلی یونیورسٹی کے تعلیمی نظام نے بہت جلد اپنا ایک مقام پیدا کر لیا یہاں تک کہ دوسری یونیورسٹیوں میں اس کی مثالیں دی جانے لگیں۔ سر مارِس بڑے ہی عزم اور ارادے کے انسان تھے۔ ہندوستان کی فیڈرل کورٹ کے چیف جسٹس بھی رہے تھے۔ اس لیے جو چاہتے تھے کرتے تھے اور حکومت کو ان کی بات ماننی پڑتی تھی۔ یونیورسٹی کے لیے انھوں نے اولڈ وائسریگل لاج کی ساری عمارتیں حاصل کر لی تھیں اور وہ انھیں عمارتوں میں سے ایک عمارت کے دو کمروں میں رہتے تھے۔ تنہا آدمی تھے۔ ان کی زندگی صرف دہلی یونیورسٹی کی ترقی کے لیے وقف تھی۔

اینگلو عربک کالج میں اس وقت میں اردو کا واحد لیکچرار تھا۔ شعبے کی صدارت بھی میرے سپرد تھی۔ یونیورسٹی میں زبان و ادب کی تعلیم کا انچارج بھی میں ہی تھا۔ عربی، فارسی اور اردو کا بورڈ آف اسٹڈیز مشترک تھا اور اس کے سربراہ سینٹ اسٹیفنز کالج کے فارسی کے پروفیسر ڈاکٹر سید اظہر علی تھے۔ عربی کی نمائندگی اینگلو عربک کالج کے عربی کے پروفیسر ڈاکٹر خورشید احمد فارق، فارسی کی نمائندگی پروفیسر منظور حسین موسوی اور اردو کی نمائندگی میں کرتا تھا۔ بورڈ کیا تھا چوں چوں کا مربہ تھا۔ میں نے صرف ایک میٹنگ میں شرکت کی۔ لیکن میری طبیعت بد مزہ ہوئی۔ اس لیے میں نے فوراً یہ فیصلہ کیا کہ اردو کے بورڈ کو کسی طرح الگ کروانا چاہیے چنانچہ اس کے لیے کوششیں جاری رکھیں۔ ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب میری پشت پناہی پر کمر بستہ تھے۔ اس لیے میں نے یہ مناسب سمجھا کہ کسی طرح انھیں اردو کا آنریری پروفیسر بننے پر آمادہ کیا جائے۔ مولوی صاحب میرے اصرار پر تیار ہو گئے، بلکہ اپنی مصروفیتوں کے باوجود انھوں نے ایم۔ اے کے طالب علموں کو ہفتے میں دو تین گھنٹے پڑھانے تک کا وعدہ کیا۔ سر مارِس اس تجویز سے بہت خوش ہوئے اور اس طرح دہلی یونیورسٹی میں اردو کا شعبہ نہایت مضبوط بنیادوں پر قائم ہو گیا۔ مولوی صاحب

ہفتے میں دو لیکچر دیتے تھے۔ باقی لیکچر میں خود دیتا تھا۔ یونیورسٹی میں جگہ نہیں تھی اس لیے ایم۔ اے اردو اور بی۔ اے آنرز کے لیکچر سینٹ اسٹیفنز کالج میں ہوتے تھے۔ میں ہفتے میں تین دن ایم۔ اے کے طالب علموں کو لیکچر دینے کے لیے سینٹ اسٹیفنز کالج جاتا تھا۔ مولوی صاحب انجمن کے دفتر دریا گنج میں لیکچر دیتے تھے۔ طالب علم ہفتے میں دو دن ان کے پاس چلے جاتے تھے۔ میں ہفتے میں تین دن اینگلو عربک کالج میں پریپریٹری اور بی۔ اے کی کلاسوں کو پڑھاتا تھا اور ایم۔ اے کے ٹیوٹوریل اور سیمینار لیتا تھا۔ کام زیادہ تھا لیکن جوانی بلکہ نوجوانی تھی، پڑھانے کا شوق بھی تھا۔ اردو زبان و ادب سے دلچسپی بھی تھی۔ اس لیے کبھی یہ محسوس نہیں ہوا کہ زیادہ کام کر رہا ہوں۔

دہلی میں اینگلو عربک کالج کی بڑی اہمیت تھی۔ اس کے پیچھے تاریخ کا ایک سلسلہ تھا۔ اس کو لوگ قدیم دلی کالج ہی کی ایک نئی صورت سمجھتے تھے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں قدیم دلی کالج تباہ و برباد ہو گیا تھا۔ جب تسلط ہوا تو حکومت کو اور خود مسلمانوں کو مسلمانوں کی تعلیم کی طرف توجہ کرنی پڑی۔ مسلمان انگریز سے برگشتہ تھے۔ انگریزی کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں تھے اس لیے مصلحتاً اینگلو کے ساتھ عربک کا لفظ لگایا گیا اور اینگلو عربک سوسائٹی قائم کی گئی جس کے تحت اینگلو عربک اسکول بنائے گئے۔ اس سوسائٹی نے وقت کے تقاضوں کے پیش نظر یہ کالج بھی قائم کر دیا۔ مولانا حالی لاہور سے دلی جانے کے بعد اینگلو عربک سوسائٹی کے انھیں اداروں سے وابستہ ہوئے اور دلی کے بیشتر خاندانوں کے نوجوانوں نے انھیں اداروں میں تعلیم حاصل کی۔ علی گڑھ کالج کے بعد مسلمانوں میں اس کالج کو اہمیت دی جاتی تھی اور اس میں تعلیم حاصل کرنے کے لیے مدراس، میسور، سی پی، سرحد، پنجاب، سندھ اور گجرات کاٹھیاواڑ سے بھی طالب علم یہاں آتے تھے۔ دلی مرکزی جگہ تھی۔ فیسیں بہت کم لی جاتی تھیں۔ ہوسٹل کا انتظام نہایت معقول تھا۔ اس لیے طالب علم یہاں دور دور سے آتے تھے۔ کالج کا ماحول بہت اچھا تھا۔ استاد شفیق اور محنت کرنے والے تھے۔ نہایت مانوس فضا تھی۔ اس لیے دور افتادہ علاقوں کے طالب علم اس کالج کو پسند کرتے تھے۔ بعض تو علی گڑھ کو چھوڑ کر یہاں آ جاتے تھے۔

کالج کی عمارتیں مغل عہد کی تعمیر کی ہوئی تھیں۔ پھاٹک کے سامنے اورنگ زیب عالمگیرؒ کے عہد کی سرخ پتھر کی مسجد تھی جو جامع مسجد دہلی یا شاہی مسجد لاہور کا نقشہ پیش کرتی تھی۔ مسجد کے سامنے گھاس کے چار خوش نما تختے تھے۔ اس کے چاروں طرف سرخ رنگ کی عمارتیں تھیں جن میں نیچے اور اوپر بے شمار کمرے تھے۔ نیچے کے کمروں میں لیکچر ہوتے تھے اور دوسری منزل میں طالب علموں کا ہاسٹل تھا جس میں طالب علم آرام و سکون سے رہتے تھے۔ اوپر کا ایک حصہ اساتذہ کے رہنے کے لیے دے دیا گیا تھا۔ اسی سے ملحق وارڈن اور سپرنٹنڈنٹ کا مکان تھا۔ اس کے پیچھے کالج کی نئی عمارت تھی جس میں ایک بہت بڑے ہال کے علاوہ کئی بڑے بڑے کمرے لیکچر روم تھے۔ اس عمارت کے سامنے مغرب کی طرف پرنسپل کا دفتر تھا اور اس کے سامنے لائبریری کی خاصی بڑی عمارت تھی۔ کالج میں داخل ہونے کے لیے جو پھاٹک تھا وہ آکسفورڈ اور کیمبرج کے کالجوں کی یاد دلاتا تھا۔ اسی طرح کے لان تھے۔ یہاں عمارتوں کے درمیان چرچ کی بجائے مسجد تھی۔ مجموعی طور پر کالج کی عمارتیں بڑی رومان انگیز سی فضا پیدا کرتی تھیں

اینگلو عربک کالج میں اسی وجہ سے میرا دل لگ گیا۔ میں طالب علموں اور استادوں میں اس طرح گھل مل گیا جیسے ان سے برسوں کی شناسائی ہے۔ ان دونوں طبقوں سے مجھے اس کالج میں جو عزت اور محبت ملی اس نے مجھے اس کالج کا اور بھی گرویدہ بنا دیا، اور میرا وقت وہاں بہت اچھا گزرنے لگا۔

اساتذہ میں پرنسپل چشتی صاحب کے علاوہ انگریزی کے پروفیسر عبدالصمد صاحب، سید انعام الحق، سید امجد علی صاحب، نفسیات کے پروفیسر مرزا محمود بیگ صاحب، معاشیات کے پروفیسر محمد لطیف قریشی صاحب اور افتخار احمد مختار صاحب، تاریخ کے پروفیسر آفتاب احمد مختار صاحب، عربی اور اسلامیات کے پروفیسر ڈاکٹر خورشید احمد فارق صاحب، فارسی کے پروفیسر سید منظور حسین موسوی صاحب اور عبدالشکور احسن صاحب اور حساب کے پروفیسر ہری شنکر صاحب نے مجھے اپنے عالمانہ مزاج، خوش ذوقی، کام کی لگن اور خلوص و محبت کی وجہ سے بہت متاثر کیا

اور ان سب سے چند روز میں میری دوستی ہو گئی۔ صمد صاحب مزاج کے سخت تھے لیکن دوستوں کے ساتھ بریشم کی طرح نرم۔ ادب پر خوب باتیں کرتے تھے اور مجھے اپنے چھوٹے بھائیوں کی طرح سمجھتے تھے۔ انعام الحق صاحب نہایت نستعلیق آدمی تھے۔ انگریزی خوب لکھتے اور بولتے تھے۔ انگریزی زبان پر انھیں ایسا عبور تھا کہ اس زبان میں اعلیٰ درجے کی شاعری بھی کرتے تھے۔ ان کی نظمیں کالج میگزین میں شائع ہوتی تھیں۔ مزاج میں کسی قدر تلوّن تھا لیکن دوستوں کے دوست تھے مولوی الیاس صاحب کی تبلیغی جماعت میں شامل تھے مجھے بھی اپنے ساتھ کئی بار تبلیغی اجتماع میں لے گئے۔ قیام پاکستان کے بعد وہ ایجوکیشن کور میں چلے گئے اور ایئر کموڈور کے عہدے سے ریٹائر ہو کر پنجاب میں ڈائرکٹر جنرل لائبریریز ہو گئے اور آج کل لاہور میں قائد اعظم لائبریری کے سربراہ ہیں۔ سید امجد علی صاحب انگریزی کے ادیب تھے۔ خوبصورت انگریزی لکھتے تھے۔ کم سخن اور زود رنج تھے۔ کالج سے کسی بات پر ناراض ہوئے اور ڈون اسکول میں چلے گئے۔ قیام پاکستان کے بعد لاہور آ کر ایف۔ سی۔ کالج میں پروفیسر رہے۔ پھر وزارت اطلاعات و نشریات حکومت پاکستان میں ڈائرکٹر جنرل ہو گئے اور اب ریٹائر ہو کر کراچی میں مقیم ہیں۔ پروفیسر مرزا محمود بیگ خاص دلی والے تھے۔ نفسیات کے بہت بڑے عالم، عظیم انسان، حد درجہ خوش مزاج اور بذلہ سنج آدمی تھے، کسی کی برائی کرنا یا کسی کو تکلیف پہنچانا ان کے نزدیک سب سے بڑا گناہ تھا۔ ہر وقت ہنستے اور مسکراتے رہتے تھے۔ ہر ایک کی مدد کرتے تھے۔ طالب علموں کو یونیورسٹی اور کالج کے علاوہ گھر پر بھی پڑھاتے تھے۔ طالب علموں میں مَیں نے ایسا مقبول استاد نہیں دیکھا۔ دلّی میں تقسیم کے موقع پر جب فسادات کی آگ بھڑکی تو میرے ساتھ وہ بھی ریفیوجی ہوئے۔ پہلے پاکستان ہائی کمیشن اور پھر پرانے قلعے میں پناہ گزیں ہوئے۔ کوئی سات مہینے کے بعد جب فسادات کی آگ کچھ ٹھنڈی ہوئی تو انھوں نے اینگلو عربک کالج کو ازسرِ نو زندہ کیا۔ دہلی کالج اس کا نام رکھا اور خود اس کے پرنسپل ہوئے ان کے خاندان کے تمام افراد پاکستان میں تھے لیکن وہ خود کالج کو زندہ رکھنے اور طالب علموں کی مدد کرنے کے لیے اپنی جان کی بازی لگا کر دلّی ہی میں رہے۔ اقتصادیات اور معاشیات کے پروفیسر

محمد لطیف قریشی صاحب، بڑے ہی نستعلیق آدمی تھے۔ بہت سیے دیے رہتے تھے لیکن بہت اچھے دوست تھے۔ کالج میں پڑھانے کے ساتھ ساتھ مسلم لیگ کے بھی سرگرم کارکن تھے۔ پاکستان کے معاشی حالات کا جائزہ لینے کے لیے مسلم لیگ نے جو کمیٹی قائم کی تھی قریشی صاحب اس کے سیکریٹری تھے۔ تقسیم سے قبل اس کی رپورٹ بھی انھوں نے تیار کی تھی بعد میں وہ یو۔ این۔ او میں چلے گئے تھے۔ آج کل لاہور میں رہتے ہیں۔ پروفیسر آفتاب احمد مختار صاحب تاریخ کے پروفیسر تھے۔ ان کا مطالعہ وسیع تھا۔ لیکن مجلسی آدمی تھے۔ خوب ہنستے اور ہنساتے تھے۔ خوش شکل، خوش بیان، اور حاضر جواب بلا کے تھے کسی کو بخشتے نہیں تھے، لیکن محبت سے پیش آتے تھے۔ قیام پاکستان سے کچھ قبل ہی ایجوکیشن کور میں چلے گئے تھے۔ خاصے عرصے طرزی کالج جہلم کے پرنسپل رہے۔ پھر کراچی میں اینگلو عربک کالج دلی والا اس کے پرنسپل رہے۔ آج کل کراچی میں ہیں۔ آفتاب احمد صاحب کے چھوٹے بھائی افتخار احمد مختار معاشیات کے استاد تھے۔ ان کی صحت اچھی نہیں تھی اس لیے انھیں غصہ جلد آجاتا تھا لیکن ویسے بہت اچھی طرح ملتے جلتے تھے۔ قیام پاکستان کے بعد انھوں نے کراچی یونیورسٹی میں بزنس ایڈمنسٹریشن کا انسٹی ٹیوٹ قایم کیا، اس کے ڈائریکٹر رہے۔ اب کراچی میں ایمریٹس پروفیسر ہیں۔ عربی اور اسلامیات کے پروفیسر ڈاکٹر خورشید احمد فارق صاحب عربی اور اسلامیات کے بہت بڑے عالم اور محقق تھے۔ سوائے پڑھنے لکھنے کے انھیں اور کوئی کام نہیں تھا۔ ہفتوں گھر سے باہر نہیں نکلتے تھے۔ ان کے کمرے کی ہر چیز چمکتی تھی اور وہ خود بھی چمکتے تھے۔ صورت سے فرشتہ معلوم ہوتے تھے۔ نہایت خلیق اور متواضع آدمی تھے۔ آج کل دلی یونیورسٹی میں اسلامیات اور عربی کے پروفیسر ہیں۔ ان کی تصانیف بین الاقوامی شہرت کی مالک ہیں۔ خصوصاً حضرت ابوبکر صدیقؓ، حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ کے سرکاری خطوط، جن کو انھوں نے بڑی محنت سے مرتب کرکے شائع کیا۔ منظور حسین موسوی صاحب فارسی کے صدر شعبہ تھے۔ عالم آدمی تھے لیکن انتظامی معاملات سے انھیں زیادہ دلچسپی تھی۔ پان کھاتے اور اچھی باتیں کرتے تھے۔ شکور احسن صاحب بھی فارسی کے شعبے میں استاد تھے۔ فارسی خوب بولتے تھے۔ مضامین بھی لکھتے تھے۔ قیام پاکستان کے بعد لاہور آ گئے۔ وہ امروز

اخبار میں اسسٹنٹ ایڈیٹر ہو گئے۔ پھر میرے اصرار پر اورینٹل کالج میں لیکچرار کی حیثیت سے آ گئے۔ کچھ عرصے بعد فارسی کے ریڈر، اور پھر پروفیسر ہو گئے۔ جلد ہی بے تکلف ہو جاتے تھے لیکن کانوں کے کچے تھے اس لیے تعلقات کو خراب بھی کر لیتے تھے۔ پروفیسر ہری شنکر صاحب بنارس کے ایک اہم پنڈت خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ بنارس یونیورسٹی میں ان کی تعلیم ہوئی تھی۔ نہایت خوش مزاج آدمی تھے۔ کبھی کسی کی برائی نہیں کرتے تھے۔ اینگلو عربک کالج مسلم لیگ کا قلعہ تھا۔ وہاں ان کا پروفیسر کی حیثیت سے رہنا معجزے سے کم نہ تھا۔ کالج سے بڑی محبت کرتے تھے۔ تقسیم کے بعد جب کالج تباہ ہوا تو ان کو ہندو کالج اور رامجس کالج نے اپنے ہاں بلانے کی کوشش کی لیکن انھوں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ میں تو اینگلو عربک کالج کا ملازم ہوں جب کالج کھلے گا تو وہیں کام کروں گا۔ چنانچہ سات آٹھ مہینے بیکار رہنے کے بعد جب کالج کھلا اور اس نے کام شروع کیا تو ہمارے ساتھ شنکر صاحب نے بھی اسی کالج میں پڑھانا شروع کیا۔

یہ تمام اساتذہ نہ صرف میرے رفیق کار تھے بلکہ دوست بھی تھے اور میں نے ان کی صحبتوں میں نہ صرف اچھا وقت گزارا بلکہ ان سے بہت کچھ سیکھا بھی۔

اینگلو عربک کالج میں طالب علم زیادہ تر اچھے گھرانوں کے آتے تھے۔ تہذیب اور شائستگی ان میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوتی تھی۔ ان میں سے ہر ایک اپنے استادوں کی عزت کرتا تھا اور استاد بھی اپنے بچوں کی طرح ان کا خیال رکھتے تھے۔ بیشتر طالب علم پڑھنے لکھنے میں اچھے تھے۔ ادب و شعر کا ذوق ہر ایک طالب علم کے مزاج میں رچا ہوا تھا۔ آئے دن ادبی جلسے اور مشاعرے ہوتے رہتے تھے اور طالب علم ان میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔ سیاسی شعور بھی ان میں بہت تھا اور وہ سب کے سب مسلم لیگ اور پاکستان کے سپاہی تھے۔

میرے اس زمانے کے شاگردوں میں سے بعض نے زندگی کے بعض شعبوں میں بڑا نام پیدا کیا ان میں جمیل الدین عالی، جمیل الدین حسن، عبدالرحمٰن صدیقی، عباس احمد عباسی، عرفان احمد امتیازی، منظور احمد، شیو پرشاد، جاوید وششٹ، گوپی چند نارنگ، ملک نسیم الظفر مرحوم، خواجہ بہادر علی حیدر،

ان کے کئی بھائی، جذبی، سردار جعفری اور اختر الایمان وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ جمیل الدین عالی نے غزلیں اور دوہے لکھے، کالم نگاری کی، گلڈ کو مضبوط بنیادوں پر قایم کیا اور انجمن ترقی اردو کے معتمد اعزازی کی حیثیت سے اردو زبان و ادب کی خدمت کے لیے اپنی زندگی وقف کی۔ جمیل الدین حسن نے پاکستان کے سفیر کی حیثیت سے مختلف ممالک میں خدمات انجام دیں، عبدالرحمٰن صدیقی افواج پاکستان میں بریگیڈیر کے عہدے تک پہنچے اور انٹر سروسز پبلک ریلیشنز میں گراں قدر خدمات انجام دیں۔ عرفان احمد امتیازی کو میں نے تین سال تک عربک کالج میگزین کا ایڈیٹر بنایا اور انھوں نے اپنے زمانۂ ادارت میں میگزین کے بہت بلند پایہ نمبر شائع کیے۔ قیام پاکستان کے بعد وہ حکومتِ پنجاب میں چیف سیکریٹری پلاننگ رہے اور آج کل وزارتِ مذہبی امور کے سیکریٹری اور زکوٰۃ کے ڈائرکٹر جنرل ہیں۔ بڑے نیک اور دیانت دار افسر مشہور ہیں، لیکن میرے سامنے آج تک اس طرح بیٹھتے ہیں جس طرح طالب علمی کے زمانے میں بیٹھتے تھے۔ نسیم المظفر اور عباس احمد عباسی اچھے شاعر اور ادیب تھے۔ ریڈیو کی ملازمت میں بھی انھوں نے اپنی ذہانتوں کے جوہر دکھائے۔ افسوس ہے جوانی میں اللہ کو پیارے ہوئے۔ منظور احمد تحریکِ پاکستان میں پیش پیش رہے۔ پاکستان کی خدمت کا جذبہ انھیں مشرقی پاکستان لے گیا، وہاں بہت کام کیا، لیکن دوسری دفعہ سنہ ۱۹۷۱ء میں رفیوجی ہوئے۔ بے شمار مضامین ان کے قلم سے نکلے ہیں۔ آج کل کراچی میں مقیم ہیں۔ خواجہ بہادر علی حیدر پاکستانی افواج کے بہت بڑے افسر بنے، کرنل یا بریگیڈیر کے عہدے تک پہنچے۔ آج کل پنڈی میں مقیم ہیں۔ اور شیو پرشاد جاوید وشسٹ اچھے شاعر ادیب اور محقق بنے اور آج کل دلی کالج میں پروفیسر ہیں۔ گوپی چند نارنگ جامعہ ملیہ دلی سے وابستہ ہیں۔ ان کے علاوہ بھی بے شمار شاگرد ہیں جو پاکستان اور ہندوستان میں کر رہے ہیں۔

ان کے علاوہ سردار جعفری، اختر الایمان، معین احسن جذبی ایسے مشہور شاعر بھی اینگلو عربک کالج سے متعلق رہے۔ انھوں نے جدید اردو شاعری میں جو کارنامے انجام دیئے ہیں ان کو فراموش

نہیں کیا جا سکتا۔

میں نے عربک کالج کے چند اساتذہ اور طلبہ کا ذکر اختصار کے ساتھ صرف اس خیال سے کرنا مناسب خیال کیا کہ لوگوں کو یہ علم ہو جائے کہ اس کالج نے کیسے کیسے جوہرِ قابل پیدا کیے اور انھوں نے کس طرح اپنی صلاحیتوں سے اس مادرِ علمی کا نام روشن کیا۔

اینگلو عربک کالج کے طالب علم نہایت ذہین ہوتے تھے۔ وہاں کی مخصوص فضا ان کی ذہانت کو کچھ زیادہ ہی صیقل کر دیتی تھی۔ حاضر جوابی میں ان کا جواب نہیں تھا بذلہ سنجی بھی ان پر ختم تھی، لیکن اس بذلہ سنجی کے اظہار میں کبھی کسی کے ہاں ابتذال کا رنگ پیدا نہیں ہوتا تھا منہ پر آئی ہوئی بات ان سے رکتی بھی نہیں تھی۔ فوراً کہہ دیتے تھے، لیکن حد درجہ تہذیب و شائستگی کے ساتھ۔

جمیل الدین حسن کی ایک بات مجھے اب تک یاد ہے۔

جب میں نے کالج میں استاد کی حیثیت سے کام شروع کیا اس وقت میری عمر بہت کم تھی۔ مشکل سے "تیئیس" "چوبیس" سال کی ہوگی، معلوم اس سے بھی کم ہوتی تھی۔ جمیل الدین اس وقت بی۔ اے کے آخری سال میں تھے۔ ایک دن لیکچر کے بعد میرے پاس آئے اور انتہائی شوخی، لیکن شائستگی کے ساتھ مجھ سے کہنے لگے۔

"عبادت صاحب! جی چاہتا ہے آپ سے پوچھوں کہ آپ نے اس کالج میں کب داخلہ لیا ہے؟"

میں اس فقرے سے بہت لطف اندوز ہوا۔

میں نے کہا "یہ تو بہت بڑا کامپلیمنٹ ہے" اور لفظوں سے یہ ظاہر کیا کہ تم بڑے ہی طرّاق ذہین لیکن شائستہ آدمی ہو۔

اینگلو عربک کالج دہلی اعلیٰ تعلیم کا ایک تعلیمی ادارہ ہی نہیں تھا، تہذیب و ثقافت اور ادب و شعر کا ایک اہم مرکز بھی تھا۔ پرانی دلی اور نئی دہلی کے سنگم پر واقع ہونے کی وجہ سے اور شہر

میں ہر جگہ سے قریب ہونے کے باعث بڑے بڑے جلسے اور ادبی اجتماع عربک کالج ہی میں ہوتے تھے۔ مسلم لیگ کا جلسہ تو کسی نہ کسی بہانے سے تقریباً روزانہ کالج ہال میں ہوتا تھا۔ کبھی نواب زادہ لیاقت علی خاں صاحب کی تقریر ہو رہی ہے، کبھی مقامی مسلم لیگ کے لیڈر جمع ہو رہے ہیں، کبھی فسادات کے خلاف یوم احتجاج منایا جا رہا ہے، کبھی یوم نجات پر تقریریں ہو رہی ہیں، کبھی قائد اعظمؒ کے کارناموں پر نظمیں پڑھی جا رہی ہیں، کبھی مشاعرے ہو رہے ہیں، کبھی خواتین کا جلسہ ہو رہا ہے، نعرے لگ رہے ہیں اور اللہ اکبر کی گونج سنائی دے رہی ہے۔ "لے کے رہیں گے پاکستان۔ بٹ کے رہے گا ہندوستان" کے نعرے بلند ہو رہے ہیں، کبھی سید محمد جعفری اپنی نظم پڑھ رہے ہیں جس کا شعر ہے ؎

مسلماں سے لڑنے چلے ہیں پٹیل
چھچھوندر کے سر میں چنبیلی کا تیل

یہ سیاسی جلسے اس لیے بھی عربک کالج میں ہوتے تھے کہ یہ مسلمانوں کا کالج تھا۔ قائد اعظم محمد علی جناح اس کے سرپرست اور نواب زادہ لیاقت علی خاں اس کے صدر تھے اور اس نسبت سے یہ کالج مسلم لیگ کا بہت بڑا گڑھ اور تحریک پاکستان کا بہت بڑا مرکز تھا۔ طالب علم اور اساتذہ سب کے سب مسلم لیگ کے حامی اور تحریک پاکستان کے سپاہی تھے اور ان کے نزدیک یہ کالج دہلی کے مسلمانوں کا قلعہ تھا۔

ادبی جلسوں کا یہ حال تھا کہ کالج کی سوسائٹیوں اور انجمنوں اور یونینوں کی طرف سے مہینے میں ایک مشاعرہ تو کالج میں ضرور ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ یوم غالب، یوم اقبالؒ، یوم مولانا محمد علی جوہر بڑے اہتمام سے منائے جاتے تھے۔ مہینے میں ایک دو بار کالج کے ڈائس پر ادبی انجمنوں کے تنقیدی اجلاس بھی ہوتے تھے جن میں مقالے اور افسانے پڑھے جاتے تھے اور نظمیں اور غزلیں بھی پیش کی جاتی تھیں اور ان سب پر حلقۂ ارباب ذوق کے انداز کی تنقید کی جاتی تھی۔

دہلی میں اس وقت ہندوستان کے مختلف علاقوں سے آئے ہوئے اردو کے ادیبوں کا جمگھٹا تھا۔ جنگِ عظیم سے متعلق مختلف شعبوں میں یہ ادیب مختلف حیثیتوں سے کام کر رہے تھے۔ بخاری صاحب

پہلے ہی سے ریڈیو کے ڈائرکٹر جنرل کی حیثیت سے دلّی میں آگئے تھے۔ ان کے بعد تاثیر صاحب بھی آگئے اُن کے بعد فیضؔ نے بھی لفٹیننٹ کرنل ہو کر کسی شعبے کا کام سنبھال لیا تھا۔ ریڈیو میں مولانا حامد علی خاں، ن۔ م۔ راشد، میراجی، مختار صدیقی، ضیا جالندھری، اعجاز حسین بٹالوی، محمد خلیل الرحمن، پریم ناتھ در، کرشن چندر مہندر ناتھ، اپندر ناتھ اشک وغیرہ جمع ہو گئے تھے۔ انجمن ترقی اردو میں حیات اللہ انصاری، رفیق الدین احمدؔ اور جامعہ ملیہ اسلامیہ میں ذاکر صاحب، عابد حسین صاحب، صالحہ عابد حسین، پروفیسر مجیب صاحب، عبداللطیف اعظمی صاحب، سلامت اللہ صاحب اور غلام ربانی تاباں وغیرہ جمع تھے۔ پالی ٹیکنیک میں پروفیسر حمید احمد خاں صاحب اور وقار عظیم صاحب نے ادب و شعر کا ماحول پیدا کر رکھا تھا۔ ان کے علاوہ لاہور سے ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی، مجید حسین، مولانا صلاح الدین احمد، میاں عبدالعزیز فلک پیما، میاں بشیر احمد، کنھیا لال کپور، اور ایم۔ اسلم۔ علی گڑھ سے رشید صاحب، سرور صاحب، لیث صاحب خورشید الاسلام، اختر انصاری، خلیل الرحمٰن اعظمی اور لکھنؤ اور الٰہ آباد سے ڈاکٹر اعجاز حسین صاحب اور پروفیسر سید احتشام حسین صاحب اکثر اس زمانے میں دلّی آتے رہتے تھے۔ ادبی دنیا میں ان سب کی وجہ سے بڑی چہل پہل تھی جس نے دلّی ایک اہم ادبی مرکز بنا دیا تھا۔ دلّی میں مستقل طور پر رہنے والوں میں ڈاکٹر مولوی عبدالحق، حضرت جوشؔ ملیح آبادی، خواجہ حسن نظامی، شاہد احمد دہلوی، حبیب اشعر دہلوی، اخلاق احمد دہلوی، صادق الخیری، ظفر قریشی، تابش دہلوی، شرف صبوحی، فضل حق قریشی دہلی میں موجود تھے۔

شاہد صاحب کا رسالہ "ساقی" اپنے شباب پر تھا۔ ان تمام ادیبوں کی تخلیقات اس میں شائع ہوتی تھیں۔ ادبی جلسے بھی ہوتے تھے۔ کبھی کسی ادیب کے مکان پر، کبھی کشمیری گیٹ پر پالی ٹیکنیک میں کبھی حمیدہ سلطان صاحبہ کی سری رام روڈ والی کوٹھی پر۔ کبھی خواجہ محمد شفیع صاحب کے ہاں ضیا محل میں اور کبھی اینگلو عربک کالج دہلی میں اجمیری گیٹ پر۔

میں بھی کبھی کبھی ان جلسوں میں چلا جاتا تھا، لیکن خاموش بیٹھتا تھا۔ بحث میں حصہ نہیں لیتا تھا۔ بزرگ ادیبوں سے میری بے تکلفی نہیں تھی اس لیے میں ان جلسوں کا خاموش تماشائی ہی رہا۔

بہت سے تماشے دیکھے اور ان تماشوں سے خوب لطف لیا چپ چاپ بیٹھے تماشا دیکھنے میں جو مزہ ہے وہ خود تماشا بن جانے میں نہیں ہے۔

ایک شام میں کشمیری گیٹ پر پالی ٹیکنیک میں ہونے والے ایک ادبی جلسے میں گیا۔ وقار عظیم صاحب اس جلسے کے روح رواں تھے وہ اس وقت جامعہ ملیہ کو چھوڑ کر پالی ٹیکنیک میں آ گئے تھے۔ پروفیسر حمید احمد خاں بھی اس وقت وقار صاحب کے ساتھ ہی پالی ٹیکنیک میں انگریزی کے استاد کی حیثیت سے کام کر رہے تھے۔ ان دونوں نے مل کر وہاں بھی اچھا خاصا ادبی ماحول پیدا کر لیا تھا۔ ادبی جلسے بھی وہاں ہوتے تھے۔ جس جس جلسے میں شریک ہوا اس میں حمینا ماتندھری صاحب، ڈاکٹر تاثیر صاحب، بخاری صاحب، پروفیسر حمید احمد خاں صاحب، وقار عظیم صاحب وغیرہ شریک تھے۔ حیات اللہ انصاری صاحب نے ن۔ م۔ راشد پر اپنا نہایت جامع مقالہ پڑھا۔ کوئی ایک گھنٹہ تک وہ مقالہ پڑھ کر سناتے رہے۔ یہ مقالہ بڑی محنت سے لکھا گیا تھا جب وہ مقالہ پڑھ چکے تو اس پر بحث کا آغاز ہوا۔ بیشتر حاضرین جلسہ نے مقالے کو سراہا اور اس خیال کا اظہار کیا کہ راشد کا اس سے بہتر مطالعہ ابھی تک نہیں ہوا۔ تاثیر صاحب کی عادت تھی کہ فقرے بہت کستے تھے اور اکثر مزاحیہ انداز میں باتیں کرتے تھے۔ ویسی ہی کوئی بات انھوں نے اس مقالے کے بارے میں کی۔ حیات اللہ انصاری صاحب اس پر بگڑ گئے اور کہا کہ ادبی بات سنجیدگی سے ہونی چاہیے۔ فقرے بازی پڑھے لکھے لوگوں کو زیب نہیں دیتی۔ تاثیر صاحب خاموش ہو گئے۔ فضا بگڑ گئی ماحول خراب ہو گیا۔ میں اس فضا اور ماحول کو دیکھ کر چپکے سے وہاں سے بھاگ نکلا اور آئندہ پھر کبھی ان جلسوں میں شریک نہیں ہوا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ اکثر ان جلسوں میں اسی قسم کی فضا پیدا ہو جاتی ہے۔ میں اس کو برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ اسی قسم کی فضا کو دیکھ کر میرا جی نے دلی میں حلقۂ ارباب ذوق کا ڈول ڈالا۔ ایک دن انھوں نے ایک صاحب کو میرے پاس بھیجا اور کاغذ کے ایک پرزے پر لکھا کہ:

عبادت صاحب: آئندہ اتوار سے آپ کا کالج حلقۂ ارباب ذوق کا مرکز بننے والا ہے۔ اطلاعاً آپ کو لکھ رہا ہوں جلسے کا انتظام یہیں کروا دیجیے۔

مجھے میراجی کی اس تحریر کو پڑھ کر خوشی ہوئی۔ ایک تو اس وجہ سے کہ میراجی نے مجھے لکھا اور اس قابل سمجھا کہ میں دلّی میں حلقۂ اربابِ ذوق کے جلسوں کا انتظام کروں، اور دوسرے اس وجہ سے کہ ہفتے اتوار کی شام کو لکھنے والے عربک کالج ہال میں جمع ہو جایا کریں گے، وہ ذرا رونق رہے گی۔ چنانچہ میں نے پرنسپل صاحب سے رسمی اجازت لے کر، اتوار کو عربک کالج ہال کے کشادہ لانس پر حلقے کے جلسے کا انتظام کر دیا۔

جلسے کا وقت پانچ بجے تھا۔ میں کوئی تین بجے کے قریب کالج کی دوسری منزل سے نیچے اترا تاکہ دیکھ لوں کہ کرسیاں وغیرہ ٹھیک سے لگا دی گئی ہیں یا نہیں۔ ہال کے سامنے کے لان میں دیکھا تو میراجی اکیلے چپ چاپ بیٹھے ہیں۔

میں نے انھیں دیکھتے ہی کہا۔

”آپ نے جلسے کا وقت پانچ بجے مقرر کیا تھا، آپ جلدی آ گئے تھے تو اوپر آ جاتے۔“

کہنے لگے ”میں تین بجے ہی یہاں پہنچ گیا۔ جس دن حلقے کا جلسہ ہوتا ہے مجھے چین نہیں پڑتا۔ ایک اضطراب کی سی کیفیت رہتی ہے اس لیے میں جلدی آ گیا اور سوچا یہیں بیٹھ کر آپ کا انتظار کروں۔ اوپر آ کر آپ کو پریشان کرنا مناسب نہیں معلوم ہوا۔“

میں نے کہا ”آپ نے تکلف کیا۔ ذرا دیر گپ ہوتی۔“

خیر، میں نے ہال کھلوایا۔ جلسے میں شریک ہونے والوں کے بیٹھنے کا جو انتظام کیا تھا اس کی ایک جھلک انھیں دکھائی اور پھر میں انھیں اپنے کمرے میں لے گیا جہاں وہ پان کھاتے اور اپنی ذہانت میں ڈوبی ہوئی باتوں سے گل گلزار کھلاتے رہے۔

اور اس طرح پانچ بج گئے۔

پانچ سوا پانچ بجے ادیب جمع ہونے لگے اور چند منٹ میں دیکھا کہ مولانا حامد علی خاں، ن۔ م۔ راشد، غلام عباس، مختار صدیقی، اعجاز حسین بٹالوی، ضیا جالندھری، راجندر سنگھ بیدی، کرشن چندر، پریم ناتھ ودر، ریوتی سرن شرما، محمد خلیل الرحمٰن اور بہت سے دوسرے ادیب خاصی تعداد میں آ گئے۔

میرا جی نے اپنی طویل نظم پڑھی۔ راشد نے مضمون اور پریم ناتھ در نے افسانہ پڑھا اور ان سب پر نہایت معیاری تنقیدی بحث ہوئی اور سب نے یہ محسوس کیا کہ لاہور کے حلقۂ اربابِ ذوق کا ماحول دلّی میں بھی پیدا ہو گیا ہے۔

اسی طرح حلقے کے جلسے باقاعدگی کے ساتھ ہر اتوار کو دلّی میں بھی ہونے لگے۔

اس زمانے میں میں نے ایک بہت بڑا مشاعرہ کیا۔ منصوبہ یہ بنایا کہ اس میں پرانے شاعروں کے ساتھ نئے شاعروں کو بھی شریک کیا جائے چنانچہ اس میں جوشؔ صاحب، جگرؔ صاحب، اثرؔ صاحب وغیرہ کے ساتھ میں نے میراؔجی، ن۔ م۔ راشدؔ، مختار صدیقی، ضیاؔ جالندھری، اعجازؔ بٹالوی کو بھی شریک کیا۔ میرا جی نے بہت کوشش کی کہ وہ مشاعرے میں شریک نہ ہوں، بہت ٹالا لیکن میں نے لڑکوں کو پیچھے لگا دیا۔ وہ میراؔجی کو گھیر کر لے آئے۔ میرا جی نے مجھ سے کہا کہ میری طرف سے معذرت کر دیجیے، میری نظم سامعین کی سمجھ میں نہیں آئے گی اور مشاعرے کا ماحول بگڑ جائے گا۔ لیکن میں نے کہا کہ "میں نے سامعین سے وعدہ کیا ہے کہ آج کے مشاعرے میں میراؔجی ضرور پڑھیں گے" چنانچہ میں نے ان کا نام پکارا۔ میراؔجی اسٹیج پر آئے اور غزل کا ایک شعر پڑھ کر رخصت ہوئے۔ سامعین کو بہت لطف آیا۔

اس زمانے میں اینگلو عربک سوسائٹی کے سالانہ جلسے کے موقع پر اربابِ اختیار کو ایک بہت بڑا مشاعرہ ترتیب دینے کا خیال پیدا ہوا۔ مشاعرے کا انتظام میرے سپرد تھا۔ میں نے اس کی صدارت کے لیے بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب کو مجبور کیا اور وہ میرے اصرار پر صدارت کے لیے تیار ہو گئے۔ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ مولوی صاحب مشاعرے کی صدارت کریں گے۔ لوگوں کو بڑی حیرت ہوئی۔ چنانچہ مشاعرہ ہوا اور مولوی صاحب نے صدارت فرمائی۔ شاعروں میں مولانا حسرتؔ، جگرؔ صاحب، اثرؔ صاحب، جوشؔ صاحب، فراقؔ صاحب، پنڈت آنند نرائن ملاؔ، مجازؔ، جاں نثار اخترؔ وغیرہ شریک ہوئے۔ اسی مشاعرے میں کرارؔ نوری نے اپنا طویل قصیدہ قائدِ اعظمؒ کی شان میں پڑھا جس کو بہت پسند کیا گیا۔ مولوی صاحب دو بجے رات تک صدر کی حیثیت سے

مشاعرے میں موجود ہے۔

غرض اس طرح ان ادبی جلسوں اور مشاعروں کی بدولت اینگلو عربک کالج نے دلی میں ایک اہم ادبی مرکز کی صورت اختیار کر لی۔ مسلم لیگ اور تحریک پاکستان کے ایک مرکز کی حیثیت سے تو یہ کالج پہلے ہی بہت مشہور تھا، اب ایک ادبی مرکز کی حیثیت سے بھی اس نے اپنا ایک مقام پیدا کر لیا۔

اس زمانے کی دلی میں، اینگلو عربک کالج کے باہر بھی جو ادبی ماحول تھا اس میں بڑی زندگی تھی۔ دلی کے ادیبوں کے علاوہ ہندوستان کے مختلف علاقوں سے ادیب بسلسلۂ ملازمت دلی میں آ کر جمع ہو گئے تھے۔ ادیبوں کا سب سے بڑا اجتماع تو ریڈیو میں تھا۔ اس کے علاوہ ساقی کے ایڈیٹر شاہد احمد دہلوی صاحب نے اپنی محفل الگ سجا رکھی تھی۔ نئے ادیبوں کی سرپرستی میں وہ پیش پیش تھے اور اپنے رسالے "ساقی" اور ساقی بک ڈپو کے ذریعے وہ نئے ادیبوں کی تخلیقات کو منظر عام پر لانے میں بڑا اہم کام کر رہے تھے۔ اردو بازار میں کتب خانہ علم و ادب میں ہر وقت ادیبوں کا مجمع رہتا تھا۔ وہاں شاہد صاحب، اشرف صبوحی، ظفر قریشی، اخلاق احمد دہلوی، حبیب اشعر، نہال سیوہاروی، فضل حق قریشی، اور صادق الخیری وغیرہ تو تقریباً روزانہ آتے تھے۔

ان کے علاوہ راشد، میرا جی، غلام عباس، محمد حسن عسکری، کرشن چندر، سلام مچھلی شہری، مہندر ناتھ، راجندر سنگھ بیدی، عتیق صدیقی، مرزا محمد سعید، وغیرہ کا بھی وہاں آنا جانا تھا۔ شاہد احمد دہلوی صاحب اس کے میر محفل تھے۔

میں کتب خانہ علم و ادب میں کم جاتا تھا۔ ایک دن میں ادھر سے گزرا۔ تانگہ بچا کر ایڈورڈ پارک کی طرف چلا جا رہا تھا۔ شاہد صاحب نے مجھے دیکھ لیا اور دور سے آواز دے کر بلایا اور کہا کہ "میاں کہاں ٹیڑھے ٹیڑھے چلے جا رہے ہو۔ ادھر آؤ، ایک اہم شخصیت سے تمہاری ملاقات کراتے ہیں۔"

یہ کہہ کر انھوں نے ایک صاحب کی طرف اشارہ کیا اور کہا۔ "آپ سے ملیے۔ آپ میاں ایم اسلم ہیں، لاہور سے آئے ہیں۔"

میں بڑے تپاک سے ملا اور میری زبان سے نکلا: "آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی۔" میاں صاحب کہنے لگے: "لیکن مجھے آپ سے مل کر بالکل خوشی نہیں ہوئی۔"

میں سکتے میں آ گیا۔ میرے لیے یہ نیا تجربہ تھا۔

پھر میاں صاحب شاہد صاحب کی طرف مخاطب ہو کر کہنے لگے: "انھوں نے 'ادبِ لطیف' میں ایک طویل مضمون "اردو ادب ۱۹۴۲ء میں" کے عنوان سے لکھا ہے۔ اس میں میرا بھی ذکر ہے لیکن اس طرح کہ ایم۔ اسلم اردو کے بڑے افسانہ نگار ہیں۔ انھوں نے اعلیٰ درجے کے افسانے لکھے لیکن ان کی زود نویسی اور بیش نویسی انھیں لے ڈوبی۔"

"بتائیے حضرات! اس جملے کے بعد میں ان سے مل کر کیسے خوش ہو سکتا ہوں۔ افسوس تو اس بات کا ہے کہ یہ میرے مسلمان بھائی ہیں۔ انھوں نے اپنے مسلمان بھائی کے بارے میں تو یہ لکھا اور بعض ہندو لکھنے والوں کی بڑی تعریف کی۔ مثلاً انھوں نے کرشن چندر کو بہت سراہا ہے۔"

اس پر تمام حاضرین نے زوردار قہقہہ لگایا۔ میں بھی بہت محظوظ ہوا اور میاں صاحب کی سادگی اور معصومیت پر مجھے بہت پیار آیا۔

اس طرح تھوڑی دیر شکوے شکایت کا سلسلہ جاری رہا۔ جب دم گھٹنے لگا تو میں وہاں سے بھاگا اور ایڈورڈ پارک میں جا کر پناہ لی۔

دوسرے دن شاہد صاحب سے تو کہنے لگے: "کہو بھئی کل کیسی رہی؟"

میں نے کہا: "بہت لطف آیا۔ آپ نے ایک نہایت ہی سادہ اور معصوم بزرگ سے میری ملاقات کروائی۔ آپ کا شکریہ کیسے ادا کروں؟"

کہنے لگے: "میں نے سوچا کہ میاں صاحب کو ذرا تم دیکھ تو لو۔ پھر ایسا موقع ہاتھ نہیں آئے گا۔"

ہفتے میں دو دن شام کو میں اردو بازار کی طرف جاتا تھا اور دو تین دن نئی دلی کی سیر کرتا۔ کناٹ پیلیس کے ایک دو چکر لگا کر ہم لوگ اکثر کافی ہاؤس میں اور کبھی لارڈز ریسٹورنٹ یا کسی اور ریسٹورنٹ میں بیٹھتے تھے۔ یہاں میری طویل ملاقاتیں تاثیر صاحب، اعجاز حسین بٹالوی صاحب اور

ضیا جالندھری صاحب سے ہوتی تھیں۔ ہم لوگ گھنٹوں چائے یا کافی پیتے اور باتیں کرتے تھے۔ اس طرح دلی میں میرا وقت اچھا گزر رہا تھا لیکن لکھنؤ کی یاد ستاتی ضرور تھی۔

اینگلو عربک کالج میں میرا تقرر عارضی طور پر ہوا تھا۔ ایک سال بعد یونیورسٹی کی طرف سے اس کا اشتہار دینا ضروری تھا چنانچہ اشتہار دیا گیا اور مجھے یونیورسٹی کے سلیکشن بورڈ کے سامنے پیش ہونا پڑا۔ اس بورڈ کے صدر تھے بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب اور ممبر تھے ڈاکٹر اظہر علی، ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی، پروفیسر خورشید احمد چشتی اور پروفیسر مرزا محمود بیگ۔ اشتہار چونکہ کئی اخباروں میں دیا گیا تھا اس لیے ہندوستان کے مختلف علاقوں سے خاصی تعداد میں امیدواروں کی درخواستیں آئی تھیں۔ میں چونکہ اس جگہ پر پہلے سے کام کر رہا تھا اور میرے کام کی وجہ سے لوگ مجھے جانتے بھی تھے اور عزت بھی کرتے تھے اس لیے خیال تھا کہ تقرر کی یہ کارروائی رسمی سی ہوگی اور میرا تقرر ہو جائے گا۔

سلیکشن کمیٹی کی میٹنگ کا وقت دس بجے تھا۔ ابھی دس بجنے میں پانچ منٹ تھے کہ ڈاکٹر اظہر علی نے یہ کہہ کر میٹنگ شروع کروانے کی کوشش کی کہ وقت ہو گیا ہے۔ میٹنگ شروع کر دینی چاہیے۔ امیدوار خاصی تعداد میں ہیں، اس کام میں وقت بہت لگے گا۔ ہو سکتا ہے مولوی صاحب اپنی مصروفیت کی وجہ سے اس میں شرکت نہ کریں۔

میں نے یہ سن کر کہا کہ ”ابھی دس نہیں بجے ہیں۔ مولوی صاحب صحیح وقت پر پہنچیں گے۔ ابھی ایک منٹ باقی ہے۔“

یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ مولوی صاحب کی موٹر ٹھیک دس بجے پرنسپل کے کمرے کے سامنے آ کر رکی۔ میری زبان سے اضطراری طور پر یہ جملہ نکلا ”مولوی صاحب ٹھیک دس بجے تشریف لے آئے ہیں۔ اب میٹنگ شروع کی جا سکتی ہے۔“

چشتی صاحب پرنسپل نے باہر نکل کر مولوی صاحب کا استقبال کیا اور میٹنگ کے کمرے میں لے گئے۔ میٹنگ شروع ہوئی۔ سب سے پہلے مجھے انٹرویو کے لیے بلایا گیا۔

ممبران میں سے بعض نے کچھ رسمی سے سوال کیے۔ میرا چھپا ہوا کام دیکھا اور سب کے سامنے تعریف کی لیکن ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی صاحب بجائے سوال پوچھنے کے یہ کہتے رہے کہ مجھے آپ کے بعض خیالات سے اتفاق نہیں ہے۔ میں نے جواب میں کہا کہ "میرے کیا کسی شخص کے ہر خیال سے اتفاق کرنا ضروری بھی نہیں ہے" بحث شروع ہو گئی۔ مولوی صاحب مسکراتے رہے اور کمیٹی کے ممبر اس بیکارم کی بحث سے محظوظ ہوتے رہے۔ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی صاحب نے اس کا کھل کر اظہار تو نہیں کیا لیکن بات دراصل یہ تھی کہ میں نے اس زمانے میں مولانا حسرت موہانی کے ایما پر اردو شاعری میں عریانی کے موضوع پر ایک مفصل مضمون لکھا تھا جو کئی قسطوں میں رسالہ 'ادبِ لطیف' لاہور میں شائع ہوا تھا۔ اس مضمون میں میں نے ادب اور خصوصاً شاعری میں عریانی کا تاریخی جائزہ لیا تھا اور اردو شاعری میں عریانی کی حقیقت کو بے نقاب کرنے کی کوشش کی تھی۔ غالباً اشتیاق صاحب نے یہ مضمون پڑھا تھا اور اس کو پڑھ کر اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ یہ شخص گردن زدنی ہے۔ انھوں نے انٹرویو کا رنگ بدل دیا اور بحث شروع کر دی جو اُن کے شایانِ شان نہیں تھی۔ سب ممبروں اور خصوصاً ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب نے اس کو محسوس کیا اور میری حمایت کی۔ قریشی صاحب اس صورت حال سے کچھ پریشان ہو گئے۔ پینتالیس منٹ کی بات چیت کے بعد میٹنگ کے صدر ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب نے مجھے باہر جانے کی اجازت دے دی۔ میں اپنی کتابیں اور رسالے سمیٹ کر باہر نکلا تو میرے کان میں مولوی صاحب کی یہ آواز آئی کہ "اختلاف تو ادبی اور علمی معاملات میں ہو سکتا ہے، لیکن کام کے معیار کو دیکھنا چاہیے۔" اس کے بعد دوسرے امیدوار بلائے گئے اور انٹرویو کا یہ سلسلہ کوئی دو بجے تک جاری رہا۔

شام کو میں مولوی صاحب کے پاس دریا گنج گیا۔ انھوں نے میٹنگ کی روداد سنائی اور کہا بھئی، اشتیاق حسین قریشی صاحب آخر وقت تک خدا جانے کیوں تمہاری مخالفت کرتے رہے۔ اس طرح جیسے انھیں تم سے خدا واسطے کا بیر ہو۔ جب میں نے دیکھا کہ اُن کا رویہ معاندانہ ہے تو مجھے غصہ آ گیا اور میں نے اُن کو یہ کہہ کر ڈانٹا کہ آپ لوگ کیمبرج اور آکسفورڈ اور لندن کے تعلیمی نظام

میں وہ کرتے ہیں لیکن آپ کے ذہنوں کے دریچے کھلتے نہیں۔ معمولی اختلاف کو اتنا طول دیتے ہیں۔ آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ اس شخص کا تقرر سال بھر پہلے میں نے اس کے علمی ادبی کام کی بنیاد پر وائس چانسلر اور پرنسپل سے خود کروایا ہے۔ اب یہ میٹنگ وغیرہ تو ایک رسم ہے جس کو پورا کرنا ہے۔ میری یہ باتیں سن کر وہ خاموش ہو گئے۔ ورنہ وہ مخالفت پر تلے ہوئے تھے۔ جب میں نے دیکھا کہ یہ مخالفت بے بنیاد ہے اور اس کی وجہ سے میٹنگ کے آداب بھی مجروح ہو رہے ہیں تو میں نے سختی سے بات کی۔ بہرحال تمہارا تقرر ہو گیا ہے تم مستقل بھی ہو گئے ہو۔ شعبے کی صدارت بھی تمھیں سونپی گئی ہے۔ اب اطمینان سے کام کرو۔

میں یہ باتیں سن کر اور مولوی صاحب کے پاس تھوڑی دیر بیٹھ کر واپس آیا اور خدا کا شکر ادا کیا کہ مولوی صاحب موجود تھے ورنہ خدا جانے کیا ہوتا۔

اب مجھے ذرا اطمینان نصیب ہوا اور اب میں نے شعبۂ اردو کو مضبوط بنیادوں پر استوار کرنے کا منصوبہ بنایا۔ اس سلسلے میں اردو کے لیکچرار کی ایک اسامی کے لیے کوشش شروع کی۔ کالج اور یونیورسٹی نے اس لیکچرار کی ضرورت کو تو تسلیم کر لیا لیکن فنڈ نہ ہونے کا بہانہ بنا کر اس کے تقرر کو التوا میں ڈالنے کی کوشش کی۔ میں نے اس صورت حال کو بابائے اردو مولوی عبدالحق صاحب کے سامنے رکھا۔ مولوی صاحب بہت عظیم انسان تھے۔ ایک منٹ میں انھوں نے یہ کہہ کر اس مسئلے کو حل کر دیا کہ اس کے لیے فنڈ کو مسئلہ نہیں بنانا چاہیے یہ اردو کی خدمت ہے اس لیے اس لیکچرار کی تنخواہ میں دوں گا۔ میں ان کی دانائی کا قائل ہو گیا۔ کالج اور یونیورسٹی کے ارباب اختیار سے اس کا ذکر کیا اور چند مہینے میں عارضی طور پر چھ مہینے کے لیے خواجہ احمد فاروقی کا تقرر کر لیا۔ خواجہ صاحب اس وقت حلیم مسلم ہائی اسکول کانپور میں پڑھاتے تھے۔ میرے پاس کئی بار وہ آئے اور یہ خواہش ظاہر کی کہ انھیں کسی طرح عربک کالج میں لے لیا جائے لیکن مشکل یہ تھی کہ ایم اے میں ان کی سیکنڈ ڈویژن تھی اور دہلی یونیورسٹی کے کالجوں میں صرف فرسٹ کلاس ایم اے یا پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کرنے والے کا تقرر ہو سکتا تھا۔ سر ماریس گوائر کی خاص ہدایات تھیں اس لیے اس کی سختی سے پابندی کرنی پڑتی تھی۔ خواجہ صاحب کے تقرر کے لیے میں نے کیس بنایا اور لکھا کہ خواجہ صاحب اردو کے ادیب ہیں، انھوں نے اردو زبان و ادب کے مختلف موضوعات

پر کتابیں اور مضامین لکھے ہیں۔ پھر یہ تقرر صرف چھ۶ مہینے کے لیے کیا جا رہا ہے اتنی کم مدت کے لیے کوئی اور لیکچرار آنے کے لیے تیار نہیں ہوگا۔ اس لیے ان کے تقرر کی اجازت دی جائے۔ میرے نوٹ پر یہ فیصلہ ہوا کہ عارضی طور پر خواجہ صاحب کا تقرر کر لیا جائے۔ چنانچہ خواجہ صاحب میرے رفیق کار بن گئے اور ان کی وجہ سے مجھے اپنے کام میں بڑی تقویت حاصل ہوئی

اب میں ہفتے میں چار دن ایم۔ اے اور بی اے آنرز کی کلاسیں پڑھانے کے لیے یونیورسٹی جانے لگا۔ دو دن کالج میں ٹیوٹوریل اور سیمینار وغیرہ کا کام کرتا رہا۔ اردو اور فارسی کی پوسٹ گریجویٹ کلاسیں اس وقت سینٹ اسٹیفنز کالج میں ہوتی تھیں، کیوں کہ یونیورسٹی کی عمارتیں زیر تعمیر تھیں۔ اور وہاں تمام کلاسوں کے لیکچروں کے لیے معقول جگہ کا انتظام نہیں تھا۔ لیکچر شروع ہونے سے قبل اور اس کے بعد میں کچھ دیر سینٹ اسٹیفنز کالج کے اسٹاف روم میں گزارتا تھا جہاں ڈاکٹر ریاض الاسلام، مولانا سعید احمد اکبر آبادی اور امیر حسن عابدی صاحب سے روزانہ ملاقات ہوتی تھی۔ کبھی کبھی ڈاکٹر اطہر علی اور ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی صاحب سے بھی ملاقات کا موقع ملتا تھا۔ اس طرح اینگلو عربک کالج، سینٹ اسٹیفنز کالج، اور دہلی یونیورسٹی سے میرا رابطہ قائم ہوگیا اور چند سال میرے وہاں بہت اچھے گزرے۔ مولانا سعید احمد اکبر آبادی صاحب اور ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی صاحب کی شفقت اور محبت نے مجھے بڑا سہارا دیا اور میں نے ان بزرگوں اور دوستوں سے بہت کچھ سیکھا۔

ادھر ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب سے بھی اب زیادہ قربت حاصل ہوئی۔ ہفتے میں دو دن ایم۔ اے کے طالب علم ان سے پڑھنے کے لیے انجمن ترقی اردو کے دفتر، دریا گنج جاتے تھے جہاں مولوی صاحب آنریری پروفیسر کی حیثیت سے انھیں لیکچر دیتے تھے۔ میں روزانہ کبھی دن میں کبھی شام کو ان کے پاس چلا جاتا تھا اور گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ ان کے ساتھ باتیں ہوتی تھیں۔ مولوی صاحب، از راہ محبت و نوازش مجھ سے شعبے کے بارے میں مشورے کرنے لگے۔ رسالہ اردو اور اخبار ہماری زبان کا کچھ کام بھی میرے سپرد کیا۔ مجھ سے نئی کتابوں پر تبصرے لکھوائے اور میرے پی۔ ایچ۔ ڈی کے تحقیقی مقالے کو انجمن کی طرف سے اہتمام کے ساتھ شائع کرنے کے لیے تمام سہولتیں فراہم کیں۔ ایک کاتب مجھے

دیا جو میری کتاب "اردو تنقید کا ارتقا" کی کتابت میری نگرانی میں کرنے لگا۔ اپنے خطبات، مقدمات اور مقالات کو کئی جلدوں میں شائع کرنے کی اجازت بھی مجھے مرحمت فرمائی۔ اس طرح مجھے دہلی یونیورسٹی، اینگلو عربک کالج اور سینٹ اسٹیفنز کالج کے فرائض منصبی کے ساتھ انجمن اور مولوی صاحب کی خدمت کرنے کے مواقع بھی ملے۔

ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب دریا گنج میں بڑی شان سے بادشاہوں کی طرح رہتے تھے لیکن ویسے ان کی زندگی بڑی سادہ تھی صرف ایک وقت کھانا کھاتے تھے اور دن بھر علمی کاموں میں مصروف رہتے تھے۔ کہتے تھے دن میں کھانا نہ کھانے سے طبیعت میں گرانی نہیں ہوتی اور کام زیادہ ہوتا ہے۔ کھانا کھانے سے طبیعت میں کسل پیدا ہوتا ہے اور غنودگی طاری ہو جاتی ہے۔ دن بھر مولوی صاحب کبھی لغت کے کام میں، کبھی قدیم قلمی نسخوں کو دیکھنے میں مصروف رہتے تھے۔ شام کو بالعموم میں ان کے پاس جاتا تھا۔ اس وقت وہ چائے پی کر اطمینان سے اندر کے برآمدے میں بیٹھتے تھے حقہ ان کے سامنے ہوتا تھا۔ پنڈت کیفی بھی آجاتے تھے۔ تھوڑی دیر کے لیے سید ہاشمی فرید آبادی صاحب بھی فرید آباد جانے سے قبل وہاں آکر بیٹھ جاتے تھے۔ عبدالرحمن صدیقی صاحب اکثر ان کے ہاں مہمان کی حیثیت سے قیام کرتے تھے۔ میں بھی پہنچ جاتا تھا۔ خوب باتیں ہوتی تھیں۔ اردو کے مسائل کا ذکر ہوتا تھا۔ یونیورسٹی اور عربک کالج کے معاملات زیر بحث آتے تھے۔ کوئی گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ ان کی خدمت میں حاضر رہ کر میں اپنی جائے قیام پر واپس آجاتا تھا۔ مولوی صاحب مرحوم کی شفقت اور محبت مجھ پر بے پایاں تھی۔

مولوی صاحب کو پرانی اور ویران قسم کی عمارتوں میں جانے کا بڑا شوق تھا۔ ایک دن مجھ سے کہنے لگے "تم نے حوض خاص دیکھا ہے؟" میں نے کہا "وہاں جانے کا کبھی اتفاق نہیں ہوا" کہنے لگے "کل چلیں گے۔" چنانچہ دوسرے دن ہم لوگ رفیق صاحب اور صدیقی صاحب کو ساتھ لے کر گاڑی میں کئی میل کی مسافت طے کر کے حوض خاص پہنچے۔ مغرب کا وقت ہو گیا تھا۔ خاصی ویرانی تھی۔ مولوی صاحب نے وہاں خوب سیر کی اور بلبن اور دوسرے شاہان خاندان غلاماں کو خراج تحسین پیش کیا۔ کچھ تاریخی واقعات بیان

کیے اور جب رات ہو گئی تو وہاں سے واپس آئے۔ اسی طرح ایک دن لودھی گارڈن کا پروگرام بنایا گیا۔ ایک دن تغلق آباد گئے۔ ایک دن مہرولی کے آس پاس کے کھنڈر دیکھے۔ غرض دلی کی قدیم عمارتوں اور کھنڈروں کو اس طرح مولوی صاحب کے ساتھ مجھے دیکھنے کا موقع ملا۔

ڈاکٹر انصاری کی کوٹھی نمبر ۱، دریا گنج دہلی جس میں انجمن کا دفتر تھا اور جہاں مولوی صاحب رہا کرتے تھے، اس وقت کے بڑے بڑے سیاسی لیڈروں، حکومت کے افسروں، عالموں، ادیبوں اور شاعروں کی زیارت گاہ تھی۔ یہ سب مولوی صاحب مرحوم سے ملنے آیا کرتے تھے۔ میں چونکہ روزانہ مولوی صاحب کے پاس حاضری دیتا تھا اس لیے میری بھی ان لوگوں سے ملاقات ہو جاتی تھی۔ اردو تحریک کے رہنما کی حیثیت سے یہ سب مولوی صاحب کی عزت کرتے تھے۔

مولوی صاحب کے پاس آنے والوں میں گاندھی جی، نواب زادہ لیاقت علی خاں، پنڈت سندرلال، نواب بہادر یار جنگ، جناب قاسم رضوی، ڈاکٹر عابد حسین صاحب، پروفیسر مجیب، چودھری خلیق الزماں صاحب، ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب، نواب زین یار جنگ، ڈاکٹر ضیاءالدین، پروفیسر رشید احمد صدیقی، پروفیسر آل احمد سرور، سردار عبدالرب نشتر، میاں بشیر احمد، عبدالرحمٰن صدیقی، پروفیسر نجیب اشرف ندوی، سر تیج بہادر سپرو، حکیم امامی بنگلوری، پروفیسر بخاری، ڈاکٹر تاثیر وغیرہ کے نام سرفہرست ہیں۔ ان بزرگوں سے میری ملاقاتیں مولوی صاحب ہی کے ہاں ہوئیں۔ مولوی صاحب ان سب سے مختلف موضوعات پر باتیں کرتے تھے مگر تان اردو کے مسئلے پر جا کر ٹوٹتی تھی۔

بعض اوقات یہ دیکھا کہ مولوی صاحب بعض افسر قسم کے لوگوں کو جو اردو کے معاملے میں کسی قسم کی مصالحت پر تیار ہو جاتے تھے خوب کھری کھری سناتے ہیں۔ ایک دن سہ پہر کو میں مولوی صاحب کے ہاں پہنچا تو دیکھا کہ ایک صاحب اندر بیٹھے ہیں اور مولوی صاحب انھیں خوب ڈانٹ پلا رہے ہیں۔ میں برآمدے میں بیٹھ گیا لیکن مولوی صاحب نے مجھے دیکھ لیا۔ آواز دے کر اندر بلایا لیکن بیچاری صاحب کو ڈانٹنے کا سلسلہ جاری رکھا۔ میں چپ چاپ بیٹھا رہا اور مولوی صاحب کی ڈانٹ پھٹکار کو سنتا رہا۔

دراصل بخاری صاحب ریڈیو کے ڈائرکٹر جنرل تھے۔ انھوں نے اردو کے معاملے میں بعض ہندو افسروں کے ساتھ جو پالیسی بنائی تھی اس سے اردو کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ تھا اور ان کے منصوبے سے مصالحت پسندی اور زمانہ سازی کی بو آتی تھی۔ مولوی صاحب کو اس کا علم ہو گیا تھا۔ بخاری صاحب اپنی صفائی میں کچھ کہنے کے لیے اُن کے پاس آئے تھے۔ مولوی صاحب نے اُن کو آڑے ہاتھوں لیا اور اتفاق کی بات ہے کہ اس منظر کو مجھے بھی دیکھنے کا موقع مل گیا۔

مولوی صاحب کے مزاج میں بذلہ سنجی بہت تھی۔ ایک دن میں سہ پہر کو پہنچا تو بہت خوش نظر آئے۔ ایک خط میری طرف بڑھایا اور کہا "اس کو پڑھو، یہ خط حکومتِ ہند کی طرف سے آیا ہے انجمن کی زمین کے بارے میں ہے۔"

میں نے خط پڑھا۔ اس میں لکھا تھا کہ انجمن کی نئی عمارت کی تعمیر کے لیے زمین دینے کا فیصلہ اصولی طور پر ہو چکا ہے لیکن ابھی تک اس قطعۂ زمین کی بیرکوں میں کچھ ڈیکائز رہتی ہیں (جنگ کے زمانے میں خواتین کا یہ دستہ بنایا گیا تھا جس کو ڈیکائز کہتے تھے)، اگر انجمن کے عملے میں نوجوان لوگ زیادہ نہ ہوں تو حکومت اس زمین کو بحال کرے اور جو بیرکیں بنی پڑی ہیں ان میں انجمن کا دفتر قایم ہو جائے۔ کیونکہ نوجوان لوگوں کی موجودگی میں بعض انتظامی دشواریاں پیدا ہونے کا اندیشہ ہے۔

مولوی صاحب کہنے لگے "میں نے اس مضحکہ خیز خط کا جواب لکھ دیا ہے اور اس میں یہ لکھا ہے کہ میں پچھتر سال کا بوڑھا ہوں لیکن بیس پچیس سال کے نوجوانوں سے بہتر ہوں۔ اب حکومت خود فیصلہ کرے کہ ڈیکائز کو کوئی خطرہ ہے یا نہیں۔"

میں نے حکومت کے خط کے ساتھ مولوی صاحب کا جواب بھی پڑھا اور بے اختیار ایک ہلکا سا قہقہہ لگا کر مولوی صاحب کی ذہانت، بے باکی اور بذلہ سنجی کی داد دی۔

اینگلو عربک کالج دہلی میں نئے غیر شادی شدہ استادوں کے قیام کا انتظام ہوسٹل کے ایک بلاک میں تھا جس کو اساتذہ کے لیے مخصوص کر دیا گیا تھا۔ یہ وہی کمرے تھے جن میں دہلی کالج کے زمانے میں حالی، نذیر احمد اور مولانا محمد حسین آزاد وغیرہ رہتے تھے اور اب انھیں کمروں میں میرا اور میرے رفقا

شکور احسن صاحب، ڈاکٹر خورشید احمد فارق صاحب سید حسن صاحب اور خواجہ احمد فاروقی صاحب کا قیام تھا۔ ان کمروں سے ملحق ہوسٹل کے وارڈن پروفیسر مرزا محمود بیگ کی سرکاری قیام گاہ تھی ہم سب اس بلاک میں ایک خاندان کے افراد کی طرح رہتے تھے۔ آپس میں بڑی محبت تھی، بڑی بے تکلفی تھی، اور زیادہ وقت ایک دوسرے کے ساتھ گزارتے تھے سترہ روپے مہینے میں ہوسٹل سے کھانا اور ناشتہ آجاتا تھا۔ استاد سبطے ہیڈ باورچی کے پکائے ہوئے کھانے میں بڑی لذت تھی ہفتے کو بریانی اور فیرنی وغیرہ پکتی تھی اور علی گڑھ تک یہ بریانی اور فیرنی مشہور تھی چنانچہ علی گڑھ سے بھی بعض جاننے والے طالب علم اور اساتذہ لذتِ کام و دہن حاصل کرنے کے لیے ہفتے کو یہاں آجاتے تھے۔ ہم لوگ سب ایک ساتھ کھانا کھاتے اور گپ کرتے تھے۔ بیگ صاحب ہمارے قائد اور رہنما تھے اور ہم سب انھیں "ڈیوک" کہتے تھے۔

پروفیسر مرزا محمود بیگ نفسیات کے پروفیسر تھے۔ اپنے مضمون پر انھیں پورا عبور حاصل تھا [illegible] دلی والے تھے اور ان کی زبان اور انداز بیان میں بلا کی شیرینی تھی۔ معلوم ہوتا تھا شہد و شکر کا چشمہ پھوٹ نکلا ہے۔ طالب علم ان پر جان دیتے تھے۔ کالج میں بھی طالب علموں کو پڑھاتے تھے، یونیورسٹی میں بھی پڑھاتے تھے اور گھر پر بھی طالب علموں کو بلا لیتے تھے۔ طالب علم ان سے ہر وقت مل سکتا تھا، ہر وقت ہنستے رہتے تھے اور لوگوں کو خوش رکھتے تھے۔ میں نے اتنا عظیم انسان اور مخلص شخص اپنی زندگی میں نہیں دیکھا کبھی کسی کی برائی نہیں کرتے تھے۔ انسان کو مجبور و معذور سمجھتے تھے اور دشمن تک سے دشمنی نہیں کرتے تھے۔ عفو و درگزر سے کام لینا ان کا معمول تھا۔ سزا کے وہ قائل نہیں تھے، اس لیے ہر ایک کو معاف کر دیتے تھے۔ شادی بیاہ کے جھمیلے میں نہیں پھنسے تھے۔ بالکل تنہا آدمی تھے۔ ویسے ان کے بھائی بہن بھتیجے بھانجے خاصی تعداد میں تھے۔ کہتے تھے ان سب کی تعداد سو ڈیڑھ سو سے زیادہ ہوگی۔ دلی کے محلے رودگراں میں ان کا آبائی مکان تھا۔ لیکن وہ کالج کے تین کمروں کے میں رہتے تھے۔ ان کے پاس ایک نوکر مد اللہ تھا جو شہزادوں کی طرح رہتا تھا۔ وہ بیگ صاحب کا کھانا پکا دیتا تھا اور انھیں کھلا دیتا تھا۔ اس کے بعد وہ آزاد تھا۔ عمدہ سوٹ پہنتا تھا۔ بیگ صاحب کی موٹر بھی وہ چلاتا تھا اور کسی کو خاطر میں [illegible] تھا۔ بقول ہمارے ایک ساتھی کے سب [illegible] نے اس [illegible]

اور وہ کہیں نوکری کرنے کے قابل نہیں رہا تھا۔

بیگ صاحب سرخ سفید اور بھاری بھرکم جسم کے آدمی تھے۔ سر پر گھونگر والے بال تھے۔ عمدہ سوٹ پہنتے تھے۔ ان کی شخصیت میں ایک عجیب طرح کی کشش اور جاذبیت تھی۔ بولتے تھے تو منہ سے پھول جھڑتے تھے۔ عزم و ارادے کی پختگی نے انھیں ایک چٹان اور پہاڑ بنا دیا تھا۔ حلقہ احباب ان کا بہت وسیع تھا۔ بچوں کو بہت پیار کرتے تھے۔ لڑکے لڑکیاں ان کے آس پاس اس طرح گھومتے تھے جیسے وہ ایک چشمہ شیریں ہوں۔ دلی شہر اور دلی یونیورسٹی میں ان کے بے شمار ایسے پرستار تھے جو ان پر جان چھڑکتے تھے۔ ریڈیو سے ہلکی پھلکی تقریریں نشر کرنے میں ان کا جواب نہیں تھا اور بلا مبالغہ انھوں نے سیکڑوں کی تعداد میں یہ تقریریں نشر کی ہوں گی ان کو اگر جمع کر کے شائع کر دیا جاتا تو اردو انشائیہ نگاری اور مزاح نگاری میں ان کا ایک بلند مقام ہوتا لیکن بیگ صاحب شہرت اور ناموری کے خیال سے بالکل ہی بے نیاز تھے۔ مزاج میں خودداری بہت تھی۔ بڑے ہی حساس آدمی تھے لیکن زود رنج نہیں تھے میں نے انھیں کبھی کسی سے بگڑتے اور ناراض ہوتے نہیں دیکھا۔ کدورت اور کینے کا نام ان کی لغت میں نہیں تھا۔

ہم لوگوں کے ساتھ بیگ صاحب بڑی شفقت اور محبت کے ساتھ پیش آتے تھے۔ اپنی موٹر میں سیر کرانے کے لیے لے جاتے تھے۔ کبھی قطب صاحب چلے جا رہے ہیں۔ کبھی حضرت نظام الدین اولیا۔ کبھی پھول والوں کی سیر دیکھنے جا رہے ہیں۔ کبھی سترھویں کا میلہ، کبھی مہرولی سے موٹر میں بھر کر منوں سنگھاڑے لا رہے ہیں اور شہر میں تمام جاننے والوں کو تقسیم کر رہے ہیں۔ کبھی نہاری کھلا رہے ہیں۔ کبھی کناٹ سرکس کے کافی ہاؤس میں جا کر چھ چھ سات سات پیالیاں کافی کی پی رہے ہیں اور پھر رات کو جاگ رہے ہیں، اور سب کو جگا رہے ہیں۔ چاندنی راتوں میں عربک کالج کے ہوسٹل کی چھت پر چاندنی کا منظر بہت ہی خوبصورت ہوتا تھا، محفل جمتی تھی۔ بیگ صاحب میر محفل ہوتے تھے۔ سب مل کر کھانا کھاتے تھے، اور اس کے بعد گپ ہوتی تھی اور ادب کی باتیں ہوتی تھی اور اس طرح بیگ صاحب کے ساتھ ہمارا بہت اچھا وقت گزرتا تھا۔

عربک کالج ہوسٹل میں جو اساتذہ میرے ساتھ رہتے تھے۔ ان میں ایک صاحب تھے شکور احسن نہایت نستعلیق، خوش پوش، اور خوش خوراک تھے۔ بہت جلد بے تکلف ہو جاتے تھے لیکن زود رنج بھی بہت تھے ذرا سی بات پر بگڑ بھی جاتے تھے۔ میں ان سے اچھے تعلقات کے باوجود کبھی بے تکلف نہ ہو سکا۔ مجھے ان کے مزاج کی اس کیفیت سے ڈر لگتا تھا۔ لاہور کے ایک جاگیردار خاندان کے فرد تھے اور جاگیرداری کی تمام خصوصیات ان کے اندر کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھیں۔ قہقہے لگانے میں ان کا جواب نہیں تھا لیکن یہ قہقہے کبھی کبھی اچانک خاموشی میں تبدیل ہو جاتے تھے۔ اور وہ کچھ ایسی چپ سادھ لیتے تھے کہ معلوم ہوتا تھا جیسے دنیا سے بیزار ہیں۔ میں ہمیشہ ان کے ساتھ ایک فصل رکھتا تھا کیوں کہ ان کی یہ عجیب و غریب عادت مجھے ہمیشہ خوف زدہ رکھتی تھی۔

اس کے برخلاف عربی اور اسلامیات کے پروفیسر ڈاکٹر خورشید احمد فارق صاحب اصول کے بہت سخت لیکن مزاج کے بہت شگفتہ تھے کبھی بگڑتے نہیں تھے۔ ہر وقت ہنستے رہتے تھے۔ ان کا زیادہ وقت پڑھنے لکھنے میں گزرتا تھا، ایک لمحہ بھی وہ ضائع نہیں کرتے تھے۔ علی گڑھ کے عربی کے پروفیسر عبدالعزیز میمن صاحب کے خاص شاگردوں میں تھے۔ میمن صاحب اکثر انہیں کے پاس آکر مہمان کی حیثیت سے ٹھہرتے تھے۔ صورت شکل سے فرشتہ معلوم ہوتے تھے۔ دبلے پتلے چمپئی رنگ، چہرے پر نورانی داڑھی، خوش مزاج، خوش گفتار، صفائی پسند، طالب علموں کو مہر کی آنکھ سے دیکھنے والے لیکن، حباب کی مخمل میں بریشم، یہ تھے ہمارے ساتھی ڈاکٹر خورشید احمد فارق صاحب ان کی شیروانی، جوتے، ٹوپی، میز کرسی، بستر، الماری، غرض ہر چیز چمکتی تھی۔ گرد کا ایک ذرہ کسی چیز پر نظر نہیں آتا تھا۔ شیروانی کی جیبوں میں دو رومال رکھتے تھے۔ ایک عام استعمال کے لیے، دوسرا جوتے صاف کرنے کے لیے۔ مہینوں باہر نہیں نکلتے تھے کہتے تھے "صاحب! ہر طرف سڑکوں پر گرد ہی گرد ہے۔ دھواں ہی دھواں ہے۔ ایسے میں عافیت اسی میں ہے کہ اپنے کمرے میں رہا جائے"۔ چنانچہ وہ کمرے میں کبھی چارپائی پر کبھی کرسی پر بیٹھے لکھتے پڑھتے رہتے تھے۔ کوئی کمرے میں چلا جائے تو بیزار نہیں ہوتے تھے۔ لکھنا پڑھنا بند کر کے خود اس کے لیے ہیٹر پر چائے بناتے تھے اور نہایت نفاست

اور سلیقے سے صاف ستھرے اور چکنے ہوئے برتنوں میں اس کو پیش کرتے تھے۔ بیگ صاحب انھیں اکثر چھیڑتے تھے لیکن وہ برا نہیں مانتے تھے۔ میٹنگوں سے بہت گھبراتے تھے اس لیے کہ ان میں وقت بہت ضائع ہوتا ہے۔ ہر چیز سے بے نیاز رہتے تھے۔ کسی نے کہا کہ آپ فلاں صاحب سے مل لیجیے، آپ کے پروفیسر ہونے میں مدد کریں گے۔ کہتے تھے لاحول ولا قوۃ، میں پروفیسر ہونا نہیں چاہتا، بس میرے لیے لکچررشپ ہی کافی ہے۔ پنکھا نہیں چلاتے تھے کہتے تھے اس سے معدہ خراب ہو جاتا ہے چنانچہ گرمیوں میں بعض اوقات کھڑکی سے آنے والی ہوا سے لطف اندوز ہونے کے لیے چارپائی پر چھوٹی سی میز اور کرسی رکھ کر اس پر بیٹھ جاتے تھے اور کام کرتے رہتے تھے۔ کھڑکی ذرا اونچائی پر تھی اس لیے ان کا خیال تھا کہ نیچے بیٹھو تو ہوا نہیں لگتی۔ بالا ہی بالا نکل جاتی ہے۔ دیکھنے والوں کو ان کا یہ انداز عجیب معلوم ہوتا تھا۔

گرمیوں میں ایک دفعہ آغا حسن عابدی میرے پاس آکر ٹھہرے۔ ایک دن وہ باہر نکل کر فارق صاحب کے کمرے کے پاس سے گزرے تو فارق صاحب کو اس عالم میں دیکھا، دوڑے دوڑے میرے پاس آئے "یار، چل کے دیکھو تماشا ہو رہا ہے۔ چارپائی پر میز اور کرسی اور آدمی، یہ منظر کہیں اور دیکھنے کو نہیں ملے گا۔"

میں گیا۔ فارق صاحب سے آغا حسن کی ملاقات کرائی۔ انھوں نے اپنا فلسفۂ انفس بتایا آغا حسن نے اور میں نے ان کی تشریحات سے لطف حاصل کیا اور حد درجہ نفاست اور لطافت سے بنی ہوئی چائے فارق صاحب کے ساتھ پی۔

فارق صاحب بڑے ہی معصوم آدمی تھے انھیں دنیا کے معاملات کا کچھ علم نہیں تھا انھوں نے دنیا دیکھی ہی نہیں تھی۔ [illegible] دنیا سے ان کا کوئی تعلق تھا ان کی دنیا کتابوں اور کاغذوں تک محدود تھی۔ ان کی معصومیت اور سادگی کا یہ عالم [illegible] جنگ شروع ہوئی اور کالج کے آس پاس [illegible] کے عالم میں اساتذہ اور طالب علم ایک جگہ جمع ہوئے اور آپس میں یہ مشورہ کرنے لگے کہ اگر [illegible] کا حملہ ہو تو مقابلہ کیسے کیا

جائے جو جس کے ذہن میں آیا اس نے اس کا اظہار کیا۔ فارق صاحب کہنے لگے۔

"صاحب آپ بالکل پروا نہ کیجیے۔ آپ کے پاس ہتھیار تو ہیں نہیں۔ اگر حملہ ہو تو آپ اپنی موٹی موٹی کتابوں سے ہندوؤں کو ماریں۔ آخر ان کتابوں کا یہی تو مصرف ہونا چاہیے۔"

اس پر سب لوگوں نے زوردار قہقہہ لگایا اور سب کو فارق صاحب کی اس معصومیت پر بہت پیار آیا کہ وہ اسٹین گن اور برین گن کا مقابلہ موٹی موٹی کتابوں سے کرنے کی طرف توجہ دلا رہے ہیں۔

ایسے معصوم لوگ اس دنیا میں کہاں ہوتے ہیں۔

میں نے اس زمانے میں اس بات کی کوشش کی کہ کچھ اور معقول لوگ اساتذہ کی حیثیت سے عربک کالج میں جمع ہو جائیں چنانچہ میں نے ارباب اختیار سے کہہ کر تاریخ میں اپنے پرانے ساتھی اور کلاس فیلو سید حسن اور حسن مہدی کا تقرر کروایا۔ انگلش میں اپنے ایک عزیز امان اللہ خاں کو جگہ دلوائی جو چند مہینے بعد حبیب بینک میں چلے گئے اور آج کل بی۔ سی۔ سی۔ آئی لاہور میں جنرل منیجر ہیں اور انگریزی کے شعبے میں ایک عارضی جگہ پر مشہور ادیب اور نقاد محمد حسن عسکری صاحب کا لیکچرار کی حیثیت سے تقرر کروایا۔

عسکری صاحب عربک کالج میں آ کر بہت خوش ہوئے۔ کئی سال سے وہ بیکار پھر رہے تھے اور کوئی ملازمت انھیں نہیں مل رہی تھی۔ شاہد احمد دہلوی صاحب نے انھیں "ساقی" کے ادارے میں شامل کر لیا تھا اور وہ اس کے لیے مضامین بھی لکھتے اور کچھ کام بھی کر دیتے تھے۔ جب میرے شاگرد اور انگریزی کے لیکچرار رشید مختار طویل رخصت پر کینیڈا گئے تو میں نے موقع کو غنیمت جانا اور ارباب اختیار سے عسکری صاحب کا ذکر کیا اور اس عارضی جگہ پر ان کا تقرر کروایا۔ عسکری صاحب بہت خوش ہوئے اور انھیں عربک کالج کا صاف ستھرا ماحول اتنا پسند آیا کہ انھوں نے یہیں رہنے کا فیصلہ کیا اور اگرچہ الہ آباد یونیورسٹی اور شبلی کالج اعظم گڑھ سے ان کے پاس آفر آئے لیکن انھوں نے عربک کالج کی عارضی ملازمت کو ترجیح دی۔ ان کے استاد دیب صاحب نے انھیں الہ آباد یونیورسٹی میں بلایا

لیکن انھوں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ انھیں عربک کالج سے کوئی شکایت نہیں ہے۔ شبلی کالج اعظم گڑھ کی ملازمت کے سلسلے میں وہ میرے کہنے پر اعظم گڑھ تک چلے تو گئے لیکن تیسرے دن واپس آ گئے۔ کہنے لگے "میں سٹیشن سے کالج کی طرف ایک تانگے میں چلا لیکن عبادت صاحب! وہ تو بڑی ویران سی جگہ تھی۔ بجلی کے کھمبے تک وہاں نظر نہیں آئے۔ اس لیے میں نے راستے ہی میں تانگے والے سے کہا "میاں اسٹیشن واپس چلو، میں شبلی کالج جانا نہیں چاہتا۔ چنانچہ تانگے والے نے مجھے اسٹیشن واپس پہنچایا اور میں پہلی گاڑی سے دلی واپس آ گیا۔"

یہ روداد سن کر میں نے عربک کالج کے ارباب اختیار سے پھر بات کی اور انھیں یہ قصہ سنایا۔ سب اس سے متاثر اور محظوظ ہوئے چنانچہ سب نے عسکری صاحب کی مدد کی اور مستقل طور پر وہ عربک کالج میں انگریزی کے لیکچرار ہو گئے۔

عسکری صاحب اس زمانے میں ترکمان دروازے کے اندر ایک چھوٹے سے فلیٹ میں رہتے تھے۔ یہ جگہ اجمیری دروازے سے قریب تھی۔ اس لیے کالج کے علاوہ بھی رات کو وہ میرے پاس آ جاتے تھے۔ باتیں کرتے تھے۔ دن میں جو فحش لطیفے بناتے تھے وہ مجھے سناتے تھے اور تھوڑی دیر بیٹھ کر مشہور افسانہ نگار غلام عباس کے ہاں چلے جاتے تھے جن کا قیام اس زمانے میں کالج کے قریب منٹو روڈ پر تھا۔

اس طرح عسکری صاحب سے اس زمانے میں خوب ملاقاتیں رہیں اور انھیں بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔

خواجہ احمد فاروقی صاحب بھی اس وقت تک حلیم مسلم ہائی اسکول کی ملازمت کو چھوڑ کر اردو کے لیکچرار کی حیثیت سے عارضی طور پر دلی آ گئے تھے اور اردو کے شعبے میں کام کرنے لگے تھے۔ قیام ان کا عربک کالج ہوسٹل میں ہی تھا۔ اچھی باتیں کرتے تھے اور لکھنے پڑھنے کے کاموں میں زیادہ وقت گزارتے تھے۔ کالج کے بعد وہ مختلف سفارت خانوں میں جاتے تھے یا بااثر لوگوں سے ملتے تھے۔ مسلم لیگ سے انھیں بڑی دلچسپی تھی۔ اس زمانے میں وہ بڑے کٹر قسم کے پاکستانی تھے۔ چنانچہ جب

پاکستان بنا اور ۱۴ اگست کو کراچی میں جشن منایا گیا تو وہ ہم لوگوں میں سے واحد شخص تھے جو ہوائی جہاز سے اس جشن کو دیکھنے اور اس میں شریک ہونے کے لیے گئے لیکن واپس آکر ان میں ایک عجیب انقلاب پیدا ہوا کہ وہ بڑے کٹر نیشنلسٹ مسلمان ہوگئے۔

خوب آدمی تھے۔

خواجہ صاحب کے شعبۂ اردو میں آجانے کی وجہ سے مجھے بڑی تقویت اور آزادی نصیب ہوئی میں نے پرپیریٹری اور بی۔ اے کے زیادہ لیکچر انھیں دے دیے۔ اس طرح میرا زیادہ وقت بی۔ اے آنرز اور ایم۔ اے کے طالب علموں کے ساتھ یونیورسٹی میں گزرنے لگا۔

ہندوستان کی سیاست اب نئے موڑ پر آگئی تھی۔ ہر طرف ایک ہنگامہ تھا۔ ہیروشیما اور ناگاساکی پر ایٹم بم پھینک دیے گئے تھے اور سب کچھ تباہ ہوگیا تھا، لیکن اس کے نتیجے میں دوسری جنگ عظیم ختم ہوگئی تھی کانگریس کے لیڈر جو قلعۂ احمد نگر میں قید تھے تین چار کی اسیری کے بعد رہا کر دیے گئے تھے۔ انھوں نے قید فرنگ سے باہر آکر ایک اور انقلاب کا خواب دیکھنا شروع کر دیا تھا۔ ہندستان چھوڑو کی تحریک کی صدائے بازگشت اب ایک دفعہ پھر سنائی دینے لگی تھی۔ کانگریسی لیڈروں کے بڑے بڑے عام جلسے ہونے لگے تھے جن میں پنڈت جواہر لال نہرو، آصف علی اور دوسرے لیڈر تقریریں کرتے تھے۔ دلی میں رام لیلا گراؤنڈ، اور اردو بازار کی پریڈ گراؤنڈ میں ہزارہا لوگوں کے سامنے یہ تقریریں ہوتی تھیں۔ ادھر مسلم لیگ کی تحریک بھی اپنے شباب پر تھی اور پاکستان کا مطالبہ زور پکڑتا جا رہا تھا۔ عربک کالج ہال اور اردو بازار میں مسلم لیگ کے جلسے بھی ہونے لگے تھے اور ان جلسوں میں قائد اعظم محمد علی جناح، نوابزادہ لیاقت علی خاں صاحب، سردار عبدالرب نشتر، نواب بہادر یار جنگ، چودھری خلیق الزماں، اور مولانا حسرت موہانی وغیرہ کی تقریریں ہوتی تھیں۔ ہندو مسلمانوں کے تعلقات بہت کشیدہ ہوگئے تھے جس کے نتیجے میں فسادات کا سلسلہ بھی شروع ہوگیا تھا اور گڑھ مکتیشر، بہار شریف، پٹنہ، کلکتہ، اور نواکھالی میں خوں ریزی شروع ہوگئی تھی۔

برطانوی حکومت کا ارادہ ہندوستان کو آزادی دینے کا تھا یا نہیں، یہ تو خدا ہی جانتا تھا لیکن

کانگریس اور مسلم لیگ کے لیڈروں سے حکومت کی بات چیت کا سلسلہ جاری تھا۔ جنگ ختم ہونے کے بعد چرچل کی حکومت ختم ہوگئی تھی، اور اقتدار لیبر پارٹی کے ہاتھ میں آ گیا تھا۔ ایٹلی انگلستان کے وزیر اعظم ہوگئے تھے اور یہی تجاویز کے ساتھ بڑے بڑے سیاست کے شاطر لوگوں کو ہندوستان بھیج رہے تھے۔ پہلے کرپس مشن آیا جو ناکام ہوا، پھر کیبنٹ مشن آیا، شملے میں کانفرنس ہوئی، مذاکرات ہوئے، گرگٹ نے کئی رنگ بدلے، کانگریس، مسلم لیگ اور برطانوی حکومت نے میدان سیاست میں کئی چالیں چلیں۔ بالآخر اس پہ سمجھوتہ ہوا کہ آزادی سے قبل کانگریس اور مسلم لیگ کے لیڈروں پر مشتمل ایک عبوری حکومت بنائی جائے چنانچہ اس حکومت میں پنڈت جواہر لال نہرو وزیر اعظم، سردار پٹیل داخلی امور کے وزیر، نواب زادہ لیاقت علی خاں مالیات کے وزیر، جوگندر ناتھ منڈل قانون کے وزیر، سردار عبدالرب نشتر ٹرانسپورٹ اور ریل و رسائل کے وزیر مقرر ہوئے۔ مالیات کے وزیر کی حیثیت سے نواب زادہ لیاقت علی خاں صاحب نے اپنا وہ انقلابی بجٹ پیش کیا جس نے کانگریس کے حلقوں میں کھلبلی مچا دی۔ پٹیل صاحب خاص طور پر بہت گھبرا گئے۔ نواب زادہ صاحب کی دانشمندی اور فراست نے انھیں ہلا کر رکھ دیا اور وزارتِ داخلہ کا قلمدان ان کے لیے ایک مصیبت بن گیا۔

گاندھی جی ان زمانے میں واردھا سے دلّی آگئے تھے اور انھوں نے بھنگی کالونی میں قیام کیا تھا۔ روزانہ ان کے پرارتھنا کے جلسے رام لیلا گراؤنڈ میں ہونے لگے تھے۔ ان جلسوں میں پہلے کیرتن ہوتا تھا۔ گاندھی جی کی موجودگی میں ہزارہا انسان مل کر گاندھی جی کا محبوب نغمہ "رگھوپت، راگھو راجا رام اور ایشور اللہ تیرے نام" گاتے تھے۔ گاندھی جی خود بھی اس کیرتن میں شریک ہوتے تھے اور یہ نغمہ گاتے تھے۔ آخر میں ان کی تقریر ہوتی تھی جس میں ہندوستان کی سیاست، ہندو مسلمانوں کے معاملات، اس وقت کی سیاسی شخصیتوں کے حالات، برطانوی حکومت، کانگریس اور مسلم لیگ کے مذاکرات پر روشنی ڈالتے تھے۔ ان کی ان باتوں سے سیاسی حالات کے نشیب و فراز کا خاصی حد تک علم ہو جاتا تھا اس لیے میں بھی ان کے جلسوں میں چلا جاتا تھا اور پھر جلسے کے بعد سیدھا دریا گنج جا کر ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب کو اس کی مکمل روداد سناتا تھا۔ اس روداد کو وہ مزے لے لے کر

سنتے تھے اور گاندھی جی کی شخصیت اور ان کی سیاست کے بارے میں اظہار خیال بھی کرتے جاتے تھے۔ اس موقع پر ان کی بذلہ سنجی اپنے شباب پر نظر آتی تھی۔ خود بھی ہنستے تھے اور دوسروں کو بھی ہنساتے تھے۔ دراصل گاندھی جی سے ان کو خاص نسبت تھی۔ کسی حد تک بے تکلفی بھی تھی۔ اردو ہندی کے جھگڑے میں بارہا ان سے ملاقاتیں ہوئی تھیں۔ اختلاف بھی ہوا تھا لیکن ذاتی طور پر گاندھی جی ان کو اپنا دوست اور وہ گاندھی جی کو اپنا دوست سمجھتے تھے اس لیے ان کے پرارتھنا کے جلسوں کی روداد سن کر وہ خوب لطف اندوز ہوتے تھے۔

ہندوستان اس وقت ایک دوراہے پر کھڑا ہوا تھا۔ اگرچہ ہندوستان کے وائسرائے لارڈ ویول کی کوششوں سے ایک عبوری حکومت بن گئی تھی لیکن یہ آگ اور پانی کا ملاپ تھا۔ اندر اور باہر سیاسی سازشوں کی گرم بازاری تھی۔ جن سنگھ اور راشٹریہ سیوک سنگھ مسلمانوں کا قلع قمع کرنے کے درپے تھے۔ خود کانگریس میں ان کے ہم خیال موجود تھے۔ اس کا نتیجہ سارے ملک میں ہندو مسلم فسادات کی صورت رونما ہو رہا تھا۔ پہلے مسلم لیگ ڈائریکٹ ایکشن ڈے کے موقع پر فساد ہوا۔ پھر نواکھالی میں، اس کے بعد بہار میں، پھر یو۔پی کے مختلف شہروں میں، بمبئی میں، پونا میں، دلّی میں — غرض ہر طرف فسادات کی آگ بھڑک اٹھی۔۔ اور مجھے یاد ہے کہ خوف و ہراس اتنا تھا کہ سڑک پر چلتے ہوئے ڈر لگتا تھا کہ کہیں کوئی پیچھے سے چھرا نہ بھونک دے۔

حکومت کے ملازم اس خوف کے کچھ زیادہ ہی شکار تھے۔ ایک طرف تو ان کو اپنی جان کا خطرہ تھا اور دوسری طرف وہ یہ سمجھتے تھے کہ ہندوؤں کو خوش کیے بغیر وہ چند ماہ بھی ملازمت میں صحیح طور پر نہیں گزار سکتے۔ چنانچہ وہ لوگ جو عقیدے اور نظریے کے کمزور اور خوشامد پسند تھے انھوں نے اپنا حلیہ تک بگاڑ لیا تھا۔ ہندوؤں کی خوشامد کرنے کے لیے وہ کھدر تک پہننے لگے تھے اور انگریزی لباس کو خیرباد کہہ کر وہ شیروانی اور پاجامہ زیب تن کرنے لگے تھے۔

میری حیرت کی کوئی انتہا نہیں تھی جب میں نے جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کی سلور جوبلی کے مختلف اجلاسوں میں یہ دیکھا کہ پروفیسر احمد شاہ بخاری (پطرس)، اور ڈاکٹر تاثیر کھدر کی شیروانی پاجامہ اور

گاندھی ٹوپی میں ملبوس ان جلسوں میں شرکت کر رہے ہیں۔ میں بھی اپنے کچھ رفقاء کے ساتھ ان جلسوں میں شریک ہوا تھا لیکن ہمارے لباس اور انداز میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی ہم سب یہ دیکھ کر حیران تھے کہ بخاری صاحب اور تاثیر صاحب کے ایسے بزرگوں نے اپنا چولا بدل لیا ہے۔

بات یہ ہے کہ عبوری حکومت کا اعلان ہونے کے باوجود اس قسم کے لوگوں کو یہ یقین نہیں تھا کہ پاکستان کا قیام عمل میں آئے گا چنانچہ وہ آنے والے وقت سے ڈر کر ایسا کر رہے تھے۔

اور تو اور بعض منجھے ہوئے سیاسی لیڈر تک یہ جانتے ہوئے بھی کہ پاکستان کا خواب صرف چند مہینے میں ایک حقیقت بننے والا ہے ابھی تک پاکستان کی مخالفت پر کمر باندھے ہوئے تھے۔

میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب میں ایک دن جمعہ پڑھنے کے لیے جامع مسجد گیا تو یہ اعلان ہوا کہ نماز کے بعد جلسۂ عام ہوگا، اور اس میں مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری، مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی، خان عبدالغفار خان، مولانا مفتی کفایت اللہ اور مولانا احمد سعید صاحب موجودہ سیاسی صورت حال پر تقریریں کریں گے۔

میں بھی نماز کے بعد ایک کونے میں بیٹھ گیا اس خیال سے کہ دیکھیں کیا فرماتے ہیں یہ علمائے دین سیاست حاضرہ کے بارے میں۔

نماز کے بعد جلسہ شروع ہوا۔ جامع مسجد میں ہزارہا انسانوں کے سامنے ان لیڈروں نے تقریریں کیں اور پاکستان بننے کے نقصانات گنوائے اور مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے اپنی ساحرانہ خطابت کے بعد تمام حاضرین سے ہاتھ اٹھوائے کہ پاکستان کا قیام مسلمانوں کے لیے مناسب نہیں ہے۔

میری عقل حیران تھی کہ ان بزرگوں کو کیا ہو گیا ہے اور اب اس طرح کی مخالفت کا کیا فائدہ؟ سیاست کی مزاج دانی کا تقاضا تو یہ تھا کہ وہ یہ سمجھتے کہ قیام پاکستان کو اب دنیا کی کوئی طاقت روک نہیں سکتی۔

عبوری حکومت میں داخل ہونے سے قبل مسلم لیگ نے کیبنٹ مشن کا فارمولا تسلیم کر لیا تھا۔ جس میں صوبوں کو خود مختاری مل رہی تھی، مرکز کے اختیار میں صرف دفاع، رسل و رسائل اور امور خارجہ

کے حلقے رہ گئے تھے اور مرکز میں کانگریس کی نمائندگی برابر برابر کی تسلیم کر لی گئی تھی لیکن کانگریس کے صدر جواہر لال صاحب نے اپنی ایک پریس کانفرنس میں کسی نامہ نگار کے سوال کے جواب میں یہ کہہ دیا کہ ہم ہمیشہ اس کے پابند نہیں رہیں گے۔ اس پر قائدِ اعظم نے سختی کے ساتھ کیبنٹ مشن پلان کو رد کر دیا اور یہ کہا کہ ہندوستان کے سیاسی مسائل کا حل صرف تقسیم اور پاکستان کا قیام ہے۔ حیرت کی بات تو یہ ہے کہ پٹیل اور گاندھی جی بھی اس پر راضی ہو گئے۔ صرف مولانا آزاد نے اس سے اتفاق نہیں کیا۔ اب سارے ہندوستان میں مسلمانوں کی طرف سے "بٹ کے رہے گا ہندوستان، بن کے رہے گا پاکستان" کے نعرے بلند ہونے لگے اور ہندو مسلم فساد کا سلسلہ جاری رہا جس کی وجہ سے زندگی لوگوں کے لیے اجیرن ہو گئی۔

اسی زمانے میں مسلم لیگ کونسل کا آخری اجلاس اینگلو عربک کالج میں ہوا۔ اس کے انتظام میں عربک کالج کے اساتذہ اور طلبہ پیش پیش تھے۔ قائدِ اعظم، نواب زادہ لیاقت علی خاں، چودھری خلیق الزماں، عبدالرحمٰن صدیقی، خان عبدالقیوم خاں، سرفروز خاں نون، سردار سکندر حیات خاں، نواب بہادر یار جنگ، ڈاکٹر ضیاء الدین، مولوی فضل الحق، نواب اسمٰعیل خاں اور مسلم لیگ کے دوسرے رہنماؤں نے اس میں شرکت کی اور دھواں دھار تقریریں کیں۔ بہت سے اہم فیصلے کیے گئے جن میں پاکستان کا مطالبہ سرفہرست تھا۔

دو تین دن تک اس کنونشن کے اجلاس اینگلو عربک کالج کی مسجد کے سامنے والے سبزہ زار میں ہوتے رہے۔ میں اس کے منتظمین میں سے ایک تھا۔ دن بھر کام کرنے کے بعد میں تھک گیا تو اوپر چھت پر جا کر سو رہا۔ رات کے بارہ بجے کے قریب کئی تقریریں ایسی ہوئیں جن کی وجہ سے میں جاگ گیا۔ خان عبدالقیوم خاں، سرفیروز خاں نون کہہ رہے تھے کہ اب خون کے دریا بہیں گے۔ ہم اپنی تلواریں میان سے نکال لیں گے۔ قائدِ اعظم نے آخر میں خطاب کیا اور اس قسم کی تقریروں پر تنقید کی جس سے ماحول کسی حد تک بدلا اور نعروں کا شور و زور کم ہوا۔

قائدِ اعظم نے اسی زمانے میں جامع مسجد کے سامنے اردو بازار میں بھی تقریر کی۔ یہ تقریر اردو میں تھی۔ میں اس جلسے میں شریک ہوا۔ وہ اس جلسے میں بڑے اعتماد سے بول رہے تھے اور ہزارہا

مسلمانوں کے مجمع میں کہہ رہے تھے آج کل ایک کیبنٹ مشن آیا ہوا ہے ہم اس کو بھی سنبھال لیں گے ہمیں کسی سے کوئی ڈر نہیں صرف غدار اور جاہل مسلمانوں سے ڈر لگتا ہے، لیکن ان کو بھی ہم نے سنبھال لیا ہے آپ لوگ متحد رہیئے اور سیاست کا کاروبار ہم پر چھوڑ دیجئے۔ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا، اور ہم سرخرو ہوں گے۔ دنیا کے نقشے پر سب سے بڑی اسلامی مملکت ضرور ابھر کر سامنے آئے گی۔

اور صرف چند مہینے بعد ان کی پیش گوئی درست ثابت ہوئی قیام پاکستان کا اعلان ہو گیا اور مسلمان اپنی اس کامیابی پر پھولے نہیں سمائے لیکن سیاسی فضا بوجھل رہی اور ہندوستان کے مختلف علاقوں میں فسادات کا سلسلہ جاری رہا اور ہم سب دلّی میں بیٹھ کر یہ محسوس کرتے رہے کہ ہندوستان کا نظام درہم برہم ہو گیا ہے۔

پاکستان کو اصولی طور پر تسلیم تو کر لیا گیا تھا اور مسلمان اس سے بہت خوش تھے لیکن ان کے ذہنوں میں یہ بات واضح نہیں تھی کہ اس کے نتائج کیا ہوں گے؟ خاص طور پر ہندوستان میں رہ جانے والے مسلمانوں کو اس کا بالکل علم نہیں تھا کہ ان پر کیا گزرے گی۔ وہ بڑے معصوم اور بھولے بھالے لوگ تھے۔ انھیں اس کا علم نہیں تھا کہ جب ملک بنتے ہیں تو کیا صورت حال پیدا ہوتی ہے۔ وہ سمجھتے تھے کہ ہندوستان کی نئی مملکت میں رہ کر بھی وہ پاکستانی ہو سکتے ہیں اور وہ آزادی کے ساتھ ہندوستان سے پاکستان اور پاکستان سے ہندوستان آجا سکتے ہیں۔ انھیں یہ خبر نہیں تھی کہ تھوڑے ہی عرصے بعد انھیں پرمٹ، ویزا اور پاسپورٹ کی پابندیوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ انھیں یہ نہیں معلوم تھا کہ جس ملک میں وہ رہیں گے اس سے انھیں اپنی وفاداری کا اعلان کرنا پڑے گا! اچھے خاصے پڑھے لکھے لوگ یعنی کالج کے اساتذہ تک اسی طرح سوچتے تھے کہ وہ لاہور کے رہنے والے ہیں لیکن دلی میں ملازمت کرتے رہیں گے۔ ریلیں معمول کے مطابق بغیر کسی پابندی کے چلتی رہیں گی اور سفر پر کوئی پابندی نہیں ہوگی۔ آپس میں پڑھے لکھے لوگ ان تمام پہلوؤں پر تبادلہ خیال کرتے تھے گرما گرم بحثیں ہوتی تھیں لیکن ان بحثوں کا خاتمہ اس خوش فہمی ہی پر ہوتا تھا جس کی بنیاد نادانی اور کج فہمی پر تھی بعض لوگ تو جوش میں یہاں تک کہتے تھے کہ پاکستان ہندوستان کو فتح کرے گا اور اس طرح تمام مسائل حل

ہو جائیں گے۔ میں اس صورت حال کا خاموش تماشائی تھا۔

اس سیاسی کش مکش کے نتیجے میں دلّی کی فضا خاصی خراب ہو گئی تھی۔ روزانہ فسادات کی خبریں ملتی تھیں۔ دلّی کے آس پاس کے علاقے یعنی میوات اور یوپی کے مغربی اضلاع کا حال خاصا خراب تھا۔ لوگ لٹ پٹ کر دلّی آنے لگے تھے اور جامع مسجد کے سامنے اچھا خاصا رفیوجی کیمپ قایم ہو گیا تھا۔ میں ڈرتے ڈرتے یونیورسٹی جاتا تھا اور لکچروں سے فارغ ہو کر جلد واپس آ جاتا تھا۔ کالج میں حاضری روز بروز کم ہوتی جاتی تھی کیونکہ مسلمان طالب علم گھروں سے نکلتے ہوئے ڈرنے لگے تھے۔ روزانہ قتل کی وارداتیں ہوتی تھیں۔ رات کو مسلمانوں کے محلوں پر حملے کیے جاتے تھے اور اللہ اکبر کے نعروں کی آوازیں سنائی دیتی تھیں۔ مسلمان بھی بپھرے ہوئے تھے اور کہتے تھے کہ ہم خون کی ندیاں بہا دیں گے اور آخر وقت تک ہندوؤں سے لڑیں گے لیکن انھیں اس کی خبر نہیں تھی کہ اس کا نتیجہ کیا ہوگا۔ ہندوؤں نے انھیں دلّی سے اکھاڑ پھینکنے کے جو منصوبے بنائے تھے اس کا بھی انھیں علم نہیں تھا۔ مہا سبھا اور جن سنگھ نے مسلمانوں کے مکانوں تک پر نشان لگا دیے تھے تاکہ حملہ کرنے والوں کو مسلمانوں کو پہچاننے اور ان پر حملہ کرنے میں کوئی دشواری نہ ہو۔ اینگلو عربک کالج پر نشان تو نہیں لگائے گئے تھے لیکن مسلم لیگ اور تحریک پاکستان کا قلعہ ہونے کی حیثیت سے اس پر حملہ کر کے اس کی اینٹ سے اینٹ بجانے اور اس کو تباہ و برباد کر دینے کا منصوبہ خاص طور پر ہندو مہاسبھا کی فوجی تنظیم جن سنگھ اور راشٹریہ سیوک سنگھ نے بنایا تھا۔

ایک اُلّو رات بھر کالج کے اونچے اونچے درختوں پر بولتا تھا اور اس کی دھاردار آواز کٹاری بن کر سینے میں لگتی تھی۔

اور میں اس کی دھاردار آواز کو سن کر دل ہی دل میں یہ کہتا تھا کہ "خدا خیر کرے۔ اُلّو کا اس طرح بولنا اچھا شگون نہیں ہے۔"

دسواں باب

آشوبِ قیامت

یہ صورت حال تھی جب سنہ ۱۹۴۷ء کا آغاز ہوا اور یہ سال اینگلو عربک کالج کے لیے، اس کے اساتذہ اور طلبہ کے لیے اور خود میرے لیے ایک آشوبِ قیامت کو اپنے ساتھ لایا۔ دلّی اس سال ختم ہوگئی۔ اس کی صدیوں کی بنائی ہوئی تہذیب نے دم توڑ دیا۔ دلّی کے مسلمان تباہ و برباد ہوگئے۔ اس سال اس سرزمین پر ایسا خون برسا کہ نادر و ابدالی کے زمانے کی یاد ایک دفعہ پھر تازہ ہوگئی۔

ہندو مسلم فسادات اس زمانے میں اتنے بڑے پیمانے پر ہوئے جنھوں نے زندگی کو ایک مستقل اور مسلسل عذاب بنا دیا۔ یوں تو سارے ہندوستان میں ان فسادات کے شعلے مہینوں پہلے سے بھڑک گئے تھے لیکن دلّی میں جو ہنگامے ہوئے، ان کو فسادات کہنا صحیح نہیں ہے۔ یہ دلّی کے مسلمانوں کے قتلِ عام کا منصوبہ تھا اور دلّی سے انھیں نکال باہر کرنے کی ایک منظم سازش تھی۔ ہندوستان کے مختلف علاقوں میں جو ہندو مسلم فسادات ہو رہے تھے، خیال تھا وہ ان علاقوں ہی تک محدود رہیں گے۔ دلّی تک ان کے شعلے نہیں پہنچیں گے کیونکہ یہ شہر مرکزی جگہ ہے اور ہندوستان کا دارالخلافہ ہے۔ اگر یہاں فسادات ہوئے بھی تو حکومت پوری طاقت سے ان کو دبا دے گی۔ ہندوستان کے نئے وائسرائے اور ہونے والے گورنر جنرل نے بھی اسی خیال کا اظہار کیا تھا اور یقین دلایا تھا کہ ہندوستان کی فوجیں دلّی میں فسادات کی آگ کو نہیں بھڑکنے دیں گی بلکہ ہندوستان میں جہاں جہاں بھی فسادات ہو رہے ہیں ان کے شعلوں کو انتظامیہ اور فوج کی طاقت سے پوری طرح دبا دیا جائے گا۔ لیکن اس یقین دہانی کے باوجود حالات

کچھ اچھے نظر نہیں آ رہے تھے۔ آتما یہ کہہ رہے تھے کہ دلی میں فساد ہوگا اور ضرور ہوگا اور اتنی شدت سے ہوگا کہ نادر و ابدالی کے زمانے کی یاد ایک دفعہ پھر تازہ ہو جائے گی۔

اگست ۱۹۴۷ء کا مہینہ اپنے سائے میں کچھ ایسے انتشار اور افراتفری کو لایا جس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ہندوستان کی تقسیم کو اصولی طور پر تسلیم تو کر لیا گیا تھا لیکن انگریزوں اور ہندوؤں کی نیت ٹھیک نہیں تھی۔ مسلمان خوش تھے کہ پاکستان کا مطالبہ تسلیم کر لیا گیا ہے اور انھیں ایک وطن مل گیا ہے جہاں وہ جس طرح چاہیں گے آزادی سے رہیں گے اور سر اٹھا کر چلیں گے لیکن ہندوؤں نے صاف دل سے اس کو تسلیم نہیں کیا تھا اور کانگریس کے بعض لیڈر تک یہ سمجھ رہے تھے کہ پاکستان صرف چند روز چلے گا بلکہ صحیح بات تو یہ ہے کہ اسی خیال سے انھوں نے تقسیم ہند کو قبول کیا تھا۔ ہندوؤں کی بعض سیاسی جماعتیں تو کھلم کھلا اس تقسیم کی مخالفت کر رہی تھیں اور پاکستان کو نقصان پہنچانے کے درپے تھیں۔ تمام ہندوؤں کے دل میں چور تھا اور اس صورت حال کی وجہ سے حالات نے بڑی ہی سنگین صورت اختیار کر لی تھی۔

ہندوستان کے مسلمانوں میں وہ جذبہ اس وقت بھی اپنے شباب پر تھا جس نے پاکستان کی تحریک میں اسے دوڑایا تھا۔ وہ اب بھی اسی جذبے سے سرشار تھے جس کی بدولت انھیں پاکستان بنانے میں کامیابی نصیب ہوئی تھی لیکن انھیں ان سازشوں کا علم نہیں تھا جو انھیں صفحہ ہستی سے مٹا دینے کے لیے اس وقت ہو رہی تھی۔ انھیں اس بات کا بھی علم نہیں تھا کہ جن ہندو لیڈروں نے تقسیم ہند کو تسلیم کیا ہے ان کے ارادے نیک نہیں ہیں۔ انھیں یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ ہندوؤں نے پاکستان کو صدق دل سے قبول نہیں کیا ہے۔ وہ یہ بھی نہیں جانتے تھے کہ ہندو اس کو بنا کر بگاڑنا چاہتے ہیں اور اس خیال کو عملی جامہ پہنانے کے لیے خدا جانے کیا کیا منصوبے بنا رہے ہیں۔

مسلمانوں کا حال تو یہ تھا کہ انھوں نے اس صورت حال کو سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی جو قیام پاکستان کے اعلان کے بعد ہندوستان میں پیدا ہوئی تھی۔ ان پر اس کامیابی سے ایک نشے کا سا عالم طاری تھا۔ وہ ابھی تک جذبات کے دھارے پر بہہ رہے تھے اور انھیں مطلق اس بات کا علم نہیں تھا کہ سیاسی اعتبار سے کیا تبدیلی رونما ہوئی ہے۔ وہ تو ابھی تک جذبات کے

دھارے پر بہے جا رہے تھے اور انھیں کچھ علم نہیں تھا کہ ان کی کشتی کس طرف کو جا رہی ہے۔

میں بہت حیران ہوا جب اینگلو عربک کالج کے ایک ہونہار طالب علم میرے شاگرد اور دوست منظور احمدؒ ایک دن میرے پاس آئے اور مجھے آ کر یہ بتایا کہ پھاٹک حبش خان اور اس کے آس پاس کے محلوں کے مسلمان یہ کہہ رہے ہیں کہ ہم ۱۵؍اگست کو ہندوستان کی آزادی کے دن لال قلعے پر کانگریس یا ہندوستان کا جھنڈا نہیں لگنے دیں گے۔ لال قلعہ تو ہمارا ہے مسلمانوں کا ہے۔ یہاں تو مسلم لیگ کا جھنڈا لگے گا، پاکستان کا پرچم لہرائے گا۔ اس کے لیے ہم جان کی بازی لگا دیں گے اور خون کی ندیاں بہا دیں گے۔

منظور احمدؒ اینگلو عربک کالج کے دوسرے طالب علموں کی طرح مسلم لیگ کے سرگرم کارکن اور قیام پاکستان کی تحریک میں پیش پیش تھے۔ انھوں نے مجھے یہ بھی بتایا کہ وہ اپنی سی پوری کوشش کر رہے ہیں کہ بدلی ہوئی صورت حال کا مسلمانوں کو علم ہو، وہ اس کو سمجھنے کی کوشش کریں، سیاسی تبدیلی کے نتیجے میں پیدا ہونے والے حالات کا شعور ان کے ہاں پیدا ہو لیکن وہ لوگ تو کچھ سننے اور سوچنے سمجھنے کے لیے تیار ہی نہیں ہیں۔

اس قسم کی خبریں مسلم لیگ کے ان لیڈروں تک بھی پہنچیں جو ہندوستان میں رہنے کے لیے تیار تھے یا جن سے کہا گیا تھا کہ وہ ۱۴؍اگست کے بعد بھی ہندوستان میں رہیں تاکہ ہندوستان میں رہ جانے والے مسلمانوں کو کچھ تقویت رہے۔ چنانچہ انھوں نے اخبارات میں اس قسم کے بیانات شائع کروائے کہ اب ہندوستان کے مسلمانوں کو ہندوستان کا وفادار ہونا چاہیے اور اپنے قول و فعل سے اس کا اظہار کرنا چاہیے کہ وہ ہندوستانی ہیں اور حکومت ہند کے وفادار شہری ہیں لیکن مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ان بیانات کا اثر الٹا ہوا تھا۔ مسلمان ان کی یہ بات کسی طرح ماننے کے لیے تیار نہیں تھے اور ان بیانات کو مضحکہ خیز اور نظریۂ پاکستان کے منافی سمجھتے تھے۔

میرے والد صاحب کے دوست چودھری خلیق الزماں صاحب ہندوستان کی کانسٹی ٹیونٹ اسمبلی میں ان دنوں مسلم لیگ پارٹی کے لیڈر تھے میں خاص طور پر ان سے ملنے گیا تاکہ انھیں اس عجیب و غریب صورت حال سے آگاہ کروں۔ چودھری صاحب منجھے ہوئے تجربے کار اور باخبر سیاست داں

تھے۔ انھیں اس صورت حال کا بخوبی علم تھا۔ انھوں نے اس موضوع پر جو باتیں کیں، ان سے مجھے اندازہ ہوا کہ وہ حالات سے مایوس ہیں، اور یہ کہ ان کی سیاست نے ہتھیار ڈال دیے ہیں۔ میں نے چودھری صاحب کو لکھنؤ، اور پھر دلّی میں دیکھا۔ وہ کبھی حالات سے مایوس نہیں ہوتے تھے اور سیاست پر ہمیشہ بڑی ہی خیال انگیز اور حقیقت پسندانہ باتیں کرتے تھے، لیکن آج میں نے ان کو زندگی میں پہلی دفعہ احساس شکست کا شکار دیکھا، اور مجھے بھی محسوس ہوا جیسے وہ ایک تناور درخت ہونے کے باوجود جڑ سے اکھڑ چکے ہیں اور کوئی چیز ان کی گرفت میں نہیں ہے۔ گھبراہٹ تو ان کی اس کیفیت کو نہیں کہا جا سکتا البتہ یہ ضرور کہا جا سکتا کہ ان کے سامنے آگے بڑھنے کی تمام راہیں مسدود تھیں۔

کہنے لگے: ”میاں حالات بہت ناسازگار ہیں۔ نوجوانوں کو سمجھائیے۔ انھیں احساس ہونا چاہیے کہ تقسیم نے سیاسی اعتبار سے ہمیں کس صورت حال سے دوچار کیا ہے۔ اس وقت تو ہندوستان سے وفاداری کے اعلان ہی میں عافیت ہے، اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں۔“

میں نے کہا: ”چودھری صاحب! آپ خود سمجھ سکتے ہیں کہ وہ مسلمان نوجوان اور خصوصاً طالب علم اس صورت حال سے کیسے مطابقت پیدا کر سکتے ہیں جو چند روز قبل تک تحریک پاکستان کا ہراول دستہ تھے۔ ان کا پارہ اتنا چڑھ چکا ہے کہ ایک دم اس کا نیچے آنا مشکل ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ شاید وہ عقل و شعور سے کام لینے کے لیے مجبور ہوں، اس وقت تو جذبات انھیں بہائے لیے جا رہے ہیں۔ کسی جادو کے ڈنڈے ہی سے انھیں ہندوستان کا وفادار بنایا جا سکتا ہے اور یہ جادو کا ڈنڈا ہمارے پاس نہیں ہے۔“

چودھری صاحب بہت کچھ کہنا چاہتے تھے لیکن انھوں نے کچھ نہیں کہا، خاموش رہے اور اسی بات پر اس ملاقات کو ختم کیا کہ ”نوجوانوں کے جذبات کو کسی طرح ٹھنڈا کرنا چاہیے۔“

یہ جذباتی صورت حال صرف چند روز رہی، لیکن جب دلّی کے مسلمانوں نے یہ سنا کہ قائداعظم ۱۴؍ اگست سے قبل تشریف لے جانے والے ہیں، اور نوابزادہ لیاقت علی خاں صاحب بھی پابہ رکاب ہیں تو سب نے ہمت چھوڑ دی اور احساس شکست کا شکار ہو کر گھبراہٹ کے عالم میں بے شمار لوگ کراچی جانے کی تیاری کرنے لگے۔ سامان بندھنے لگا۔ ریل اور گھریلو استعمال کی

دوسری چیزیں کوڑیوں کے مول بکنے لگیں۔ مسلمان ذہنی طور پر اپنی جگہ سے اکھڑ گئے۔ بعض لوگ جائدادوں کا بھی سودا کرنا چاہتے تھے لیکن انھیں کوئی خریدار نہیں ملتا تھا۔ مسلمانوں میں خریدنے کی سکت نہیں تھی کیونکہ ہر شخص بھاگنے کی فکر میں تھا۔ ہندو خریدنے کے لیے تیار نہیں تھا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ یہ سب کچھ تو مسلمان یہیں چھوڑ کر جائیں گے۔ اس پر قبضہ ہمارا ہوگا، خریدنے سے کیا فائدہ۔؟

ہندوؤں کی سیاسی جماعتوں نے مسلمانوں کو مارنے اور انھیں بھگانے کے جو منصوبے بنائے گئے تھے۔ عام ہندوؤں کو اس کا بخوبی علم تھا۔ اس لیے وہ تو اس آشوب قیامت کا انتظار کر رہے تھے جس سے چند روز کے اندر دلّی کے مسلمان دوچار ہونے والے تھے۔

شام کو میں اینگلو عربک کالج سے نکلتا اور سیر کرنے کے لیے نئی دہلی کی طرف جاتا تھا۔ ٹاپین روڈ کو پار کر کے میں ٹیگور روڈ پر حضرت خواجہ میر دردؒ کی درگاہ پر حاضری دیتا تھا اور فاتحہ پڑھ کر کناٹ پلیس کے ایک دو چکر لگا کر عربک کالج واپس آتا تھا۔ مسلمانوں کی تعداد نئی دہلی کے ان مکانوں میں کچھ زیادہ نہیں تھی لیکن ہر سڑک پر پانچ سات مکان مسلمانوں کے ضرور تھے۔ میں نے دیکھا کہ چند روز کے اندر مسلمانوں کے ان مکانوں پر کچھ خاص قسم کے نشانات لگائے جا رہے ہیں۔ خیال یہ ہوا کہ مردم شماری یا سرکاری محکموں کے لوگ یہ نشان لگا گئے ہیں لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ یہ سب کچھ آر ایس ایس اور جن سنگھ کی کارستانی ہے تاکہ جب لوٹ مار اور قتل و غارت گری شروع ہو تو مسلمانوں کے ان مکانوں کو پہچانا جا سکے۔ لیکن مسلمانوں کو ستمبر کے شروع تک اس کا علم نہ ہو سکا اور وہ اطمینان سے اپنے ان مکانوں میں بیٹھے رہے۔

تقسیم کا عمل شروع ہو چکا تھا اور ۱۵ اگست سے کوئی دو ہفتے قبل مرکزی حکومت کے پاکستان جانے والے سرکاری ملازمین کو دفتروں سے فارغ کر دیا گیا تھا۔ ان سے پنسلیں اور قلم تک رکھوا لیے گئے تھے، اور وہ سب کراچی جانے کے لیے پابہ رکاب تھے۔ خصوصی ریل گاڑیاں چلنے لگی تھیں جو نئی دہلی کے اسٹیشن سے دن کے وقت کراچی کے لیے روانہ ہوتی تھیں۔ روزانہ ایک ٹرین پاکستان جانے والے سرکاری ملازمین کو لے کر نئی دہلی کے اسٹیشن سے روانہ ہوتی تھی۔ یہ اسٹیشن اینگلو عربک کالج کے بالکل قریب تھا اس لیے

میں روزانہ پاکستان جانے والے دوستوں سے ملنے اور انہیں خدا حافظ کہنے کے لیے اسٹیشن چلا جاتا تھا۔

سب سے پہلے "پاکستان گورنمنٹ" کے الفاظ میں نے اس فائل پر ٹائپ کیے ہوئے دیکھے جو مشہور مزاحیہ شاعر اور مرکزی حکومت کے شعبۂ اطلاعات کے ڈائرکٹر سید محمد جعفری کے ہاتھ میں تھی اور جو پاکستان جانے والی پہلی ٹرین کے نگران تھے۔ وہ ان کاغذات کو ہاتھ میں لیے نئی دہلی کے ریلوے اسٹیشن پر ادھر اُدھر گھوم رہے تھے اور انتظام میں مصروف تھے۔ باتیں کرنا اور فقرے کسنا ان کے مزاج میں داخل تھا لیکن آج وہ بہت سنجیدہ تھے اور بے حد مصروف نظر آ رہے تھے۔ میں نے اُن کے ساتھ پلیٹ فارم پر ادھر ادھر گھوم پھر کر چند باتیں کیں، انہیں اور ٹرین کے تمام مسافروں کو خدا حافظ کہا اور "پاکستان گورنمنٹ" کے الفاظ کو دل ہی دل میں فخر کے ساتھ دہراتا ہوا واپس اپنے کالج آیا۔ لیکن دوسرے دن سے اسٹیشن جانے کی ہمت نہیں پڑی۔ گھروں کے اجڑنے کا خیال اور عدم تحفظ کا احساس اتنا شدید تھا کہ اس نے مجھے نئی دہلی کے ریلوے اسٹیشن جانے سے باز رکھا۔ پہلی ٹرین پر بھی مشرقی پنجاب میں حملہ ہوا لیکن معلوم یہ ہوا کہ فوجی گارڈ کی وجہ سے وہ کسی طرح صحیح سلامت کراچی پہنچ گئی، البتہ دو دن کا سفر کئی دن میں طے ہوا۔

اس عرصے میں یہ افواہ شہر میں پھیل گئی کہ دس اورنگ زیب روڈ والی تاریخی کوٹھی اس وقت کے ایک سرمایہ دار برلا نے ایک لاکھ روپے میں خرید لی ہے۔ یہ خبر صحیح تھی یا غلط، اس کا تو علم نہ ہو سکا، لیکن اس کا اثر یہ ضرور ہوا کہ مسلمان پریشان ہو گئے، کیونکہ دلّی کے مسلمان دس اورنگ زیب روڈ والی کوٹھی کو مسلمانوں کے وقار کی ایک علامت اور تحریک پاکستان کی جدوجہد کی ایک نشانی تصور کرتے تھے۔ سارے شہر میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں جتنے منہ اتنی ہی باتیں سننے میں آنے لگیں۔ پھر یہ خبر ملی کہ قائداعظم، قائد ملت نوابزادہ لیاقت علی خاں صاحب اور مسلم لیگ کے کچھ دوسرے لیڈر کراچی چلے گئے۔ اس خبر سے دلّی میں مسلمانوں نے اپنے آپ کو بالکل بے سہارا محسوس کیا اور ان کے حوصلوں اور دلوں پر اوس سی پڑ گئی۔ حوصلے پست ہو گئے۔ جذب و شوق ٹھنڈا پڑ گیا اور ہر مسلمان نے یہ محسوس کیا کہ جیسے وہ جڑ سے اکھاڑ پھینکا گیا ہے۔

بالآخر ۱۴ راگست کا دن آ گیا۔ پاکستان کی نئی ڈومینین کی رسم افتتاح دیکھنے کے لیے بعض

لوگ ہوائی جہازوں کے ذریعے کراچی بھی گئے۔ ان میں میرے بعض رفیق کار بھی تھے جب وہ چلنے لگے تو میں نے ان کی ہمت اور ولولہ و شوق کی داد دی اور انھیں یہ کہہ کر رخصت کیا کہ واپس آکر وہاں کے حالات تفصیل سے سنائیے گا۔ وہ لوگ تین چار روز میں واپس تو آگئے لیکن اس عرصے میں دلی میں قیامت برپا ہو چکی تھی مسلمانوں کا قتل عام شروع ہو چکا تھا اور منظم طور پر ایک منصوبے کے تحت مسلمانوں کو جان سے مارنے اور دلی سے باہر نکالنے کی کوششیں تیز ہو چکی تھیں۔

۱۵ راگست کو دلی میں ہندوستان کا یوم آزادی بڑے اہتمام سے منایا گیا انتقال اقتدار کی تقریب تو وائسرائے ہاؤس میں ہوئی اور پھر لال قلعے پر ہندوستان کا جھنڈا لہرایا گیا۔ وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو نے یہ رسم ادا کی، اور لاکھوں انسانوں کے مجمع سے خطاب کیا۔ اس تقریر میں انھوں نے ہندوستان کی آزادی کی جدوجہد کی تاریخ بیان کی اور اس سلسلے میں جو قربانیاں دی گئیں، ان کا نقشہ کھینچا۔ گاندھی جی کے تدبر کی تعریف کی۔ اور ہندوستان کی آزادی کو ان کا کارنامہ قرار دیا۔ امن کی تلقین کی اور جو لوگ فسادات کی آگ بھڑکا رہے تھے ان کو ملک کا دشمن قرار دیا۔

لال قلعہ تک تو جانے کی ہمت نہیں ہوئی لیکن میں جامع مسجد کے قریب کھڑا ہوا ان کی تقریر کو سنتا رہا۔ ڈر یہ تھا کہ کہیں فسادات یہیں سے شروع نہ ہو جائیں۔ خیر جلسہ ختم ہونے کے بعد کوئی واردات نہیں ہوئی لوگ چپ چاپ اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔ لیکن دوسرے ہی دن سے دلی کے مختلف محلوں میں مسلمانوں کے مارے جانے کی خبریں آنے لگیں۔ پنجاب سے سکھ اور ہندو خاصی تعداد میں ریلوں اور ہوائی جہازوں کے ذریعے دلی پہنچنے لگے۔ کناٹ پلیس میں ہوائی جہاز کا جو دفتر تھا، اس میں سکھ ہی سکھ نظر آتے تھے۔ دن میں کئی کئی پروازیں پنجاب سے آتی تھیں۔ ہوائی اڈے سے سکھ ہوائی کمپنی کی بسوں میں بیٹھ کر کناٹ پلیس میں ہوائی جہاز کے دفتر آجاتے تھے اور کناٹ پلیس میں ٹہلتے گھومتے پھرتے تھے، جگہ جگہ جمع ہو کر اپنی بپتا بھی سناتے تھے۔ اس کا مقصد اشتعال پیدا کرنا تھا جو انھوں نے چند روز میں پیدا کر دیا اور اس طرح دلی کی فضا روز بروز مسموم ہوتی گئی جس جگہ دیکھیے جہاں سنیے یہی باتیں ہو رہی ہیں کہ پنجاب میں ہندوؤں اور سکھوں پر بڑا ظلم ڈھایا

جا رہا ہے۔ قتل عام ہو رہا ہے۔ جگہ جگہ کیمپ بنا دیئے گئے ہیں جن میں ہندو اور سکھ پناہ گزیں ہیں۔ ان کیمپوں پر حملے بھی ہو رہے ہیں اور ریلیں روک کر کاٹی جا رہی ہیں۔ غرض اس طرح کی بے شمار افواہیں شہر میں پھیلنے لگیں۔

خدا جانے ان باتوں میں کہاں تک صداقت تھی کیونکہ دلّی میں ہم لوگوں کو پنجاب کے حالات کا صحیح علم نہیں ہو رہا تھا۔ بھانت بھانت کی بولیاں بولی جا رہی تھیں۔ اخبارات کسی مقصد کے تحت بنائی ہوئی خبریں شائع کر رہے تھے جن کو پڑھ کر ہندوؤں کا پارہ چڑھ رہا تھا اور مسلمان بے یار و مددگار ہونے کی وجہ سے کچھ گھبرائے ہوئے سے نظر آ رہے تھے۔ کیونکہ حالات کے تیور بتا رہے تھے کہ آسمان سے خون برسنے والا ہے اور زمین سرخ ہونے والی ہے۔

مختلف محلّوں میں فضا خاصی کشیدہ ہونے لگی تھی جہاں جس کو موقع ملتا مسلمانوں کو مار دیتا تھا۔ مسلمانوں کے محلوں پر حملے بھی ہونے لگے تھے جب رات گئے ہندوؤں کے یہ حملے ہوتے تھے تو مسلمان اپنے اپنے گھروں سے اللہ اکبر کے نعرے بلند کرتے تھے۔ ان نعروں کی گونج دور دور تک سنائی دیتی تھی۔ ان کو سن کر مختلف محلّوں کے مسلمان پریشان ہو جاتے تھے اور انھیں یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اس شہر پر قیامت ٹوٹنے والی ہے۔ جب مختلف محلوں پر ہندوؤں کے مسلح حملے ہوتے تھے تو گولیوں کی آواز بھی دور دور تک سنائی دیتی تھیں جن سے مسلمانوں کے خوف و ہراس میں کچھ اور بھی اضافہ ہو جاتا تھا اور سب لوگ اپنی اپنی جگہ یہ محسوس کرتے تھے کہ کل یہ حملہ ان کے محلے پر بھی ہوگا۔ گولیاں چلیں گی قتل عام ہوگا اور لوگ بری طرح مارے جائیں گے۔

غرض مسلمانوں کے نعروں اور گولیوں کی آوازوں سے زمین دہلتی تھی اور آسمان کانپتا تھا اور فضاؤں میں بارود اور خون کی بو بسی ہوئی محسوس ہوتی تھی کیونکہ دور دور تک گولیاں چل رہی تھیں۔ مشین گنوں، اسٹین گنوں اور برین گنوں کے چلنے سے ایک شور برپا تھا اور خون کا مینہ برس رہا تھا۔

ہم لوگ اینگلو عربک کالج میں دبکے بیٹھے تھے۔ کسی کی کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کیا جائے؟ رات کو جب گولیوں کی آوازوں اور نعروں کی گونج میں اضافہ ہوتا تھا تو ہم لوگ اپنے اپنے کمروں سے

باہر آجاتے اور گھبراہٹ کے عالم میں ایک دوسرے سے مشورے کرتے۔ کالج کے اساتذہ میں سے جو لوگ اس وقت ہوسٹل کے ایک بلاک میں قیام پذیر تھے، ان میں پروفیسر مرزا محمود بیگ، ڈاکٹر خورشید احمدؔ فارق، شکور احسن، سید حسن اور حسن مہدی وغیرہ تھے۔ سامنے کے بلاک میں لڑکے رہتے تھے۔ وہ بھی اپنے اپنے کمروں سے نکل آتے تھے اور رات رات بھر جاگ کر وقت گزارتے تھے۔ کیا لڑکے اور کیا استاد سب پہ ایک دہشت کا عالم طاری تھا۔

آپس میں اس وقت جو باتیں ہوتی تھیں، ان سے اس حقیقت کا اندازہ ہوتا تھا کہ یہ سب بھولے بھالے لوگ ہیں اور دلی میں جو طوفان اُٹھنے والے ہیں، ان کا انھیں مطلق علم نہیں۔ بلکہ بعضوں کی باتیں تو ایسی مضحکہ خیز تھیں جن پہ ہنسی آتی تھی اور بعض اوقات تو سر پیٹ لینے کو جی چاہتا تھا۔

مثلاً کوئی کہتا تھا "صاحب! بہت سی اینٹیں جمع کر لیجیے، جب حملہ ہو تو ہندوؤں کو ان اینٹوں سے ماریئے، حملہ پسپا ہو جائے گا۔"

کوئی کہتا تھا "صاحب! بڑی مقدار میں پسی ہوئی مرچیں خرید کر رکھ لیجیے، جب ہندو عربک کالج پر حملہ کریں تو یہ مرچیں اُن کی آنکھوں میں جھونک دیجیے۔"

کوئی مشورہ دیتا تھا کہ "ریت منگوا کر رکھ لیجیے جب حملہ ہو تو حملہ آوروں کو ریت سے اندھا کر دیجیے!"

کسی کی زبان سے نکلتا تھا کہ "جناب پولیس کو اطلاع دے دیجیے وہ عربک کالج کے طالب علموں اور پروفیسروں کی حفاظت کرے گی کیونکہ دلی ہندوستان کا دارالخلافہ ہے اور یہاں حکومت بڑے پیمانے پر فساد نہیں ہونے دے گی۔"

عربی کے پروفیسر ڈاکٹر خورشید احمدؔ فارق بڑے ہی معصوم آدمی تھے۔ انھیں لکھنے پڑھنے کے سوا کوئی اور کام نہیں آتا تھا۔ سیاست سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ اخبار تک نہیں پڑھتے تھے۔ ہفتوں بلکہ بعض اوقات مہینوں اپنے کمرے سے باہر نہیں نکلتے تھے، یا تو لڑکوں کو پڑھاتے تھے یا ہر وقت خود پڑھتے لکھتے رہتے تھے۔ جب ایک رات سارے شہر میں بہت سی اسٹین گنیں اور برین گنیں چلیں اور اللہ اکبر کے نعروں کی آوازیں بہت زیادہ گونجیں تو سب لوگ اپنے اپنے کمروں سے باہر نکل آئے اور باتیں کرنے لگے تو فارق صاحب

نہایت معصومیت سے کہنے لگے۔

"صاحب! یہ موٹی موٹی کتابیں جو ہم لوگ پڑھتے رہے ہیں آخر کس دن کام آئیں گی ہندو اگر کالج پر حملہ کریں تو آپ سب ان کتابوں سے ان کو ماریں" اس پر سب نے زوردار قہقہہ لگایا۔

اور میں نے کہا "فکر ہر کس بہ قدر ہمت اوست۔ فاروقی صاحب ہندوؤں کو مارنے کے لیے بھی موٹی موٹی کتابوں کو استعمال کریں گے۔ ایک عالم اور پروفیسر سے اور کیا توقع کی جا سکتی ہے۔

اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ لوگ حالات کی سنگینی سے کتنے بے خبر تھے۔ غرض اس طرح کی باتوں میں کئی دن گزر گئے۔ فساد روز بروز بڑھتا گیا، یہاں تک کہ اس کو دبانا پولیس اور فوج تک کے بس کی بات نہ رہی کیونکہ ہنگاموں اور فسادات کو فرو کرنے اور روکنے کے لیے جو فوج اور پولیس بھیجی جاتی تھی وہ خود مسلمانوں کو مارنا شروع کر دیتی تھی۔ اس لیے فساد ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان نہیں رہ گیا تھا بلکہ پولیس فوج اور مسلمانوں کے درمیان تھا۔

اس نازک صورت حال کو دیکھ کر دلی کی کانگریسی حکومت نے کئی ایسے اقدامات کیے جن سے حالات کو سدھارا جا سکے لیکن ان سب کا اثر نہ ہوا مثلاً حکومت کی طرف سے دلی کے چیف کمشنر کے عہدے پر ایک مسلمان خورشید احمد خاں کا تقرر کیا گیا، اس لیے کہ شاید اس طرح ہندوؤں کے حملوں کا زور کچھ کم ہو جائے۔ لیکن مسلمان چیف کمشنر صاحب خود ہندوؤں سے ڈرنے اور ان کی خوشامد کرنے لگے۔ ان کی اس کمزوری کو دیکھ کر ہندوؤں کی نیم فوجی سیاسی تنظیمیں آر۔ ایس۔ ایس اور مہاسبھا من مانی کرنے لگیں اور فساد کا بازار کچھ زیادہ ہی گرم ہو گیا۔

رندھاوا اس زمانے میں دلی کے ڈپٹی کمشنر تھے۔ ان کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ پوری طرح غیر جانب دار افسر ہیں اور تعصب ان میں نام کو نہیں ہے۔ چنانچہ شروع شروع میں ان کی شہرت اچھی رہی لیکن پھر یہ معلوم ہوا کہ ان کے خاندان کے کچھ لوگ پنجاب میں قتل کر دیے گئے اس لیے انتقاماً وہ مسلمانوں کے خلاف ہو گئے اور دلی کے مسلمانوں سے پنجاب کے واقعات کا بدلہ لینا شروع کر دیا۔ خبر یہ مشہور ہوئی کہ وہ خود پولیس کو لے کر جاتے ہیں اور مسلمانوں کے محلوں پر حملے کرواتے ہیں جن میں آر۔ ایس۔ ایس

کے لوگ بھی شریک ہو جاتے تھے اور اس طرح نہتے مسلمانوں کا قتل عام ہوتا تھا۔ مسلمان اب دلی میں بالکل بے یار و مددگار ہو گئے تھے۔ مر جانے کے سوا اب ان کے پاس کوئی چارہ نہیں رہا تھا کیونکہ شہر کا سربراہ افسر بھی ان سے انتقام لے رہا تھا اور پولیس اور فوج بھی ان کے وجود کو ملیامیٹ کرنے کے درپے تھی۔

ان حالات میں ظاہر ہے کہ کوئی بھی کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ مسلم لیگ کے لیڈر تو خیر اب کسی شمار و قطار ہی میں نہیں تھے۔ کانگریس کے لیڈر مولانا ابوالکلام آزاد اور رفیع احمد قدوائی صاحب تک کی کچھ نہیں چل رہی تھی۔ انتظامیہ اور عوام کوئی بھی انھیں خاطر میں نہیں لا رہا تھا۔ غرض بڑی ہی سنگین اور نازک صورتِ حال تھی۔

یہ حالات تھے کہ ایک دن اللہ بخش راجپوت عربک کالج میں میرے پاس آئے اور یہ خبر دی کہ امرتسر میں زبردست فساد ہوا ہے۔ آتش زنی اور قتل و غارت گری نے مسلمانوں کو تباہ و برباد کر دیا ہے بلکہ انھوں نے بتایا کہ امرتسر جل رہا ہے۔ مسلمانوں کے مکانوں سے شعلے اٹھ رہے ہیں۔ دھواں بلند ہو رہا ہے لیکن ابھی تک مسلمان سکھوں اور ہندوؤں کے مقابلے میں صف آرا ہیں اور خوب مقابلہ کر رہے ہیں۔

اللہ بخش راجپوت کو یہ خبریں کسی عزیز کے ذریعے سے ملیں جو کسی طرح بھاگ کر امرتسر سے دلی پہنچے تھے۔ اس لیے ان کی صداقت میں کسی شک و شبہے کی گنجائش نہیں تھی۔

راجپوت صاحب امرتسر کے رہنے والے تھے لیکن حکومت ہند کے محکمۂ اطلاعات و نشریات میں ڈائرکٹر یا ڈپٹی ڈائرکٹر تھے۔ وہ انگریزی زبان میں لکھتے تھے اور کئی کتابوں کے مصنف تھے۔ ان سے ہماری پرانی دوستی تھی اور وہ اکثر اینگلو عربک کالج آتے رہتے تھے اور ہم لوگوں سے اس وقت کے سیاسی حالات پر باتیں کرتے رہتے تھے۔ ان کا مزاج تجزیاتی تھا اور وہ عقل و شعور اور دانش مندی سے حالات کا جائزہ لیتے تھے لیکن آج جب انھوں نے امرتسر کے فسادات کی خبر سنائی تو وہ خاصے جذباتی تھے کیونکہ ان کا شہر جل رہا تھا، ان کا وطن جل رہا تھا اور ان کے عزیزوں اور دوستوں پر ان حالات میں خدا جانے کیا گزر رہی تھی۔

یہ خبریں سنا کر راجپوت صاحب تو اپنے گھر چلے گئے اور اینگلو عربک کالج میں تمام لوگوں کا وقت انتہائی پریشانی کے عالم میں گزرنے لگا اور یہ پریشانی روز بروز بڑھتی ہی گئی۔ ریڈیو اور اخبارات کے ذریعے سے صحیح خبریں ملتی نہیں تھیں۔ لوگ ادھر اُدھر سے خبریں لاتے تھے۔ افواہیں بھی پھیلی تھیں اور ان کو سُن کر پریشانی میں کچھ زیادہ ہی اضافہ ہوتا تھا۔

اسی عالم میں دو تین دن اور گزر گئے۔ افواہوں نے دلّی کی فضا کو کچھ اور بھی خراب کر دیا اور ہم سب اینگلو عربک کالج میں دبکے ہوئے بیٹھے رہے۔

پروفیسر راجندر ناتھ شیدا اس زمانے میں اکثر میرے پاس آتے تھے۔ شیدا صاحب لکھنؤ یونیورسٹی میں مجھ سے سینیئر تھے۔ اردو میں ایم۔ اے کر رہے تھے۔ حبیب اللہ ہوسٹل میں رہتے تھے۔ وہاں اکثر ان سے ملاقاتیں رہتی تھیں اور مختلف سیاسی حالات پر گھنٹوں تبادلۂ خیال ہوتا تھا۔ نہایت روشن خیال آدمی تھے۔ مظفر نگر کے رہنے والے تھے، خالص برہمن تھے، لیکن رہن سہن مسلمانوں کا اپنایا تھا۔ ہمیشہ مسلمانوں کی طرح شیروانی اور پاجامہ پہنتے تھے، فصیح اردو بولتے تھے اور اردو کی حمایت کرتے تھے۔ ہندوؤں کی عصبیت انھیں پسند نہیں تھی، خاص طور پر اُردو کے معاملے میں وہ کسی قسم کی عصبیت کو برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ ہندی ان کے نزدیک مصنوعی زبان تھی اور اس سے اُن کے خیال میں ہندوستان کی مشترکہ ہندو مسلم تہذیب و ثقافت کی نفی ہوتی تھی۔ اردو زبان اور ادب کا نہایت پاکیزہ ذوق رکھتے تھے اور اس کے مختلف پہلوؤں پر انھوں نے خیال انگیز تنقیدی مقالے بھی لکھے تھے جو ادبی رسائل میں شائع ہو چکے تھے اور انھوں نے ان مضامین کو کتابی صورت میں بھی چھاپ دیا تھا دو مجموعے شائع ہو چکے تھے۔ ہندو کالج دہلی میں اردو کے استاد تھے۔

ایک دن شیدا صاحب سہ پہر کو آئے اور دیر تک میرے پاس بیٹھے رہے۔ پانچ بجے کے قریب ریڈیو پر اعلان ہوا کہ دہلی کی فضا خراب ہے اس لیے اسی وقت سے بہتّر گھنٹے کا کرفیو لگایا جاتا ہے۔ لوگ اپنے گھروں میں رہیں۔ باہر نکلنے والوں کو گولی مار دی جائے گی۔

یہ خبر ایک طالب علم لے کر آیا۔ ہم لوگ اس خبر کو سن کر حیران و پریشان رہ گئے، کیونکہ یہ تو

ہمیں معلوم تھا کہ دلّی کی فضا کشیدہ ہے، لیکن بہتّر گھنٹے کا کرفیو لگانے کا کوئی جواز ہماری سمجھ میں نہیں آیا۔ خلیفہ صاحب بھی یہ خبر سن کر حیران ہوئے۔ انھوں نے کہا میں شہر میں رہتا ہوں۔ اندرون شہر تو کوئی خاص ہنگامہ نہیں ہے، البتہ باہر کی آبادیوں میں جہاں پنجاب سے سکھ اور ہندو آکر اشتعال انگیز باتیں کر رہے ہیں وہاں یقیناً فضا خراب ہے۔ مسلمانوں کے مکانوں پر حملے بھی ہو رہے ہیں۔ رات کو نعروں اور گولیوں کی آوازیں بھی آتی ہیں، لیکن یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ بہتّر گھنٹے کا کرفیو لگانے کی کیا ضرورت ہے۔ ہو سکتا ہے کسی بڑے ہنگامے کا اندیشہ ہو، اس کو روکنے کے لیے حکومت نے یہ اقدام کیا ہو۔ بہرحال یہ رموزِ مملکت ہیں، خسرواں دانند۔ مجھے اب گھر جانا چاہیے، کہیں کرفیو کی خلاف ورزی میں نہ پکڑا جاؤں۔“

یہ کہہ کر خلیفہ صاحب تو اپنے گھر چلے گئے اور ہم لوگ، اساتذہ اور لڑکے، اینگلو عربک کالج میں خوف و ہراس کے عالم میں کئی دن تک پابہ زنجیر رہے۔ رات رات بھر گولیوں اور اللہ اکبر کے نعروں کی آوازیں سنتے اور زیادہ وقت جاگ کر اور عربک کالج کی وسیع و عریض چھتوں پر اِدھر اُدھر گھوم کر گزارتے۔

بعد میں معلوم ہوا کہ خود پولیس اور انتظامیہ آر۔ ایس۔ ایس کے ساتھ مل کر پہاڑ گنج، سبزی منڈی اور کچھ دوسری آبادیوں میں مسلمانوں کا قتل عام کروا رہی ہے۔ چنانچہ کوئی ایک ہفتے تک یہ قتل عام ہوتا رہا اور لوٹ مار کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ مسلمانوں نے بڑی جرأت اور بہادری سے اس صورت حال کا مقابلہ کیا، لیکن بالآخر گھروں سے نکلنے پر مجبور ہوگئے۔ جو گھر خالی ہوتا اس میں پنجاب سے آئے ہوئے سکھ یا ہندو داخل ہو جاتے، اور مسلمانوں کے مکانوں اور مال و اسباب پر قبضہ کر لیتے۔ مسلمان لوگ جامع مسجد کی طرف بھاگ گئے یا آس پاس کے مسلمانوں کے محلوں میں پناہ لیتے تھے۔ کوئی ایک ہفتے تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ سبزی منڈی برباد ہوگئی، پہاڑ گنج تباہ ہوگیا۔

بہتّر گھنٹے کا کرفیو لگانے کا مقصد پورا ہوگیا۔

اب قرول باغ کی باری تھی۔ چنانچہ وہاں بھی مسلمانوں کے مکانوں پر حملے شروع ہوگئے۔ ۱۷ ستمبر

کو ہمیں یہ خبر ملی کہ عربک کالج کے انگریزی کے استاد سید امجد علی صاحب کا خاندان قرول باغ میں بڑے خطرے میں ہے۔ امجد علی صاحب تو عربک کالج سے طویل رخصت لے کر ملازمت کی غرض سے دہرہ دون چلے گئے تھے اور وہیں پھنسے ہوئے تھے۔ ان کے والد اور بہنیں قرول باغ میں ان کی اس نئی کوٹھی میں سہمے ہوئے تھے، جس کو امجد صاحب کے والد نے زر کثیر صرف کر کے تعمیر کروایا تھا۔

بیگ صاحب کو ان کی اس پریشانی کی خبر کسی نے فون پر دی۔ انھوں نے بڑی ہمت سے کام لیا۔ فوراً اپنی موٹر نکالی مجھے ساتھ لیا اور چند منٹ میں قرول باغ میں امجد صاحب کے گھر پہنچ گئے۔ ان لوگوں پر بس چند منٹ میں حملہ ہونے ہی والا تھا کیونکہ ہم نے دیکھا کہ آس پاس ہندو سکھ جمع ہو کر آپس میں مسکوٹ کر رہے ہیں۔

بیگ صاحب نے بڑی دانش مندی سے کام لیا اور امجد صاحب کے والد اور بہنوں کو باہر سے آواز دی کہ جلد از جلد گاڑی میں بیٹھ جائیے، وقت نہیں ہے، خطرہ سنگین ہے۔

یہ سن کر امجد صاحب کے والد، ان کی دو بہنیں اور ان کے بچے سب کچھ چھوڑ کر گاڑی میں بیٹھ گئے اور بیگ صاحب نے گاڑی اسٹارٹ کر کے تیزی سے چلا دی۔ ہم نے گاڑی میں سے مڑ کر دیکھا تو ہندو اور سکھ امجد صاحب کے مکان کو لوٹ رہے تھے، اور ان کا نہایت قیمتی سامان اٹھا اٹھا کر لیے جا رہے تھے۔

پھر ہم نے خدا کا شکر ادا کیا کہ کم از کم جانیں تو بچ گئیں۔ ہم لوگ انھیں اینگلو عربک کالج میں لے آئے اور ان لوگوں نے ایک عالم کس مپرسی میں بیگ صاحب کے ہاں قیام کیا۔ ان کا سب کچھ لٹ گیا تھا۔ اب نہ گھر تھا نہ گھر کا سامان، بس تن پر جو کپڑے تھے وہی ان کا سرمایہ تھے۔ زندگی میں پہلی دفعہ مجھے یہ معلوم ہوا کہ ریفیوجی کس کو کہتے ہیں۔ یہ لوگ عربک کالج میں پناہ گزیں تھے لیکن عربک کالج بھی کوئی محفوظ جگہ نہیں تھی۔ وہ مسلم لیگ کا سب سے بڑا گڑھ اور تحریک پاکستان کا قلعہ تھا۔ اس لیے اس کو سب سے زیادہ خطرہ درپیش تھا۔ ہندو، سکھ اس کی تاک میں تھے اور موقع کا انتظار کر رہے تھے کہ جیسے ہی موقع ملے، اس پر حملہ کر دیں۔ لڑکوں اور پروفیسروں کو قتل کر دیں اور کالج کی عمارت پر قبضہ کر لیں۔ ان کے خیال میں اس کالج کے طالب علموں اور استادوں سے اسی طرح

استقام لیا جا سکتا تھا۔

ہم لوگوں کو تو اس کا علم ہی نہیں تھا، ہوتا بھی کیسے، ہم تو کالج میں محصور تھے، باہر لوٹ مار اور قتل و غارت گری کا دور دورہ تھا۔ مسلم لیگ کے کسی کارکن نے یہ اطلاع دی کہ دو تین دن کے اندر اینگلو عربک کالج پر حملہ ہوگا۔ طالب علم اور استاد قتل کر دیے جائیں گے اور اس کی تاریخی عمارت پر آر۔ ایس۔ ایس کا قبضہ ہو جائے گا۔

چنانچہ کئی دن اور راتیں ہم نے جاگ کر کاٹیں۔ پروفیسر ہارون خاں شیروانی صاحب جو ہمارے نئے پرنسپل تھے اور جو صرف چند مہینے قبل حیدرآباد دکن سے آئے تھے، ان کا قیام بھی کالج ہی میں تھا۔ ان کے پاس ایک معمولی سی دونالی بندوق تھی۔ وہ اس بندوق کو لے کر اینگلو عربک کالج کی چھت پر آجاتے تھے اور رات بھر ادھر ادھر گھومتے تھے۔ اللہ اکبر کے نعروں کی آوازیں جس طرف سے بلند ہوتی تھیں اس طرف اس دونالی بندوق کا رخ ہو جاتا تھا لیکن دیسی بندوقوں سے کیا ہوتا ہے۔ وہاں تو آس پاس اسٹین گنیں، اور برین گنیں چل رہی تھیں اور ان کی آوازیں اللہ اکبر کے نعروں کے ساتھ اس طرح آتی تھیں گویا بھاڑ میں چنے بھن رہے ہیں —— تین دن اور تین راتیں اسی طرح گزریں۔

۳ر ماہ ستمبر کو بیگ صاحب نے مجھ سے کہا کہ موٹر نکالتے ہیں۔ نارتھ بلاک سکریٹریٹ چلتے ہیں۔ وہاں مجھے کچھ لوگوں سے ملنا ہے۔ راستے میں ادھر ادھر گھوم پھر کر شہر کا حال بھی دیکھیں گے۔ پھر سوچیں گے کہ کیا کرنا چاہیے۔

چنانچہ میں بیگ صاحب کے ساتھ ہو لیا۔ صبح کا وقت تھا۔ بظاہر کوئی ہنگامہ نظر نہیں آیا۔ اجمیری دروازے سے چل کر کناٹ سرکس اور پارلیمنٹ اسٹریٹ ہوتے ہوئے ہم لوگ سکریٹریٹ کے نارتھ بلاک پہنچے۔ بیگ صاحب کو جو کام تھا، وہ انھوں نے کیا اور پھر ہم لوگ جلد ہی واپس لوٹے۔ واپسی پر منظر بدل گیا تھا۔ نئی دہلی کے پورے شہر کا حال دگرگوں تھا ہر سڑک پر ہندو سکھوں کا مجمع نظر آیا۔ کناٹ پلیس پہنچے تو دیکھا کہ مسلمانوں کی دکانیں لٹ رہی ہیں ہر شخص کوئی نہ کوئی چیز ہاتھ میں لیے بھاگا جا رہا ہے اور پولیس کھڑی تماشا دیکھ رہی ہے۔

تنی دیر میں دیکھا کہ پنڈت جواہر لال نہرو کی کار آگئی۔ وہ کار سے باہر آئے اور مجمع میں سے کسی کے ہاتھ سے ڈنڈا چھین کر ان لوگوں کی طرف مارنے کے لیے دوڑے جو مسلمانوں کی دکانیں لوٹ رہے تھے۔ انھیں دیکھ کر پولیس بھی ان کے ساتھ ہوگئی۔ تھوڑی دیر یہ سلسلہ جاری رہا، مجمع کچھ ادھر ادھر منتشر ہوگیا۔ ہم لوگ واپس اینگلو عربک کالج واپس آگئے۔

رات کو پھر وہی اللہ اکبر کے نعرے اور اسٹین گن اور برین گن کی آواز کا سلسلہ جاری رہا اور شیروانی صاحب رات بھر اپنی دونالی بندوق ہاتھ میں لے کر ہم لوگوں کے ساتھ عربک کالج کی لمبی چھت پر ادھر ادھر گھومتے رہے، عجیب پریشانی، بے بسی اور کس مپری کا عالم دیکھنے میں آیا۔

دو تین راتیں اسی طرح گزریں۔ ۷ ستمبر ۱۹۴۷ء کو گولیوں کی آوازوں کا شور اتنا بڑھ گیا کہ معلوم ہوتا تھا اب یہ ہمارے سینے اور سروں پر چلیں گی۔ اللہ اکبر کے نعروں کی آوازیں اس طرح گونجتی تھیں جیسے مسلمان کوئی جنگ لڑ رہے ہیں، جن محلوں میں جنگ ہو رہی تھی، اس کے بارے میں ہمیں کچھ معلوم نہیں تھا کہ کیا ہو رہا ہے۔ ہم لوگ تو اب اینگلو عربک کالج میں تقریباً محصور ہو چکے تھے۔ نہ باہر نکل سکتے تھے نہ اندر کسی ذریعے سے کوئی خبر آتی تھی۔ بس یوں محسوس ہوتا تھا کہ ہم سب کالج کی عمارت میں قید ہیں اور اپنی موت کا انتظار کر رہے ہیں۔

یہ کیفیت تھی جب میں نے یہ فیصلہ کیا کہ مولانا ابوالکلام آزاد کو فون کیا جائے اور ان حالات کی تفصیل انھیں بتائی جائے چنانچہ میں نے ان کے گھر کے نمبر پر فون کیا لیکن ٹیلی فون بجائے مولانا ابوالکلام آزاد کے گھر ملنے کے پاکستان ہائی کمیشن زاہد حسین صاحب کے ہاں ملا۔ انھوں نے خود ٹیلی فون اٹھایا اور کہا "میں زاہد حسین بول رہا ہوں۔

میں نے کہا جناب! میں نے اینگلو عربک کالج کے لڑکوں اور استادوں کی حالت زار بتانے کے لیے مولانا ابوالکلام آزاد کو فون کیا لیکن آپ کے ہاں مل گیا۔

کہنے لگے "اس کو بھی غنیمت جانیے کہ میرے ہاں مل گیا۔ ٹیلی فون کے سارے نظام کو خراب کر دیا گیا ہے۔ تار ادھر ادھر کر دیئے گئے ہیں۔ میری اطلاع کے مطابق آج رات کو اینگلو عربک کالج

پر آمادہ ہیں۔ ریلی کا حملہ ہوگا اور آپ سب لوگ، طالب علم اور پروفیسر قتل کر دیئے جائیں گے۔ مناسب یہ ہے کہ آپ لوگ میرے ہاں ہائی کمیشن میں آجائیں اور فی الحال یہیں رہیں جو سب کا حال وہ اپنا حال۔ میں ایک گاڑی بھیجتا ہوں۔ وہ دو تین پھیرے کرے گی۔ کسی کو وہاں نہ چھوڑیئے۔ آپ سب لوگ میرے پاس آجائیے۔"

کوئی دو بجے کے قریب پاکستان کے ہائی کمشنر زاہد حسین صاحب سے فون پر یہ بات ہوئی۔ ایک گاڑی انھوں نے بھیجی۔ دو ایک گاڑیاں ہمارے پاس تھیں۔ ان گاڑیوں میں سوار ہو کر ہم لوگ، پروفیسر، طالب علم اور کالج کے نوکر ضروری سامان لے کر پاکستان ہائی کمیشن میں "گل رعنا" پہنچ گئے۔ راستے میں دو تین جگہ جھاڑیوں چھپے ہوئے سکھوں نے گاڑیوں پر فائر کیے لیکن شکر ہے کہ ہم لوگ صحیح سلامت "گل رعنا" پہنچ گئے۔

کالج ہم سے چھوٹ گیا اور اس طرح ہم صحیح معنوں میں ریفیوجی ہو گئے۔

"گل رعنا" میں عجیب منظر تھا۔ اس کے وسیع و عریض ڈرائنگ روم اور لاؤنج میں ہم لوگ، پروفیسر خورشید احمد چشتی صاحب، پروفیسر مرزا محمود بیگ، ڈاکٹر خورشید احمد فارق اور کچھ دوسرے پروفیسر اور طالب علم اس طرح بیٹھے ہوئے تھے جیسے کسی "کنسنٹریشن کیمپ" یا جیل خانے میں ہوں۔ ہم سب کو کچھ معلوم نہیں تھا کہ اب کہاں جائیں گے؟ آئندہ دن کیسے گزریں گے؟ کالج واپس پہنچ سکیں گے یا نہیں؟ چاروں طرف تاریکی ہی تاریکی نظر آتی تھی۔ دور دور تک اندھیرا ہی اندھیرا چھایا ہوا دکھائی دیتا تھا۔

ستمبر کی وہ رات قیامت کی رات تھی جو ہم پر گزری۔ رات کو ایک ایک روٹی زاہد حسین صاحب ہائی کمشنر کی طرف سے کھانے کو ملی۔ ہم نے وہ روٹی کھا کر پانی پی لیا اور اسی طرح کرسیوں، صوفوں اور فرش پر بیٹھے رہے۔ اتنے آدمیوں کے لیے سونے کی جگہ کہاں سے آتی؟ چشتی صاحب کی بیگم کے ہاں بچہ ہونے والا تھا۔ اس کے لیے رات کو کسی نہ کسی طرح ایک ڈاکٹرنی کا بندوبست بھی کرنا پڑا۔ غرض یہ قیامت گزر گئی۔

"گل رعنا" کے ڈرائنگ روم میں، ڈائننگ روم میں، لاؤنج میں، غرض تمام کمروں میں لوگ

کرسیوں پر، صوفوں پر، فرش پر پریشان حال بیٹھے تھے۔ خاموشی کی فضا تھی۔ ایک دوسرے سے بات تک کرنے کوئی نہیں چاہتا تھا۔ باہر سے آنے والوں کا سلسلہ بھی جاری تھا۔

رات گئے کوئی بارہ بجے کے قریب ایک شخص آیا اور مجھ سے کہنے لگا ”میرے اس شہر میں دس پٹرول پمپ ہیں۔ ہزار ہا گیلن پٹرول ان میں بھرا ہوا ہے۔ جن سنگھ والوں نے سب پر نشان لگا دیے ہیں۔ کسی وقت بھی جلا دیے جائیں گے۔ آپ ہائی کمشنر صاحب سے کہیے کہ اپنے ٹرک بھیج کر ٹنکیاں بھروا لیں۔ صرف ایک ٹرک مجھے دے دیں تاکہ میں گھروں سے کسی طرح اپنے بچوں کو نکال لاؤں۔“ ہم لوگوں نے زاہد حسین صاحب سے کہا۔ لیکن انھوں نے احتیاط کے خیال سے اس کو مناسب نہیں سمجھا۔ وہ مایوس ہو کر چلا گیا۔ خدا جانے اس کے پٹرول پمپوں کا اور اس کے خاندان والوں کا کیا حشر ہوا۔

رات گئے کوئی دو بجے کے قریب میں نے دیکھا کہ میرے پرانے کلاس فیلو میجر چودھری سعیدالرحمٰن بھائی فوجی وردی میں ملبوس چلے آ رہے ہیں۔ میں انھیں دیکھ کر حیران ہوا۔ کہنے لگے ”بہت جلدی میں ہوں۔ ہائی کمشنر صاحب کو چند ضروری اطلاعات دینے آیا ہوں۔ آپ لوگوں کو نہیں بتا سکتا۔ اس کا صیغۂ راز میں رہنا ضروری ہے۔“ دو بجے وہ زاہد حسین صاحب سے ملے اور خاصی دیر تک ان سے تنہائی میں باتیں کیں۔ ہم لوگوں کو ان باتوں کا علم نہ ہو سکا۔ تین بجے کے بعد وہ ہائی کمیشن سے رخصت ہوئے۔

رات اسی طرح گزر گئی۔

صبح کو میں نے ہائی کمیشن کی عمارت سے باہر نکل کر دیکھا۔ سیکڑوں مسلمان سڑک پر موجود تھے۔ ان میں سے بعض تو خون میں نہائے ہوئے تھے۔ ان میں سے بیشتر اپنے بچوں سے پاکستان کے پرچم کی طرف اشارہ کر کے کہہ رہے تھے ”بیٹے! یہ تمھارا جھنڈا ہے۔ پاکستان کا جھنڈا ہے۔ اب ہم پاکستان چلیں گے اور وہاں اطمینان سے رہیں گے۔ وہاں ہمیں کوئی نہیں مارے گا۔ ہم پر کوئی حملہ نہیں ہوگا۔“

اتنے میں دیکھا کہ ہائی کمیشن کے عملے کے لوگ، ان مسلمانوں کو جو ہائی کمیشن کے کمپاؤنڈ کے اندر جمع ہو رہے تھے، باہر نکال رہے ہیں اور بعضوں کو مکوں سے مار رہے ہیں۔ یہ دیکھ کر میرا دل بھر آیا۔ ہم لوگوں نے کہا ”آپ ان کو ماریں نہیں۔ یہ تو ویسے ہی پریشان حال ہیں۔“ لیکن کسی نے ہماری بات نہیں سنی اور مار پیٹ

کا یہ سلسلہ دیر تک جاری رہا۔ عجب بے حس اور ظالم لوگ تھے۔

زاہد حسن صاحب بے چارے دل کے مریض تھے۔ وہ ہائی کمیشن کے ایک کمرے میں محصور تھے۔ بگڑتے ہوئے حالات نے ان کی تکلیف میں کچھ اور بھی اضافہ کر دیا تھا اور اس کی وجہ سے ہائی کمیشن کا سارا نظام درہم برہم ہو گیا تھا۔ محلے کے بیشتر لوگ ہائی کمیشن تک پہنچ نہیں سکتے تھے۔ اس لیے اپنے گھروں میں محصور تھے۔ کچھ گھروں کو چھوڑ کر مع بچوں کے ہائی کمیشن میں آ گئے تھے۔ عجب کس مپرسی کا عالم تھا۔ کسی کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کیا جائے۔

صبح کو ہم لوگوں نے یعنی کالج کے پروفیسروں اور لڑکوں نے زاہد حسن صاحب ہائی کمشنر کی طرف ہوم ڈیپارٹمنٹ کو فون کیا تاکہ یہ معلوم کیا جائے کہ جو مسلمان لٹ پٹ کر لہولہان ہائی کمیشن کے سامنے جمع ہوتے جا رہے ہیں، ان کو کہاں رکھا جائے؟ ٹیلیفون ہوم منسٹر پٹیل خود اٹھاتے تھے۔ میں نے خود ٹیلیفون پر ان کی آواز سنی۔ جواب میں کہہ رہے تھے کہ ان مسلمانوں کو پرانے قلعے میں بھیجیے۔ ان کے لیے یہی رفیوجی کیمپ ہے۔ یہ لوگ پاکستانی ہیں اور پاکستان بھیجے جائیں گے۔ یہاں ان کے لیے کوئی جگہ نہیں۔ جب ہم نے یہ پوچھا کہ ان کے راشن وغیرہ کا کیا انتظام ہوگا؟ تو آواز آئی۔ ان کے لیے یہاں کوئی راشن نہیں۔ انھیں راشن پاکستان میں ملے گا۔ اور ٹیلیفون بند کر دیا گیا۔

یہ سن کر ہم لوگوں نے یہ فیصلہ کیا کہ سب سے پہلے ہم لوگوں کو پرانے قلعے چلنا چاہیے اور جس طرح بھی ہو سکے کیمپ کا انتظام کرنا چاہیے۔

ابھی پرانے قلعے کو آباد کرنے کے یہ منصوبے بنائے جا رہے تھے کہ زاہد حسن صاحب کے ہاں پاکستان ہائی کمیشن میں ایک کھیپ دہلی یونیورسٹی کے مسلمان پروفیسروں کی اور آ گئی۔ ان میں تاریخ کے پروفیسر اور آرٹ فیکلٹی کے ڈین ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی، تاریخ کے پروفیسر ڈاکٹر ریاض الاسلام، فارسی کے پروفیسر ڈاکٹر امیر حسن عابدی، انگریزی کے استاد اشتیاق علی عباسی صاحب، شعبۂ فارسی کے صدر ڈاکٹر اطہر علی اور یونیورسٹی کے رجسٹرار اختر حسین صاحب شامل تھے۔ ان کے جسم پر صرف ایک قمیص اور ایک پتلون تھی۔ بیشتر کے پاؤں میں جوتے بھی نہیں تھے۔ جب ان کے گھروں پر حملہ ہوا

تو انھیں سب کچھ چھوڑ کر ننگے سر ننگے پاؤں بھاگنا پڑا۔ سمجھ میں نہیں آیا کہ کہاں جائیں اس لیے ہائی کمیشن کا رخ کیا، ور زاہد حسن صاحب کے ہاں آ گئے۔ عورتیں اور بچے بھی اُن کے ساتھ تھے۔ ان کی حالت دیکھی نہیں جاتی تھی۔

یہ سب بھی ہم لوگوں میں شامل ہو گئے۔ ان کا حال کچھ زیادہ ہی خراب تھا۔ یہ لوگ تو آگ و خون کے دریا میں سے ہو کر آئے تھے ہم لوگوں کو زاہد حسن صاحب کی وجہ سے کسی قدر اطمینان سے یہاں آنا نصیب ہوا تھا۔ بہرحال رفیوجی سب تھے۔

ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی صاحب، ہمارے بزرگ تھے ہمدرد اور بہی خواہ تھے، ہادی اور رہنما تھے سرپرست تھے۔ وہ دہلی یونیورسٹی میں تاریخ کے پروفیسر اور آرٹس فیکلٹی کے ڈین تھے۔ اینگلو عربک کالج کی گورننگ باڈی کے نائب صدر بھی تھے۔ نواب زادہ لیاقت علی خاں صاحب کالج کے صدر تھے، لیکن اپنی سیاسی مصروفیتوں کی وجہ سے انھوں نے قیام پاکستان سے چند ماہ قبل کالج کا سارا کام ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی صاحب کے سپرد کر دیا تھا۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو ہم ہی میں سے ایک تھے جب کوئی مسئلہ سامنے آتا تھا ہم لوگ دوڑے ہوئے ان کے پاس دہلی یونیورسٹی چلے جاتے تھے۔ جہاں، اولڈ وائسریگل لاج کے ایک خوبصورت بنگلے میں ان کا قیام تھا۔ یونیورسٹی کے وائس چانسلر سر ماریس گوائر ان کی بڑی عزت کرتے تھے، اور ان کی بات مانتے تھے، لیکن وہ بھی انھیں نہ بچا سکے جن مسلمانوں کا یونیورسٹی میں قیام تھا۔ قریشی صاحب کو ان سب کے ساتھ جان بچا کر بھاگنا پڑا، اور پاکستان ہائی کمیشن میں پناہ لینی پڑی۔

قریشی صاحب نے بتایا کہ میں تو یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ حملہ کرنے والوں میں میرے وہ ہندو سکھ شاگرد بھی شامل تھے جو میرے سامنے ہاتھ باندھ کر بیٹھتے تھے، زانوئے ادب تہ کرتے تھے اور میرے لیکچر شوق سے سنتے تھے۔

میں نے ان کی یہ روداد سن کر کہا کہ "ایسا تو کبھی تاریخ میں نہیں ہوا ہوگا کہ شاگرد استاد کے گھر پر حملہ کریں اور لوٹ مار کے مرتکب ہوں۔" قریشی صاحب کہنے لگے "واقعی تاریخ میں کبھی ایسا نہیں ہوا۔"

ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی صاحب یوں تو سب سے اچھی طرح ملتے تھے، لیکن پڑھنے لکھنے اور ادبی کام کرنے کی وجہ سے مجھ پر خصوصیت کے ساتھ بہت شفقت فرماتے تھے۔ میری جان انھیں بہت عزیز تھی۔

کہنے لگے: "سعادت صاحب! یہاں تو اب قتل و غارت گری کا دور دورہ ہے۔ یہ حالات درست ہوتے معلوم نہیں ہوتے۔ سب کو پاکستان جانا پڑے گا۔ ریلیں چلیں گی لیکن ریلیں صحیح سلامت پاکستان پہنچ نہیں سکیں گی۔ راستے میں لوگ قتل کیے جائیں گے۔ آپ کی زندگی بہت قیمتی ہے۔ ابھی آپ کو بہت سا ادبی کام کرنا ہے۔ میں آپ کو ان ہوائی جہازوں کے ذریعے سے پاکستان بھجوا دیتا ہوں جو قائدِ اعظم نے مرکزی حکومت کے اسٹاف کو کراچی لے جانے کے لیے چارٹر کیے ہیں۔"

میں نے کہا: "شکریہ! لیکن ابھی تو پرانے قلعے کے کیمپ کا انتظام کرنا ہے۔ اینگلو عربک کالج کے استادوں اور طالب علموں نے اس ذمے داری کو اپنا فرض سمجھ کر قبول کیا ہے۔ پٹیل صاحب نے فون پر یہ کہا ہے کہ مسلمانوں کو پرانے قلعے میں رکھا جائے گا۔ اب ہم ان سب کو چھوڑ کر کیسے جا سکتے ہیں؟ موت اور زندگی اللہ کے اختیار میں ہے، اگر بچ گئے تو خیر، ورنہ جہاں اتنے مسلمان مارے جا رہے ہیں وہاں ہم بھی سہی!"

قریشی صاحب سے یہ باتیں کر کے ۸ ستمبر کو دوپہر کے بعد ہم لوگوں نے پرانے قلعے جانے کا مصمم ارادہ کر لیا۔ جو مسلمان ہائی کمیشن کے اندر اور باہر جمع تھے ان سے کہا کہ "آپ سب پرانے قلعے چلیے۔ آپ کے لیے وہ محفوظ جگہ بنائی گئی ہے۔ اینگلو عربک کالج کے طالب علم اور استاد اور دوسرے ملازمین سب آپ کے ساتھ ہیں۔ ہم سے جو خدمت آپ کی ہو سکے گی، انشاءاللہ ضرور کریں گے۔"

یہ سن کر مسلمانوں نے پرانے قلعے کا رخ کیا۔ ہم لوگ بھی عصر کے وقت تک طالب علموں اور ملازموں کو لے کر پرانے قلعے پہنچ گئے۔ یہ خبر کہ پرانے قلعے میں مسلمانوں کے لیے کیمپ کھول دیا گیا ہے، جہاں سے وہ پاکستان بھیجے جائیں گے، سارے دلی شہر میں جنگل کی آگ کی طرح پھیلی اور اتنی تیزی سے مسلمانوں نے پرانے قلعے آنا شروع کیا کہ مغرب کے وقت تک سارا قلعہ مسلمانوں سے بھر گیا اور قلعے

کے اندر تل دھرنے کی جگہ نہیں رہی۔

پرانا قلعہ نام کا قلعہ تھا لیکن درحقیقت ایک کھنڈر تھا جس نے بیسیوں تمدنوں، درسیکڑوں بادشاہوں کے زمانے دیکھے تھے۔ صرف پرانے پتھروں کی فصیل تھی جو خاصے بڑے میدان کو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے تھی۔ سنا تھا کہ یہ قلعہ کوروپانڈو کے وقت سے بننا شروع ہوا اور دہلی کے مختلف بادشاہ اس میں اضافے کرتے رہے لیکن اندر کوئی عمارت نہ بنا سکے۔ شاید اس کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ کیونکہ غالباً اس قلعے کو تعمیر کرنے کا مقصد یہ تھا کہ کوئی خطرہ درپیش ہو اور باہر سے کوئی حملہ آور آئے تو شہر کی ساری آبادی اس میں سما جائے۔ تغلق آباد کا قلعہ بھی اسی مقصد سے تعمیر کیا گیا تھا اور اتنا وسیع و عریض تھا کہ اس میں کئی کئی گاؤں آباد ہو گئے تھے۔ پرانا قلعہ بھی اسی طرح کا قلعہ تھا۔ نہ اندر کوئی عمارت، نہ دھوپ اور بارش سے بچاؤ کی کوئی اور صورت۔ سایۂ دیوار تک اس میں کسی کو نصیب نہیں ہو سکتا تھا۔

اس قلعے میں پہنچ کر ہم لوگوں نے پھاٹک کے قریب ہی پڑاؤ ڈالا تاکہ یہاں سے اس وسیع و عریض قلعے میں لٹ پٹ کر آنے والے لوگوں کی حالت زار کا جائزہ لے سکیں اور جو خدمت ہم ان کی کر سکتے ہیں کریں۔ کالج کے لڑکے ہمارے ساتھ تھے۔ نوکر بھی ہمارے تھے۔ چلتے وقت میں نے استاد سبطی، اینگلو عربک کالج کے ہیڈ باورچی سے کہا تھا کہ راشن کا جو گیہوں ہے اور شکر وغیرہ جو ملی ہے وہ گاڑیوں میں رکھ لینا۔ خدا جانے کس وقت ان چیزوں کی ضرورت پیش آجائے۔ بے سروسامانی کی وادیوں میں ہم لوگ قدم رکھ رہے ہیں۔ "چھ روز کا راشن ہمارے پاس ضرور ہونا چاہیے"۔ اس راشن نے بڑا کام دیا۔ ہم لوگ کئی وقت کے بھوکے تھے۔ استاد سبطی، یسین اور حسن وغیرہ نے پتیلے میں گیہوں ابالنے کے لیے رکھ دیے اور اس میں شکر ڈال کر اس قابل بنا دیا کہ کھایا جا سکے۔ قدرت کا عجیب کھیل ہے کہ وہ استاد سبطی جس کے ہاتھ کے پکے ہوئے سالن کو کھا کر لوگ انگلیاں چاٹتے تھے اور جس کی بریانی اور قورمے کی گلی گلی تک دھوم تھی، آج ہمارے لیے گیہوں ابال رہا تھا۔ بہرحال ہم لوگوں نے وہ ابلے ہوئے گیہوں کھائے تاکہ کام کرنے کے لیے کچھ جان آجائے اور پھر ہم لوگ اپنے مشن پر نکلے۔ ایک ایک خاندان

پاس گئے، ان کا حال احوال پوچھا۔ ہر ایک نے اپنی بپتا سنائی جس کو سن کر ہم میں سے ہر ایک یوں محسوس کیا جیسے ہمارے سینے شق ہو گئے ہیں۔

ہم نے ان لوگوں سے کہا کہ ”آپ درختوں کی ٹہنیاں کاٹ کر ہو سکے تو کم از کم چادریں تان لیجیے تاکہ رات کی شبنم اور دن کی دھوپ سے کچھ تو محفوظ رہیں۔“ چنانچہ ہمارے کہنے کا یہ اثر ہوا کہ جن لوگوں کے پاس چادریں یا عورتوں کے دوپٹے تھے انھوں نے اپنی اپنی جگہ پر چادریں تان لیں، اور جو تھوڑا بہت سامان لے کر آئے تھے اس کو اکٹھا کر کے بیٹھ گئے۔ بلوچ رجمنٹ کے سپاہیوں نے حفاظت کرنے کا کام سنبھال لیا، اور وہ قلعے کے اندر اور آس پاس پہرہ دینے لگے۔

اس سے لوگوں کو کسی قدر یہ اطمینان ہوا کہ از کم رات کو قلعے پر حملہ تو نہیں ہوگا۔ لیکن وہ رات قیامت کی رات تھی۔ لاکھوں آدمی ایک عالم کس مپرسی میں پرانے قلعے میں پڑا ہوا تھا۔ نہ کھانے کو کوئی چیز تھی، نہ پینے کو پانی۔ قلعے کے باہر صرف ایک نل تھا جس سے لوگ پانی پی سکتے تھے۔ یہ نلکا اس وقت لگایا گیا تھا جب جاپانی جنگی قیدی اس قلعے میں قید تھے۔ پانی لینے کے لیے لمبی قطاریں بن گئی تھیں۔ کسی کے ہاتھ میں گلاس، کسی کے ہاتھ میں کٹورہ، کسی کے ہاتھ میں بالٹی، کسی کے ہاتھ میں تسلا، غرض عجیب منظر تھا جس نے کربلا کی یاد تازہ کر دی تھی۔ کسی کو پانی ملا کسی کو نہ ملا۔

رات کو ہم نے تاریکی میں قلعے کے اندر چکر لگایا۔ عجب پریشانی کا عالم دیکھا۔ مرد پریشان، عورتیں سوگوار، بچے زندگی سے بیزار، ماؤں کا دودھ کئی کئی دن فاقہ کرنے اور دہشت کے عالم میں وقت گزارنے کی وجہ سے خشک ہو گیا تھا، چنانچہ انھوں نے اپنے بلکتے ہوئے معصوم بچوں کے منہ میں اپنے دوپٹوں کی بتیاں سی بنا کر دے دی تھیں تاکہ وہ تھوڑی دیر تو چپ رہیں، لیکن یہ نسخہ آخر کب تک کارگر ہوتا۔ بچے پھر بلکنے لگے تو ان کی چیخوں اور رونے کی آوازوں نے سارے قلعے کو حشر کا میدان بنا دیا۔

اور پھر رات گئے بارش شروع ہو گئی اور ایسی موسلا دھار بارش ہوئی کہ وہ چادریں جو تانی گئی تھیں اس میں بہہ گئیں۔ لوگ بھیگ کر چوہا ہو گئے۔ بچا کھچا سامان جو کسی طرح لے کر آئے تھے وہ پانی میں

تیرنے لگا۔ اس عالم میں کوئی کسی کی کیا مدد کرتا۔ بجلی کے کوندے کی روشنی میں دیکھا لوگ قلعے کی دیواروں کے سائے میں پناہ لیتے ہوئے نظر آئے۔ دبکے بیٹھے ہوئے تھے۔ دیکھ کر افسوس ہوا لیکن ہم ت کچھ کر نہیں سکتے تھے۔ اس میدانِ حشر میں کوئی کسی کی کیا مدد کرتا۔ سب ایک دوسرے کو حسرت سے دیکھتے تھے اور بس اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے تھے کہ اس عذاب سے کسی طرح جلد نجات ملے لیکن بظاہر س کی کوئی صورت دور دور تک نظر نہیں آتی تھی۔

ت بھر کی بارش کا یہ اثر ہوا کہ پورا پرانا قلعہ ایک دریا بن گیا اور پھر سانپ نکلنے لگے۔ ن سانپوں نے کئی لوگوں کو ڈس بھی لیا۔ کچھ لوگ ڈر، خوف اور ہیبت سے بھی مرنے لگے۔ جنازے اُٹھنے لگے اور مرنے والے، سی پرانے قلعے کی شمالی دیوار کے ساتھ دفن کیے جانے لگے بغیر کفن کے مرنے دالوں کو گڑھوں میں پھینک دیتے تھے اور مٹی ڈال دیتے تھے۔

س عالم میں دوسری صبح ہوئی۔ سورج طلوع ہوا لیکن بادل آسمان کو گھیرے رہے اور وقفے وقفے سے موسلادھار بارش ہوتی رہی۔ زندگی تو پہلے ہی جہنم بن گئی تھی، اس بارش نے اسے کچھ اور بھی جہنم بنا دیا۔ کئی کئی دن کے بھوکے پیاسے لوگ موت کی دعائیں مانگنے لگے لیکن بیشتر کو موت بھی نہیں آئی۔ وہ نت نئی تکلیفیں اٹھانے کے لیے زندہ رہے، لیکن یہ زندگی موت سے بدتر تھی۔

دو تین دن کے بعد بی او اے سی کے ذریعے کراچی جانے والے وفاقی حکومت پاکستان کے وزیر نے کراچی جا کر یہ اطلاع دی کہ دلی میں آشوب قیامت کا دور دورہ ہے۔ دلی والے اپنے اپنے محلوں اور گھروں کو چھوڑ کر پرانے قلعے میں پناہ لینے کے لیے مجبور ہو گئے ہیں اور کئی دن سے لوگوں کا تانتا بندھا ہوا ہے۔ دلی دروازے سے پرانے قلعے تک سامان گاڑیوں میں، تانگوں میں اور پیدل پرانے قلعے جانے پر مجبور ہو گئے ہیں اور پرانے قلعے میں بھی اب جگہ نہیں رہی ہے۔ عورتیں، بچے، بوڑھے، جوان سب دور دور تک پرانے قلعے کے سامنے وان سڑک پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ مجبوراً انھیں آر ایس ایس، پولیس اور فوج کے ڈر سے اپنے گھروں کو چھوڑنا پڑا ہے۔ ان کے سروں پر موت ناچ رہی ہے۔ ان کے پاس نہ کھانے کو ہے نہ پینے کو۔ فاقہ کشی ان کا مقدر بن گئی ہے۔ لوگ اب بھوک سے مرنے بھی لگے

حکومت پاکستان کے یہ ملازمین بی او اے سی کے چارٹرڈ کیے ہوئے جہازوں سے کراچی جاتے تھے۔ بلوچ رجمنٹ کے سپاہیوں کے پہرے میں انھیں پالم ایئرپورٹ پر پہنچایا جاتا تھا جہاں سے بی او اے سی کے جہاز انھیں کراچی پہنچاتے تھے۔ پرانے قلعے میں یہ ملازمین بھی ٹھہرے ہوئے تھے چنانچہ جب انھوں نے کراچی جا کر پرانے قلعے کا آنکھوں دیکھا حال بیان کیا تو کراچی کے لوگ ان خالی جہازوں کو جو ملازمین کو کراچی چھوڑ کر واپس جاتے تھے ان کو کھانے پینے کی چیزوں سے بھر دیتے تھے۔ ڈبل روٹی، انڈے، کباب، نان مختلف قسم کے پھل اور خدا جانے کیا کیا۔ ان خالی جہازوں کے ذریعے سے دہلی پہنچتا تھا۔ بلوچ رجمنٹ کے سپاہی کھانے کے اس سامان کو ٹرکوں میں بھر کر پرانے قلعے لاتے تھے۔ اس کو تقسیم کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کیونکہ لوگ اتنے بھوکے تھے کہ ٹرک [illegible] قلعے کے اندر داخل ہوتے ہی اس کو لوٹ لیتے تھے اور جس کو جو مل جاتا تھا اس کو منہ میں رکھ لیتا تھا۔ نفسا نفسی کی کیفیت تھی۔ بھوک بھی انسان کا کیا حال کر دیتی ہے!

اس کھانے میں سے ایک شامی کباب میرے حصے میں بھی آیا تھا۔ کسی نے لوٹ کر مجھے دے دیا تھا۔ کئی دن کے فاقے کے بعد وہ کباب کھانے کو ملا اور اس سے جو لذت نصیب ہوئی اس کو الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ پیٹ تو خیر اس سے کیا بھرتا اور بھوک تو کیا ختم ہوتی، لیکن اس کو کھا کر لطف بہت آیا کیونکہ اس حشر کے میدان میں شامی کباب کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا اور پھر وہ کراچی سے بھیجا گیا تھا۔ اس میں پاکستانی جذبے اور محبت کی لذت بھی تھی جس کو میں نے اس وقت نہایت شدت سے محسوس کیا۔

پرانے قلعے میں کئی دن تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ بی او اے سی کے خالی جہازوں میں کراچی سے کھانے کا سامان بھر بھر کر آتا تھا اور بلوچ رجمنٹ کے ان ٹرکوں کو قلعے کے اندر داخل ہوتے ہی لوٹ لیتے تھے۔ کئی کئی دن کے بھوکے لوگ اور پیٹ میں بھوک کی جو آگ بھڑک رہی تھی اس کو اس طرح بجھانے کی کوشش کرتے تھے لیکن بے شمار لوگ اس کھانے سے محروم رہے۔ خاص طور پر بوڑھے، عورتیں اور بچے اس لیے کہ وہ سامان سے بھرے ہوئے ٹرکوں تک رسائی حاصل نہیں کر سکتے تھے کیونکہ راستے میں

یک جم غفیر ہوتا تھا جو ڑکوں پر بدبوں دیتا تھا۔ نفسا نفسی کی کیفیت تھی

افسوس اس بات پر ہوا کہ کھانے کے سامان کو لوٹنے والے اس کو کبھی کبھی بیچنا بھی شروع کر دیتے تھے۔ میرے کانوں میں ایک دو دفعہ یہ آواز آئی۔ "دو روپے کی ڈبل روٹی صاحب دو روپے کی ڈبل روٹی"۔ بعض لوگ جن کے ہاتھ زیادہ ڈبل روٹیاں آجاتی تھیں وہ ان کو آواز لگا کر دو دو تین تین روپے میں بیچ دیتے تھے۔ ہم لوگوں کو اس بات پر غصہ بھی آتا تھا لیکن کچھ کر نہیں سکتے تھے کیونکہ ہر طرف ایک افراتفری اور انتشار کا عالم تھا۔ تمام اصول، تمام قاعدے قانون اور تمام اخلاقی ضوابط اس سیلاب بلا میں خس و خاشاک کی طرح بہہ گئے تھے۔

پرانے قلعے میں آئے ہم لوگوں کو تیسرا چوتھا دن تھا۔ قلعے میں تو پہلے ہی تل دھرنے کی جگہ نہیں تھی، اب باہر سڑک پر بھی مسلمانوں کے خاندان آکر بسیرا کرنے لگے۔ شہر میں تو قیامت بپا تھی اس لیے ہندوؤں کے حملوں سے گھبرا کر اور پریشان ہو کر مسلمان مع اپنے اہل و عیال کے پرانے قلعے کی طرف بھاگتے تھے اور قلعے کے اندر جانے کا موقع نہیں ملتا تھا تو باہر سڑک پر اپنے لیے جگہ بنا لیتے تھے۔ عورتوں کو دیکھا جو ان کے پاس بہترین کپڑے تھے وہ انھوں نے پہن لیے تھے۔ اس خیال سے کہ اس ہنگامے میں ان کا ضائع ہونا تو یقینی ہے۔ ان اچھے کپڑوں میں ملبوس ہزاروں کی تعداد میں خواتین پرانے قلعے کے سامنے والی سڑک متھرا روڈ پر ایک عالم کس مپرسی میں پڑی ہوئی تھیں۔ ان میں سے بیشتر پردہ نشین تھیں۔ کیونکہ اس زمانے میں دلّی کے مسلمانوں میں پردے کا رواج بہت تھا۔ عورتیں گھروں سے باہر کم نکلتی تھیں۔ اور جو نکلتی تھیں ان کے سروں پر برقع ضرور ہوتا تھا لیکن اس آشوبِ قیامت میں اب پردہ تار تار ہو گیا تھا۔ برقع کا نام و نشان باقی نہیں رہا تھا۔ جن خواتین کو کوئی تصور میں بھی نہیں دیکھ سکتا تھا وہ اب پرانے قلعے کے سامنے سڑک پر پڑی ہوئی تھیں۔ زمین ان کا بستر تھی اور آسمان ان کا شامیانہ تھا ؏

تفو بر تو اے چرخِ گرداں تفو

پرانے قلعے کی طرف مسلمان اس لیے بھاگ رہے تھے کہ وہ ان کے خیال میں ایک محفوظ جگہ تھی کیونکہ وہاں "مرگِ انبوہ جشنے دارد" کے مصداق تمام لوگ ایک ہی حال میں تھے۔ پھر یہاں کم از کم

بلوچ رجمنٹ کا پہرہ تھا جو پاکستان کی فوج تھی اور جس کے جانباز سپاہی قلعے پر حملے کو روک سکتے تھے۔ پھر ایک بات یہ بھی تھی کہ دلّی کے یہ مسلمان اب پاکستان جانے کے شوق اور اشتیاق میں بھی یہاں آ رہے تھے۔ انھوں نے یہ سن رکھا تھا کہ پرانے قلعے کے قریب حضرت نظام الدین اولیاؒ سے ریلیں چلیں گی جو مسلمانوں کو پاکستان لے جائیں گی۔ سب کے سب پاکستان جانے کے لیے بے چین تھے کوئی اور راستہ پاکستان جانے کا نہیں تھا۔ ریلوے اسٹیشن پر مسلمان قتل کیے جا رہے تھے۔ ہوائی اڈے پر بھی یہی کیفیت تھی۔ اس لیے ایسے مسلمان بھی جو اپنے محلوں میں کسی حد تک محفوظ تھے وہ بھی گھروں کو چھوڑ کر باہر نکل آئے اور پرانے قلعے میں آ کر سڑک پر پڑ گئے۔ لیکن ابھی تو لوگ جمع ہو رہے تھے۔ کسی کو معلوم نہیں تھا کہ پاکستان کے لیے ریلیں کب چلیں گی اور چلیں گی بھی یا نہیں، اور چلیں گی تو یہ منزل پر پہنچیں گی بھی یا نہیں!

ہم لوگوں کا خیال تھا کہ پرانے قلعے پر حملہ ضرور ہوگا اور بلوچ رجمنٹ کے پہرے کے باوجود مسلمان یہاں بھی قتل کیے جائیں گے۔ چنانچہ دو تین دفعہ رات کو حملہ کرنے کی کوشش کی گئی پیچھے کی طرف مجمع اکٹھا ہوا لیکن کسی طرح یہ خبر مل گئی کہ بلوچ رجمنٹ کے مسلح سپاہی قلعے کے کیمپ کی حفاظت کر رہے ہیں اس لیے یہ لوگ حملہ کرنے سے باز رہے۔ قلعے میں پناہ لینے والوں پر ڈر اور خوف بہرحال طاری رہا۔

۱۰ یا ۱۱ ستمبر کو قلعے میں دہلی پولیس کے مسلمان سپاہیوں کا ایک دستہ بھی آ گیا۔ اس کے سپاہی خاصے گھبرائے ہوئے اور پریشان تھے۔ رائفل تو وہ اپنے ساتھ لے آئے تھے لیکن ان میں کارتوس نہیں تھے۔ ان لوگوں پر ان کے ہندو ساتھیوں نے حملہ کر دیا تھا۔ خاصی دیر تک گولیاں چلتی رہی تھیں لیکن بالآخر مسلمان سپاہیوں کے پاس کارتوس ختم ہو گئے تھے اس لیے انھیں بھاگنا پڑا اور وہ قلعے میں پناہ لینے کے لیے مجبور ہو گئے۔ ان سپاہیوں نے ہمیں بتایا کہ دہلی پولیس کے مسلمان اور ہندو سپاہیوں میں کبھی کوئی اختلاف نہیں ہوا سب اچھے دوستوں کی طرح رہتے تھے اور مل جل کر کام کرتے تھے لیکن پھر نہ جانے کیا ہوا کہ ہندو سپاہیوں میں نفرت کی آگ بھڑک اٹھی اور وہی ساتھی

جو ایک ساتھ رہتے اور کام کرتے تھے وہ ایک دوسرے پر گولیاں چلانے لگے۔ مقابلہ ہوا، کچھ لوگ مارے بھی گئے، مسلمانوں کے پاس کارتوس نہیں تھے اس لیے ہمیں مجبوراً قلعے کی طرف آنا پڑا۔

اب قلعے میں اور اس کے آس پاس دلی کا تقریباً پورا شہر سما گیا تھا۔ ہر قسم کے لوگ اس میں تھے۔ حکومتِ پاکستان کے ملازمین جنھوں نے پاکستان جانے اور حکومتِ پاکستان کے لیے کام کرنے پر رضامندی ظاہر کی تھی۔ پروفیسر، طالب علم، تاجر، صنعت کار، ملازم پیشہ لوگ، دلی کے رئیس اور مسافر جو دلی آئے تھے لیکن پھر وہاں سے باہر نہ نکل سکے۔ غرض چند روز میں اس پرانے قلعے کے اندر ایک دنیا آباد ہو گئی تھی لیکن یہ سب لوگ پریشان حال تھے اپنے مستقبل سے بے خبر بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ اپنی موت کے منتظر۔ عجیب و غریب منظر تھا جس کو دیکھ کر کلیجہ منہ کو آتا تھا۔

میں اب زیادہ وقت قلعے کے صدر دروازے کے پاس کھڑے ہو کر گزارتا تھا اس لیے کہ جو لوگ شہر سے قلعے میں آتے تھے ان سے باتیں کرنے کا موقع مل جاتا تھا اور اس طرح شہر کی حالت زار کی کچھ خبریں مل جاتی تھیں۔ جو شخص بھی آتا تھا تباہی اور بربادی کی تفصیل سناتا تھا۔ اخبار چھپتے تھے لیکن ان میں دلی کے قتل عام کی کوئی خبر نہیں ہوتی تھی صرف ایک کالم میں دو ایک سطروں کی یہ خبر ہوتی تھی کہ فلاں جگہ معمولی سا فساد ہوا لیکن پولیس پہنچ گئی اور اس نے فساد پر قابو پا لیا حالانکہ جو لوگ لٹ پٹ کر آئے تھے، ان کی باتوں سے تو یہ پتہ چلتا تھا کہ سارا دلی شہر تباہ ہو گیا ہے۔ دن رات مسلمانوں کے محلوں پر حملے رہتے ہیں، گولیاں چلتی ہیں، خون بہتا ہے، لوگ مارے جاتے ہیں، گھروں کو چھوڑ کر جو مسلمان بھاگ گئے ہیں، ان کے مکانوں پر قبضہ کر لیا جاتا ہے۔ آر ایس ایس کے لوگ فوجی وردیاں پہنے ہوئے پولیس اور فوج کے ساتھ مل کر فساد برپا کرتے ہیں۔ مسلمانوں کے بڑے بڑے دفتروں اور اداروں کو آگ لگا دی جاتی ہے۔ ایک صاحب نے بتایا کہ مسلم لیگ کے اخبار "ڈان" کے دفتر کو ان کے سامنے کانگریس کی اہم شخصیت کی موجودگی میں ان کے حکم سے آگ لگائی گئی۔

"قرول باغ سے آئے ہوئے ایک صاحب نے بتایا کہ کس طرح مشہور عالم دین اور سینٹ اسٹیفنز کالج کے پروفیسر مولانا سعید احمد اکبر آبادی کے نہایت قیمتی کتب خانے کو جلایا گیا، کس طرح

وہ چھتوں چھتوں بھاگے؟ اور سب کچھ چھوڑ کر کسی طرح جامع مسجد پہنچے اور ندوۃ المصنفین کے دفتر میں پناہ لی اور یہ کہ انھوں نے ڈر اور خوف سے داڑھی منڈوا دی ہے تاکہ یہ نہ معلوم ہو کہ مسلمان ہیں۔

ایک دن ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب قلعے میں مسلمانوں کی حالت زار دیکھنے آئے۔ انھوں نے بتایا کہ جامعہ ملیہ پر بھی حملہ ہوا، دریائے جمنا کی طرف ہزارہا آدمیوں کا مجمع رات کی تاریکی میں مشعلیں اٹھائے جامعہ کی طرف دور سے آتا ہوا نظر آیا۔ یہ منظر دیکھ کر میرے اندر بھی گھبراہٹ پیدا ہوئی اور مجھے یقین ہو گیا کہ آخری وقت آ گیا ہے، بچنے کی کوئی صورت نہیں۔ مجھے یقین ہو گیا کہ جامعہ میں جتنے لوگ بھی ہیں وہ قتل کر دیے جائیں گے اور جامعہ کی عمارتوں کو تباہ کر دیا جائے گا۔ میں نے مجمع کی بہت بڑی تعداد دیکھ کر پنڈت جواہر لال کو فون کیا اور ان سے کہا کہ آخری وقت آگیا ہے، جاٹوں کا مجمع خاصا بپھرا ہوا ہے، آپ یہاں آنے کی کوشش نہ کیجیے، خطرہ سنگین ہے۔ میں نے سوچا آپ کو بتا دوں اور خدا حافظ بھی کہہ دوں۔ میری یہ بات سن کر انھوں نے فون بند کیا اور تھوڑی دیر میں دیکھا کہ ان کی کار جامعہ میں داخل ہوئی۔ جلدی سے کار سے باہر آئے اور کہنے لگے کہ "میں مجمع کی طرف جاؤں گا اور ان کے سامنے تقریر کروں گا۔ وہ یقیناً مجھے دیکھ کر اور میری تقریر سن کر اپنے ناپاک ارادوں سے باز آجائیں گے۔

میں نے بہت منع کیا، وہ نہیں مانے اور مجمع کی طرف چل دیے۔ ہم لوگ بھی ان کے ساتھ ہو لیے۔ جامعہ پر حملہ کرنے والے مسلح مجمع کے ہاتھوں میں مشعلیں تھیں اور وہ دریائے جمنا کی طرف سے نعرے لگاتا ہوا جامعہ کی جانب بڑھ رہا تھا۔ اس میں بیشتر جاٹ تھے۔ جواہر لال اس مجمع کی طرف بڑھنے لگے۔ مشعلوں کی روشنی میں ان کے خاص لباس اور مخصوص انداز کی وجہ سے مجمع میں سے بعض لوگوں نے انھیں پہچان لیا اور بہ آواز بلند کہا:

"پنڈت جی آ رہے ہیں، پنڈت جی آ رہے ہیں۔"

یہ آوازیں سن کر مجمع رک گیا۔ پنڈت جواہر لال ان کے قریب پہنچے اور اپنے مخصوص انداز میں انھوں نے نہایت متاثر کرنے والی تقریر کی جس میں بہت سی باتیں تھیں لیکن بنیادی خیال یہ تھا کہ تم لوگ مسلح ہو کر ایسے لوگوں پر حملہ کرنے جا رہے ہو جو آزادی کی لڑائی میں ہمیشہ ہمارے ساتھ رہے

ہیں، اور جنھوں نے صحیح معنوں میں ہم لوگوں کو انسان بنایا ہے، انسانیت اور محبت کا درس دیا ہے۔

پنڈت جواہر لال کی یہ تقریر سن کر مجمع منتشر ہو گیا، اور ہم لوگ بھی جامعہ میں واپس آ گئے۔

پنڈت جواہر لال نے بڑی ہمت کی ورنہ ہم لوگوں میں سے ایک شخص بھی زندہ نہ بچتا۔

یہ باتیں کر کے، اور قلعے کی حالت زار کو دیکھ کر ڈاکٹر صاحب رخصت ہوئے!

ایک اور صاحب نے قلعے میں آ کر یہ اطلاع دی کہ کئی بار مولانا ابوالکلام آزاد اور رفیع احمد قدوائی صاحب کے مکانوں پر بھی حملہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے لیکن مسلح گارڈ نے اس کو ناکام بنا دیا۔

غرض اس طرح کی بے شمار خبریں سننے میں آنے لگیں جن کی وجہ سے میرے اعصاب تو جواب دے گئے۔ ان حالات میں دلّی سے باہر نکلنے کا کوئی راستہ نہیں تھا اس لیے کہ ریلیں دلّی کے سٹیشن پر لاشوں سے بھری ہوئی آتی تھیں، اور جانے والے مسلمانوں کو چن چن کر قتل کر دیا جاتا تھا۔ ہوائی اڈے کی کیفیت بھی ایک مقتل کی سی تھی۔ تمام راستے مسدود تھے۔ میرے گھر والے سب لکھنؤ میں تھے اور ظاہر ہے کہ پریشان تھے۔ مجھے لکھنؤ جا کر انھیں بھی تسلی دینی تھی اور آئندہ کا پروگرام بنانا تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کیا جائے۔

انھیں خیالات میں گم میں ۱۵ ستمبر ۱۹۴۷ء کی ایک صبح کو فجر کے وقت قلعے کے دروازے پر کھڑا ہوا تھا کہ ایک فوجی ٹرک آ کر رکا۔ اس کو ہمارے دوست مقبول الٰہی درویش چلا رہے تھے۔ مقبول الٰہی لائل پور کے رہنے والے تھے اور نیوی کے افسر تھے۔ ٹرک روک کر میرے پاس آئے، کہنے لگے "میں شب و روز مسلمانوں کو گھروں سے نکالنے کا کام کر رہا ہوں۔ یہ ٹرک میرے پاس ہے، بس اس کو مسلمانوں کو بچانے اور یہاں تک پہنچانے کے لیے استعمال کر رہا ہوں۔ وردی پہن کر خود چلاتا ہوں تاکہ کسی کو شبہ نہ ہو۔ شہر کا حال خراب ہے، مسلمان بری طرح قتل کیے جا رہے ہیں، اور تو کچھ کر نہیں سکتا، آپ کو کسی جگہ جانا ہو تو بتلائیے میں آپ کو پہنچا دوں گا۔"

میں پرانے قلعے میں کوئی آٹھ دس دن رہ کر اور تباہی اور بربادی کے مناظر دیکھ کر پریشان ہو گیا تھا اور یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میرے اعصاب جواب دے گئے ہیں اور نروس بریک ڈاؤن ہو گیا ہے

اس لیے میں نے مقبول الٰہی سے کہا کہ:

"مجھے گل رعنا میں زاہد حسن صاحب کے ہاں پہنچا دو۔ وہاں چشتی صاحب ابھی تک ٹھہرے ہوئے ہیں، ان سے باتیں کروں گا، تھوڑا سا وقت اچھا گزر جائے گا۔ قلعے کے دل دوز مناظر دیکھنے سے نجات ملے گی، کسی حد تک تازہ دم ہو جاؤں گا، پھر دو ایک دن وہاں گزار کر واپس آ جاؤں گا اور قلعے میں سب کے ساتھ مل کر کام کروں گا۔"

میرے جسم پر اس وقت ایک میلی قمیص اور پتلون تھی۔ پاؤں میں جوتے بھی نہیں تھے۔ اس حالت میں مقبول الٰہی نے مجھے ٹرک میں بٹھا لیا اور چند منٹ میں پاکستان ہائی کمیشن میں زاہد حسن صاحب کے ہاں "گل رعنا" پہنچا دیا۔

وہاں چشتی صاحب ملے کہنے لگے "میں ابھی تک یہیں ہوں۔ زاہد حسن صاحب کی مہربانی ہے کہ انھوں نے مجھے ابھی تک نکالا نہیں ورنہ ہم لوگ بھی نوزائیدہ بچے کے ساتھ قلعے میں ہوتے۔ اچھا ہوا تم آ گئے۔ میں تنہائی محسوس کر رہا تھا۔ اب تم سے باتیں کروں گا اور اپنے ہندو سکھ دوستوں کو فون کر کے کھانے پینے کی چیزیں منگواؤں گا۔ مرنا تو ہے ہی لیکن ہمیں اپنا پیٹ بھر کر مرنا چاہیے۔"

غرض چشتی صاحب نے مجھے بڑا سہارا دیا، میرا دل بڑھایا، مجھے تسلی دی۔ واقعی جگہ جگہ فون کر کے کھانے پینے کی چیزیں منگوئیں۔ دن بھر مجھے کھلاتے رہے۔ میں قلعے میں کوئی آٹھ دس روز تقریباً فاقے سے رہا تھا۔ صرف استاد سبطی کے ابالے ہوئے راشن کے گیہوں پیٹ میں گئے تھے اس لیے "گل رعنا" میں چشتی صاحب کے پاس آ کر مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں موت کے منہ سے نکل کر پھر دنیا میں آ گیا ہوں۔ دن ہم نے باتوں میں گزارا۔ رات کو زاہد حسن صاحب کی طرف سے ایک ایک روٹی اور ذرا سی دال ملی تھی کیونکہ گوشت تو شہر میں ملتا ہی نہیں تھا۔ دال کے ساتھ ایک ایک چپاتی کھا کر ہم لوگ بیٹھے باتیں کر رہے تھے کہ گیارہ بجے کے قریب ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ چشتی صاحب نے فون اٹھایا۔

یہ رفیع احمد قدوائی صاحب کا فون تھا جو رات کے وقت اپنے گھر سے فون کر رہے تھے۔ رفیع صاحب حکومت ہند کے وزیر مواصلات تھے۔ چشتی صاحب سے انھوں نے فون پر کہا:

"میں رفیع احمد قدوائی بول رہا ہوں۔ میں نے ایک جہاز لکھنؤ کے لیے چارٹر کیا ہے تاکہ جو مسلمان اُدھر جانے والے ہوں وہ اس جہاز سے چلے جائیں۔ اگر ہائی کمیشن یا قلعے میں ایسے لوگ ہوں تو اُن کے نام بتائیے۔"

چشتی صاحب نے کہا "میرے پاس عبادت صاحب بیٹھے ہیں۔ وہ لکھنؤ جانا چاہتے ہیں۔"

میں نے فون لیا۔ رفیع صاحب کہنے لگے "آپ کہاں ہیں۔ میں آپ کو دو ہفتے سے تلاش کر رہا ہوں کہیں پتہ نہیں چلا۔ لکھنؤ سے آپ کے گھر سے کوئی سو فون آئے۔ میں نے انھیں اطمینان دلا دیا کہ وہ جامعہ ملیہ میں ہیں اور محفوظ ہیں۔ مقصد صرف یہ تھا کہ وہ پریشان نہ ہوں۔"

میں نے کہا "میں عربک کالج کے استادوں اور لڑکوں کے ساتھ یہاں زاہد حسین صاحب کے ہاں آیا۔ پھر پرانے قلعے میں گیا۔ آج پھر یہاں آیا ہوں۔"

رفیع صاحب کہنے لگے "آپ کل لکھنؤ چلے جائیے۔ میں نے لکھنؤ کے لیے ایک جہاز چارٹر کیا ہے۔ میں اپنے سکریٹری جے زائن کو صبح منہ اندھیرے بھیجوں گا۔ آپ تیار رہیئے گا۔ وہ میری گاڑی میں آپ کو یہاں میرے گھر لائیں گے۔ یہاں سے آپ ایئر پورٹ جائیں گے۔ ایک گھنٹے میں آپ لکھنؤ پہنچ جائیں گے۔"

میں نے کہا "میں تیار رہوں گا۔ اور یہیں پاکستان ہائی کمشن میں جے زائن کا انتظار کروں گا۔"

صبح ہوئی، پو پھٹی۔ ابھی اندھیرا خاصا تھا کہ گل رعنا میں رفیع صاحب کی سفید رنگ کی کار داخل ہوئی۔ جے زائن صاحب ڈرائیور کے پاس بیٹھے ہوئے نظر آئے۔ ان کے ساتھ دو مسلح سپاہی بھی تھے۔ کار سے اتر کر کہنے لگے "چلیے۔"

میں نے کہا "میں پہلے پرانے قلعے جاؤں گا۔ میرا اٹیچی کیس وہاں پڑا ہے۔ اپنے ساتھیوں سے ملوں گا انھیں رفیع صاحب کے فون کی روداد سناؤں گا۔ خدا حافظ کہوں گا۔ کپڑے بدلوں گا، پھر رفیع صاحب کے ہاں آپ کے ساتھ چلوں گا۔"

اُنھوں نے مجھے کار میں بٹھالیا اور کار پرانے قلعے کی طرف چل دی۔

چند منٹ میں ہم پرانے قلعے پہنچے۔ میں اندر گیا۔ ڈاکٹر فاروق صاحب فجر کی نماز پڑھ رہے تھے۔

میں نے انھیں رفیع صاحب کے فون کی روداد سنائی۔ وہ کہنے لگے، جو کچھ ہوا ہے وہ ایک معجزے سے کم نہیں۔ اس وقت دلی سے نکلنا مشکل ہے۔ ہر طرف قتلِ عام ہو رہا ہے۔ آپ آج ہی لکھنؤ پہنچ جائیں گے۔ یہ بڑی خوش قسمتی کی بات ہے۔ ہم لوگ یہاں سے نہیں نکل سکتے۔ فی الحال کوئی صورت نہیں۔

میں نے اپنا اٹیچی کیس لیا، شیروانی اور پاجامہ پہنا اور اپنے ساتھیوں کو خدا حافظ کہہ کر پرانے قلعے کے اس جہنم سے باہر نکلا۔ جے نرائن نے کار سے باہر نکل کر مجھے کار میں بٹھایا، اٹیچی کیس پیچھے ڈگی میں رکھوایا اور کار رفیع صاحب کے گھر کی طرف چل دی۔

ہم لوگ رفیع صاحب کی کوٹھی میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ وہ لان میں ٹہل رہے ہیں اور کچھ سوچ رہے ہیں کہ سوچنا ان کی شخصیت کی سب سے اہم خصوصیت تھی۔

مجھے دیکھ کر کہنے لگے ”آپ کا فون پر ملنا ایک معجزے سے کسی طرح کم نہیں۔ میں نے کئی جگہ فون کیے کہ لکھنؤ کی طرف جانے والے لوگ مل جائیں جو حفاظت سے اپنے گھروں کو پہنچ جائیں۔ دلی کی حالت بگڑتی جا رہی ہے، قابو سے باہر ہوتی جا رہی ہے۔ فساد کو روکنے والے جب خود فساد کرنے پر اتر آئیں تو کوئی کیا کرتا ہے۔ اس وقت یہی صورت حال ہے۔ حکومت پریشان ہے۔ وزیر اعظم تک خطرے میں ہیں۔ میں نے کیبنٹ میں یہ تجویز پیش کی ہے کہ مدراس رجمنٹ کو بلایئے اور اینگلو عربک کالج کو ان کا ہیڈ کوارٹر بنا دیجیے۔ ان میں تعصب نہیں ہے۔ شاید وہ حالات کو سنبھال لیں۔ اس طرح اینگلو عربک کالج بھی بچ جائے گا اور دلی کی فضا بھی کچھ بہتر ہو جائے گی۔ بس یہ آخری حربہ ہے۔ بہرحال آپ تو لکھنؤ سدھاریے، وہاں امن ہے۔“

رفیع صاحب بولتے کم تھے۔ آج پہلی دفعہ انھوں نے مجھ سے اتنی تفصیل سے باتیں کیں پھر کہا ”چائے تیار ہے۔ آپ چائے پی لیجیے، کچھ کھا بھی لیجیے۔ جہاز دیر سے چلتے ہیں۔ ایئرپورٹ پر حالات اچھے نہیں ہیں۔ ہو سکتا ہے کئی گھنٹے آپ کو وہاں ٹھہرنا پڑے۔“

جے نرائن مجھے اندر لے گئے، چائے پلائی، ناشتہ کرایا اور پھر ایئرپورٹ جانے کے لیے باہر نکلے۔ رفیع صاحب نے مجھے رخصت کیا اور کہا:

خدا آپ کو خیریت سے لکھنؤ پہنچائے۔ لکھنؤ جا کر مجھے فون کر دیجیے گا تاکہ اطمینان ہو جائے۔ حسین کامل لکھنؤ ہی میں ہیں، ان سے بھی مل لیجیے گا، وہ بھی آپ کی وجہ سے متفکر ہیں۔ آپ کی خیریت انھیں ملنا چاہیے۔“

اب ہم کار میں بیٹھ گئے۔ کار میں ڈرائیور کے ساتھ جے زائی بیٹھے۔ پیچھے کی سیٹ پر دو مسلح فوجی سپاہیوں کے درمیان مجھے بٹھایا گیا۔ یہ غالباً مدراس رجمنٹ کے سپاہی تھے۔

کار اسٹارٹ ہوئی تو رفیع صاحب نے جے زائی سے کہا کہ؛

”جب تک جہاز اُڑ نہ جائے اُس وقت تک آپ ان کے ساتھ رہیئے اور خود جہاز میں جا کر انھیں بٹھایئے گا۔ جب جہاز اُڑ جائے تب آپ واپس آیئے گا۔“

اس طرح رفیع صاحب نے مجھے رخصت کیا۔

یہ ۱۶؍ستمبر ۱۹۴۷ء کی ایک صبح تھی۔ آسمان پر گہرے سیاہ بادل چھائے ہوئے تھے۔ ہر طرف ایک عجیب طرح کی اُداسی تھی۔ ہر چیز میں مجھے غمگینی کا احساس ہو رہا تھا۔ ساری فضا سوگوار نظر آ رہی تھی اور یہ سب کچھ دلی کی تباہی اور بربادی کی وجہ سے تھا۔ اس فضا میں ہم لوگ پالم کے ہوائی اڈے کی طرف رواں دواں تھے۔ کار کے اندر خاموشی تھی۔ مسلح سپاہی بھی خاموش تھے، کار کا ڈرائیور بھی خاموش تھا، جے زائی بھی خاموش تھے۔ مجھے بھی چپ لگ گئی تھی۔ اس عالم میں ہم نے پالم کے ہوائی اڈے تک کا فاصلہ طے کیا اور بالآخر ہم لوگ کوئی آدھے گھنٹے کے بعد ہوائی اڈے پہنچ گئے۔

ہوائی اڈے کے اندر داخل ہوئے تو ہر طرف سکھ ہی سکھ نظر آئے۔ کرپانیں اور تلواریں لگائے ہوئے اِدھر اُدھر گھوم رہے تھے۔ مسلمان دور دور تک نظر نہیں آیا۔ نظر آتا بھی کیسے؟ اس کو تو دیکھتے ہی قتل کر دیا جاتا تھا۔ مجمع بہت تھا۔ ہوائی اڈے کی عمارت ہندوؤں اور سکھوں سے کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔ میں نے شیروانی اور پاجامے کے ساتھ اودے کی کشتی نما ٹوپی بھی پہن لی تھی۔ اس کو شاید سکھوں نے گاندھی ٹوپی سمجھ لیا۔ رفیع صاحب کے سکریٹری بھی کھدر کے کپڑوں میں ملبوس تھے۔ یہ لوگ سمجھے کہ ضرور کوئی کانگریس کا بڑا لیڈر کہیں جا رہا ہے۔

ہوائی اڈے کی عمارت میں داخل ہو کر ہم لوگ لاؤنج میں بیٹھ گئے۔ مسلح فوجی سپاہی ہمارے ساتھ رہے۔ جے نرائن نے انکوائری سے پوچھا تو معلوم ہوا کہ لکھنؤ کا جہاز جس کو خاص طور سے چارٹر کیا گیا ہے۔ کم از کم تین گھنٹے کی تاخیر سے چلے گا۔ یہ سن کر میں نے دل میں کہا، یا اللہ! تین گھنٹے اب کیسے گزریں گے۔ اس عرصے میں کسی سکھ کی تلوار کا وار یا پستول کی گولی ہمارا کام تمام نہ کر دے۔ میں بیٹھا ہوا جے نرائن سے زیادہ گھل مل کر باتیں کرنے لگا تاکہ لوگوں کو یہ احساس ہو کہ ہم پر کسی قسم کا خوف طاری نہیں ہے اور ہم نارمل حالات میں سفر کر رہے ہیں۔

چند منٹ بعد ایک صاحب کھدر کے کپڑوں میں ملبوس آ گئے۔ سر پر گاندھی ٹوپی، تنگ پاجامہ، کرتا اور جواہر کٹ بنڈی پہنے ہوئے۔ جے نرائن نے ان کا استقبال کیا، میرا تعارف کرایا اور ہم تینوں وقت گزارنے کے لیے باتیں کرنے لگے۔

یہ صاحب سری پرکاش تھے جو پاکستان میں ہندوستان کے ہائی کمشنر مقرر ہوئے تھے اور کراچی جانے کے لیے آئے تھے۔ ان کا جہاز بھی تین گھنٹے کی تاخیر سے چلنے والا تھا، اس لیے وہ ہمارے ساتھ تین گھنٹے باتیں کرتے رہے۔ مجھے باتوں سے نیک اور شریف آدمی معلوم ہوئے۔ میں نے ان کا نام سنا تھا، ملاقات کبھی نہیں ہوئی تھی۔ بنارس کے رہنے والے تھے اردو فارسی کے عالم تھے اور فصیح اردو میں باتیں کرتے تھے۔ موضوع دلی کا فساد تھا۔ افسوس کا اظہار کرتے رہے۔ اس خدشے کا اظہار بھی کیا کہ اس کے اثرات کراچی اور سندھ کے دوسرے شہروں میں بھی ہو سکتے ہیں اگر ایسا ہوا تو پنجاب کا سا حال سندھ کا بھی ہوگا۔

میں چپ چاپ ان کی باتیں سنتا رہا اور ایک لفظ نہیں بولا کیونکہ اسی میں مجھے عافیت نظر آئی کہ میں نے دلی کے فساد کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ سارا شہر میرے سامنے اجڑا تھا۔ پرانے قلعے میں دلی کے مسلمانوں کی حالت زار آٹھ دس دن تک میری آنکھوں کے سامنے رہی تھی۔ جی چاہتا تھا اس کی تفصیل سری پرکاش صاحب کو سناؤں لیکن میں نے خاموش رہنا ہی مناسب سمجھا۔ ویسے سری پرکاش صاحب کی باتیں فکر انگیز تھیں، اس لیے کہ اس میں انسانیت اور

انسان دوستی کا جذبہ تھا۔

ان باتوں میں تین گھنٹے گزر گئے۔ پہلے کراچی جانے والے جہاز کی پرواز کا اعلان ہوا۔ سری پرکاش صاحب ہم سے گلے مل کر رخصت ہوئے اور جا کر کراچی کے جہاز میں بیٹھ گئے۔ اُن کا جہاز اڑ گیا تو لکھنؤ جانے والے جہاز کی پرواز کا اعلان ہوا۔ جے نرائن مجھے اس جہاز میں لے گئے۔ مجھے اس میں اطمینان سے بٹھایا اور جب تک جہاز نہیں اڑا، میرے پاس بیٹھے رہے۔ رفیع صاحب کی ہدایات پر انھوں نے پوری طرح عمل کیا اور پھر جب جہاز کے اُڑنے کا اعلان ہوا تو جے نرائن نے مجھے خدا حافظ کہا اور چلے گئے۔ اس جہاز میں مسافر کم تھے، اس لیے کہ ہوائی اڈے تک مسلمانوں کا پہنچنا مشکل تھی۔

کوئی ڈھائی گھنٹے کی پرواز کے بعد یہ جہاز اموسی کے ہوائی اڈے پر اترا۔ یہاں حالات نارمل تھے۔ ہندو مسلمان سب اطمینان سے ادھر اُدھر آزادی کے ساتھ بغیر کسی خوف اور خطرے کے گھوم پھر رہے تھے۔ میں نے یہ منظر دیکھ کر اطمینان کا سانس لیا، لیکن خدا جانے کیوں میری آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ ایئر لائن کی بس ہمیں اموسی کے ہوائی اڈے سے اپنے دفتر حضرت گنج لے گئی۔ میں وہاں اترا، تانگہ کیا اور اپنے گھر ڈیوڑھی آغا میر آیا۔

راستے بھر میرے آنسو نہیں رُکے۔ روتا ہوا میں گھر کے اندر داخل ہوا۔ میرے والد صاحب اور والدہ اور بھائی بہنوں نے مجھے گلے لگایا، پیار کیا اور مجھے روتا دیکھ کر وہ سب بھی دیر تک روتے رہے۔ آنسوؤں کا ایک سیلاب تھا جو کسی طرح رُکتا ہی نہیں تھا۔ ظاہر ہے کہ میں موت کے منھ سے نکل کر آیا تھا۔ میرے گھر کے سب لوگ دلّی کے قتل عام کی خبریں سُن سُن کر سخت پریشان تھے۔ اگرچہ رفیع صاحب نے ان لوگوں کو فون پر یہ اطمینان دلا دیا تھا کہ میں محفوظ ہوں اور جامعہ ملّیہ میں ہوں لیکن اس کے باوجود میری والدہ کی آنکھیں رو رو کر سوجھ گئی تھیں۔ انھوں نے کھانا پینا تک چھوڑ رکھا تھا۔ مجھے دیکھ کر کہنے لگیں۔

"بیٹے! ماں کی مامتا ایسی ہوتی ہے کہ اس کو الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ بیٹا ماں سے الگ ہو جائے، دور چلا جائے اور پھر خطرے میں ہو تو ماں کو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے سینے میں کوئی ڈائی

چلا رہا ہے۔ پہلوٹھی کے بیٹے کی محبت ماں باپ کو کچھ زیادہ ہی ہوتی ہے۔"

میرے والد صاحب، بولتے کم تھے لیے دیئے رہتے تھے۔ ان کے مزاج میں نرمی بھی نہیں تھی۔ کوئی خاص جذباتی بھی نہیں تھے لیکن اس کے باوجود میں نے دیکھا کہ آن کی آنکھوں سے آنسو جاری ہیں۔

خدا نے مجھے صحیح سلامت گھر پہنچایا تو سب اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں سجدہ ریز ہوئے۔ سب نے شکرانے کے نفل پڑھے۔ بزرگان دین اور صوفیائے کرام کی نذر نیاز ہوئی۔ دیگیں پکیں غریبوں کو کھانا تقسیم کیا گیا۔ حضرت مخدوم شاہ مینا صاحبؒ کے مزار پر جا کر سب نے حاضری دی۔ میں بھی حاضری دینے، فاتحہ پڑھنے اور دعا مانگنے کے لیے حاضر ہوا۔ اور میرا تو مہینوں تک یہ معمول رہا کہ حضرت مخدوم شاہ مینا صاحبؒ کی درگاہ میں مغرب کے بعد روزانہ حاضری دیتا تھا۔ زار و قطار روتا تھا۔ اس سے مجھے بڑا سکون ملتا تھا اور روحانی مسرت نصیب ہوتی تھی۔

لکھنؤ میں یوں تو امن تھا۔ سارے ہندوستان میں فسادات ہو رہے تھے لیکن یہاں کے ہندو اور مسلمان جیسے لڑنا اور فسادات کرنا جانتے ہی نہیں تھے۔ تمام کام معمول کے مطابق چل رہے تھے۔ بازاروں میں رونق تھی۔ ہندو مسلمانوں میں کشیدگی کی فضا نام کو نہیں تھی لیکن یہ ضرور تھا کہ اندر ہی اندر در پردہ ہندوؤں کی نیم فوجی جماعتیں جن سنگھ اور راشٹریہ سیوک سنگھ فساد کی فضا پیدا کرنا چاہتی تھیں چنانچہ اس کا آغاز انھوں نے حضرت مخدوم شاہ مینا صاحبؒ کی درگاہ سے کرنا چاہا۔ ایک روز کہ جمعرات تھی درگاہ میں خاصا مجمع تھا۔ میں محفل سماع سے محظوظ ہو رہا تھا کہ کسی شرپسند نے درگاہ پر ایک بم پھینکا۔ میری آنکھوں کے سامنے وہ بم جلتا ہوا درگاہ کی پائنتی کی طرف آ کر گرا لیکن گرتے ہی بجائے پھٹنے کے میری آنکھوں کے سامنے بجھ گیا۔ مجمع میں شور ہوا۔ لوگ اِدھر اُدھر بھاگے۔ میں کھڑا رہا اور اس معجزے کو میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا حضرت مخدوم شاہ مینا صاحبؒ نے اسے بجھا دیا تھا۔ بم پھینکنے والے کا مقصد یہ تھا کہ بم پھٹے گا تو مزار کو نقصان پہنچے گا۔ مسلمان مشتعل ہو جائیں گے اور اس طرح فساد شروع ہو جائے گا۔ لیکن حضرت مخدوم شاہ میناؒ کی برکت اور فیض کی وجہ سے یہ منصوبہ ناکام ہو گیا۔ ہندوؤں تک نے کچھ لوگوں کے ان ناپاک ارادوں کی مذمت

کیونکہ یہ لوگ بھی حضرت شاہ مینا کے معتقد تھے اور بڑی محبت اور عقیدت سے درگاہ پر حاضری دیتے تھے۔ لکھنؤ کی فضا اس واقعے کے بعد کچھ اور بھی بہتر ہو گئی، حالانکہ سارے ہندوستان کے مختلف علاقوں سے فسادات کی خبریں آتی رہیں، لیکن لکھنؤ والوں پر کوئی اثر نہ ہوا۔

دلی سے لکھنؤ آنے کے بعد میرے آنسو ہفتوں تک نہیں رکے۔ بس ایک سیلاب تھا جو موجزن تھا۔ پرانے قلعے کے دل دوز مناظر ہر وقت آنکھوں کے سامنے رہتے تھے۔ دلی کی تباہی کا منظر ہر وقت حواس پر چھایا رہتا تھا۔ ہر وقت میں یہی سوچتا تھا کہ دلی مسلمانوں کا شہر تھا، مسلمانوں کی تہذیب و ثقافت کا شہر تھی۔ وہاں مسلمانوں کے پاس دولت تھی، وہ مضبوط تھے لیکن اس خون ریزی نے ان تمام چیزوں کا خاتمہ کر دیا۔ اور یہ کہ وہ اب کبھی اس صورت میں آباد نہیں ہو سکیں گے۔ چند روز میں مسلمانوں کی صدیوں کی آبادیاں جڑوں سے اکھڑ گئیں، اور اب وہاں کچھ باقی نہیں رہا۔ بس یہ احساس مجھے ایک لمحے کو بھی چین سے نہیں بیٹھنے دیتا تھا۔ اور میں اس بے چینی کے عالم میں بس آنسو بہا کر دل کے بوجھ کو ہلکا کرتا تھا۔ کھانے پینے تک کو میرا جی نہیں چاہتا تھا۔ میری والدہ قسم قسم کے مزیدار کھانے پکا کر دسترخوان پر میرے لیے چنتی تھیں لیکن ان کو شوق سے کھانا میرے نصیب میں نہیں تھا۔

وقت کے ساتھ ساتھ یہ کیفیت کچھ کم ہوئی۔ ملنے والوں کا جو تانتا بندھا رہا اس کا کچھ اچھا اثر ہوا۔ میرے اساتذہ مجھے دیکھنے اور مجھ سے ملنے آتے۔ میرے استادوں میں پروفیسر سید احتشام حسین صاحب ایک فرشتہ خصلت انسان تھے۔ انھوں نے بار بار آ کر مجھے سمجھایا اور تسلی دی۔ پھر پرانے دوستوں نے مجھے گھیرے رکھا۔ ان میں منان اللہ بیگ، رجب، خورشید علی جواد زیدی، حبیب الرحمٰن، باقر حسنین، کمال بیگ اور آغا حسن وغیرہ نے میرا دل بڑھایا۔ اور میرے عزیزوں اور رشتے داروں نے اپنی باتوں سے بڑی حد تک میرے غم کو غلط کیا۔ دانش محل کی محفلوں کا خاص طور پر بہت اچھا اثر ہوا اور اس طرح کئی مہینے بعد میری طبیعت کچھ بحال ہوئی۔

اس زمانے میں دلی کی کوئی خبر نہیں ملتی تھی۔ اخبارات یہی لکھتے تھے کہ حالات معمول پر ہیں لیکن ایسا نہیں تھا۔ گاندھی جی کے پرارتھنا کے جلسوں کی جو تفصیلات سننے میں آتی تھیں ان سے پتہ چلتا تھا

کہ دلی کا حال ٹھیک نہیں ہے۔ ان حالات کو درست کرنے کے لیے گاندھی جی برت رکھ رہے تھے۔ خبر ملی کہ وہ برت رکھنے کی تیاری کر رہے ہیں۔ یہ بھی سننے میں آیا کہ پرانے قلعے میں جو مسلمان آ گئے تھے، ان کو پاکستان لے جانے کے لیے نظام الدین اولیا کے ریلوے اسٹیشن سے گاڑیاں چلنے لگیں۔ کئی ٹرینوں پر مشرقی پنجاب میں حملے ہوئے۔ بہت سے راستے میں قتل ہوئے۔ ٹرینیں روک روک کر ان کو قتل کیا گیا۔ کچھ پہنچے کچھ نہ پہنچ سکے۔ بے شمار نوجوان لڑکیوں کو اغوا کر لیا گیا۔ ایک صاحب اپنی پانچ نوجوان لڑکیوں کو لے کر ٹرین میں پاکستان جانے کے لیے سوار ہوئے۔ راستے میں ٹرین روکی گئی۔ لڑکیاں اغوا کر لی گئیں، وہ کسی طرح دلی واپس پہنچے۔ پاگلوں کی طرح سڑکوں پر گھومتے تھے اور کہتے تھے میں سب کو پاکستان چھوڑ آیا ہوں۔ غرض اس طرح کے بے شمار دردناک واقعات سننے میں آئے تھے جن کو سن کر کلیجہ منہ کو آتا تھا۔ یہ خبریں ہر مسلمان کو پریشان کر رہی تھیں۔ ہر شخص کو تشویش تھی۔ ہر گھر میں سامان باندھا جا رہا تھا۔ مسلمان یہ محسوس کر رہے تھے کہ ضرور کوئی حشر برپا ہونے والا ہے اور کوئی قیامت آنے والی ہے اس لیے بہتر یہ ہے کہ قبل اس کے کہ یہ حشر برپا ہو اور یہ قیامت آئے پاکستان چلے جانا چاہیے۔ برتن اور کپڑے بک رہے تھے اور ان کو کوئی خریدنے والا نہیں تھا۔ میں لکھنؤ بریلی جس شہر میں بھی گیا، سامان بندھتے ہوئے دیکھا۔ ہر شخص پاکستان جانے کے لیے پابہ رکاب نظر آیا۔

فوجی اسپیشل سے کچھ اثر و رسوخ والے لوگ لاہور پہنچ گئے۔ بے شمار لوگ بمبئی تک ریل میں جاتے تھے وہاں سے بحری جہازوں میں سوار ہو کر کراچی پہنچتے تھے۔

ایک دن میں دانش محل میں بیٹھا تھا کہ سنٹرل ہوٹل میں یہ خبر ملی کہ دلی سے کوئی جہاز آیا ہے۔ رفیع احمد قدوائی صاحب نے بھیجا ہے اور چودھری خلیق الزماں صاحب اور ان کے خاندان کے تمام لوگ دلی جا رہے ہیں، وہاں سے وہ اسی جہاز میں کراچی جائیں گے۔ یہ خبر چودھری خلیق الزماں صاحب کے شہر لکھنؤ میں جنگل کی آگ کی طرح پھیلی اور اس خبر کو سن کر خوف و ہراس اتنا بڑھ گیا کہ لکھنؤ میں ہر مسلمان اپنے آپ کو غیر محفوظ خیال کرنے لگا۔ ہر شخص نے یہ محسوس کیا کہ دلی کی طرح لکھنؤ پر بھی کوئی قیامت ٹوٹنے والی ہے۔ اگرچہ ابھی تک لکھنؤ کی فضا کشیدہ نہیں تھی اور حالات معمول پر تھے لیکن چودھری صاحب کے پاکستان جانے کی خبر نے سب کو ہلا کر رکھ دیا۔ برتن اور کپڑے اب زیادہ

تیزی سے بکنے لگے اور جن لوگوں کے اثرات تھے وہ فوجی اسپیشلوں کے ذریعے پاکستان جانے کی کوششوں میں سرگرداں نظر آنے لگے۔ ریلوے اسٹیشنوں پر اس زمانے میں بڑا مجمع ہوتا تھا خاص طور پر اس وقت جب اسپیشل جاتے تھے۔ کہنے کو تو ان اسپیشلوں میں فوجی جاتے تھے لیکن بااثر سویلین بھی اس میں بیٹھ جاتے تھے۔ کوئی ان سے کچھ نہیں کہتا تھا۔ پاکستان جانے والے مسلمان فوجیوں کا بھی یہی تاثر تھا کہ جو اس وقت نکل جائے بہتر ہے کیونکہ اس وقت ہر شخص محسوس کر رہا تھا کہ اب ہندوستان میں مسلمانوں کے لیے جگہ نہیں ہے۔ فسادات کا اندیشہ بھی ہے اور مستقبل کا کچھ علم نہیں ہر طرف تاریکی ہی تاریکی نظر آتی تھی۔

رات گئے چودھری صاحب اور ان کے خاندان کے افراد کو لے کر جہاز دلی چلا گیا اور تیسرے دن یہ خبر ملی کہ چودھری صاحب کراچی میں ہیں۔ ہندوستانی پارلیمنٹ میں مسلم لیگ پارٹی کے لیڈر کی ہجرت مسلمانوں کے لیے تشویش کا باعث ہوئی۔ لکھنؤ اداس اور سوگوار ہو گیا کیونکہ چودھری صاحب لکھنؤ ہی سے پارلیمنٹ کے لیے منتخب ہوئے تھے۔ شہر میں ہر طرف چہ می گوئیاں ہونے لگیں اور مسلمان کچھ اکھڑا اکھڑا سا نظر آنے لگا۔ بہت سے لوگ بمبئی اور وہاں سے بحری جہاز کے ذریعے کراچی جانے کے لیے آمادہ ہو گئے کیونکہ اس وقت فوجی اسپیشلوں کے علاوہ صرف یہی ایک راستہ پاکستان جانے کے لیے کھلا ہوا تھا۔ بہت سے خاندان اپنے آبائی شہر اور گھروں کو چھوڑ کر ایک نئی دنیا بسانے اور ایک نئے وطن میں پناہ لینے کے لیے پاکستان چلے گئے۔ لکھنؤ کی رونق ختم ہو گئی۔ مجاز نے اسی زمانے میں اپنی مشہور نظم لکھی ؎

سبزہ و برگ و لالہ و سرو و سمن کو کیا ہوا　　سارا چمن اداس ہے ہائے چمن کو کیا ہوا
ایک سکوت ہر طرف ہوش ربا و ہولناک　　خلدِ وطن کے پاسباں خلدِ وطن کو کیا ہوا
رقص طرب کدھر گیا، نغمہ طراز کیا ہوئے　　غمزہ و ناز کیا ہوئے، عشوہ و فن کو کیا ہوا
جس کی نوائے دلستاں زخمۂ سازِ شوق تھی　　کوئی بتاؤ اس بتِ غنچہ دہن کو کیا ہوا

چشمک دم بہ دم نہیں مشقِ خرام و رم نہیں
میرے غزال کیا ہوئے میرے ختن کو کیا ہوا

مہینوں یہ سلسلہ جاری رہا۔ جو نہیں گئے وہ جانے کی تیاری میں مصروف رہے۔ جس گھر

میں بھی جاکر دیکھا سامان باندھا یا بیچا جا رہا ہے۔ میری والدہ نے بھی سامان باندھنا اور بیچنا شروع کر دیا میں نے انھیں منع کیا اور کہا کہ جب تک روزگار کی کوئی صورت نہ نکلے وہاں جاکر سڑک پر پڑ جانے سے کیا فائدہ۔ یہاں کم از کم سروں پر چھت تو ہے، چار دیواری تو ہے۔ میری باتوں کا کچھ اثر ہوا اور وقتی طور پر ہجرت کرنے کا خیال صرف میری وجہ سے التوا میں پڑ گیا لیکن میرے دو چھوٹے بھائی کراچی اور راولپنڈی چلے گئے۔ ایک نے فوج کے دفتر میں ملازمت کر لی۔ اس کی پوسٹنگ راولپنڈی میں ہو گئی۔ دوسرے تحریک پاکستان میں پیش پیش تھے اور مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے صدر یا سکریٹری تھے اس لیے انھوں نے فوراً کراچی جانا مناسب سمجھا۔ ان کی ہجرت نے ہمارے خاندان کے پاؤں اکھاڑ دیے۔

اب مجھے دلی سے لکھنؤ آئے ہوئے کئی مہینے گزر چکے تھے۔ کالج کی کوئی خبر نہیں تھی۔ دلی سے کوئی رابطہ قائم نہ ہو سکا۔ بیگ صاحب کے خط سے صرف یہ معلوم ہوا کہ پرانے قلعے کے تمام لوگ ریلوں کے ذریعے پاکستان چلے گئے۔ لیکن بیگ صاحب اور ڈاکٹر فاروقی صاحب شیر شاہ میں مقیم ہیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد اور ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب کے کہنے سے وہ رک گئے ہیں۔ شیر شاہ میں انھیں ایک کمرہ دے دیا گیا ہے۔ کالج کا نیا نظام بنایا جا رہا ہے اور فضا کے بہتر ہوتے ہی اس کے کھلنے کا امکان ہے لیکن حالت ابھی تک بہتر نہیں ہوئی تھی۔ سارے ہندوستان میں ابھی تک فسادات کی آگ بھڑک رہی تھی۔ بہار میں پھر فسادات شروع ہو گئے تھے۔ اس کے نتیجے میں مشرقی پاکستان میں بھی فسادات کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ گاندھی جی کی کوششیں ان فسادات کو روکنے کے لیے جاری تھیں۔ ان کی پرارتھنا کے جلسے پابندی سے ہو رہے تھے۔ وہ روزانہ اس میں تقریر کرتے تھے۔ ان کی ان کوششوں کو ہندوؤں کی نیم فوجی متعصب جماعتیں پسند نہیں کر رہی تھیں۔ ان کا منصوبہ تو کچھ اور ہی تھا۔

۳۰ جنوری ۱۹۴۸ء کی شام میں اپنے کچھ دوستوں کے ساتھ لکھنؤ میں حضرت گنج کے کافی ہاؤس میں بیٹھا ہوا تھا کہ کسی نے آکر یہ وحشت اثر خبر دی کہ گاندھی جی کو گولی مار دی گئی ہے۔ پرارتھنا کے جلسے میں کسی شخص نے ان پر کئی فائر کیے اور وہ اللہ کو پیارے ہو گئے۔ اس خبر کو سن کر سب لوگ اپنے اپنے گھروں کو بھاگے۔ یہ سوچتے رہے کہ اگر کسی مسلمان نے ایسا کیا ہے تو اب ہندوستان میں مسلمانوں کی

خیر نہیں، ان کا نام و نشان تک باقی نہیں رہنے دیا جائے گا... لیکن گھر پہنچ کر مجھے یہ معلوم ہوا کہ ابھی ابھی پنڈت جواہر لال نہرو نے ریڈیو پر اعلان کیا ہے کہ ایک جنونی ہندو نے گاندھی کو قتل کیا ہے۔ اس اعلان سے مسلمانوں نے اطمینان کا سانس لیا اور ان پر جو دہشت طاری ہوئی تھی وہ کسی حد تک کم ہوئی۔

اس سانحے کا سب کو غم ہوا۔ اس لیے بھی کہ ایک ایسا شخص گولی کا نشانہ بنا تھا جو زندگی بھر عدم تشدد کا پرچار کرتا رہا تھا۔ قدرت کی یہ عجیب ستم ظریفی ہے کہ جس شخص نے اپنے عدم تشدد کی پالیسی سے بڑی بڑی حکومتوں تک کے منہ پھیر دیئے تھے وہ تشدد کے ذریعے موت کے گھاٹ اتارا گیا۔ جدھر دیکھئے جس شخص سے بھی ملئے وہ اسی طرح کی باتیں کرتے تھے۔ ہر ایک کو ان کے اس طرح مارے جانے کا دکھ تھا۔ لوگوں کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے، عورتیں سینہ کوبی کر رہی تھیں۔ سارے ہندوستان میں ایک کہرام مچ گیا تھا۔ در و دیوار تک سوگوار تھے۔ درختوں اور سبزہ زاروں تک پر اداسی تھی۔ آسمان خون رو رہا تھا۔ زمین ماتم کر رہی تھی۔

دلی اور دوسرے شہروں کا حال تو مجھے معلوم نہیں لکھنؤ میں ہر مذہب اور ملت کے ہر انسان کو اپنی زندگی بے معنی معلوم ہونے لگی تھی۔ لوگ حیران اور ششدر تھے۔ کچھ کہتے نہیں تھے لیکن ان کی خاموشی نہ جانے کیا کیا کچھ کہہ رہی تھی۔

۳۱ جنوری ۱۹۴۸ء کی شام کو گاندھی جی کا جسم خاکی دریائے جمنا کے کنارے راج گھاٹ پر نذرِ آتش کر دیا گیا اور ان کے ساتھ ہندوستان کی تاریخ کا ایک دور ختم ہو گیا۔ سیاست کی ایک روایت ختم ہو گئی۔ ایک منحنی سا انسان جس نے نصف صدی سے زیادہ کروڑوں لوگوں کے دلوں پر حکمرانی کی تھی۔ بے لباسی کو لباس بنا دینے والا ایک شخص جس نے دنیا کی بڑی بڑی حکومتوں کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ اب اس دنیا میں نہیں تھا۔ کرائے کے ایک آدمی نے اس کی جان لے لی تھی۔ اس قتل کے پیچھے کسی اور کا ہاتھ تھا۔ یہ خون کی ہولی اس لیے کھیلی گئی تھی کہ بعض لوگوں کو من مانی کرنے کا موقع ملے۔ منصوبہ یہ تھا کہ ہندوستان ایک قلزمِ خوں بنا دیا جائے لیکن اس کا اثر الٹا ہوا۔ گاندھی جی نے اپنی جان دے کر اس منصوبے کو خاک میں ملا دیا۔

گاندھی جی کے رخصت ہو جانے کے بعد ہندوستان کی دنیا ہی بدل گئی۔ فسادات ختم ہو گئے۔ کوئی کسی کو مارتا نہیں تھا۔ ہنگامے کی کوئی فضا باقی نہیں رہی تھی۔ مسلمان اپنے آپ کو خاصی حد تک محفوظ سمجھنے لگے تھے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ سب کچھ کیسے ہوا اور کیوں ہوا لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ جو ہنگامہ آرائیاں عرصۂ دراز سے ہندوستان میں ہو رہی تھیں ان کا خاتمہ ہو گیا اور لوگ بڑی حد تک اطمینان سے رہنے لگے۔ خوف و ہراس کی فضا خاصی حد تک ختم ہو گئی اور لوگ اپنے اپنے کاموں میں لگ گئے۔

فروری اور مارچ سنہ ۱۹۴۸ء کے مہینے اس طرح گزرے۔ اس صورت حال کا ایک نتیجہ یہ نکلا کہ اپریل کے شروع میں میرے پاس دہلی یونیورسٹی کی طرف سے ایک خط آیا جس کا مضمون یہ تھا کہ اینگلو عربک کالج کی نئی منصوبہ بندی ہو چکی ہے۔ ہمیں معلوم ہوا ہے کہ آپ ہندوستان میں ہیں اور لکھنؤ میں مقیم ہیں۔ آپ ۹ر اپریل سے قبل دلی پہنچ جایئے۔ دلی یونیورسٹی کے وائس چانسلر سر ماریس گوائر آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ ۱۰ر اپریل کو بارہ بجے ان سے یونیورسٹی میں ملیے۔ اس خط کے ساتھ ہمارے پرانے رفیق کار اور دوست پروفیسر مرزا محمود بیگ کا خط بھی ملا جس میں دلی بلائے جانے کی کچھ زیادہ تفصیل تھی۔ لکھا تھا، آپ ۹ر اپریل کی صبح تک دلی پہنچ جایئے اور میرے ساتھ رودگراں میں قیام کیجیے۔ ۱۰ر اپریل بارہ بجے میں آپ کا انتظار کروں گا۔ آپ کے کچھ اور پرانے ساتھی بھی وائس چانسلر سے ملنے جائیں گے۔ سر ماریس سے ملیں گے اور چند روز میں ہم لوگ پھر کالج میں منتقل ہو جائیں گے۔ کالج کی بحالی کے سلسلے میں جو کچھ ہوا ہے اس کی تفصیل میں آپ کو زبانی بتاؤں گا۔ کچھ حالات سر ماریس سے بھی معلوم ہوں گے۔

میں نہ جانے کب سے اس خوش خبری کا انتظار کر رہا تھا۔ بے کاری کے عالم میں آٹھ دس مہینے سے زیادہ گزر چکے تھے۔ کرنے کے لیے کوئی کام نہیں تھا۔ آمدنی کی بھی کوئی صورت نہیں تھی۔ خدا جانے کس طرح یہ وقت گزارا تھا۔ ریڈیو اسٹیشن پر کچھ پروگرام مل جاتے تھے۔ اس سے گزر بسر کیا ہوتی۔ بہرحال اس زمانے میں ریڈیو کے پروگرام پروڈیوسر جگا کمار ماتھر اور وشوا متر عادل نے میری بہت

مدد کی تھی۔ وہ تو کہیے کہ اپنا گھر لکھنؤ میں تھا، اس لیے بے کاری نے ایسی کچھ زیادہ تکلیف نہیں دی۔ گھر نہ ہوتا تو خدا جانے کیا ہوتا۔

ان حالات میں دلّی یونیورسٹی سے اس خط کا ملنا اور سر مارس گوائر وائس چانسلر سے ملاقات کی خوش خبری نعمت غیر مترقبہ معلوم ہوئی اور یہ یقین ہو گیا کہ بیکاری کے دن ختم ہو گئے ہیں اور کالج کا نیا دور اب شروع ہونے والا ہے۔ چنانچہ ۸ر اپریل کو میں شام کی گاڑی سے دلّی روانہ ہو گیا اور ۹ر اپریل کی صبح کو دلّی پہنچ گیا۔ گھر والے اداس ہوئے۔ انھیں ابھی تک یقین نہیں تھا کہ دلّی کی فضا بہتر ہے۔ مجھے خود بھی یقین نہیں تھا، لیکن حکم حاکم، وائس چانسلر کی طرف سے بلاوا آیا تھا اس لیے دلی جانے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔

میں دلّی پہنچا اور ریلوے اسٹیشن سے سیدھا پرانی دلّی میں فراش خانے کے قریب محلہ رودگران گیا جہاں بیگ صاحب کا آبائی مکان تھا اور جہاں وہ پرانے قلعے اور شیر شاہ میس سے واپس آنے کے بعد اب اپنے والد صاحب کے ساتھ رہتے تھے۔ کیونکہ کالج کی عمارت ابھی تک پوری طرح بحال نہیں نہیں ہوئی تھی اور ہمارے کمروں میں ابھی تک مدراس رجمنٹ کے سپاہی براجمان تھے اس لیے ہم لوگ اپنے پرانے کمروں میں قیام نہیں کر سکتے تھے صرف دفتر کے لیے ایک حصہ خالی کرایا گیا تھا۔

بیگ صاحب بڑی محبت سے ملے اور کہنے لگے "دو چار دن آپ یہیں ٹھہریے انشاءاللہ چند روز میں کالج کی عمارت بحال ہو جائے گی اور ہم وہاں جا کر کام بھی کر سکیں گے اور ہوسٹل میں قیام بھی کر سکیں گے لیکن اب اس کا نام اینگلو عربک کالج نہیں بلکہ دہلی کالج ہوگا۔ بیگ صاحب نے تفصیل نہیں بتائی، میں نے پوچھی بھی نہیں، لیکن میں سمجھ گیا کہ یہ فیصلہ کیوں کیا گیا ہے؛

گیارھواں باب

دہلی کالج

۹ / اپریل ۱۹۴۸ء کو آٹھ دس مہینے کے بعد اب میں پھر دلّی آیا تھا۔

دلّی اب ایک مختلف شہر تھا۔ سڑکوں پر زیادہ تر پنجاب سے آئے ہوئے سکھ اور ہندو شرنارتھی ہی شرنارتھی نظر آتے تھے۔ مسلمان تو تقریباً ختم ہی ہو چکے تھے۔ بعض محلّوں میں صرف ایسے مسلمان رہ گئے تھے جن کو ہم آپ نے غدر کے بعد اہلِ حرفہ کہا تھا۔ سڑکوں پر جگہ جگہ جھونپڑیاں بنالی گئی تھیں اور ان میں پنجاب سے آئے ہوئے ہندو اور سکھ بسیرا کرتے تھے۔ دلّی کی مقامی آبادی سکڑ کر رہ گئی تھی۔ مقامی ہندو بھی پنجاب سے آئے ہوئے شرنارتھیوں کے مقابلے میں نسبتاً کم نظر آتے تھے۔ اب دلّی پنجاب کا ایک شہر معلوم ہوتا تھا۔

اجمیری دروازہ جہاں ہمارا کالج واقع تھا، شرنارتھیوں سے گھرا ہوا تھا۔ اجمیری دروازے کے آس پاس جھونپڑیاں ہی جھونپڑیاں تھیں۔ کالج کے ایک حصّے میں اندر بھی شرنارتھی آگئے تھے اور جس حصّے میں کبھی طالب علم رہا کرتے تھے، اس میں رہنے لگے تھے۔ اس صورتِ حال کی وجہ سے دلّی کی فضا بدلی ہوئی نظر آتی تھی۔ ماضی سے اب اس کا کوئی تعلق نہیں رہا تھا

اس بدلی ہوئی فضا میں ہم لوگ دس بجے کے قریب کالج میں جمع ہوئے۔ میں، بیگ صاحب، موسوی صاحب، ڈاکٹر فاروقی صاحب اور مہری شنکر صاحب۔ پرانے اسٹاف میں سے صرف یہ لوگ جمع ہو سکے۔ بیشتر تو بٹ کر پاکستان چلے گئے تھے۔ کچھ ہندوستان میں تھے لیکن دلّی سے دور تھے اور

انھیں وقت پر اطلاع بھی نہیں ہو سکتی تھی اس لیے ہم صرف پانچ پروفیسر دہلی یونیورسٹی کے وائس چانسلر سر ماریس گوائر کے پاس جانے کے لیے جمع ہو سکے تھے۔

میرے خیال میں ہم پانچوں میں سب سے اہم انسان پروفیسر ہری شنکر تھے جو اینگلو عربک کالج میں کوئی تیس سال تک حساب کے پروفیسر رہے۔ انھیں عربک کالج سے محبت ہی نہیں عشق تھا۔ وہ بنارس کے رہنے والے تھے اور برہمن تھے اور ہندو مذہب کے اصولوں کے سختی سے پابند لیکن ان کی دوستی مسلمانوں کے ساتھ تھی۔ عربک کالج میں جب مسلم لیگ کا زور تھا تب بھی وہ اسی کالج میں رہے جب کالج لٹ پٹ گیا اور بند ہو گیا تب بھی انھوں نے اپنے آپ کو ذہنی اور جذباتی طور پر عربک کالج کے ساتھ وابستہ رکھا۔ ہندو کالج اور رامجس کالج نے انھیں بلایا اور اچھے سے اچھے آفر دیئے لیکن انھوں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ میں تو عربک کالج کا ملازم ہوں۔ جب کالج کھلے گا تو اسی کالج میں کام کروں گا۔ کوئی دس مہینے انھوں نے ہماری طرح بیکاری میں گزارے لیکن ان کے ماتھے پر شکن تک نہیں آئی۔ آج ۱۰ اپریل ۱۹۴۸ء کو بھی میں نے انھیں اسی طرح بنارسی پان کھاتے ہوئے ہنسی مذاق کرتے ہوئے اور ہر ایک سے محبت کے ساتھ پیش آتے دیکھا جیسے وہ اس سے قبل ہمیشہ عربک کالج میں دکھائی دیتے تھے ان میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔

خیر تو ہم پانچوں پروفیسر بیگ صاحب کی گاڑی میں گیارہ بجے کے بعد دہلی یونیورسٹی کی طرف روانہ ہوئے اور بارہ بجے سے کچھ قبل ہی اولڈ وائسریگل لاج پہنچ گئے جہاں پرانی عمارت کے دو کمروں میں سر ماریس کا قیام تھا۔ بیگ صاحب کے مزاج میں بذلہ سنجی بہت تھی کہنے لگے کہ اب عربک کالج ایک موٹر کار میں سما سکتا ہے

THE COLLEGE CAN BE ACCOMODATED IN A CAR

وہ نفسیات اور فلسفے کے پروفیسر تھے اور انسانی زندگی کے تغیرات کا انھیں شدید احساس تھا اسی لیے انھوں نے اپنے مخصوص مزاحیہ انداز میں یہ فقرہ کہا۔

یونیورسٹی پہنچ کر ہم لوگوں نے اطلاع کروائی اور برآمدے میں بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ سر ماریس خود باہر نکل آئے اور ہم لوگوں کو اندر اپنے کمرے میں لے گئے۔ وہ اب بہت بوڑھے

ہو چکے تھے اور خاصے بیمار نظر آ رہے تھے۔ ان کے ہاتھوں کی تمام انگلیوں میں پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔ انھیں عرصے سے گٹھیا اور ARTHRITIS کی تکلیف تھی جو اب معلوم ہوتا تھا کہ بہت بڑھ گئی ہے۔ بہرحال علالت کے باوجود انھوں نے ہمیں خاصا وقت دیا۔ سب سے پہلے تو انھوں نے اپنی طرف سے اور یونیورسٹی کی طرف سے معذرت کی کہ اساتذہ بھی ان ہنگاموں کا شکار ہوئے اور انھیں بھی تکلیفیں اٹھانی پڑیں۔ ان کے گھر بھی لوٹے گئے اور انھیں بھی اپنی جانیں بچانے کے لیے کیمپوں میں جانا پڑا۔ انھوں نے کہا کہ "یونیورسٹی اور حکومت ہند کو اور مجھے بھی ذاتی طور پر اس کا افسوس ہے۔ اب حالات بہتر ہیں۔ آپ لوگوں کے کالج کے معاملات میں وزیر تعلیم مولانا ابوالکلام آزاد اور ڈاکٹر ذاکر حسین خاں نے گہری دلچسپی لے کر یہ فیصلہ کیا ہے کہ اس کا نام اینگلو عربک کالج کی بجائے دہلی کالج ہوگا۔ ڈاکٹر ذاکر حسین اس کے صدر ہوں گے اور پروفیسر مرزا محمود بیگ کو پرنسپل مقرر کیا گیا ہے۔ ایک نئی گورننگ باڈی کی تشکیل بھی کر دی گئی ہے۔ چند روز میں مدراس رجمنٹ کے سپاہی کالج کی عمارت کو خالی کر دیں گے۔ پروفیسروں کو گزشتہ دس مہینے کی تنخواہ بھی یک مشت ادا کی جائے گی۔ وائس چانسلر کی حیثیت سے مجھے آپ کے ساتھ ہمدردی ہے۔ میں آپ کے تمام مسائل کو حل کرنے کی کوشش کروں گا۔

سر ماریس تقریباً ایک گھنٹے تک باتیں کرتے رہے۔ اس کے بعد انھوں نے ہمیں رخصت کیا۔ ہم لوگ وہاں سے سیدھے اپنے کالج واپس آ گئے۔ بیگ صاحب نے پرنسپل کا چارج سنبھال لیا اور کالج کی عمارت کے ایک حصے میں اپنا دفتر بنا لیا۔ لیکن نہ تو اساتذہ تھے نہ طالب علم لیکن اس کے باوجود کالج کھل گیا تھا اور ہم پانچ اساتذہ کالج کے اوقات میں حاضر رہتے تھے۔ کچھ مسلمان لڑکے جو اندرون شہر رہتے تھے اور پاکستان نہیں گئے تھے، وہ آ جاتے تھے۔ ان سے ہم لوگ باتیں کر لیتے تھے یا پھر جو لڑکے پاکستان چلے گئے تھے ان کے سرٹیفکیٹ بنا کر پوسٹ کر دیتے تھے تاکہ پاکستان میں انھیں داخلے کے سلسلے میں تکلیف نہ ہو۔ پھر جون میں ہمیں کچھ چھٹیاں ملیں اور ہم لوگ کچھ عرصے کے لیے اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔ جولائی کے آخر میں واپسی ہوئی۔

بیگ صاحب نے پرنسپل کی حیثیت سے اس زمانے میں شب و روز کام کیا اور

مولانا ابوالکلام آزاد نے کالج کے حالات کو معمول پر لانے کے لیے بہت مدد کی۔ بیگ صاحب جب بھی کالج کے حالات بتانے کے لیے مولانا کے پاس جاتے تھے تو مجھے بھی ساتھ لے جاتے تھے۔ مولانا سے جب بھی ملاقات ہوتی وہ یہ پوچھتے: "کیسے کالج کیسا چل رہا ہے؟" اور ہم لوگ یہی جواب دیتے "خدا کا شکر ہے، حالات بظاہر سازگار ہیں۔ نظام بن گیا ہے۔ حالات معمول پر آ رہے ہیں۔ اساتذہ کی تعداد میں بھی اضافہ ہو گیا ہے، صرف طالب علم نہیں ہیں۔"

مولانا سے جب بھی یہ باتیں ہوئیں، انھوں نے نہایت اعتماد کے ساتھ یہی کہا کہ "میرے بھائی! طالب علم بھی آجائیں گے، اس کا بھی انتظام ہو رہا ہے۔"

جولائی میں داخلے ہونے چاہیے تھے لیکن بازار سرد رہا اور صرف چند مسلمان طالب علم داخل ہوئے۔ خیال تھا کہ اگست ستمبر میں کچھ اور داخلے ہو جائیں گے لیکن ستمبر کا مہینہ اپنے ساتھ پھر ایک آشوب کو لایا۔ گیارہ ستمبر کو قائدِ اعظمؒ کا انتقال ہو گیا۔ میں ابھی صبح کو سو کر اٹھا ہی تھا اور چائے پی رہا تھا کہ خواجہ احمد فاروقی اخبار لے کر میرے کمرے میں داخل ہوئے۔ پہلے صفحے پر یہ سرخی تھی۔ "QUAID-I-AZAM JINNAH DEAD"

یہ سرخی پڑھ کر میرے تو پیروں تلے سے زمین نکل گئی، سناٹے میں آگیا۔ سخت پریشان ہوا۔ طرح طرح کے خیالات ذہن پر منڈلانے لگے۔ میری زبان سے یہی الفاظ نکلتے رہے: "خدا خیر کرے۔ اللہ تعالیٰ پاکستان کو سلامت رکھے۔" اسی دن حیدرآباد کی ریاست پر ہندوستان کی طرف سے حملہ کیا گیا جیسے یہ لوگ اس منحوس دن کے انتظار ہی میں تھے۔ لڑائی تو صرف چند روز ہی ہوئی جس میں لاکھوں مسلمان گاجر مولی کی طرح کاٹے گئے۔ اس کے علاوہ بھی بہت کچھ ہوا یعنی ہندوستانی فوج کے ہاتھوں حیدرآباد کے مختلف علاقوں میں بسنے والے بے گناہ مسلمانوں کا قتل عام اور بے شمار مسلمان عورتوں کی بے حرمتی۔ اخباروں میں تو یہ خبریں کیا آتیں، ایک صاحب حیدرآباد پولیس میں بہت بڑے افسر تھے۔ وہ کسی طرح جان بچا کر نکل آئے۔ انھوں نے جو تفصیل وہاں کے حالات کی سنائی وہ نہایت دل دوز تھی۔

ان حالات نے ایک دفعہ پھر دلی میں خوف و ہراس پھیلا دیا اور ہم سب ایک دفعہ پھر پریشان ہونے لگے۔ قائدِ اعظمؒ کی وفات نے پہلے ہی ہمیں ہلا کر رکھ دیا تھا اور ہمارے دلوں میں ایسے ایسے خیالات

پیدا ہو رہے تھے کہ کہیں ہندوستان، پاکستان میں جنگ ہی نہ چھڑ جائے۔ یہ خیالات غلط اور بے بنیاد نہیں تھے کیونکہ سردار پٹیل کا منصوبہ یہی تھا۔ یہ اور بات ہے کہ فوجی افسروں کے مشوروں کی وجہ سے وہ ایسا نہ کر سکے

باوثوق ذرائع سے مجھے یہ خبر ملی کہ حیدرآباد میں اپنی کامیابی کے بعد پٹیل نے کیبنٹ میں فخر کے ساتھ یہ تجویز پیش کی کہ حیدرآباد ہو گیا ہے اور ہمارا "پولیس ایکشن" پوری طرح کامیاب رہا ہے۔ اس لیے اب ہمیں مشرقی پاکستان میں بھی پولیس ایکشن کرنا چاہیے کیونکہ وہاں عرصے سے فسادات ہو رہے ہیں اور ہندوؤں کے ساتھ زیادتی کی جا رہی ہے۔ اس تجویز سے وزیر اعظم ہند تو سخت پریشان ہوئے لیکن ایک نہایت ہی باتدبیر وزیر نے ان کی مدد کی اور کہا کہ "کمانڈر ان چیف کو بلایا جائے تاکہ ان کی ایکسپرٹ فوجی رائے لی جا سکے" چند منٹ میں کمانڈر ان چیف آ گئے۔ ان سے وزیر باتدبیر نے پوچھا "آپ مشرقی پاکستان کتنی دیر میں لے سکتے ہیں؟" انھوں نے جواب دیا "دو گھنٹے میں" ـــــ لیکن اس عرصے میں دلّی آپ کے ہاتھ سے نکل جائے گا" ـــــ یہ ایکسپرٹ فوجی رائے سن کر پٹیل صاحب کو پسینہ آ گیا اور انھوں نے اپنی تجویز واپس لے لی۔ سیاسی تدبر اور دانش مندی اس وزیر باتدبیر پر ختم تھی۔

یہ روداد مجھے ایک ایسے شخص نے سنائی جو خود کیبنٹ کی اس میٹنگ میں موجود تھا اور جس کی بصیرت اور تدبیر کی اس زمانے میں دھوم تھی۔ اس کی تصدیق مولانا حسرت موہانی نے بھی کی جو اس زمانے میں ہندوستانی پارلیمنٹ کے ممبر تھے۔ مولانا حسرت جیسا کہ سب جانتے ہیں، بڑے ہی مخلص، نڈر اور دبنگ انسان تھے۔ انھوں نے پارلیمنٹ میں حیدرآباد پر پولیس ایکشن کو کھلی ہوئی جارحیت اور باقاعدہ حملہ قرار دیا تھا اور حملے کو مسلمانوں کی نسل کشی (GENOCIDE) قرار دیا تھا۔ ان کی تقریر کے کچھ حصے اخبار اسٹیٹس مین میں بھی شائع ہوئے تھے۔ مولانا حسرت اس اخبار کو اپنے تھیلے میں لیے پھرتے تھے اور جو بھی جاننے والا ملتا تھا اس کو دکھاتے تھے اور کہتے تھے کہ میں نے اپنا فرض پورا کیا، کسی اور کو اس کے بارے میں کچھ کہنے کی جرأت نہیں ہوئی۔ مشرقی پاکستان پر حملے کے منصوبے کا بھی انھیں علم تھا اور وہ اس سے بے خبر نہیں تھے۔ حالانکہ اس منصوبے کا علم سوائے کیبنٹ کے ممبروں

کے کسی اور کو نہیں تھا۔

ان حالات میں دہلی کالج اپنی زندگی کے ابتدائی مراحل طے کر رہا تھا۔ فضا خاصی خراب تھی اور ہم لوگ اس فضا میں اس کالج کو قایم اور باقی رکھنے کی کوشش میں سرگرداں تھے۔

اسی فضا میں ستمبر کا مہینہ گزر گیا اور اکتوبر میں موسم خزاں کی ایک مہینے کی تعطیلات ہو گئیں اور ہم لوگ ایک مہینے کے لیے اپنے گھروں کو چلے گئے۔ جب ہم لوگ ایک مہینے کی چھٹیاں گزار کر نومبر میں واپس دلی آئے تو دیکھا کالج میں خاصی چہل پہل ہے۔ لڑکے لڑکیاں خاصی تعداد میں اہلے گہلے پھرتے ہیں۔ یہ سب لڑکے لڑکیاں سندھ اور کراچی سے آئے ہوئے پناہ گزیں تھے۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے یہ فیصلہ کیا کہ ان سب کو دہلی کالج میں داخل کیا جائے۔ اندھا کیا چاہے دو آنکھیں، ان کو فوراً داخل کر لیا گیا۔ کچھ لڑکے لڑکیاں پنجاب یونیورسٹی کیمپ کالج سے بھی آ گئے اور اس طرح لڑکے لڑکیوں کی وجہ سے دہلی کالج میں اچھی خاصی رونق ہو گئی۔

طالب علموں کی تعداد اس طرح کوئی ڈیڑھ دو ہزار ہو گئی۔ اتنے طالب علموں کو پڑھانے کے لیے کچھ نئے اساتذہ کا تقرر بھی کیا گیا۔ بیگ صاحب نے جلدی جلدی ضابطے کی کارروائی کر کے یہ تقرر کر لیے۔ ان پروفیسروں میں سے بیشتر سرحد، پنجاب اور سندھ سے آئے ہوئے تھے۔ انگریزی زبان و ادب کے لیے بال کرشن کالیہ کا تقرر کیا گیا جو اس سے قبل دیال سنگھ کالج لاہور میں انگریزی کے پروفیسر تھے۔ حساب کے لیے ہنس راج مہرا لیے گئے جو اس سے قبل پشاور کے کسی کالج میں حساب کے پروفیسر تھے۔ معاشیات میں مارک کا تقرر کیا گیا جو اس سے قبل آگرہ کالج میں معاشیات پڑھاتے تھے۔ سندھی لڑکے اور لڑکیوں کی تعداد بہت تھی اس لیے سندھی زبان پڑھانے کے لیے ڈاکٹر سدارنگانی کا تقرر کیا گیا۔ یہ صاحب بمبئی یونیورسٹی سے فارسی میں پی ایچ۔ ڈی تھے۔ فارسی خوب جانتے تھے لیکن اردو میں مذکر مونث کا استعمال انھیں نہیں آتا تھا۔ آدمی نہایت شریف تھے۔ تقرر تو اور بھی کئی پروفیسروں کا ہوا تھا لیکن یہ نام مجھے اس لیے یاد رہ گئے کہ یہ لوگ ہمارے ہوسٹل ہی کے اس بلاک میں رہتے تھے جو اساتذہ کے لیے مخصوص تھا۔ ان سب اساتذہ میں انسانیت اور شرافت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔

اسی لیے ان لوگوں سے چند روز میں میری گہری دوستی ہو گئی۔ دن رات یہ لوگ میرے ساتھ رہتے تھے ایک ساتھ ایک مسلمان باورچی کے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا کھاتے تھے۔ میرا دل بھی بہلاتے تھے۔ میری ہر بات کا خیال رکھتے تھے۔ ان کی وجہ سے اس بدلے ہوئے ماحول میں بڑی حد تک میرا دل لگ گیا۔ ان کے ساتھ واقعی میرا بہت اچھا وقت گزرا۔

یہ لوگ بڑے روشن خیال تھے۔ کالیہ اگرچہ جالندھر کے برہمن تھے، گوشت نہیں کھاتے تھے لیکن مسلمان کے ہاتھ کا کھانے میں انھیں کوئی اعتراض نہیں تھا۔ ہنس راج مہرا کا تعلق تو خیر پٹھانوں کے علاقے سے تھا اس لیے وہ پٹھانوں کی طرح خلوص و محبت کا مجسمہ تھے۔ مہمان نوازی ان پر ختم تھی۔ بڑی محبت سے پیش آتے تھے۔ کبھی میں اداس ہوتا تو مختلف طریقوں سے میرا دل بہلاتے تھے۔ کھانا کھاتے وقت بار بار کہتے تھے "عبادت صاحب! خوب کھایئے۔ اور کھایئے۔ اس لیے کہ ہم لوگ صرف روٹی کھاتے ہیں کوئی اور چیز نہ کھاتے ہیں نہ پیتے ہیں"۔ اور مارک تو خیر عیسائی تھے۔ عیسائیوں کی اخلاقی روایت ان کی شخصیت میں اپنے کمال پر نظر آتی تھی اور ڈاکٹر سدرنگانی تو نیکی اور شرافت کے پتلے تھے۔

ہنس راج مہرا کا ایک واقعہ مجھے کبھی نہیں بھولتا۔ ان کو آئے ہوئے ابھی چند روز ہی ہوئے تھے کہ میں بہت بیمار ہو گیا۔ اس زمانے میں ہمارے کھانے کا کوئی معقول انتظام نہیں ہوا تھا۔ میں مسلمانوں کے ایک ہوٹل سے رات کا کھانا منگوا لیتا تھا۔ ایک دن مجھے ہوٹل کے کھانے سے FOOD POISON ہو گیا۔ رات بھر تکلیف رہی۔ ہنس راج مہرا نے پوری رات میرے سرہانے بیٹھ کر گزار دی۔ کبھی ہاتھ پاؤں دباتے، کبھی میرا سر سہلاتے، کبھی مجھے پانی پلاتے! ـــــ میں نے بہت کہا کہ آپ سو جایئے۔ کہنے لگے "آپ کو تکلیف ہو اور مجھے نیند آجائے یہ کس طرح ہو سکتا ہے؟ میں رات آپ کے پاس بیٹھ کر گزاروں گا، آپ کی دیکھ بھال کروں گا، آپ کی خدمت کروں گا"۔ چنانچہ وہ رات بھر اسی طرح بیٹھے رہے اور ساری رات انھوں نے جاگ کر گزار دی۔ صبح کو میرے ایک ہندو طالب علم سریندر پال کو میری بیماری کی خبر ملی تو وہ دوڑا دوڑا گیا اور اپنے والد کو لے آیا جو ڈاکٹر تھے۔ انھوں نے مجھے دوا دی جس سے مجھے فوراً فائدہ ہوا۔ جب میری طبیعت بحال ہوئی تب ہنس راج مہرا میرے پاس سے اٹھ کر لیکچر دینے کے لیے کالج گئے۔

ان دوستوں کے علاوہ کالج میں بیگ صاحب، فارق صاحب اور ۔ جسن تھے جو میرا بہت خیال رکھتے تھے۔ بیگ صاحب مجھے جگہ جگہ اپنے ساتھ لے جاتے تھے کبھی مولانا ابوالکلام آزاد کے پاس کبھی ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب کے پاس کبھی یونیورسٹی کے ایسے پروفیسروں کے پاس جن سے ان کی دوستی تھی۔ ان کی انسانیت اور محبت کا یہ عالم تھا کہ کالج کے لٹنے کے بعد کاغذوں کے جو انبار لگا دیئے گئے تھے ان میں سے انھوں نے میرے پی۔ ایچ۔ ڈی کے مقالے کی کاپی نکالی اور مجھے لاکر دی۔ یہ کہہ کر کہ اور چیزیں تو آئندہ بھی مل سکتی ہیں۔ یہ تھیسز نادر و نایاب چیز ہے اس لیے میں نے اس انبار میں سے اسی کا نکالنا مناسب سمجھا۔

کالج سے باہر اس زمانے میں دلی میں جوش صاحب تھے، بلونت سنگھ اور جگن ناتھ آزاد تھے، پریم ناتھ درد اور پرکاش پنڈت تھے جو میر۔ بہت خیال رکھتے تھے۔ جوش صاحب کے پاس تو میں روزانہ جاتا تھا۔ یونیورسٹی میں تین چار دن ایم۔ اے اور بی۔ اے آنرز کی کلاسیں ہوتی تھیں میں ان جماعتوں کو لیکچر دینے جاتا تھا۔ ایک بجے کے قریب لیکچر ختم کرکے میں فلیگ اسٹاف روڈ سے نیچے اتر کر علی پور روڈ پر آجاتا تھا جہاں جوش صاحب، عرش ملسیانی، جگن ناتھ آزاد اور بلونت سنگھ کا دفتر تھا۔ یہ سب لوگ رسالہ "آجکل" نکالتے تھے اور اسی سے وابستہ تھے۔ جوش صاحب مدیر اعلیٰ تھے اور بقیہ لوگ نائب مدیر۔

علی پور روڈ پر حکومت ہند کی وزارت اطلاعات کا جو دفتر تھا اس کے ایک کشادہ کمرے میں جوش صاحب بادشاہوں کی طرح بیٹھتے تھے۔ ملنے والوں کا تانتا بندھا رہتا تھا خدا جانے کہاں کہاں سے لوگ ان کے پاس آتے تھے اور جوش صاحب ہر ایک سے نہایت خندہ پیشانی سے ملتے تھے۔ جوش ملسیانی اور جگن ناتھ آزاد ان کے خاص مصاحب تھے اور ہر وقت ان کی خدمت میں حاضر رہتے تھے۔ میں بھی ہفتے میں تین چار روز ان کے پاس ضرور چلا جاتا تھا۔ جوش صاحب واقعی اس زمانے میں بادشاہ تھے۔ شاہانہ ٹھاٹھ سے رہتے تھے، بہت بڑی بیوک کار خود چلاتے تھے تیمار پور میں ان کا قیام تھا۔ دن دفتر میں گزارتے تھے۔ شامیں ان کی مختلف ٹھکانوں پر گزرتی تھیں۔ پنڈت جواہرلال

اور مولانا ابوالکلام آزاد سے اُن کی دوستی تھی اور وہ ان کی بڑی عزت کرتے تھے۔ وہ کسی وقت بھی ان کے پاس جاسکتے تھے اور ہر قسم کا کام ان سے ذاتی طور پر کروا لیتے تھے۔ واقعی اس زمانے میں ان کا بڑا اثر و رسوخ تھا۔ وہ ہندوستان کے سب سے بڑے قومی شاعر (POET LAUREATE OF INDIA) سمجھے جاتے تھے۔

مقبوضہ کشمیر کے وزیر اعلیٰ شیخ محمد عبداللہ کا اس زمانے میں طوطی بولتا تھا کیونکہ مقبوضہ کشمیر صرف ان کی وجہ سے ہندوستان میں شامل ہوا تھا۔ زبردستی اس پر قبضہ کیا گیا تھا۔ مہینوں لڑائی جاری رہی۔ پٹھانوں نے اچھا خاصا سبق پڑھایا لیکن ہندوستانی فوج کے سامنے وہ کیسے کامیاب ہو سکتے تھے۔ یہ مسلح فوج ہوائی جہازوں کے ذریعے کشمیر میں اتاری گئی تھی۔ میرے ایک پرانے کلاس فیلو چودھری سعیدالرحمٰن لکھنؤ یونیورسٹی میں میرے ساتھ پڑھتے تھے۔ اودھ کے بڑے تعلقہ دار تھے، فوج میں چلے گئے تھے۔ انھوں نے اپنی جائداد کے چھن جانے کے ڈر سے عارضی طور پر ہندوستان میں رہنے کا ارادہ کیا تھا۔ انھیں اسی زمانے میں سری نگر پوسٹ کر دیا گیا۔ بالآخر جب وہ پاکستانی فوج میں آئے تو انھوں نے بتایا کہ ہم لوگ سری نگر میں یہ انتظار کر رہے تھے کہ ہندوستانی فوج کے آنے سے پہلے پاکستانی فوج آجائے گی اور سری نگر پر ان کا قبضہ ہو جائے گا۔ لیکن پاکستانی فوج نہیں آئی۔ پٹھان حملہ آوروں کے بارے میں یہ سنا کہ وہ سری نگر سے چھ میل ادھر رک گئے۔ اور کچھ مال وغیرہ آپس میں تقسیم کرنے لگے۔ اتنے میں ہندوستانی فوج سری نگر میں اترنا شروع ہو گئی۔ پاکستانی فوج نہیں آئی کیونکہ سنا ہے کہ اس وقت کے انگریز کمانڈر ان چیف نے اس کی اجازت نہیں دی۔

یہ کاروائی کر کے ہندوستان نے شیخ عبداللہ کو وزیر اعلیٰ بنا دیا اور اس طرح مقبوضہ کشمیر میں ان کا طوطی بولنے لگا اور وہ اکثر دلی آنے جانے لگے۔ وہ جوش صاحب کے پرستاروں میں تھے۔ ان کی شاعری پر سر دھنتے تھے اور ان کی بڑی عزت کرتے تھے جب انھیں یہ معلوم ہوا کہ جوش صاحب ایک طویل نظم حرفِ آخر کے نام سے لکھ رہے ہیں اور وہ ابھی تک مکمل نہیں ہوئی ہے تو انھوں نے جوش صاحب کو مقبوضہ کشمیر آنے کی دعوت دی اور اس نظم کے کچھ حصے سن کر یہ کہا "جوش صاحب! آپ کشمیر تشریف لائیے۔ وہاں آپ کے قیام کا انتظام کیا جائے گا۔ آپ وہاں اطمینان سے رہیے اور اس نظم کو مکمل کیجیے:

جوش صاحب نے شیخ صاحب کی یہ دعوت قبول کر لی اور وہ کئی مہینے کشمیر میں جا کر رہے۔

شیخ صاحب نے اُن کے قیام کا بہت اچھا انتظام کیا اور تمام سہولتیں انھیں بہم پہنچائیں تاکہ وہ وہاں اطمینان سے اپنی معرکہ آرا نظم حرفِ آخر مکمل کر سکیں۔ شاید انھیں حالات سے متاثر ہو کر انھوں نے ایک نظم شیخ عبداللہ کے بارے میں بھی لکھی جس میں یہ کہا کہ میں نے بے شمار شیخ دیکھے ہیں لیکن شیخ عبداللہ کا سا شیخ نہیں دیکھا۔

"حرفِ آخر" تو جوش صاحب سے مقبوضہ کشمیر کے دوران قیام میں بھی مکمل نہ ہو سکی۔ صرف اس کے کچھ حصے مکمل کر سکے۔ شاید اس وجہ سے کہ وہ ایک طویل نظم تھی اور غور و فکر کا رنگ و آہنگ اس میں اتنا تھا کہ وہ کسی ایک جگہ بیٹھ کر مکمل نہیں کی جا سکتی تھی۔ چنانچہ چند مہینے مقبوضہ کشمیر میں شیخ عبداللہ کے مہمان رہ کر وہ دہلی واپس آ گئے۔

جوش صاحب کے دہلی آنے کے بعد ہم نے دہلی کالج میں ایک بہت بڑا مشاعرہ کیا۔ اس میں جوش صاحب کے علاوہ مولانا حسرت، جگر صاحب، اثر صاحب، مجاز، جاں نثار اختر اور جذبی وغیرہ شریک ہوئے۔ یہ مشاعرہ بڑے پیمانے پر دہلی کالج ہال میں ہوا اور رات گئے تک جاری رہا۔ جوش صاحب نے اس مشاعرے میں وہی نظم پڑھی جو شیخ عبداللہ کی تعریف میں تھی اور کچھ اشعار ایسے بھی پڑھے جس میں صاف صاف یہ کہا گیا تھا کہ شیخ عبداللہ کی کوششوں کے باوجود کشمیریوں کو پاکستان سے بڑی محبت ہے اور اگر جمہوری طور پر رائے لی جائے گی تو اس کا پاکستان میں شامل ہونا یقینی ہے۔ اور یہ نظم سناتے ہوئے ذرا رک کر نثر میں یہ بھی کہا کہ "ہم نے تو صاحب! جس سے بھی پوچھا کہ پاکستان سے ملنا چاہتے ہو یا ہندوستان سے تو اس نے یہی جواب دیا "پاکستان سے"۔ صاحب! ہمارا بوٹ والا بھی یہی کہہ رہا تھا۔"

یہ خبر دلّی میں مشہور ہوئی کہ جوش صاحب کشمیر کیا گئے، ہندوستان کا موقف کمزور ہو گیا۔ وہ اپنی آزادانہ باتوں سے اس موقف کو کمزور سے کمزور تر کر رہے ہیں۔ بات پنڈت جواہر لال تک بھی پہنچی۔ جوش صاحب سے ان کی ملاقات ہوئی تو انھوں نے کہا۔

"جوش صاحب! اصلیت کچھ بھی ہو لیکن خدا کے لیے آپ لوگوں سے یہ باتیں نہ کہیے۔ اس سے ہندوستان کو نقصان پہنچنے کا امکان ہے اور یہ ہے بھی ہندوستان کی بنیادی پالیسی کے خلاف۔"

لیکن جوش صاحب نے ہمیشہ یہی جواب دیا کہ صاحب! ہم تو سچ بات کہتے ہیں، ہم کبھی جھوٹ نہیں بولتے حقیقت یہی ہے اور اظہارِ حقیقت کوئی جرم نہیں ہے۔"

پنڈت جواہر لال نہرو کشمیر کے معاملے میں خاصے جذباتی تھے لیکن جوش صاحب کو وہ کیسے روک سکتے تھے؟ وہ تو جوش صاحب تھے! انھیں تو اظہارِ حقیقت سے کوئی بھی نہیں روک سکتا تھا۔ وہ بڑے ہی جرأت والے اور صاف گو آدمی تھے۔ کسی کی پروا نہیں کرتے تھے۔ حق گوئی اور بیباکی میں ان کا جواب نہیں تھا۔

دلّی میں جگہ جگہ اس زمانے میں خاصے عرصے تک ان باتوں کا چرچا رہا۔

دہلی کالج میں اس زمانے میں خاصا ادبی ماحول پیدا ہو گیا تھا، ادبی جلسے ہوتے رہتے تھے اور ان جلسوں میں پریم ناتھ در، جگن ناتھ آزاد، پرکاش پنڈت، شمشیر سنگھ نرولا، م۔ م۔ راجندر اور رضیہ فتح آبادی وغیرہ باقاعدگی سے شریک ہوتے تھے۔ صرف بلونت سنگھ ان جلسوں میں نہیں آتے تھے کیونکہ وہ کسی ادبی جلسے میں جانا پسند نہیں کرتے تھے۔ ویسے بلونت سنگھ میرے پاس کالج میں بڑی باقاعدگی سے آتے تھے اور خاصا وقت میرے ساتھ گزارتے تھے۔ اپنے افسانے بھی مجھے سناتے، اور سکھوں کے لطیفے بھی۔ میری تصویریں بھی کھینچتے اور خاصا وقت میرے ساتھ گزارتے لیکن اس دوستی میں کسی اور کو حائل نہیں ہونے دیتے تھے۔ وہ ایک تنہائی پسند آدمی تھے، اور صرف دو ایک آدمیوں سے مل سکتے تھے۔ مجمع میں بیٹھنے سے گھبراتے تھے۔

ہماری دوستی کا یہ عالم ہو گیا تھا کہ وہ تقریباً ہر شام کو میرے پاس آ جاتے، گھنٹوں میرے پاس بیٹھتے، باتیں کرتے، پھر ہم ایک ساتھ کناٹ پلیس جاتے۔ وہاں لارڈز ریسٹورنٹ میں چائے پیتے اور گپ کرتے۔ کبھی کبھی کوئی عجیب سی انگریزی فلم بھی دیکھ لیتے جس کا مقصد صرف وقت گزارنا ہوتا تھا۔

اسی زمانے میں ساحر لدھیانوی لاہور سے دلّی آ گئے۔ اردو بازار میں ان سے ملاقات ہوئی اور پھر باقاعدگی سے ملاقاتیں ہوتی رہیں جتنے دن وہ دلّی میں رہے انھوں نے خاصا وقت میرے

ساتھ گزارا۔ چند روز بعد ان کی والدہ بھی آگئیں۔ یہ لوگ پرانی دلّی سے خاصے فاصلے پر کسی دوست کے ہاں ٹھہرے تھے لیکن ساحر روزانہ میرے پاس آتے تھے۔ ہم سڑکوں پر گھومتے تھے اور خوب باتیں کرتے تھے اور کسی شرنارتھی سکھ کی دوکان پر کھڑے ہو کر پیڑے والی لسّی پیتے جو مجھے بہت اچھی لگتی تھی۔ ساحر لدھیانوی کے دلّی آنے سے ادبی فضا میں کچھ اور زندگی پیدا ہو گئی۔ حالی پبلشنگ ہاؤس کے مالک یوسف صاحب نے ایک رسالہ "شاہراہ" کے نام سے نکالنے کا پروگرام بنایا اور مجھے اور ساحر لدھیانوی کو اس کی ادارت کے لئے آمادہ کیا۔ ہم لوگ تیار ہو گئے۔ ایک دو شمارے ہماری ادارت میں نکلے تھے لیکن پھر ساحر لدھیانوی بمبئی چلے گئے اور اس کی ادارت ہم لوگوں نے پرکاش پنڈت کے سپرد کر دی کیونکہ میں تنہا کالج کے کام کے ساتھ رسالے کے کام کو اچھی طرح انجام نہیں دے سکتا تھا۔

ساحر لدھیانوی کے ساتھ میں اس زمانے میں علی گڑھ بھی گیا۔ رشید احمد صدیقی صاحب اور مسعود حسین خاں صاحب نے ہمیں شعبۂ اردو کے ایک جلسے میں شرکت کرنے کی دعوت دی۔ چنانچہ ہم لوگ علی گڑھ گئے اور مسعود صاحب کے ہاں قیام کیا۔ ان کے ایک عزیز حیدرآباد میں پولیس کے اعلیٰ عہدے پر فائز تھے۔ وہ بھی ان دنوں علی گڑھ آئے ہوئے تھے اور ان کا قیام بھی مسعود صاحب کے ہاں تھا۔ انھوں نے حیدرآباد پر حملے اور مسلمانوں کے قتل عام کی جو تفصیلات سنائیں ان کو سن کر ہمارے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ انھوں نے بتایا کہ سید قاسم رضوی کے رضاکار اس قدر جوش میں تھے کہ معمولی ہتھیاروں کے ساتھ ٹینکوں کے سامنے جا کر شہید ہو جاتے تھے۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ ٹینک کیا چیز ہے اور اس سے کس طرح نبرد آزما ہوا جاتا ہے۔ وہ اللہ اکبر کے نعرے لگاتے تھے اور شہادت کے شوق سے سرشار تھے لیکن بڑے ہی نادان اور بے خبر تھے۔ ہندوستانی فوجوں نے بُری طرح ان کا قتل عام کیا اور تین طرف سے یہ فوج شہروں میں قتل عام کرتی ہوئی دیہاتوں میں پھیل گئی۔ جہاں مسلمانوں کی آبادیاں تھیں انھیں ان فوجیوں نے تباہ و برباد کر دیا اور سب سے بڑا ظلم یہ کیا کہ عورتوں کی بے عزتی کی۔ کسی نوجوان لڑکی کو نہیں چھوڑا۔ انھوں نے بتایا کہ پولیس افسر کی حیثیت سے وہ خود وہاں موجود تھے اور یہ تمام مناظر انھوں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھے ہیں۔

جو تفصیل میں نے ان کی زبانی سُنی اس کو میں الفاظ میں بیان نہیں کر سکتا، کلیجہ منہ کو آتا ہے۔

علی گڑھ میں ہم لوگ کوئی چار پانچ دن رہے۔ وہاں خوف و ہراس نسبتاً کم تھا اور مسلمانوں کا شہر معلوم ہوتا تھا۔ اس زمانے میں وہاں نمائش بھی ہو رہی تھی اور اس میں وہی چہل پہل تھی جو علی گڑھ کی نمائش میں ہوا کرتی تھی۔ میں دلّی سے آیا تھا جو اس وقت پنجاب سے آئے ہوئے شرنارتھیوں کی بستی بن گئی تھی اس لیے علی گڑھ میں مسلمانوں کے ماحول کو دیکھ کر میرا دل خوش ہوا۔ ساحر لدھیانوی بھی اس ماحول سے خوش ہوئے اور ہمارا وقت علی گڑھ میں بہت اچھا گزرا۔

شعبۂ اردو میں ایک بڑا ادبی جلسہ ہوا۔ لڑکیاں پردے کے پیچھے بیٹھیں اور لڑکے ہمارے سامنے۔ میں نے جدید ادب پر لیکچر دیا اور ساحر لدھیانوی نے اپنا کلام سنایا۔ رشید صاحب نے اپنے مخصوص انداز میں ہمارا شکریہ ادا کیا۔ یہ فضا دلّی میں اب نہیں تھی۔ وہاں تو بس ایک نئے قسم کا ماحول تھا جس کو دیکھ کر وحشت ہوتی تھی اور وقت گزارنا مشکل معلوم ہوتا تھا۔

قیامِ پاکستان کے بعد میں مجبوراً سال ڈیڑھ سال دلّی میں رہا۔ اس لیے کہ مولانا ابوالکلام آزاد اور ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب نے مجبور کیا تھا اور کہا تھا کہ "آپ کے کالج کے مفاد میں یہ ہے کہ آپ کم از کم ایک تعلیمی سال یہاں گزاریں۔ جب کام چل نکلے اور کالج کے حالات معمول پر آجائیں تو آپ پاکستان چلے جائیے گا۔" ہم نے ان سے وعدہ کر لیا کہ کالج کے مفاد کے پیشِ نظر ہم لوگ فی الحال یہیں رہیں گے ابھی پاکستان نہیں جائیں گے۔

لیکن ایمان کی بات یہ ہے کہ دلّی کے اس نئے ماحول میں میری طبیعت پریشان رہتی تھی اور جی چاہتا تھا کہ اپنے تمام گھر والوں کو ساتھ لے کر کسی طرح اُڑ کر پاکستان چلا جاؤں۔

اس پریشانی میں اور بھی اضافہ اس وقت ہوا جب میں نے یہ دیکھا کہ ایک منصوبے کے تحت خاموشی کے ساتھ مسلمانوں کے آثار مٹائے جا رہے ہیں۔ دیکھتے دیکھتے مسلمانوں کے کئی قبرستان برابر کر دیے گئے۔ بے شمار قبروں کا نام و نشان باقی نہ رہا۔ اجمیری دروازے سے لے کر دلّی دروازے تک جو فصیل تھی اس کا ایک ایک پتھر میری آنکھوں کے سامنے نکالا جانے لگا۔ میں یہ دیکھ کر حیران تھا کہ دنیا کی قومیں تو

اپنے معمولی سے معمولی تاریخی آثار کو محفوظ رکھنے کی کوشش کرتی ہیں، اس کے لیے منصوبے بناتی ہیں اور زرِ کثیر اس پر صرف کرتی ہیں، لیکن دلی پر یہ کیا قیامت آئی ہے کہ شاہجہاں کی بنائی ہوئی فصیل کو صفحۂ ہستی سے نیست و نابود کیا جا رہا ہے۔ چند مہینے میں اس کا نام و نشان باقی نہ رہا۔ اس تاریخی فصیل کے وہ پتھر جن پر تاریخ لکھی ہوئی تھی خدا جانے کہاں گئے۔ اس فصیل کی جگہ اونچی اونچی عمارتوں کی تعمیر شروع ہوئی اور ان میں لوگوں کو بسایا گیا۔ اب وہاں فصیل نہیں تھی، عمارتیں ہی عمارتیں تھیں جنھوں نے رام لیلا گراؤنڈ کی کشادگی کو بھی خاک میں ملا دیا تھا۔ کوٹلہ فیروز شاہ جو دور سے نظر آیا کرتا تھا، اس کے آس پاس بھی عمارتوں کی تعمیر شروع کر دی گئی تھی اور فیروز شاہ تغلق کا تعمیر کروایا ہوا کوٹلہ ان عمارتوں کے پیچھے دب کر رہ گیا تھا۔ اب وہ دور سے نظر نہیں آتا تھا۔ ان کے علاوہ بھی قدیم عمارتوں کے ساتھ بہت کچھ ہوا۔ ساری دنیا خاموش رہی۔ مسلمان چوں نہ کر سکے۔

مولانا حفظ الرحمان نے اس زمانے میں عمارتوں کو محفوظ کرنے، مسجدوں کو بحال کرانے اور مزاروں کو بچانے کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا دی چنانچہ اس کے نتائج بھی اچھے نکلے، لیکن بڑی عمارتوں کو وہ بھی نہ بچا سکے۔ مسجدیں، ان کی کوششوں سے خاصی تعداد میں بحال ہو گئیں۔ حضرت خواجہ میر دردؒ کی درگاہ جہاں ان کے والد حضرت خواجہ ناصر عندلیبؒ، خواجہ میر اثرؒ اور میر محمدی بیدار وغیرہ کے مزار تھے جنونی ہندوؤں نے تباہ و برباد کر دیے تھے۔ مزار کھود ڈالے تھے، اس کی چار دیواری بھی ختم کر دی تھی۔ وہاں بھینسیں باندھی جانے لگی تھیں۔ آس پاس دور دور تک گوبر کے انبار لگا دیے تھے جس کی بُو فضا میں دور دور تک بسی ہوئی تھی۔ میں تو ہمیشہ سے تقریباً روزانہ ان مزاروں پر حاضری دیتا تھا۔ اب بھی چوری چھپے جاتا تھا اور فاتحہ پڑھتا تھا۔ مولانا حفظ الرحمٰن کی کوششوں سے یہ درگاہ بحال ہوئی۔ مزاروں کی مرمت کی گئی اور نئے کتبے لگائے گئے۔ یہ بہت بڑا کارنامہ تھا، لیکن اس درگاہ کو سکڑنا۔ اس کی زمین کے زیادہ حصے پر لوگوں نے قبضہ کر لیا اور وہاں رہنے لگے۔ انھیں کوئی روکنے والا نہ تھا۔

اگرچہ بظاہر اس وقت دلی میں امن تھا، لیکن فضا کچھ ایسی تھی کہ معلوم ہوتا تھا کہ ہنگامے کسی وقت

بھی شروع ہو سکتے ہیں اور اکا دُکا لوگوں کو مارا بھی جاتا تھا۔ میں روزانہ شام کو سیر کے لیے کناٹ پلیس جاتا تھا۔ جاتے ہوئے تو ڈر نہیں لگتا تھا لیکن جب رات کو واپسی ہوتی تھی تو ہمیشہ یہ خیال ذہن پر طاری رہتا تھا کہ کوئی پیچھے سے چھرا بھونک دے گا اور منٹو روڈ یا ٹاسن روڈ کی کسی جھاڑی یا نالے میں دوسرے دن ایک لاش پڑی ہوئی ملے گی جس کو کوئی پہچان بھی نہ سکے گا کیونکہ پوچھنے والا کوئی بھی نہیں تھا۔

خوف وہراس کا اب بھی یہ عالم تھا کہ مسلمانوں نے داڑھیاں منڈا دی تھیں اور وہ مغربی لباس پہننے لگے تھے تاکہ پہچانے نہ جاسکیں، لیکن پھر بھی پہچان لیے جاتے تھے۔ تحقیق کے لیے پتلونیں تک کھلوائی جاتی تھیں۔ مولانا سعید احمد اکبرآبادی کے ایسے بزرگ نے بھی داڑھی مونچھیں منڈوا دی تھیں اور کوٹ پتلون پہننے لگے تھے۔ اب ان کا قیام اردو بازار میں ندوۃ المصنفین میں مفتی عتیق الرحمٰن صاحب کے ہاں تھا۔ وہاں سے وہ حتی الامکان چھپ کر نکلتے تھے اور سینٹ اسٹیفنز کالج جاتے تھے اور اپنے فرائض منصبی پورے کرکے دوپہر کے بعد واپس آتے تھے۔ اس کے علاوہ کہیں آنا جانا انھوں نے موقوف کر دیا تھا۔ کلین شیو اور مغربی لباس میں وہ کہاں جاتے!

ان تمام حالات کا اثر مجھ پر کچھ ایسا تھا کہ الفاظ میں بیان نہیں کیا جاسکتا۔ میں ان حالات کو دیکھ دیکھ کر کچھ اور بھی پریشان رہنے لگا اور یوں محسوس ہوا جیسے میرا NERVOUS BREAK DOWN ہو گیا ہے۔ حد درجہ اداس، غمگین اور خستہ حال رہنے لگا! بیگ صاحب نے بہت تسلی دی، ڈاکٹر فاروق صاحب نے بہت ہمت بندھائی لیکن کچھ اثر نہ ہوا۔ یہ خبر بیگ صاحب کے ذریعہ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب اور مولانا ابوالکلام آزاد تک بھی پہنچی۔ ان دونوں بزرگوں نے میرے ساتھ بڑی ہمدردی کا اظہار کیا۔ انسان دوستی ان پر ختم تھی۔

ذاکر صاحب ایک دن کالج میں تشریف لائے۔ حال احوال پوچھا، خیریت معلوم کی، پھر کہنے لگے۔

”شانتی نکیتن میں اردو زبان وادب کی ایک پروفیسر شپ ہے جو نظام چیئر کہلاتی ہے۔ اگر آپ وہاں جانا چاہیں تو وہ آپ کو مل سکتی ہے۔ اچھا ہے سال دو سال کے لیے وہاں ہو آئیے۔ وہاں کے رومانی ماحول میں آپ کا دل ضرور لگ جائے گا۔ وہاں تو رقص وسرود، مصوری وموسیقی اور

حسن و جمال کی فضا ہے، یہ فضا ضرور آپ کا دل لبھائے گی اور آپ وہاں خوش رہیں گے۔ دہلی کی بدلی ہوئی فضا کی جو کیفیت ہے اس سے بھی کچھ عرصے کے لیے نجات مل جائے گی۔

میں نے کہا، "اگر آپ سمجھتے ہیں کہ میرا وہاں جانا مناسب ہے اور میں وہاں مفید کام کر سکوں گا تو میں جانے کے لیے تیار ہوں۔"

ذاکر صاحب نے کہا، "میرے خیال میں اچھی تبدیلی ہوگی۔ آپ کو تبدیلیٔ آب و ہوا کی ضرورت ہے۔ میں آپ کو چند روز میں اطلاع دوں گا بلکہ تقرری کا خط آپ کو بھجوا دوں گا۔"

اس ملاقات کے کوئی دو ہفتے بعد میرے پاس شانتی نکیتن سے اردو کی پروفیسری پر تقرری کا خط آ گیا اور میں عزیزوں اور دوستوں سے مشورہ کرنے لگا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔

یہ اطلاع کسی طرح بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب کو بھی کسی ذریعے سے کراچی پہنچ گئی۔ انھوں نے مجھے جذباتی سا خط لکھا کہ شانتی نکیتن ہرگز مت جانا، وقت ضائع ہوگا۔ پاکستان میں تمھاری ضرورت ہے اور تمھیں یہاں آنا چاہیے۔ ہندوستان میں بہت رہ لیے، اب پاکستان میں رہ کر کام کرنا چاہیے۔

خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ چند روز بعد ہی انجمن ترقی اردو کے معاملات کو طے کرنے کے لیے بابائے اردو کا دلی آنے کا پروگرام بن گیا۔ انھوں نے مجھے یہ اطلاع دی کہ میں فلاں تاریخ کو ہوائی جہاز سے دلی پہنچ رہا ہوں اور چوڑی والان میں ٹھہروں گا اور تمھارے مستقبل کے بارے میں مفصل باتیں کروں گا۔

چنانچہ مولوی صاحب پروگرام کے مطابق مقررہ تاریخ کو دلی تشریف لائے اور چوڑی والان میں ایک صاحب کے ہاں قیام کیا۔

میں ان سے ملنے گیا تو دیکھا بہت برہم ہیں۔ کہنے لگے "انجمن کے بارے میں میٹنگ ہو گئی۔ اس میٹنگ میں مولانا آزاد، ذاکر صاحب اور کچھ اور لوگ بھی تھے۔ میں نے یہ موقف اختیار کیا کہ انجمن ایک علمی ادارہ ہے۔ یہ ہندوستان اور پاکستان دونوں جگہ کام کر سکتی ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد یہی کہتے رہے کہ حکومت اس کے لیے تیار نہیں ہے۔ پاکستان اور ہندوستان دو ملک ہیں۔

اس لیے وہ کسی ایک جگہ ہی کام کر سکتی ہے۔

اس پر میں نے جل کر کہا "حکومت اب کہاں ہے، حکومت تو ۱۹۴۷ء کے بعد ختم ہو گئی۔ میں نے اب فیصلہ کیا ہے کہ میں کراچی ہی میں انجمن کا صدر دفتر قایم کروں گا اور وہیں کام کروں گا تمہارا پاکستان آنا ضروری ہے۔"

میں نے کہا "میں حاضر ہوں۔ جب بھی آپ فرمائیں گے، میں حاضر ہو جاؤں گا۔"

کہنے لگے "میں نے ڈاکٹر عمر حیات ملک وائس چانسلر پنجاب یونیورسٹی سے بات کی ہے۔ وہ اپنی یونیورسٹی میں بڑے پیمانے پر اردو کا شعبہ کھولنا چاہتے ہیں اور تمہیں اس شعبے میں لینے کے لیے تیار ہیں۔"

میں نے کہا "شانتی نکیتن جانے کا خیال میں نے چھوڑ دیا ہے۔ پنجاب یونیورسٹی میں رہنا میرے لیے بہتر ہوگا۔ میں اس طرح پاکستان میں اطمینان سے رہ سکوں گا اور اس طرح میرے گھر والے بھی پاکستان پہنچ جائیں گے۔"

یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ مولانا حسرت موہانی مولوی صاحب سے ملنے آ گئے۔ دونوں بزرگوں نے معانقہ کیا اور بے تکلفی سے باتیں کرنے لگے۔

مولانا حسرت نے اپنے تھیلے میں سے اسٹیٹسمین اخبار کا وہ پرچہ نکالا جس میں ان کی اس تقریر کے کچھ حصے شائع ہوئے تھے جو انھوں نے حیدرآباد پر ہندوستانی فوج کے حملے کے خلاف ہندوستانی پارلیمنٹ میں کی تھی۔ ان کی تقریر کے اس حصے پر سرخ نشان لگے ہوئے تھے۔ مولوی صاحب نے اخبار لے کر تقریر پڑھی اور مولانا حسرت کی جرات اور بیباکی کی داد دی۔ پھر اخبار مجھے دیا۔ میں نے بھی تقریر پڑھی۔ واقعی بڑی زوردار تقریر تھی۔ انھوں نے ہندوستانی حکومت کے بخیے ادھیڑ دیے تھے۔

مولوی صاحب اور مولانا حسرت بے تکلفی کے ماحول میں باتیں کرتے رہے اور میں خاموشی سے ان دونوں بزرگوں کی دلچسپ باتیں سنتا رہا۔

دلّی میں چند روز قیام کرنے کے بعد مولوی صاحب کراچی واپس چلے گئے۔ چلتے وقت مجھ سے

کہا کہ میرے خط کا انتظار کرنا۔ میں ڈاکٹر عمر حیات ملک سے بات کر کے تمہیں تفصیل سے لکھوں گا۔

مولوی صاحب کے کراچی جانے کے بعد ایک دن شاہد احمد دہلوی صاحب ایڈیٹر "ساقی" سے ملاقات ہو گئی۔ وہ کراچی سے دلی اپنے کچھ معاملات طے کرنے کے لیے آئے تھے۔ جامع مسجد کے قریب ٹرام میں بیٹھے رہے تھے۔ مجھے دیکھا تو اتر آئے کہنے لگے۔

"میاں! دلی میں کہاں مارے مارے پھر رہے ہو۔ یہاں رہنے کا اب کوئی فائدہ نہیں اب تو ہم سب کے لیے پاکستان ہی جائے پناہ ہے۔ جلدی آ جاؤ تو اچھا ہے۔ میں پرسوں آیا تھا۔ کل واپس جا رہا ہوں۔ یہاں اب دل نہیں لگتا۔ دلی اب دلی نہیں ہے کوئی اور شہر ہے۔"

میں نے ان سے کہا "انشاء اللہ جلد کوئی صورت نکلے گی اور آپ کو خوش خبری سناؤں گا۔"

یہ باتیں کر کے وہ تو کھاری باؤلی چلے گئے اور میں کالج آ گیا۔ ڈاک دیکھی تو اس میں ایک خط پنجاب یونیورسٹی لاہور کے رجسٹرار کا تھا جس میں یہ لکھا تھا کہ اورینٹل کالج میں ایک پوسٹ اردو کے سینئر لیکچرار کی ہے جو وائس چانسلر کی طرف سے آپ کو آفر کی جاتی ہے۔

میں سمجھ گیا کہ یہ آفر بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب کی سفارش پر پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر عمر حیات ملک کی طرف سے بھیجا گیا ہے۔ مولوی صاحب نے اپنے کسی خطبے میں کہا تھا کہ اردو زبان کی خدمت تین اداروں نے ایسی کی ہے کہ جس کو سنہری حروف میں لکھا جانا چاہیے۔ ایک فورٹ ولیم کالج، دوسرے مرحوم دہلی کالج اور تیسرے اورینٹل کالج لاہور۔ اس لیے میں نے ایک ایسے ادارے سے اپنی وابستگی کو اپنی خوش قسمتی پر محمول کیا اور لاہور جانے کا ارادہ کر لیا۔

میں نے اپنے کالج کے تمام دوستوں کو بتا دیا کہ میرے پاس پنجاب یونیورسٹی لاہور سے آفر آیا ہے۔ تنخواہ یہاں کے مقابلے میں بہت زیادہ ہے اور بدلے ہوئے حالات کے پیش نظر وہاں علمی ادبی کام کرنے کے امکانات بھی بہت روشن ہیں۔ اس لیے ہو سکتا ہے میں اس کو قبول کر لوں اور لاہور چلا جاؤں۔ اس کا ایک فائدہ یہ بھی ہو گا کہ میرے خاندان کے لوگ جو ابھی تک لکھنؤ میں رہتے ہیں میرے ساتھ جا کر اطمینان سے ایک جگہ رہ سکیں گے۔

یہ خبر سن کر سب لوگ خوش ہوئے لیکن افسوس کا اظہار بھی کہ ایک اچھا دوست اس طرح ہم سے بچھڑ جائے گا۔ کالیہ، مہرا اور مارک رجن کے ساتھ میرا زیادہ وقت گزرتا تھا۔ یہ سن کر زیادہ اداس ہوئے۔ ڈاکٹر رام بہاری جو اس وقت ڈین تھے کہنے لگے۔

"آپ کے لیے تو ہم اردو کی پروفیسرشپ قایم کر رہے ہیں۔ آپ اب کیوں جاتے ہیں؟ یہیں رہیے۔"

تاریخ کے پروفیسر سید حسن، جو لکھنؤ یونیورسٹی میں میرے کلاس فیلو تھے، اور جن کو میں نے استاد کی حیثیت سے اینگلو عربک کالج میں بلا لیا تھا، خاص طور پر بہت خوش ہوئے اور کہنے لگے۔" اورینٹل کالج بڑا مشہور تعلیمی اور تحقیقی ادارہ ہے نہ صرف ہندوستان میں بلکہ ساری دنیا میں اس کے پروفیسروں کی شہرت ہے، پروفیسر وولنر، پروفیسر شفیع، پروفیسر اقبال، بنارسی داس، حافظ محمود خاں شیرانی وغیرہ کا نام ساری دنیا میں مشہور ہے۔ مولانا محمد حسین آزاد اور علامہ اقبالؒ بھی اس ادارے سے وابستہ رہے ہیں تمہیں وہاں علمی اور تحقیقی کام کرنے کا موقع ملے گا کیونکہ کالج میں فضا علمی ہوگی اور پڑھانے کا کام بھی کم ہوگا۔"

چھ سات مہینے تک پنجاب یونیورسٹی اور اورینٹل کالج سے خط و کتابت ہوتی رہی جب تمام باتیں واضح ہوگئیں اور ہر اعتبار سے پختگی ہوگئی تو میں نے ان کے آفر کو قبول کر لیا۔

دلی کالج کے ارباب اختیار نے مجھے چھ مہینے کی چھٹی دے دی تاکہ میں وہاں جاکر حالات دیکھ لوں۔ اگر حالات سازگار ہوں، ماحول اچھا ہو، اور وہاں دل لگے تو وہاں رہوں، ورنہ واپس آجاؤں۔ اس فیصلے سے میں بہت خوش ہوا اس لیے کہ یہ سیاسی تبدیلیوں کے ہاتھوں پیدا ہونے والے مخصوص ماحول کو نظرانداز کرکے خالص علمی اور تعلیمی بنیادوں پر کیا گیا تھا اور اس میں بیگ صاحب، مولانا آزاد اور ذاکر صاحب کی روشن خیالی، انسانیت، علم دوستی، ادب نوازی اور شرافت کا بڑا ہاتھ تھا۔

اس فیصلے کے بعد میں نے رختِ سفر باندھا اور ۲۵ اپریل ۱۹۵۰ء کو ہوائی جہاز کے ذریعے دلی سے روانہ ہوا اور صرف ڈیڑھ گھنٹے میں لاہور پہنچ گیا۔

بارھواں

اورینٹل کالج، لاہور

اورینٹ ایرویز کا جہاز کوئی ساڑھے دس بجے کے قریب والٹن کے ہوائی اڈّے پر اُترا اور اس طرح میں لاہور پہنچ گیا۔ یہ سوچ کر کہ اب میں پاک سرزمین پر ہوں میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ خدا جانے کیوں بے اختیار رو دیا۔ یہ خوشی کے آنسو بھی تھے۔ کیونکہ میں یہ سوچ رہا تھا کہ اب میں ایسی سرزمین پر قدم رکھ رہا ہوں جو واقعی میرے لیے پاک اور بے حد مُقدّس ہے۔ کیونکہ میں نے بھی اس سرزمین کو حاصل کرنے، ایک عام کام کرنے والے ہی کی حیثیت سے ہی کام کیا تھا۔ اس سرزمین کو حاصل کرنے کے سلسلے میں اینگلو عربک کالج دہلی میں جو کچھ ہوا تھا، اس میں میں بھی شریک تھا۔ مسلم لیگ کے جلسے، مسلم لیگ کونسل کے اجلاس کے انتظامات کالج ہی کے سپرد تھے، اور میں بھی اپنے ساتھیوں کے ساتھ ان کاموں میں پیش پیش تھا، اور پھر اس کے بعد دلّی میں مسلمانوں پر جو بپتا پڑی تھی اُس کو میں نے بھی سہا تھا، اُن کی زندگیوں کو بچانے اور انھیں پاکستان پہنچانے میں کچھ میرا بھی حصّہ تھا کیونکہ پرانے قلعے کے ریفیوجی کیمپ میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ میں نے بھی کام کیا تھا — پھر شاید اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ مجھے اب یہ احساس تھا کہ یہ سرزمین اپنی ہے۔ یہاں جتنے لوگ بھی ہیں وہ سب اپنے ہیں۔ یہاں مجھے کوئی نہیں مارے گا۔ کوئی پیچھے سے چھُرا نہیں بھونکے گا۔ طمانیت کا احساس بھی کبھی کبھی انسان

کو رلاتا رہا۔ بہرحال میں جہاز سے اُتر کر رو رہا تھا۔ آنسو تھمتے ہی نہیں تھے۔ خدا جانے کیوں؟

والٹن کے ہوائی اڈے سے اُس زمانے میں ایر لائن کی بس اِن کے دفتر مال روڈ پر چیرنگ کراس آتی تھی۔ میں دوسرے مسافروں کے ساتھ اس بس میں بیٹھا اور کوئی آدھ گھنٹے میں اس بس نے مجھے مال روڈ پہنچا دیا۔ وہاں سے میں نے تانگہ کیا۔ تانگے والے سے کہا کہ مال روڈ پر ۶۳۔ سی جاؤں گا۔ یہ میرے ماموں زاد بھائی نصرت حسین صاحب کا مکان تھا جو کسٹم میں ملازم تھے اور قیام پاکستان کے فوراً بعد کسی فوجی اسپیشل میں بیٹھ کر سیدھے لاہور آ گئے تھے۔ یہ مکان اُن کے نام الاٹ ہو گیا تھا۔ یہ جگہ ریگل سینما کے قریب تھی۔ تانگے والے نے کوئی دس منٹ میں مجھے یہاں پہنچا دیا۔

میں نے تانگے سے اتر کر گھنٹی بجائی تو ایک ایسے شخص نے دروازہ کھولا جو شکل سے چار فٹ کا آدمی تھا۔ چہرے پر سیاہ داڑھی، سر پر سیاہ رنگ کی اونچی دیوار کی ٹوپی، لمبی قمیص اور پاجامے میں ملبوس یہ شخص مجھے جن معلوم ہوا۔

کہنے لگا ”فرمایئے۔ میں نصرت صاحب کا خانساماں ہوں۔ وہ دفتر گئے ہیں۔ دو ڈھائی بجے آئیں گے۔“

میں نے کہا ”میں ان کا پھوپھی زاد بھائی ہوں ـــــ دلّی سے ہوائی جہاز میں ابھی ابھی یہاں پہنچا ہوں۔ یہیں ٹھہروں گا۔ نصرت صاحب کو اطلاع دی تھی لیکن غالباً وہ خط انہیں ملا نہیں۔“

یہ سن کر اس نے میرا سامان تانگے سے اتار کر اندر کمرے میں رکھا اور میرے لیے لکڑی کے برادے کی انگیٹھی پر چائے بنانی شروع کی۔ چند منٹ میں چائے تیار ہو گئی۔ میں نے ایک پیالی پی اور اس سے کہا ”میں اورینٹل کالج جا رہا ہوں۔ دو ڈھائی بجے تک واپس آ جاؤں گا اور واپسی پر کھانا اُن کے ساتھ کھاؤں گا۔ میرا انتظار کریں۔“

میں نے مال روڈ پر آ کر تانگہ نہیں کیا۔ ایک صاحب سے اورینٹل کالج کا پتہ پوچھا

انھوں نے کہا مال پر سیدھے چلے جایئے۔ ہائی کورٹ اور جی۔ پی۔ او سے دائیں جانب مڑ کر سیدھے چلیے، نیلا گنبد انارکلی کے چوراہے کو پار کیجیے۔ بس لا کالج اور اورینٹل کالج آجائے گا۔ اس کے سامنے سینٹ ہال اور رجسٹرار کا دفتر بھی ہے۔"

شہر کو دیکھنے اور اس کے حسن سے لطف اندوز ہونے کے لیے میں نے پیدل چلنا ہی مناسب خیال کیا۔

اگرچہ دوپہر کا وقت تھا۔ آخر اپریل کی دھوپ بھی تیز تھی لیکن لاہور کی لطیف ہوا اور آسمان سے باتیں کرتے ہوئے اونچے اونچے ہرے بھرے درختوں کے سایے نے موسم کو خوشگوار بنا دیا تھا جس کی وجہ سے مجھے پیدل چلنے میں کوئی تکلیف نہیں ہوئی بلکہ لطف آیا۔ بلکہ لطف آیا۔

مال روڈ کا حسن واقعی دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ صاف ستھری سڑک، اونچی اونچی عمارتوں کے ساتھ جو ہرے بھرے درخت تھے وہ آنکھوں میں ٹھنڈک اور دل میں ایک عجیب طرح کا سرور پیدا کرتے تھے۔ سڑک کے دونوں طرف فٹ پاتھ کے ساتھ لمبی لمبی کیاریاں بنی ہوئی تھیں جن میں سبزہ اپنی بہار دکھا رہا تھا۔ رنگ رنگ کے پھول کھلے ہوئے تھے اور جگہ جگہ ان کیاریوں میں چھوٹے چھوٹے بورڈ لگے ہوئے تھے جن پہ فصیح اردو میں لکھا تھا۔ "ازراہ نوازش سڑک پر چلیے، سبزے پر چلنا اور پھول توڑنا آپ کے ایسے باذوق انسان کے لیے مناسب نہیں۔" مال روڈ پر ٹریفک بھی کچھ ایسا زیادہ نہیں تھا۔ کاریں کم تھیں۔ طرحدار قسم کے لاہوری تانگے زیادہ چلتے تھے جن سے اس خوبصورت سڑک کے حسن و جمال میں اضافہ ہوتا تھا۔ صحت مند اور خوش پوش مرد اور خوبرو برقع پوش خواتین اس سڑک کے حسن و جمال کو دوبالا کر رہی تھیں۔

میں مال روڈ کے ان مناظر سے لطف اندوز ہوتا ہوا نیلے گنبد اور انارکلی کے چوراہے کو پار کر کے تھوڑی دیر میں اورینٹل کالج پہنچ گیا۔

کالج میں اس وقت سنّاٹا تھا۔ طالب علم جا چکے تھے۔ کچھ پروفیسر البتہ اپنے اپنے کمروں میں ابھی تک بیٹھے تھے۔ کچھ چپراسی بھی نظر آ رہے تھے۔ میں نے اُن میں سے ایک سے پوچھا "ڈاکٹر عبداللہ کہاں بیٹھتے ہیں؟"

جواب ملا "سامنے چلے جائیے۔ بائیں جانب اُن کا کمرہ ہے۔ نام کی تختی لگی ہوئی ہے۔"

بعد میں معلوم ہوا یہ کالج کا پرانا چپراسی مہردین تھا جس نے مجھے تفصیل سے ڈاکٹر عبداللہ کا پتہ بتایا۔ بہت شائستہ آدمی معلوم ہوا۔

میں نے اطلاع کروائی۔ میرا نام سن کر سید صاحب خود باہر آئے اور بڑی محبت سے مجھے اپنے کمرے میں لے گئے، اپنے برابر کرسی پر بٹھایا، حال احوال پوچھا، اور خوشی کا اظہار کیا۔

کہنے لگے "عرصے سے آپ کا انتظار تھا۔ شکر ہے کہ آپ لاہور پہنچ گئے۔ ہمارے شعبے کو آپ کی بڑی ضرورت تھی۔ یہاں تنقید کا پرچہ پڑھانے والا کوئی نہیں تھا۔ آپ نے تو اردو تنقید پر اعلیٰ درجے کا کام کیا ہے۔ طالب علم آپ سے استفادہ کریں گے۔"

میں نے کہا "میں ہر خدمت کے لیے حاضر ہوں۔"

سید صاحب نے اسی وقت مجھ سے جوائننگ رپورٹ لکھوائی، اور ٹائم ٹیبل بھی مجھے دے دیا۔

کہنے لگے "یہاں ابھی نیا نیا ایم اے کھلا ہے۔ ہم نے سب کے لیے دروازے کھول رکھے ہیں۔ بہت سے ادیب اور شاعر بھی ایم اے میں داخل ہو گئے ہیں۔ دفتروں کے لوگ بھی ایم اے کے طالب علم ہیں ــــ سب ملا کر کوئی ڈیڑھ سو طالب علم ہیں۔ بیشتر شاید عمر میں آپ سے بڑے ہوں گے لیکن بزرگی عقل و علم سے ہوتی ہے نہ کہ سال سے۔ آپ کل ہی سے لیکچر دینا شروع کر دیجیے۔ گرمیوں کا زمانہ ہے، اس لیے لیکچر صبح سات بجے شروع ہو جاتے ہیں۔ کل صبح آپ کا لیکچر سات بجے ہوگا۔ آپ کو صبح جلدی آنے میں تکلیف تو نہیں ہوگی؟"

میں نے کہا "میں یہاں سے قریب ہی مال روڈ پر ٹھہرا ہوں۔ سحر خیزی میری عادت

ہے، اس لیے مجھے سات بجے صبح کالج پہنچنے میں کوئی دشواری نہیں ہوگی۔ میں ان شاء اللہ کل صبح سے لیکچر دینا شروع کردوں گا۔"

سید صاحب نے چائے منگوائی۔ ہم لوگ باتیں کرتے رہے اور چائے پیتے رہے۔

دو بجے کے بعد میں وہاں سے رخصت ہوا اور اپنی جائے قیام پر آیا۔ میرے ماموں زاد بھائی نصرت صاحب دفتر سے آگئے تھے اور میرا انتظار کر رہے تھے۔ بڑی محبت سے ملے۔ میرے پاکستان آنے سے خوش ہوئے۔ ہم نے کھانا کھایا اور دیر تک باتیں کرتے رہے۔ ہندوستان اور پاکستان کی باتیں، بریلی، لکھنؤ اور ردولی کی باتیں۔

شام کو انھوں نے مجھے مال روڈ کی سیر کرائی۔ ایک اچھے ریسٹورنٹ میں چائے پلائی اور ہم رات گئے گھر واپس آئے۔

دوسرے دن صبح کو میں معمول کے مطابق فجر کے وقت اٹھا اور حوائج ضروری سے فارغ ہوکر سات بجے سے پہلے ہی کالج پہنچ گیا۔ سات بجے لیکچر کا وقت تھا۔ ٹھیک سات بجے میں لیکچر روم میں پہنچا لیکن وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ میں اکیلا کلاس روم میں بیٹھا رہا۔ ساڑھے سات بجے کے قریب ایک طالب علم آیا، پھر دوسرا، پھر تیسرا، پھر کچھ لڑکیاں آئیں۔ کوئی آٹھ بجے تک کچھ لڑکے لڑکیاں جمع ہوئے۔ میں نے ان طالب علموں سے کہا کہ "میرا لیکچر سات بجے سے آٹھ بجے تک ہے۔ اب آٹھ بج رہے ہیں، اس لیے لیکچر کا وقت ختم ہوگیا۔ اب میں نیچے اپنے کمرے میں بیٹھتا ہوں کسی کو ملنا ہو تو میرے پاس آسکتا ہے۔"

طالب علموں نے مجھے بتایا کہ سات بجے کی بجائے لیکچر آٹھ بجے ہی شروع ہوتے ہیں کیونکہ اساتذہ تاخیر سے آتے ہیں اور اس طرح گھنٹے پون گھنٹے کی تاخیر ہو جاتی ہے۔

میں تو وقت کی پابندی کرنے والا آدمی تھا اس لیے یہ بات کہ اساتذہ اور طلبا ایک گھنٹے کی تاخیر سے آئیں میری سمجھ سے باہر تھی۔ اس لیے میں نے ان سے کہا کہ "آپ فیصلہ کرکے مجھے بتادیجیے کہ سات بجے آئیں گے یا آٹھ بجے۔ اگر سات بجے کا وقت ہوگا تو جیسے ہی

گھڑی کی سوئی سات پر آئے گی میں کلاس میں پہنچ جاؤں گا۔"

چنانچہ طالب علموں نے یک زبان ہو کر کل سے ٹھیک سات بجے آنے کا وعدہ کیا، اور دوسرے دن سے میں نے ٹھیک سات بجے اپنا لیکچر شروع کر دیا۔ لیکچر کے دوران میں نے محسوس کیا کہ طالب علم سر ہلا رہے ہیں بلکہ جھوم رہے ہیں۔ بعد میں معلوم ہوا کہ ڈاکٹر عبداللہ کے لیکچر میں بھی طالب علم جھومتے ہیں، کیونکہ وہ مزے لے لے کر غزلوں کے اشعار سناتے ہیں، خود بھی جھومتے ہیں اور ان کو اس عالم میں دیکھ کر طالب علم بھی جھومتے ہیں۔

میرے لیے یہ نیا اور عجیب تجربہ تھا۔

ایک اور دلچسپ بات یہ دیکھی کہ لیکچر کے دوران دفتر کے ایک کلرک صاحب احمد دین بے تکلفی سے کلاس روم میں آتے تھے اور حاضری لینا شروع کرتے تھے۔ پروفیسر کو اس موقع پر اپنا لیکچر روک دینا پڑتا تھا۔ ایک دو دن تو میں نے احمد دین کو برداشت کیا پھر اس کے بعد لیکچر روم میں داخل ہونے کی اجازت نہیں دی۔

یہ احمد دین کے لیے نیا تجربہ تھا۔ اسے اس سے قبل اس قسم کے پروفیسر سے پالا نہیں پڑا تھا۔

میرے آنے سے قبل اورینٹل کالج کے شعبۂ اردو میں سید وقار عظیم صاحب اور ابواللیث صدیقی صاحب آ چکے تھے۔ دوسرے دن ان دونوں سے میری تفصیلی ملاقات ہوئی۔ دونوں بہت خوش ہوئے۔ اب شعبے میں پانچ استاد ہو گئے۔ میں، ڈاکٹر عبداللہ، لیث صاحب، وقار صاحب اور مشرف انصاری۔ مشرف انصاری ہم سب سے پہلے اورینٹل کالج میں آئے تھے۔ ان کا تقرر عارضی طور پر کالج کے مستقل پرنسپل اور عربی کے پروفیسر ڈاکٹر برکت علی قریشی صاحب نے کیا تھا۔ مشرف انصاری جلد ہی ہمارا ساتھ چھوڑ گئے کیونکہ انھیں کنفرم نہیں کیا گیا۔

اس زمانے میں اورینٹل کالج میں دو طرح کے تعلیمی نظام تھے، ایک تو مغربی جس کے تحت

ایم۔ اے اور پی ایچ ڈی کی ڈگریاں دی جاتی تھیں، دوسرا مشرقی جس کے تحت مولوی فاضل منشی فاضل اور ادیب فاضل کی جماعتیں تھیں۔ جن میں عربی، فارسی اور اردو پڑھائی جاتی تھی ان کا امتحان بھی اس وقت یونیورسٹی کے سپرد تھا جو طالب علم ان امتحانوں میں کامیاب ہو کر اور سندیں حاصل کر کے بی اے کا صرف انگریزی کا امتحان پاس کر لیتے تھے، انھیں ایم۔ اے میں داخل کر لیا جاتا تھا۔ فیس صرف آٹھ آنے لی جاتی تھی۔ ہوسٹل کا خرچ آٹھ دس روپے سے زیادہ نہیں تھا کچھ عرصے بعد ایم۔ اے کی فیس بڑھا کر پانچ روپے کر دی گئی۔ ظاہر ہے کہ وہ بھی نہ ہونے کے برابر تھی۔

اساتذہ میں کچھ تو یونیورسٹی کے پروفیسر ہوتے تھے، جیسے پروفیسر وولنر، پروفیسر شفیع، پروفیسر اقبال، پروفیسر لکشمن سروپ وغیرہ، اور کچھ مشرقی نظام کی جماعتوں کو پڑھانے والے اساتذہ مثلاً مولانا رسول خاں، مولانا سید مبارک شاہ، مولانا فیوض الرحمن، مولانا نور الحسن خاں اور مولانا عبدالصمد صارم وغیرہ

کالج بظاہر دیکھنے میں چھوٹا سا تھا لیکن اس کی علمی اور تحقیقی روایت نے نہ صرف ہندوستان بلکہ ساری دنیا میں اس کی عظمت کے جھنڈے گاڑ دیئے تھے ـــ اس کالج سے جو طلبا فارغ التحصیل ہو کر نکلے تھے، ان میں مولانا امتیاز علی خاں عرشی، پروفیسر شادانی وغیرہ کا بڑا نام تھا۔

سب سے زیادہ سینیئر یونیورسٹی پروفیسر کالج کا پرنسپل ہوتا تھا۔ اس وقت عربی کے یونیورسٹی پروفیسر ڈاکٹر برکت علی قریشی صاحب پرنسپل تھے جو چند ہفتے ہوئے لبنان میں سفیر ہو کر بیروت چلے گئے تھے۔ ڈاکٹر عبدالستار اور ڈاکٹر محمد باقر ریڈر تھے۔ دوران میں یہ جھگڑا تھا کہ قریشی صاحب کی جگہ قائم مقام پرنسپل کون ہو، اس جھگڑے کے نتیجے میں یونیورسٹی نے قائم مقام پرنسپل ڈاکٹر شوستری کو بنا دیا تھا جو ایرانی النسل تھے لیکن میسور میں رہتے تھے۔ وہ دو سال کے معاہدے پر (READER IN SPOKEN IRANIAN) بولنے والی فارسی کے ریڈر کی حیثیت سے بلائے گئے تھے۔ ریٹائرڈ آدمی تھے۔ اس سے قبل بھی برسوں پہلے وہ اورینٹل کالج میں فارسی کے

ریڈر رہ چکے تھے۔ ان کی مادری زبان فارسی تھی لیکن چونکہ ہندوستان میں ایک زمانے تک رہے تھے اس لیے اردو روانی کے ساتھ بولتے تھے۔ اُن سے کئی بار مفصل گفتگو ہوئی جس سے معلوم ہوا کہ وہ اورینٹل کالج کے ماحول کو اچھی طرح سمجھتے ہیں اور اسٹاف کے پرانے لوگوں کو اچھی طرح جانتے ہیں۔

پرانے اساتذہ میں ڈاکٹر سید عبداللہ بڑے باقاعدہ آدمی تھے۔ ہر وقت سوٹ پہنے رہتے تھے اور شوخ سی ٹائی لگائے رہتے تھے۔ سوٹ پر سیاہ رنگ کی اکیڈمک گاؤن بھی پہنتے تھے۔ کمرے میں بیٹھتے تھے تب بھی، کیڈمک گاؤن نہیں اتارتے تھے۔ کلاس میں لیکچر دینے کے لیے جاتے تھے تو اُن کا چپراسی گل محمد اُن کی کتابیں وغیرہ پہلے جاکر کلاس روم کی میز پر رکھتا تھا۔ جس کا مقصد درحقیقت اس بات کا اعلان کرنا ہوتا تھا کہ سید صاحب لیکچر دینے کے لیے تشریف لا رہے ہیں۔ پھر سید صاحب، اکیڈمک گاؤن زیب تن کیے خراماں خراماں کلاس روم کی طرف جاتے تھے، اور پھر لیکچر شروع کرتے تھے جس کو سن کر لڑکے جھومتے تھے۔ لیکچر کا وقت ایک گھنٹہ تھا لیکن سید صاحب سوا گھنٹہ یا ڈیڑھ گھنٹہ پڑھاتے تھے۔ اُن کا لیکچر دلچسپ ہوتا تھا اور وہ محنت اور شوق سے لیکچر دیتے تھے۔

لیکچر کے بعد وہ زیادہ وقت اپنے کمرے میں بیٹھتے تھے اور دفتری کام کرتے تھے۔ کمرے کے دروازے کے سامنے گیلری میں ایک چپراسی بیٹھا اونگھتا رہتا تھا۔ دروازے پر کاغذ کی چٹیں لٹکی رہتی تھیں، کوئی ملنے والا آتا تو پہلے چٹ پر اپنا نام لکھ کر اندر بھیجتا۔ سید صاحب اگر مصروف نہ ہوتے تو اس کو بلا لیتے۔ مصروف ہوتے تو اس کو اسٹاف روم میں بیٹھ کر انتظار کرنا پڑتا۔ کبھی ایسا ہوتا کہ سید صاحب چٹ پر لکھے ہوئے نام کے نیچے لکھتے "کام؟"۔ بعض طالب علم شریر بھی ہوتے ہیں۔ وہ اس چٹ پر لکھتے "سلام" اور وہاں سے تو دو گیارہ ہو جاتے۔ غرض دن بھر یہ "نامہ و پیام" کا سلسلہ جاری رہتا۔

میرے لیے یہ دفتری ماحول تھا، بیوروکریسی کا ماحول تھا۔ اس لیے مجھے اچھا نہیں

لگتا تھا لیکن اس کو کیا کیا جائے کہ اس وقت اورینٹل کالج میں ماحول یہی تھا۔ انگریزوں سے ہندوستان میں حکومت کرنے کا جو نظام بنایا تھا اس کی ایک مسخ شدہ صورت مجھے یہاں نظر آئی۔ پاکستان بن چکا تھا لیکن پرنسپل کو اب بھی پرنسپل بہادر لکھا جاتا تھا۔ انیسویں صدی کے انگریز پرنسپلوں کے وقت سے یہ روایت چلی آرہی تھی۔ پروفیسر وولنر کے بعد پروفیسر شفیع تک یہ سلسلہ قائم رہا۔ ڈاکٹر عبداللہ بھی اُن کے نقشِ قدم پر چلنے کی کوشش کرتے تھے

میں اس ماحول سے مطابقت پیدا نہ کر سکا۔

سید صاحب انتظامی معاملات میں بہت سخت تھے۔ سختی سے دفتری اصولوں کی پابندی کرتے تھے، فائلیں بناتے تھے معمولی سی اطلاع بھی کسی کو دینی ہو تو باقاعدہ خط لکھا جاتا تھا، وہ ٹائپ ہوتا تھا کاپی بھی PEDN BOOK پر چڑھایا جاتا تھا جس کو اطلاع دی جاتی تھی اُس کے دستخط لئے جاتے تھے اور ان کاموں میں سید صاحب دفتر کے لوگوں کو دن بھر مصروف رکھتے تھے منٹ منٹ پر کمرے میں گھنٹیاں بجتی رہتی تھیں، اور چپراسی اندر جاتا رہتا اور باہر آتا رہتا تھا۔

اگرچہ سید صاحب ابھی پرنسپل نہیں ہوئے تھے، صرف صدر شعبہ تھے لیکن اکیڈمک گاؤن زیب تن کرکے کالج کا راؤنڈ لیتے تھے۔ غالباً یہ دیکھنے کے لیے کہ استاد پڑھا رہے ہیں یا نہیں۔

ایک دن عجیب وغریب واقعہ ہوا۔ میں جب اسٹاف روم میں پہنچا تو دیکھا فارسی کے استاد مولانا فیوض الرحمٰن صاحب مرحوم اداس اور زندگی سے بیزار بیٹھے ہیں۔

میں نے پوچھا ”مولانا! کیسا مزاج ہے؟ طبیعت تو ٹھیک ہے؟ آپ کچھ اداس اور پریشان نظر آرہے ہیں:

کہنے لگے ”کیا عرض کروں؟ آج صبح میں جب کلاس میں پڑھانے کے لیے پہنچا تو سید صاحب کی ایک چٹ ملی جس میں لکھا تھا کہ آپ آج تاخیر سے کلاس میں گئے۔ میں نے اسی چٹ پر لکھ دیا کہ میں صحیح وقت پر کلاس میں گیا، اور پورا ایک گھنٹہ پڑھایا۔ اس پر سید صاحب نے یہ لکھ کر بھیجا کہ ”آپ غلط کہتے ہیں“ مجھے اس سے پہلے کبھی ایسا تجربہ نہیں ہوا،

طبیعت بد مزہ ہے۔"

میں حیران ہوا۔ میں نے مولانا کو تسلی دی اور کہا کہ "آپ ان چھوٹی چھوٹی باتوں کا خیال نہ کیجیے۔ کام تو چلتا ہی رہتا ہے۔ استاد کا مرتبہ بہت بلند ہے۔"

لیکن مولانا کی اداسی اور پریشانی کم نہ ہوئی۔ بیمار رہنے لگے، اور بالآخر جلد ہی اس دُنیا سے رُخصت ہو گئے۔

اس زمانے میں شعبۂ اردو میں ایک مددگار جمیل الرحمٰن تھے۔ نہایت مہذب، شائستہ سچے اور مستعد اور ذمے دار آدمی تھے۔ شعبے کا دفتری کام نہایت محنت اور تن دہی سے کرتے تھے۔ صبح سے شام تک دفتری کام میں مصروف رہتے تھے۔ دفتر کا کام گھر پر بھی لے جاتے تھے۔ اتفاق سے اُن کے والد دیوبند ضلع سہارنپور میں بیمار ہوئے تو جمیل چار دن کی چھٹی لے کر انھیں دیکھنے کے لیے دیوبند گئے۔ لیکن والد کی طبیعت سنبھلی نہیں۔ اس لیے انھوں نے تار دیا اور پانچ دن کی مزید چھٹی کے لیے درخواست پیش کی۔ یہ تار آیا تو میں اور وقار عظیم صاحب سید صاحب کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ انھوں نے تار ہماری طرف بڑھایا، اور کہا "جمیل الرحمٰن نے پانچ دن کی مزید چھٹی مانگی ہے۔" اس پر وقار عظیم صاحب نے کہا "والد کی طبیعت زیادہ خراب ہوگی، اس لیے مجبور ہو گئے ہوں گے۔ انسان بے بس ہے۔" سید صاحب کہنے لگے "نہیں، یہ صرف بہانہ ہے۔ چار پانچ دن مزید وہاں رہنا چاہتے ہوں گے۔ اس لیے یہ تار دیا ہے۔" اور پھر کالج کے ہیڈ کلرک سید احسان الحق کو بلایا، اور کہا کہ "چار دن تک روزانہ سرکاری خرچ پر ایک تار دیتے رہیے جس میں لکھیے کہ چھٹی منظور نہیں ہوئی فوڑاً واپس آ جائیے۔"

یہ سن کر وقار عظیم صاحب سے نہ رہا گیا کہنے لگے "سید صاحب! ایک تار کافی ہے۔ چار عدد دینے سے کیا فائدہ ہوگا؟"

سید صاحب نے فرمایا "اس لئے کہ جمیل الرحمٰن چین سے نہ بیٹھ سکیں۔ چار دن تک روزانہ ایک تار دینے کا یہی مقصد ہے کہ انھیں سکون نصیب نہ ہو اور وہ اطمینان سے ایک دن بھی

وہاں نہ گزار سکیں۔"

یہ سن کر وقار صاحب چپ ہو گئے۔ انھیں بہت صدمہ ہوا، اس لیے کہ انسان دوست آدمی تھے، میں بھی خاموش رہا۔

لیکن اس جملے نے میرے دل پر کٹاری کا کام کیا۔

ویسے سید صاحب میرے ساتھ بڑی شفقت اور محبت سے پیش آتے تھے۔ ہمیشہ کہتے تھے "آپ آگئے ہیں، آپ کی وجہ سے شعبۂ اردو میں لکھنے پڑھنے کا صحیح ماحول پیدا ہوگا۔ آپ کے مضامین میں نے پڑھے ہیں، ماشاء اللہ خوب لکھتے ہیں۔ بڑی خیال انگیز باتیں کرتے ہیں، میں اب تک پرانے انداز کے مقالات لکھتا رہا ہوں۔ اب میں بھی نئے انداز کے تنقیدی مقالات لکھوں گا۔ طالب علم آپ کے لکچروں کی بڑی تعریف کرتے ہیں۔"

میں ان کی یہ باتیں سن کر ہمیشہ یہی کہتا تھا کہ "آپ کی محبت ہے، ورنہ میں کسی قابل نہیں ہوں۔"

اس زمانے میں میں نے طالب علموں کو ناول، افسانہ، شاعری، تاریخِ ادب اور علامہ اقبالؒ پر خاصی تعداد میں لکچر دیئے اور وہ ان لکچروں کو سن کر خوش ہوئے، ہو سکتا ہے کچھ فائدہ بھی ہوا ہو۔

موسم گرما کی تعطیلات کے آغاز تک یہ سلسلہ جاری رہا۔

اکتوبر میں موسم گرما کی تعطیلات کے بعد جب یونیورسٹی کھلی اور نیا ٹائم ٹیبل بنا تو اس میں ایم۔ اے کا میرا ہفتے میں صرف ایک گھنٹہ دکھایا گیا تھا لیکن ۲۸ گھنٹے ادیب فاضل کی جماعت کو پڑھانے کے لئے دیئے گئے تھے۔

یہ بات میری سمجھ سے باہر تھی۔ کیونکہ یونیورسٹی نے مجھے ایم۔ اے اور پی ایچ ڈی کے کام کے لئے خصوصی آفر بھیج کر بلایا تھا، اور سینیئر لکچرار کی MAXIMUM تنخواہ دے کر میرا تقرر کیا تھا۔ ساتھ ہی یہ وعدہ بھی کیا تھا کہ آپ کو جلد ہی ریڈر بنا دیا جائے گا۔ اس وقت ریڈر کی کوئی

پوسٹ نہیں ہے۔ سینیر لیکچرار اور ریڈر کی تنخواہ میں صرف سو روپے کا فرق ہے۔ اور مجھے جو تنخواہ دی گئی ہے، وہ شعبے کے تمام اساتذہ کی تنخواہوں سے زیادہ ہے۔

ان حالات کی روشنی میں ادیب فاضل کی جماعتوں کو ہفتے میں اٹھائیس گھنٹے پڑھانے کا کام مجھے ایک معمّا معلوم ہوا۔

سید صاحب سے کہا تو انھوں نے فرمایا "آپ کا تقرر جس پوسٹ پر ہوا ہے، وہ ادیب فاضل کو پڑھانے کے لیے ہے۔ اس لئے آپ کو زیادہ کام اسی جماعت کا دیا گیا ہے"۔

یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی اس لئے میں نے کہا کہ "میں اس سلسلے میں وائس چانسلر صاحب سے بات کروں گا مجھے ہفتے میں ادیب فاضل کو ۲۸ گھنٹے پڑھانا منظور نہیں ہے۔

چنانچہ میں نے وائس چانسلر کو خط لکھا۔ یونیورسٹی کے مستقل وائس چانسلر ڈاکٹر عمر حیات ملک اس وقت انڈونیشیا میں سفیر ہو کر چلے گئے تھے۔ جسٹس ایس۔ اے رحمٰن اس وقت قائم مقام وائس چانسلر تھے۔ انھوں نے مجھے اپنے گھر بلایا۔ میں شام کو ان کے گھر ۴۰۔ لارنس روڈ پہنچا۔ بڑی شفقت اور محبت سے ملے۔ روداد سنی۔ چائے پلائی اور کہا "یہ فیصلہ صحیح نہیں ہے۔ آپ کو تو سابق وائس چانسلر ڈاکٹر عمر حیات ملک اور پرنسپل ڈاکٹر برکت علی قریشی صاحب نے ذاتی خط لکھ کر بلایا ہے اور آپ کے تمام مطالبات منظور کئے ہیں۔ آپ سے تو زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانا چاہیئے۔ آپ چند سطریں لکھ کر مجھے دید دیجئے، میں اس پر اپنا فیصلہ لکھ دوں گا۔

میں نے تعمیل کی۔ رحمٰن صاحب نے اس پر یہ حکم صادر کیا کہ ڈاکٹر عبادت کو دفتری چکّروں میں نہ اُلجھایا جائے، وہ ہمارے لئے محترم ہیں۔ ان کی خدمات سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانا چاہیئے۔ وہ سینیر اساتذہ میں ہیں اس لئے انھیں ایم۔ اے اور پی ایچ ڈی کا کام زیادہ دینا چاہیے۔

رحمٰن صاحب واقعی بڑے عظیم انسان تھے۔ انھیں انسان دوستی، نیکی، شرافت اور محبت کا پیکر کہا جائے تو بے جا نہیں؛

یہ الجھن اس طرح دور ہوئی۔

چند ماہ بعد ڈاکٹر برکت علی قریشی صاحب لبنان کی سفارت سے استعفیٰ دے کر اورینٹل کالج کی پرنسپلی پر واپس آ گئے۔ انھوں نے وائس چانسلر کے احکام مجھے ایک خط کی صورت میں لکھ کر بھیج دیئے۔ ان کی روشنی میں شعبے کے تمام اساتذہ کے کام کا جائزہ لیا گیا اور ایم۔اے اور دوسری جماعتوں کے ٹائم ٹیبل میں تبدیلی کی گئی۔ اب مجھے ایم۔اے کے چار پرچے شاعری، تنقید، تاریخ ادب اور اقبال" پڑھانے کے لئے دیئے گئے۔ ادیب فاضل کا کام تمام اساتذہ میں برابر تقسیم کر دیا گیا۔ میرے حصے میں ہفتے میں چار گھنٹے آئے۔

ظاہر ہے کہ سید صاحب اس فیصلے سے کچھ خوش نہیں ہوئے بلکہ ناراض ہوئے اور اُن کے ناراض ہونے کی وجہ سے کھنچاؤ کی جو فضا پیدا ہوئی اس کا تجربہ مجھے اس سے قبل کبھی نہیں ہوا تھا۔ مخالفت کا ایک طویل سلسلہ شروع ہوا جس کو میں سخت جان ہونے کی وجہ سے جھیل گیا۔ کوئی دوسرا ہوتا تو بھاگ نکلتا۔

اس مخالفت کی وجہ سے وہ سکون ناپید ہو گیا جو علمی اور تعلیمی کاموں کے لئے ضروری ہے۔ میں پریشان رہنے لگا۔ یہ بھی سوچنے لگا کہ روز روز کی اس بک بک جھک جھک سے کیا فائدہ مجھے کہیں اور چلا جانا چاہیئے۔ لیکن، سیوکن ایدامن کے ریڈر شوستری صاحب کو میری بددلی کا علم ہوا تو انھوں نے مجھے سہارا دیا۔ مجھے اپنے کمرے میں لے گئے۔ دیر تک باتیں کیں، سمجھایا اور کہا کہ میں اس سے قبل بھی یہاں عرصۂ دراز تک رہ چکا ہوں۔ یہاں کے حالات کو اچھی طرح سمجھتا ہوں۔ آپ اپنے مضمون میں بہت دی ہیں۔ آپ کی شہرت بھی خاصی ہے۔ بعض لوگ اپنے مفاد کے پیش نظر یہ نہیں چاہتے کہ آپ یہاں رہیں۔ اس میں ان کا نقصان ہے۔ لیکن آپ ہرگز کہیں اور جانے کا خیال دل میں نہ لایئے گا۔ آپ تو یہاں پروفیسر اور پرنسپل ہوں گے۔ سارا نقشہ میری آنکھوں کے سامنے ہے۔“

اور شوستری صاحب کی باتیں صحیح ثابت ہوئیں۔ مخالفت کے باوجود میں

پنجاب یونیورسٹی میں اردو کا پروفیسر، اورینٹل کالج کا پرنسپل ہوا، اور اورینٹل لرننگ اور اسلامیات کا ڈین بھی ہوا۔

ان زمانے میں پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج اور لاہور کے دوسرے کالجوں میں مجھے اچھے لوگ بھی ملے۔ ان میں ڈاکٹر محمد باقر صاحب صدر شعبۂ فارسی کا نام سرفہرست ہے۔ انھوں نے مجھ پر بعض احسانات بھی کیے جن کو میں کبھی فراموش نہیں کرسکتا۔ آج بھی میں انھیں اپنا محسن سمجھتا ہوں۔ ان کے علاوہ اسلامیہ کالج کے پروفیسر اور پرنسپل پروفیسر حمید احمد خاں صاحب تھے جنھوں نے مجھے ہمیشہ اپنا چھوٹا بھائی سمجھا، اور ہر معاملے میں میری مدد کی۔ ان کے احسانات کو بھی میں کبھی بھلا نہیں سکتا۔ ان کے بڑے بھائی مولانا حامد علی خاں صاحب مدیر "ہمایوں" اور پروفیسر محمود احمد خاں صاحب بھی میرے محسن تھے۔ کوئین میری گرلز کالج کے ایک پروفیسر ڈاکٹر صابر علی خاں صاحب بھی اس زمانے میں میرا بہت خیال رکھتے تھے۔ بڑے ہی مخلص اور محبت کے آدمی تھے۔ ہمیشہ میرا دل بڑھاتے تھے اور اکثر میرے پاس آتے تھے۔ ان کے علاوہ پروفیسر سید عابد علی عابد پرنسپل دیال سنگھ کالج اور پروفیسر غلام مصطفیٰ تبسم پروفیسر گورنمنٹ کالج لاہور بھی میرے ساتھ بڑی محبت سے پیش آتے تھے۔ ہمایوں کے ایڈیٹر میاں بشیر احمد صاحب، مصور مشرق عبدالرحمن چغتائی، اسلامیہ کالج لاہور کے ڈاکٹر تاثیر اور فیض صاحب کی بے پایاں شفقت اور محبت بھی مجھے حاصل تھی، اور وہ بھی مجھ سے بڑے ہی خلوص اور محبت سے ملتے تھے، اور ہمیشہ میری مدد کرنے کے لئے تیار رہتے تھے۔ لاہور کے ناشرین میں چودھری برکت علی، چودھری نذیر احمد، شیخ محمد اشرف اور محمد طفیل صاحب بھی میرے ساتھ بڑی محبت سے پیش آتے تھے، اور میرا بہت خیال رکھتے تھے۔

ان بزرگوں اور دوستوں نے اس زمانے میں ہمیشہ میری ہمت افزائی کی، اور میرے لئے زیست کرنے اور زندہ رہنے کا سامان پیدا کیا۔ کالج کے اساتذہ میں ڈاکٹر رانا احسان الٰہی، ڈاکٹر ابواللیث صدیقی، پروفیسر وقار عظیم، مولانا نور الحسن خاں اور مولانا صارم کی شفقت اور محبت

کی وجہ سے میرا دل یہاں لگ گیا، اور میں نے کبھی بھی اپنے آپ کو یہاں بے یار و مددگار نہیں سمجھا۔ اساتذہ کے ساتھ ساتھ طالب علم بھی مجھے ایسے ملے جو ہر وقت جاں نثار کرنے کے لئے تیار رہتے تھے۔ آج یہ شاگرد دور دور تک پھیلے ہوئے ہیں اور عزت و احترام سے پیش آتے ہیں۔ ان سب کی محبت کو میں اپنی زندگی کا بہت بڑا سرمایہ سمجھتا ہوں۔

لاہور ادیبوں، شاعروں اور فن کاروں کا شہر تھا۔ یہاں میں نے جو تہذیبی اور ثقافتی ماحول دیکھا، وہ دنیا کے کسی اور شہر میں مجھے نظر نہیں آیا۔ اس شہر میں ہر پڑھا لکھا آدمی مجھے ادب سے دلچسپی لیتا ہوا نظر آیا۔ اور ادب سے اسی دلچسپی نے ان میں سے خاصی تعداد کو ادیب اور شاعر بنا دیا۔ یہاں ادبی انجمنوں کی بہتات دیکھی، اور سب کو فعال اور مستعد پایا۔ حلقہ ارباب ذوق کو ان سب میں زیادہ باقاعدہ اور مستعد دیکھا۔ حلقے سے میرا تعلق پرانا تھا اس لیے میں باقاعدگی سے ہر اتوار کو اس کے جلسوں میں جاتا تھا۔ ان جلسوں میں، علمی پائے کے تنقیدی مقالات، افسانے، غزلیں اور نظمیں پڑھی جاتی تھیں، اور ان پر بلند معیار کی تنقید بھی ہوتی تھی۔ اس زمانے میں راشد قیوم نظر، یوسف ظفر، ناصر کاظمی، احمد مشتاق، منٹو، انتظار حسین، اے حمید، مولانا حامد علی خاں، مولانا صلاح الدین احمد، وزیر آغا، پروفیسر سید وقار عظیم، ڈاکٹر ابواللیث صدیقی، اعجاز بٹالوی، ضیا جالندھری، انجم رومانی، عبدالمجید بھٹی وغیرہ باقاعدگی سے شریک ہوتے تھے۔ وائی ایم سی اے کا ہال (لورڈ روم) کھچا کھچ بھرا رہتا تھا۔ یہ خصوصیت میں نے اسی شہر میں دیکھی کہ ادبی جلسوں میں لوگ بہت بڑی تعداد میں شریک ہوتے تھے اور آخر وقت تک بیٹھے رہتے تھے، اکتاتے نہیں تھے۔ خاصی علمی اور ادبی فضا تھی۔

اس لئے یونیورسٹی اور اورینٹل کالج کے روح کش ماحول کے باوجود میرا دل یہاں لگ گیا، اور میرا وقت اچھا گذرنے لگا۔

لاہور آنے کے چند مہینے بعد ہی میرے خاندان کے تمام افراد بھی لکھنؤ سے لاہور پہنچ گئے۔ شروع شروع میں تو ان لوگوں کو یہاں بڑی تکلیف ہوئی۔ اس وقت تک تو میرے پاس

سر چھپانے کی جگہ تک نہیں تھی۔ میں خود کسی کے ہاں مہمان کی حیثیت سے رہ رہا تھا۔ ظاہر ہے کہ کسی عزیز یا دوست کے ہاں دس بارہ آدمی نہیں سما سکتے تھے۔ میرے پرانے شاگرد عباس احمد عباسی مرحوم اُس زمانے میں روزانہ میرے پاس آتے تھے۔ میں نے اُن سے ذکر کیا تو کہنے لگے "آپ بالکل فکر نہ کیجیے۔ میکلوڈ روڈ پر میرے ایک جاننے والے کو ہوٹل الاٹ ہوا ہے۔ ہوٹل کہاں ہے۔ بس چھوٹے چھوٹے خالی کمرے ہیں۔ میں دو کمرے آپ کے لئے ان سے حاصل کر لوں گا۔"

دوسرے دن صبح کو وہ میرے پاس آئے اور کہنے لگے "عبادت صاحب! کمروں کا انتظام ہو گیا ہے۔ البتہ فرنیچر وغیرہ ان کمروں میں نہیں ہے لیکن اس کا بھی انتظام ہو جائے گا۔"

شام کو میرے خاندان کے بارہ افراد واہگہ کے راستے لاہور پہنچے۔ میں نے ان کو میکلوڈ روڈ پر ان کمروں میں پہنچایا۔ فرش پر بستر لگوائے۔ سامان زیادہ تھا اس لئے اورینٹل کالج ہوسٹل کے دو کمروں میں رکھا اور اس طرح ہم باقاعدہ مہاجر ہو گئے۔ کئی ہفتے فرش پر سوتے رہے۔ معمولی انگیٹھی پر کھانا پکتا رہا۔ ضروری سامان منگانے کے لئے اورینٹل کالج ہوسٹل کے دن میں کئی کئی چکر لگاتے رہے۔

بیشتر جاننے والے جب ہم لوگوں کو اس حال میں دیکھتے تھے تو ان پر رقت طاری ہو جاتی تھی۔ مشہور صحافی اور کالم نگار م۔ش (میاں محمد شفیع) سے ایک دن ملاقات ہوئی اور میں نے اپنی بپتا انھیں سنائی تو ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے، اور وہ واقعی رونے لگے۔ کم و بیش یہی کیفیت میں نے کئی اور دوستوں اور جاننے والوں کی دیکھی۔ لاہور کے لوگ بڑی محبت کے لوگ تھے۔

اس عرصے میں مختلف لوگوں کی کوششوں سے کئی کوٹھیاں میرے نام الاٹ ہوئیں اور مجھ سے کہا گیا کہ ان میں جو مہاجر بیٹھے ہیں، انھیں پولیس سے نکلوا کر ان پر قبضہ کر لیجیے۔ لیکن میں خود غرض اور سفاک آدمی نہیں تھا، اس لیے مجھ سے یہ سب کچھ نہ ہو سکا اور الاٹ ہونے کے باوجود مکان مجھے نہ مل سکا۔ ایسا مکان جو دوسروں کو تکلیف دے کر حاصل

کیا جائے، مجھے نہیں چاہیئے تھا۔ چنانچہ میں اس معاملے میں ناکامی سے مطابقت پیدا کر کے وقت گزارتا رہا، اور میرے گھر والے ایسی تکلیفیں اٹھاتے رہے جن کا اس سے قبل انھیں کبھی تجربہ نہیں ہوا تھا۔ لیکن وہ لوگ خوش تھے۔ اس لیے کہ اب وہ پاکستان میں تھے جو مسلمانوں کی مملکت تھی، اور جہاں انھیں یہ خطرہ نہیں تھا کہ کوئی انھیں مارے گا یا ان کے گھر پر حملہ کرے گا اور لوٹ مار کرے گا۔

میں دن رات مکان کی تلاش میں سرگرداں رہتا تھا لیکن مکان کا اس زمانے میں ملنا ناممکن تھا کیونکہ بیشتر مکان جو ہندو چھوڑ کر گئے تھے، ان پر مہاجروں نے قبضہ کر رکھا تھا۔ مقامی مسلمانوں کے مکان بہت کم تھے۔ اس لیے مکان کا کرائے پر ملنا ناممکن تھا۔

ایک دن میں مکان کی تلاش میں نیلے گنبد کے پاس سے گزر رہا تھا تو خیال آیا کہ شاید آغا حسن عابدی لاہور میں حبیب بینک کی کسی برانچ کے منیجر ہیں، انھیں تلاش کیا جائے۔ چنانچہ میں بینک اسکوائر کی طرف چل دیا۔ حبیب بینک کی شاخ میں گیا تو دیکھا سامنے آغا حسن عابدی منیجر کی کرسی پر بیٹھے ہیں۔ کئی سال کے بعد ملاقات ہوئی۔ بچپن کے ساتھی تھے، بڑی محبت سے ملے، گلے لگایا، حال احوال پوچھا۔ چائے منگوائی اور دیر تک باتیں کرتے رہے۔ دوران گفتگو دلی کی تباہی اور لاہور میں مکان نہ ملنے کا ذکر بھی ہوا۔

یہ سن کر آغا حسن نے اپنے بینک کے ایک افسر منظر خاں صاحب کو بلایا اور ان سے کہا: "خاں صاحب اگر آپ کو لائل پور پوسٹ کر دیا جائے تو کوئی تکلیف تو نہیں ہوگی؟"

انھوں نے جواب دیا: "لائل پور میں مجھے آرام ملے گا۔"

آغا حسن نے کہا: "بس آپ لائل پور چلے جائیے۔ وہاں آپ کو بینک کی طرف سے مکان بھی ملے گا، اور دوسری تمام سہولتیں بھی فراہم کی جائیں گی۔ آپ کا جو ذاتی مکان یہاں لاہور میں ہے، وہ آپ مجھے دے دیجیے، اس کا معقول کرایہ آپ کو ملے گا۔"

یہ کہہ کر آغا حسن نے خاں صاحب کو رخصت کیا اور مجھ سے کہنے لگے "لو بھئی مکان کا انتظام ہو گیا۔ تم فی الحال دو ایک دن بعد اس میں چلے جاؤ۔ وہاں آرام ملے گا۔ وہاں پانی، بجلی، فلش سب کچھ ہے، چار کمرے ہیں۔ لاہور امپرومنٹ ٹرسٹ کے چیرمین، ظفر الاحسن صاحب نے نئے کوارٹر سمن آباد میں بنوائے ہیں، اسی آبادی میں یہ مکان ہے۔ اچھی کھلی ہوئی آبادی ہے۔"

دوسرے دن میں مکان دیکھنے گیا۔ واقعی اچھا خاصا مکان تھا۔ سامنے بہت بڑا لان بھی تھا۔ چار کمرے تھے دالان بھی تھا فلش بھی تھا بجلی بھی تھی، پانی بھی تھا۔ غرض سب سہولتیں اس مکان میں موجود تھیں۔ دو تین دن کے بعد خاں صاحب تو لائل پور چلے گئے اور ہم لوگ ان کے نئے مکان میں منتقل ہو گئے۔ صرف پچاس روپے اس مکان کا کرایہ تھا لیکن اس مکان میں جو آرام ملا وہ ہزاروں روپے کرائے کے مکان سے کم نہ تھا۔

آغا حسن نے چند منٹ میں یہ مسئلہ حل کر دیا۔ میں اس کی قوتِ فیصلہ سے اور محبت اور ہمدردی کے جذبے سے بہت متاثر ہوا۔ جو کچھ اس نے کیا، اور جس طرح کیا شاید میں بھی اس طرح نہیں کر سکتا تھا۔ جی چاہتا تھا اس کا شکریہ ادا کروں لیکن وہ میرا بچپن کا دوست اور ساتھی تھا۔ اس سے میری بے تکلفی تھی۔ اس کا شکریہ کیا اور کیسے ادا کرتا۔ البتہ آج تک میں اس کو دعائیں دیتا ہوں۔

اب مکان کا انتظام ہو گیا، اور سر چھپانے کی جگہ مل گئی تو میں نے پڑھانے کے ساتھ ساتھ اپنے علمی، ادبی کاموں کی طرف توجہ کی۔ لاہور کے علمی ادبی ماحول نے مجھے زیادہ کام کرنے کی طرف راغب کیا۔ اور چند سال میں میری کئی کتابیں چھپ گئیں۔ "اردو تنقید کا ارتقا" چھپ کر آ گئی۔ اس کے بعد میں نے غزل کے موضوع پر کام کیا۔ "غزل اور مطالعۂ غزل" کے نام سے پانچ سو صفحات کی کتاب تیار کی جس کو بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق نے انجمن ترقی اردو پاکستان کی طرف سے نہایت اہتمام سے شائع کیا اور اس پر یہ رائے ظاہر کی کہ "اس کتاب کا موضوع غزل ہے۔ ڈاکٹر عبادت نے غزل کے ارتقا، اس کی اہمیت، اس کے جمالیاتی پہلو، جدید

حجانات اور اس کے مستقبل، غرض ہر پہلو پر بہت تفصیلی اور بصیرت افروز بحث کی ہے اور غزل سے متعلق تمام مسائل کا تنقیدی تجزیہ کیا ہے۔ چند مضامین غزل کے اصول کی تنقید میں ہیں اور چند غزل کے ارتقاء پر۔ غزل پر ایسی جامع کتاب جس میں غزل پر اس تفصیل سے بحث کی گئی ہو اب تک نہیں لکھی گئی۔ ڈاکٹر عبادت صاحب اردو کے ممتاز نقادوں میں ہیں، اور ان کا انداز تنقید امتیازی حیثیت رکھتا ہے"۔ اور اس رائے کو انھوں نے کتاب کے فلیپ پر نمایاں کرکے شائع کیا۔ یہ سب کچھ مولوی صاحب مرحوم کی شفقت اور محبت تھی کہ انھوں نے یہ سب کچھ لکھ کر میری ہمت افزائی فرمائی۔ ورنہ میں اس قابل نہیں تھا۔ اس کے بعد انجمن ہی کی طرف سے ایک اور کتاب "روایت کی اہمیت" شائع ہوئی جس میں غالب، حالی، داغ اور حسرت پر تحقیقی اور تنقیدی مقالے تھے۔ یہ بھی تقریباً پانچ سو صفحات کی کتاب تھی۔ اس کے علاوہ انجمن سے خطباتِ عبدالحق اور مقدمات عبدالحق بھی شائع ہوئے۔ میرے تنقیدی مضامین کا پہلا ایڈیشن مکتبۂ اردو لاہور سے شائع ہوا تھا۔ اب اس کا دوسرا ایڈیشن ترمیم و اضافہ کے ساتھ اردو مرکز لاہور سے شائع ہوا۔ ان تمام کتابوں پر حکومتِ پنجاب اور پنجاب یونیورسٹی کی طرف سے انعامات بھی ملے، شاید اس لئے کہ ان موضوعات پر ابھی تک کوئی خاص کام نہیں ہوا تھا ورنہ ان میں کوئی خاص بات نہیں تھی۔

ان کتابوں کو شائع کرنے کے بعد میں نے مومن پر کام شروع کیا، اور کئی سال کی مسلسل دوران تھک محنت کے بعد بڑے سائز کے تقریباً چھ سو صفحات کی ایک کتاب "مومن اور مطالعۂ مومن" تیار کی جو کراچی سے شائع ہوئی۔ اس میں مومن کی زندگی، شخصیت، ماحول، غزل گوئی اور مثنوی نگاری کا تحقیقی اور تنقیدی مطالعہ تھا۔ اس کتاب کو ادبی حلقوں میں بہت سراہا گیا، شاید اس وجہ سے کہ اس سے قبل مومن کا مطالعہ تجزیاتی انداز میں اتنی تفصیل سے نہیں کیا گیا تھا۔ باہر کے ملکوں میں اس کتاب کی شہرت ہوئی۔ اسی زمانے میں جدید شاعری پر میری ایک کتاب کوئی چھ سو صفحات کی شائع ہوئی۔ اس کتاب کا بھی بہت چرچا رہا

کیونکہ جدید شاعری کے مختلف پہلوؤں کا تنقیدی اور تجزیاتی مطالعہ اس سے قبل کسی نے نہیں کیا تھا۔ اس کے علاوہ اس زمانے میں تنقیدی تجربے کے نام سے ایک اور کتاب شائع ہوئی جس میں تنقید خصوصاً جدید تنقید، جدید افسانہ نگاری اور جدید شاعری کے مختلف رجحانات پر تنقیدی مضامین تھے۔ ان کتابوں کے ساتھ میر کے کلیات کو از سرِ نو ترتیب دے کر شائع کرنے کا کام میں نے جاری رکھا۔ چنانچہ بڑے سائز کے تقریباً سترہ سو صفحات کی یہ ضخیم کتاب ۱۹۵۸ء میں شائع ہوئی۔ افسوس ہے ضخامت کے پیش نظر حواشی و تعلیقات اس میں شامل نہ ہو سکے جن کو میں نے بڑی محنت و عرق ریزی سے لکھا تھا۔ ناشر نے کتاب کی ضخامت کے پیش نظر روک لیا۔ اس کی تساہلی کی وجہ سے کچھ غلطیاں بھی رہ گئیں۔ بہرحال کتاب چھپ گئی اور اس کو اس طرح ہاتھوں ہاتھ لیا گیا کہ آج اس کا کوئی نسخہ کسی قیمت پر نہیں ملتا۔ اس کو میر صاحب کے کلام کا اعجاز سمجھنا چاہیے۔

غرض اس طرح علمی، ادبی کاموں کا سلسلہ جاری رہا۔ چند سال کے اندر مختلف ادبی موضوعات پر خاصی تعداد میں میری کتابیں شائع ہو گئیں۔ ادبی رسائل میں مختلف ادبی موضوعات پر تحقیقی اور تنقیدی مقالات بھی خاصی تعداد میں چھپے۔ ایک اندازے کے مطابق میں نے اورینٹل کالج کے دوران قیام میں تقریباً بیس ہزار صفحات لکھے۔ اس کام کی بنیاد تو ادب سے میری دلچسپی تھی لیکن اس میں اورینٹل کالج کے علمی ماحول اور شہر لاہور کی ادبی فضا کا بھی خاصا ہاتھ تھا۔

اورینٹل کالج میں علمی فضا تو تھی لیکن گھٹن کا احساس بہت ہوتا تھا۔ بیشتر اساتذہ کی زندگی نارمل نظر نہیں آتی تھی۔ اکثر مکتبوں اور مسجدوں کے تعلیم یافتہ تھے یا پھر دیہاتوں سے آئے تھے اور نچلے متوسط طبقے سے تعلق رکھتے تھے جنھوں نے اعلیٰ تعلیم کا صحیح ماحول نہیں دیکھا تھا۔ ہر شخص کسی نہ کسی نفسیاتی الجھن کا شکار نظر آتا تھا۔ آپس میں جھگڑے فساد بہت تھے۔ کوئی کسی پر اعتماد نہیں کرتا تھا۔ احساس تحفظ نے ہر شخص کو خود غرض اور سفّاک بنا دیا تھا۔ ان کی زندگی کے فیصلے یونیورسٹی کی سطح پر ہوتے تھے اس لیے معمولی سی ترقی کے موقع پر بھی ریشہ دوانیاں

بست ہوتی تھیں جن میں ہمیشہ سازش کا رنگ و آہنگ پیدا ہو جاتا تھا۔

اور ہم سب اس سازش کے ماحول میں زندگی بسر کر رہے تھے مجھے اس ماحول سے سخت الجھن ہوتی تھی اور میں خاصا پریشان رہتا تھا۔ میں نے اپنی زندگی اب تک لکھنؤ یونیورسٹی اور دہلی یونیورسٹی میں گذاری تھی۔ جہاں محبت اور انسانیت زندگی کا معیار تھی، جہاں کوئی کسی کو ستاتا نہیں تھا، کسی کی پگڑی نہیں اچھالتا تھا، پریشان نہیں کرتا تھا، جہاں فکر و خیال کی مکمل آزادی تھی۔ لیکن یہاں ہر شخص ایک دوسرے کو پریشان کرنے کے درپے رہتا تھا۔ آزادیٔ خیال نام کو نہیں تھی، خوف و ہراس کی فضا تھی، اور اس صورت حال نے اس علمی ادارے کو اچھا خاصا اکھاڑہ بنا دیا تھا۔

کالج کے اندر اور باہر دونوں جگہ یہی کیفیت تھی۔ کسی کی پگڑی اچھالنے کے لئے اخباروں کے دروازے تک کھٹکھٹائے جاتے تھے، سیاسی لوگوں سے رابطہ قائم کیا جاتا تھا۔ حکومت کے افسروں کی خوشامد کی جاتی تھی۔ تاکہ کسی کو بدنام کرنے، بقول شخصے کوکین رکھ کر پکڑوانے، اور تھانے میں جا جا کے رپٹ لکھوانے میں آسانی ہو۔ اس کاروبار میں جو شخص شریک نہیں ہو سکتا تھا وہ مار کھاتا تھا اور زندگی اس کے لئے اجیرن ہو جاتی تھی۔ بعض لوگ یونیورسٹی کے کلرکوں اور افسروں کو چاول، گندم اور گھی وغیرہ سے نوازتے تھے اور ان کی مدد سے اہم کاغذات تک رسائی حاصل کرکے ان میں اس طرح تبدیلیاں کرتے یا کروا لیتے تھے جس کی وجہ سے انھیں خاطر خواہ کامیابی حاصل ہو جاتی تھی۔ کوئی خوش قسمت ایسا ہوتا تھا جو ان حالات کا شکار ہونے سے بچ جاتا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ جن لوگوں نے ایسا کیا ہے ان کی بخشش نہیں ہوگی۔

میرے علم میں ایسے کئی ہوش ربا اور گھناؤنے واقعات ہیں، جن کو میں بیان کرنے سے قاصر ہوں۔ یہ واقعات آج بھی مجھے خون کے آنسو رلاتے ہیں۔

یہ تو خیر ایک تعلیمی ادارے کا تذکرہ تھا جس سے میں براہ راست متعلق تھا لیکن اس عرصے میں وطن عزیز میں بھی سیاسی طور پر ایسے حالات پیدا ہوتے رہے جن کی وجہ سے اجتماعی

زندگی ایک عذاب میں گرفتار نظر آنے لگی۔

ایک دن یہ اعلان ہوا کہ وزیر اعظم پاکستان نواب زادہ لیاقت علی خاں صاحب یونیورسٹی گراؤنڈ میں عوام سے خطاب کریں گے۔ میں بھی جلسے کے وقت یونیورسٹی گراؤنڈ پہنچا۔ جلسہ شروع ہوا۔ نواب زادہ صاحب نے تقریر شروع کی لیکن چند منٹ میں حاضرین جلسہ اٹھ کر کھڑے ہو گئے اور اُن کے خلاف نعرے لگانے لگے۔ بہت ہوٹنگ ہوئی۔ پولیس نے مداخلت کی کوشش کی تو نواب زادہ صاحب نے بہ آواز بلند ان کو روکا اور کہا کہ "اس وقت میں پاکستان کے وزیر اعظم کی حیثیت نہیں بول رہا ہوں۔ مسلم لیگ کے ایک لیڈر کی حیثیت سے تقریر کر رہا ہوں"۔ میں حیران تھا کہ یہ سب کچھ کیوں ہو رہا ہے۔ نواب زادہ صاحب تو مسلم لیگ کے ہر دلعزیز لیڈر اور قائد اعظم کے قابلِ اعتماد ساتھی ہیں ان کے خلاف یہ ہنگامہ کیوں ہو رہا ہے۔ بعض لوگوں سے معلوم ہوا کہ اس ہنگامے کے پیچھے کوئی خفیہ ہاتھ تھا۔

پھر سال بھر کے اندر نواب زادہ صاحب کو راولپنڈی میں گولی کا نشانہ بنا دیا گیا۔ اس سازش میں کون لوگ شریک تھے اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے۔ ابھی تک خون کھلا نہیں۔

نواب زادہ صاحب کے انتقال کے بعد خواجہ ناظم الدین صاحب نے ملک کو سنبھالا لیکن سازشیں ایسی تھیں کہ وہ ان کی تاب نہ لا سکے۔ گورنر جنرل سے وزیر اعظم ہوئے لیکن ان کے بعد ہر چیز منتشر ہو گئی ملک غلام محمد نے اسمبلی توڑ دی، مارشل لا لگنے لگے۔ دس پندرہ سال میں کئی دفعہ مارشل لاء لگائے گئے صحیح قسم کی سیاست ختم ہو گئی۔ زباں بندی کا دور دورہ ہوا۔ لوگ کھانے پینے اور جائدادیں بنانے میں مصروف ہو گئے۔

اور اس طرح پاکستان کے تاج محل میں رخنے پڑ گئے۔

ان حالات کو دیکھ کر کلیجہ منہ کو آتا تھا۔ طبیعت پریشان رہتی تھی۔ سوائے دعا کرنے کے اور کوئی چارہ نہ تھا۔

ان حالات میں اورینٹل کالج اور یونیورسٹی کی فضا کیسے بدلتی؟ یہاں کے حالات

تو روز بہ روز بد سے بدتر ہوتے گئے۔

میں اورینٹل کالج میں سینیر لکچرار کی حیثیت سے آیا تھا۔ میں نے درخواست نہیں دی تھی یونیورسٹی نے مجھے خصوصی "آفر" بھیج کر اس وعدے کے ساتھ بلایا تھا کہ اس وقت ریڈر کی کوئی پوسٹ نہیں ہے، اس لئے میں سینیر لکچرشپ قبول کر لوں تنخواہ کے اعتبار سے سینیر لکچرار اور ریڈر میں کوئی خاص فرق نہیں ہے۔ جلد ہی مجھے ریڈر بنا دیا جائے گا۔ لیکن ریڈر ہونے کے لئے مجھے آٹھ دس سال انتظار کرنا پڑا۔

پہلے تو ایک زمانے تک پوسٹ کا اشتہار ہی نہیں دیا گیا یونیورسٹی کے قواعد وضوابط کے مطابق ایسا کرنا ضروری ہوتا ہے۔ اس کے لئے حیلے بہانے تلاش کئے گئے۔ اور دس سال تک اس کو التوا میں رکھا گیا۔ لیکن بالآخر خود وائس چانسلر میاں افضل حسین نے اس کے بارے میں فیصلہ کیا۔ چنانچہ پوسٹ کا اشتہار دیا گیا۔ درخواستیں آئیں۔ کام کی جانچ پڑتال کے لئے مبصرین مقرر کئے گئے۔ انھوں نے رائے میرے حق میں لکھ بھیجی ایک مبصر نے مجھے ذاتی خط بھی لکھا جس کا مضمون یہ تھا کہ آپ سے میرے ذاتی تعلقات نہیں ہیں۔ میں آپ کو ذاتی طور پر جانتا بھی نہیں لیکن آپ کی مخالفت کا حال دیکھ کر میں نے ضروری سمجھا کہ آپ کو یہ ذاتی خط لکھوں اللہ تعالیٰ آپ کو اپنی امان میں رکھے! میں نے اپنی زندگی میں کسی شخص کی اتنی اور ایسی مخالفت نہیں دیکھی۔ مغربی اور مشرقی پاکستان میں رہنے والا اردو کا کوئی اہم آدمی ایسا نہیں تھا (جس میں میرے داماد اور بیٹی بھی شامل ہیں) جس نے کسی کے کہنے پر یہ نہ لکھا ہو کہ آپ بہت خراب آدمی ہیں اور لکھنے پڑھنے سے آپ کا کوئی تعلق نہیں۔ اس لئے آپ کو یونیورسٹی میں نہیں ہونا چاہیئے۔ میں آپ کو صرف ایک لکھنے پڑھنے والے کی حیثیت سے جانتا ہوں، اور آپ کی تحریروں کا مداح ہوں، اس لئے مجھ پر ان باتوں کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ میں نے رائے آپ کے حق میں دی ہے لیکن سوچا کہ آپ کو مخالفت کی فضا سے مطلع کر دوں تاکہ آپ مخالفین سے بے خبر نہ رہیں۔ اور اپنی حفاظت کریں۔

خیر تو میں اس مخالفت کے باوجود شعبۂ اردو میں ریڈر یعنی ایسوسیٹ پروفیسر ہوگیا

اس کی اہمیت اس وجہ سے تھی کہ ریڈر ہی آئندہ اردو کا پروفیسر اور صدر شعبہ اور اورینٹل کالج کا پرنسپل ہوتا اور اسی وجہ سے مخالفت میں اتنی شدت پیدا ہوئی، ورنہ یہ تو روٹین' (ROUTINE) کا معاملہ تھا اس کی کوئی خاص اہمیت نہیں تھی۔

لیکن ریڈر شپ کی کامیابی کے بعد جو کچھ میرے ساتھ ہوا، اس کا اس مہذب دنیا خصوصاً یونیورسٹی کی فضا میں کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا۔

یہ فیلڈ مارشل ایوب خاں کی صدارت کا زمانہ تھا۔ مارشل لا کی حکومت تھی، اس حکومت نے ایک حکم جاری کیا تھا کہ یونیورسٹیوں میں جو بھی تقرر کیا جائے اس کی کلیرنس بھی حکومت سے حاصل کی جائے۔ مقصد اس حکم کا یہ تھا کہ پولیس کے ذریعے یہ معلوم کیا جائے کہ جس شخص کا تقرر کیا گیا ہے اُس کے خیالات و نظریات کیا ہیں۔

چنانچہ اس مقصد کے لئے ایک دن خفیہ پولیس کا ایک آدمی میرے پاس کالج میں آیا اور کہنے لگا "میرا نام نذیر احمد شاد ہے۔ میں پولیس کا انسپکٹر ہوں۔ آپ کے بارے میں کچھ معلومات حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ یہ معلومات میں دوسرے لوگوں سے بھی حاصل کر سکتا تھا لیکن میں نے یہ سوچا کہ آپ تو بہت پڑھے لکھے آدمی ہیں، استاد ہیں، ادیب ہیں، آپ کی بڑی شہرت ہے۔ اس لئے مناسب ہوگا کہ خود آپ سے یہ معلومات حاصل کر کے اپنی رپورٹ لکھ دوں رسمی سی بات ہے۔ خانہ پُری کرنی ہے۔ میں آپ کو غائبانہ طور پر جانتا ہوں۔ آپ کے علمی ادبی کام سے بھی واقف ہوں۔ آپ کے خیالات کا بھی علم ہے۔ لیکن سوچا ایک دفعہ آپ سے مل کر باتیں کروں۔ حکومت کے احکام کی پابندی کرنی پڑتی ہے۔ آپ اس کا کچھ خیال نہ کیجئے گا۔ میں اس کے لئے معذرت خواہ ہوں اور شرمندہ ہوں۔"

میں نے کہا "شاہ صاحب! تشریف رکھیے اور جو باتیں کرنی ہیں کر لیجئے" اس نے کچھ اس قسم کے سوال کئے کہ "آپ کب پاکستان آئے؟ یونیورسٹی میں کتنے سال

سے ہیں؟ آپ کی کون کون سی کتابیں شائع ہوئی ہیں؟ آپ کے خیالات و نظریات کیا ہیں؟"

ان سوالوں کے جواب میں نے اسی وقت دے دیئے۔

نذیر احمد شاہ یہ باتیں کر کے چلا گیا۔ چلتے وقت اُس نے کہا "میں چند روز میں رپورٹ دے دوں گا۔ اور آپ کو تقرر کے کاغذات یونیورسٹی سے مل جائیں گے۔"

میں نے کہا "شکریہ!"

لیکن ڈیڑھ دو مہینے گزر گئے۔ یونیورسٹی کے پاس کلیرنس کی رپورٹ نہیں آئی۔ میں نے رجسٹرار سے پوچھا تو انھوں نے کہا "خدا جانے کیوں تاخیر ہو رہی ہے۔ رسمی سا معاملہ ہے۔ تاخیر کی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔"

میں چپ ہو کر بیٹھ رہا۔

دو مہینے کے بعد نذیر احمد شاہ انسپکٹر میرے پاس پھر آیا۔ کہنے لگا "میں کسی تفتیش کے سلسلے میں آزاد کشمیر چلا گیا تھا۔ آپ کی رپورٹ کے سلسلے میں پھر آپ کے پاس آیا ہوں۔ افسوس ہے کلیرنس رپورٹ ابھی تک یونیورسٹی کو نہیں بھیجی گئی۔ میں آپ کو یہ بتانے کے لیئے آیا ہوں کہ آپ کے مخالفین نے پولیس کے بعض افسروں کو آپ کے خلاف خدا جانے کیا کیا کچھ لکھ کر بھیجا ہے۔ پولیس کے بعض افسروں سے ذاتی طور پر بھی ان لوگوں نے رابطہ قائم کر رکھا ہے۔ اب ڈی آئی جی صاحب نے ایک کمیٹی بنا دی ہے۔ اس میں یہ معاملہ پیش ہوگا — لیکن اس کی کوئی خاص اہمیت نہیں ہے۔ انشاءاللہ پرسوں تک رپورٹ بھجوا دی جائے گی۔ ایسی باتوں سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ مخالفت کی یہ صورت اپنی ملازمت میں میں نے پہلی دفعہ دیکھی ہے۔ پولیس کی ملازمتوں تک میں کبھی ایسا نہیں ہوتا۔ یونیورسٹیوں اور کالجوں میں تو اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔"

اب میں نے سوچا کہ اپنا اثر استعمال کرنا چاہیئے۔ خفیہ پولیس کے ایک ایس پی ملک حبیب اللہ صاحب میرے پاس اکثر آتے تھے اور سرکاری کاغذات کے ترجمے وغیرہ کے سلسلے میں

مجھ سے علمی مشورہ کرتے تھے۔ پڑھنے لکھنے سے انھیں دلچسپی تھی۔ میں نے انھیں فون کیا۔ انھوں نے کمیٹی کی میٹنگ کی روداد سنائی۔

کہنے لگے ”میں نہیں چاہتا تھا کہ آپ کو اس گھٹیا بات کا علم ہو لیکن اب علم ہو ہی گیا ہے تو سنیے، آپ کے مخالفین ایسے ہیں جو غالباً پولیس میں رہ چکے ہیں۔ انھوں نے زمین آسمان کے قلابے ملا دیے ہیں۔ کمیٹی کے بعض ممبروں سے میٹنگ میں کسی پولیس کے ملازم سے یہ کہلوایا کہ یہ تو کمیونسٹ ہیں“ چونکہ ادیبوں کے معاملات میرے سپرد کیے جاتے ہیں اس لیے کمیٹی کے صدر نے مجھ سے پوچھا کہ ”آپ کی کیا رائے ہے؟“ ——— میں بھرا بیٹھا تھا۔ میں نے کہا ”ڈاکٹر صاحب پندرہ سولہ سال سے یونیورسٹی میں ہیں۔ اُن کی تمام کتابیں میرے پاس ہیں۔ میں نے ان کا جائزہ لیا ہے۔ مجھے تو اُن کے ہاں کوئی ایسی بات نظر نہیں آئی۔ وہ تو ادبی موضوعات پر لکھتے ہیں۔ اسلامی تصوف سے انھیں دلچسپی ہے۔ بزرگانِ دین اور صوفیائے کرام کے کارناموں پر انھوں نے ادب کے حوالے سے بہت کچھ لکھا ہے۔ ادبی موضوعات میں کمیونزم کہاں سے آگیا؟ ہر شخص کے کچھ مخالفین بھی ہوتے ہیں۔ خاص طور پر جب کسی جگہ کے لیے مقابلہ ہوتا ہے تو وہ ہر سطح پر اس طرح کے ہتھکنڈے استعمال کرتے ہیں“ یہ ہمارے معاشرے اور تعلیمی ماحول کی بدقسمتی ہے ”ایک پروفیسر جو پندرہ سال سے یونیورسٹی میں کام کر رہا ہے اس کے بارے میں آج آپ کو یہ علم ہوا ہے کہ اس کے خیالات خراب ہیں“ میری یہ باتیں سن کر کمیٹی نے متفقہ طور پر یہ فیصلہ کیا کہ کلیرنس رپورٹ فوراً بھیج دی جائے۔ دو ایک دن میں رپورٹ یونیورسٹی کو مل جائے گی۔ آپ اس کا کچھ خیال نہ کیجیے“

میں یہ باتیں سن کر حیران ہوا اور یہ سوچتا رہا کہ مخالفین اتنے ذلیل، اتنے کمینے، اتنے جھوٹے اور اتنے مکار بھی ہو سکتے ہیں۔

قصہ مختصر یہ کہ یہ معاملہ اس طرح بخیر و خوبی طے ہوا۔

یہ ماحول تھا جس کے سائے میں میں نے عمرِ عزیز کا بدترین زمانہ گذارا۔ یہ تو ایک واقعہ تھا۔ ایسے خدا جانے کتنے ہی واقعات سے مجھے اور بعض دوسرے اساتذہ کو دوچار ہونا پڑا جس کی وجہ سے ذہن پر ہمیشہ ایک بوجھ سا رہا اور طبیعت بدمزہ رہی لیکن میں نے ہمت نہیں ہاری اور معمول کے مطابق اپنے کاموں میں مصروف رہا۔

اس مسموم فضا کو پیدا کرنے میں کون لوگ شریک تھے؟ اس کا مجھے بخوبی علم تھا۔ اس میں کچھ "پردہ نشینوں" کے بھی نام آتے ہیں، لیکن میں انھیں بے نقاب نہیں کرنا چاہتا۔ بہت چھوٹے، گھٹیا اور نفسیاتی اعتبار سے بیمار لوگ تھے۔

تقریباً دس سال میں نے اس ماحول میں گذارے۔ میرے ساتھ ایک بڑا خاندان ہجرت کر کے پاکستان آیا تھا۔ اس کا بوجھ بھی خاصے عرصے تک مجھے اٹھانا پڑا۔ خدا کا شکر ہے کہ میں نے اپنے یہ فرائض بڑی ذمہ داری سے انجام دیئے، اور اپنے خاندان کے تقریباً پندرہ بیس افراد کا ہر طرح خیال رکھا۔ مکان خریدا۔ اس مکان میں انھیں ہر طرح کا آرام اور سکون بہم پہنچایا۔ جن لوگوں کی تعلیم نامکمل تھی، اُن کی تعلیم کا معقول انتظام کیا، اور اس طرح میرے خاندان کے تمام افراد نے اپنے لیے راستے بنا لیے، جن پر چل کر وہ کامیابیوں سے ہمکنار ہوئے۔

۱۹۵۶ء میں میری شادی ہوئی۔ میری والدہ کی نگاہِ انتخاب ایک ایسی لڑکی پر پڑی جو اعلیٰ تعلیم یافتہ کالج میں پروفیسر اور ایک نہایت ہی شریف خاندان سے تعلق رکھتی تھی۔ اس لڑکی نے مجھے بڑا سہارا دیا۔ رفاقت کا حق ادا کر دیا۔ میں نے ایسی سادہ، نیک، شریف، حلیم، بردبار، سلیقہ شعار، معاملہ فہم اور انسان دوست خاتون اپنی زندگی میں نہیں دیکھی۔ انھوں نے مجھ سے بھی زیادہ میرے خاندان کی خدمت کی، اور میرے ساتھ اس کو بنانے سنوارنے میں بڑا اہم کردار ادا کیا، اور انھیں بھی ہمارے ہاں وہ عزت اور محبت ملی جس کا حاصل کرنا ہر عورت کا نصب العین ہوتا ہے۔

بیگم فہمیدہ عبادت نے علمی و ادبی کاموں میں بھی میرا ہاتھ بٹایا اور اپنی دانش مندی اور سلیقہ شعاری سے ایسی فضا پیدا کی جو علمی اور ادبی کام کرنے کے لیے ضروری ہوتی ہے۔ میں نے گذشتہ تیس پینتیس سال میں جو علمی کام کیا ہے اس کی تشکیل و تکمیل میں اُن کا بھی بڑا ہاتھ ہے۔

اللہ تعالیٰ انھیں ہمیشہ خوش و خرم رکھے!

ورینٹل کالج کے مخصوص ماحول میں دس گیارہ سال گذارنے کے بعد میں اپنی اہلیہ اور بچے کے ساتھ پانچ سال کے لیے لندن چلا گیا، جہاں میں نے عمرِ عزیز کے پانچ سال نہایت اطمینان اور سکون سے گذارے۔

کاش اورینٹل کالج میں بھی مجھے ایسا ہی ماحول نصیب ہوتا!

تیرھواں باب

لندن

اسکول آف اورینٹل اینڈ افریقن اسٹڈیز، یونیورسٹی آف لندن

لندن جانے کا قصّہ بھی عجیب ہے۔

ہوا یوں کہ ۱۹۶۱ء میں میرے دوست اور رفیقِ دیرینہ رالف رسل نے مجھے لندن سے اس مضمون کا خط لکھا کہ یہاں لندن یونیورسٹی کے اسکول آف اورینٹل اینڈ افریکن اسٹڈیز میں اردو کے استاد کی ایک جگہ ہے۔ اس پر مشہور ناول نگار اور نقاد پروفیسر عزیز احمدؔ کام کر رہے تھے۔ اب وہ اپنا ٹرم پورا کر کے لندن سے کنیڈا جا رہے ہیں، ٹورنٹو یونیورسٹی میں انھیں اسلامیات کی پروفیسرشپ مل گئی ہے۔ لندن میں اردو کی یہ پوسٹ خاصی اہم ہے۔ اس سے قبل اس پوسٹ پر ڈاکٹر خورشید الاسلام اور ڈاکٹر حامد حسن بلگرامی بھی کام کر چکے ہیں۔ اس وقت عزیز احمدؔ کے کنیڈا جانے سے یہ پوسٹ خالی ہوئی ہے۔ اگر آپ کو لندن آنے اور اس پوسٹ پر کام کرنے سے دلچسپی ہو تو میں اسکول آف اورینٹل اسٹڈیز اور لندن یونیورسٹی کے اربابِ اختیار سے اس سلسلے میں بات کروں۔"

میں نے رسل کے خط کا جواب لکھ دیا کہ "میں لندن میں کام کرنے کے لئے تیار ہوں بشرطیکہ پنجاب یونیورسٹی نے مجھے طویل عرصے کے لئے چھٹی اور لندن یونیورسٹی میں کام کرنے کی اجازت دے دی۔ اگر ایسا ہوا تو میں نئے اکیڈمک سیشن میں لندن پہنچ جاؤں گا۔"

چند روز میں اسکول آف اورینٹل اینڈ افریکن اسٹڈیز کے سکریٹری کرنل ڈاکٹر موائز بارٹلیٹ (COL DR. MOYSE BARTLET) کی طرف سے ایک خط آیا جس میں میرے تقرر کی اطلاع تھی اور ساتھ ہی معاہدے کا ایک فارم تھا جس پر دستخط کرکے واپس بھیجنے کی ہدایت تھی۔ میں نے فارم دستخط کرکے واپس بھیج دیا اور ساتھ ہی یہ خط بھی لکھ دیا کہ میں جلد ہی اپنی نئی ذمہ داریاں سنبھالنے کے لئے لندن پہنچوں گا۔

اس عرصے میں ایک خط وزارتِ تعلیمات کی طرف سے پاکستان کی تمام یونیورسٹیوں کو بھیجا گیا جس میں وائس چانسلروں کو اس پوسٹ کے لئے مناسب نام تجویز کرنے کی طرف توجہ دلائی گئی۔ اورینٹل کالج کے اربابِ اختیار نے بالا ہی بالا کچھ نام تجویز کرکے بھیج دیئے۔ ان میں میرا نام نہیں تھا۔ اُس زمانے میں سندھ یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر رضی الدین صدیقی صاحب تھے عجیب اتفاق ہے کہ انھوں نے میرا نام تجویز کیا، اور وزارتِ تعلیمات حکومتِ پاکستان کو یہ تار دیا کہ اس پوسٹ کے لئے ڈاکٹر عبادت مناسب ترین اسکالر ہیں —— یہ تار وزارت نے پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر جسٹس شریف کے پاس مناسب کارروائی کے لئے بھیج دیا۔ یہ بات ہمارے پرنسپل صاحب کو بہت ناگوار گذری۔ انھوں نے وائس چانسلر سے احتجاج کیا اور یہ لکھا کہ یہ بات ڈسپلن کے خلاف ہے۔

اس پر جسٹس شریف صاحب نے مجھے بلایا، اور پوری فائل میرے سامنے رکھ دی۔ ان کا رویہ بہت ہمدردانہ تھا۔ انھوں نے مجھ سے کہا کہ ”آپ کے پرنسپل صاحب اس بات پر ناراض ہیں کہ آپ کا نام سندھ یونیورسٹی کے وائس چانسلر نے کیوں تجویز کیا۔ اور غالباً اسی وجہ سے آپ کا نام تجویز نہیں کیا ہے۔ برخلاف اس کے کچھ اور لوگوں کے نام تجویز کئے ہیں، اور ان کا اصرار ہے کہ ان میں سے کسی ایک کو لندن بھیجنے کی سفارش کی جائے۔ لیکن میرے خیال میں آپ مناسب ترین آدمی ہیں۔ یہ اعزاز کی بات ہے کہ آپ کا نام

کسی دوسری یونیورسٹی کے وائس چانسلر نے تجویز کیا ہے اس سے آپ کے کام کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ میں نے آپ کی تین سال کی چھٹی سنڈیکیٹ سے منظور کروادی ہے۔ آپ کو لندن یونیورسٹی میں کام کرنے کی اجازت بھی دے دی گئی ہے۔ اب آپ جب چاہیں لندن جاسکتے ہیں۔

میں یہ سن کر بہت خوش ہوا۔ یونیورسٹی کا اجازت نامہ لے کر راولپنڈی گیا۔ شوکت تھانوی صاحب مرحوم کے توسط سے وزارت تعلیمات کے دفتر پہنچا۔ رفیق احمد صاحب ایجوکیشنل ایڈوائزر سے مناسب کارروائی کروائی تقرر کے کاغذات حاصل کیے، اور لاہور واپس آکر لندن جانے کی تیاری کرنے لگا۔

پاسپورٹ بنوایا جس میں کوئی خاص دشواری نہیں ہوئی کیونکہ وزارت تعلیمات حکومت پاکستان نے پاسپورٹ کے ارباب اختیار کو اس سلسلے میں ضروری ہدایات دے دی تھیں۔ اس کے بعد اسٹیٹ بینک جانا پڑا۔ وہاں بھی کچھ کاغذی کارروائی ضروری تھی۔ کچھ فارن ایکسچینج بھی لینا تھا۔ بڑی مشکل سے۔ سٹیٹ بینک نے دس پونڈ دیے۔ یہاں سے فارغ ہوکر گوب ٹراولز کے دفتر گیا تاکہ لندن کے لیے ٹکٹ بنوالوں۔ وہاں اینگلو عربک کالج دہلی کے زمانے کے ایک پرانے شاگرد انور رفیق مل گئے۔ انھوں نے ضروری فارم وغیرہ خود پُر کرکے تھوڑی دیر میں لندن کا ٹکٹ بنوادیا۔

اب مجھے ذرا اطمینان ہوا کیونکہ بہت سے بوجھ اتر گئے۔ یکم اکتوبر کو مجھے لندن پہنچنا تھا۔ اس لئے میں نے ۲۸ ستمبر کو سیٹ بک کروائی۔ لاہور سے کراچی روانہ ہوا۔ ایک رات کراچی ٹھہرا۔ وہاں سے ۳۰ ستمبر کو لندن روانہ ہوا اور اسی دن شام کو بخیر و خوبی لندن پہنچ گیا۔

لندن ایئرپورٹ پر امیگریشن اور کسٹم وغیرہ سے فارغ ہوکر جب میں ہوائی اڈے کی عمارت سے باہر نکلا تو سامنے میرے پرانے دوست نعیم ملک کھڑے ہوئے

نظر آئے۔ میں نے انھیں تار دے دیا تھا۔ اس لئے ہوائی اڈے پر مجھے لینے کے لئے پہنچ گئے تھے۔ لندن میں مستقل طور پر قیام کرنے سے قبل وہ لاہور میں تھے، یہاں ان سے اکثر ملاقاتیں رہتی تھیں۔ نہایت مخلص اور مستعد آدمی تھے۔ میرے لندن میں قیام کرنے سے بہت خوش تھے۔ بڑے تپاک سے ملے۔ ایرپورٹ پر ہم لوگ ابھی باتیں کر رہے تھے کہ میرے دوست رالف رسل بھی آ گئے۔ بارو سے کوئی تیس میل کا فاصلہ طے کر کے وہ لندن ایرپورٹ پہنچے تھے۔ بڑی محبت سے ملے۔

میں نے کہا "آپ کو بہت دور سے آنا پڑا۔"

کہنے لگے "میں نے سوچا ایرپورٹ پر آپ کا استقبال کرنا چاہیئے۔ اس لئے میں آ گیا۔ کہیئے آپ کا سفر کیسا گذرا؟ کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی؟"

میں نے کہا "نہیں، بڑے آرام سے لندن پہنچا ہوں۔ سفر معلوم ہی نہیں ہوا۔"

میں نے نعیم ملک سے رسل کا تعارف کرایا۔ اور چند منٹ ہم باتیں کرتے رہے۔ پھر رسل نے اور نعیم نے میرا سامان اٹھا کر ٹیکسی میں رکھا، اور ہم تینوں باتیں کرتے ہوئے رسل اسکوائر کے پاس ویورلی ہوٹل ساؤتھمپٹن روڈ پہنچ گئے جہاں لندن یونیورسٹی کے اسکول آف اورینٹل اینڈ افریکن اسٹڈیز کی طرف سے میرے قیام کا انتظام تھا۔ کاؤنٹر پر دو لڑکیاں کام کر رہی تھیں۔ ہم نے ان سے کمرے کا نمبر پوچھا۔ انھوں نے بتایا کہ تیسری منزل پر ۱۳۴ نمبر کمرہ میرے لئے ریزرو کیا گیا ہے۔ لفٹ کے ذریعے سے ہم لوگ وہاں پہنچے۔ کمرے میں سامان رکھا، اور تھوڑی دیر اطمینان سے بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔ اب رات کے دس بج چکے تھے۔ رالف رسل کو خاصی دور ہارو جانا تھا۔ اس لئے وہ تو دس بجے کے بعد یہ کہہ کر چلے گئے کہ "کل اسکول میں ملاقات ہو گی۔" نعیم ملک میرے پاس گیارہ بجے تک بیٹھے رہے۔ ان سے پاکستان، لاہور اور لاہور کے احباب کی باتیں ہوتی رہیں۔ نعیم کئی سال ہوئے لاہور سے لندن آ گئے تھے۔ یہاں گھر بنا لیا تھا۔ ایک انگریز خاتون سے شادی بھی کر لی تھی لیکن وطن

کی یاد انھیں ہر وقت آتی رہتی تھی۔ اس لئے دیر تک وہ لاہور کے علمی، ادبی اور تہذیبی ماحول کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔ ان سے مل کر اور مفصل باتیں کرکے بہت لطف آیا۔ گیارہ بج گئے تو وہ یہ کہہ کر رخصت ہوئے کہ "انشاء اللہ صبح ملاقات ہوگی۔ میں ساڑھے نو بجے یہاں آؤں گا، اور آپ کو اسکول لے چلوں گا۔ لندن کی سیر بھی کریں گے۔

دیورلی ہوٹل مرکزی لندن میں تھا۔ یہاں سے اسکول آف اورینٹل اسٹڈیز کی عمارت قریب تھی۔ رسل اسکوئر سے گزر کر پانچ سات منٹ میں وہاں پہنچ سکتے تھے۔ ہوٹل بھی کھلا اچھا تھا۔ صاف ستھرا، خاموش، تمام سہولتیں بھی اس میں موجود تھیں۔ مجھے اس ہوٹل میں بڑا آرام ملا۔

نعیم کے جانے کے بعد میں نے تھوڑی سی تنہائی ضرور محسوس کی لیکن دن بھر کے سفر نے تھکا دیا تھا اس لئے جلد ہی میری آنکھ لگ گئی۔ معمول کے مطابق صبح چار بجے اٹھا۔ کچھ دیر بستر ہی میں لیٹا رہا اور گھر والوں کو یاد کرتا رہا۔ پانچ بجے کے قریب قدموں کی چاپ سنائی دی اور برتنوں کے کھنکنے کی آوازیں آنے لگیں۔ ہوٹل کی ویٹریس آ گئی تھی۔ اور اپنے کام میں مصروف تھی۔ میں کمرے سے باہر نکلا، اور ویٹریس سے کہا "میں صبح کو چائے پینے کا عادی ہوں۔ کیا مجھے ایک پیالی گرم چائے مل سکتی ہے؟"

اُس نے کہا "ضرور میں ابھی لاتی ہوں۔"

تھوڑی دیر میں وہ چائے لے آئی، اور نہایت سلیقے سے چائے کے برتن میز پر رکھ دیئے۔ میں نے اٹھ کر اطمینان سے چائے پی۔ بہت لطف آیا۔

اب پو پھٹ چکی تھی۔ دن نکل آیا تھا۔ سامنے کھڑکی میں سے صبح کی روشنی جھانکنے لگی تھی۔ معمول کے مطابق میں اس وقت سیر کے لئے جایا کرتا تھا لیکن آج ظاہر ہے کہ باہر نکلنا مشکل تھا۔ میں لندن میں نووارد تھا، اور مجھے اس شہر میں آئے ہوئے ابھی صرف بارہ گھنٹے گزرے تھے۔ ہوٹل کے آس پاس کی جگہوں سے میں ناواقف تھا، اس لئے ہوٹل

سے باہر جانے کی ہمت نہیں پڑی۔ حالانکہ ہوٹل کے کمرے میں اس وقت مجھے خاصی گھٹن کا احساس ہو رہا تھا۔ رات بھر مجھے گرمی لگتی رہی تھی کیونکہ ہوٹل میں اکتوبر ہی کے مہینے سے سنٹرل ہیٹنگ شروع کر دی گئی تھی اور ہوٹل والوں نے کمروں کو خاصا گرم کر رکھا تھا۔

چائے پی کر میں تھوڑا سا وقت گذارنے کے لئے ویٹریس کے پاس گیا اور اس سے کہا "رات کو گرمی بہت تھی۔ مجھے پسینہ آتا رہا۔ کیا واقعی لندن میں ابھی تک گرمی ہے؟"

اُس نے کہا "لندن میں تو اکتوبر کے مہینے میں خاصی سردی ہو جاتی ہے۔ باہر بھی خاصی سردی ہے لیکن اس ہوٹل کی عمارت گرم ہے۔ سنٹرل ہیٹنگ کی وجہ سے۔ آج کل کمروں کو کچھ زیادہ ہی گرم کرنے کا رواج ہو گیا ہے۔ بات یہ ہے کہ امریکن گرم کروں کو کچھ زیادہ ہی پسند کرتے ہیں۔ خاصی تعداد میں امریکی یہاں آتے ہیں۔ اُن کی وجہ سے ہیٹنگ کچھ زیادہ ہی تیز کر دی گئی ہے۔ حالانکہ ابھی لندن کا موسم ایسا ہے کہ اتنی گرمی کی ضرورت نہیں ہے"

میں نے کہا "مجھے تو اتنی گرمی اچھی نہیں لگی۔ ہم لوگ پاکستانی تو تازہ ہواؤں میں رہنے کے عادی ہیں۔ سنٹرل ہیٹنگ کی وجہ سے تو میرے سر میں درد ہونے لگا"

اس نے کہا "مجھے افسوس ہے کہ آپ کو تکلیف ہوئی۔ آج سے میں ٹمپریچر کچھ کم کروا دوں گی"

ویٹریس کی ان باتوں میں بڑی ہی انسانیت تہذیب و شائستگی اور مادرانہ شفقت تھی۔

غرض تھوڑی دیر یہ باتیں کر کے میں اپنے کمرے میں واپس آیا، نہا دھو کر تیار ہوا، اور نیچے ڈائننگ ہال میں ناشتہ کرنے کے لئے گیا۔

ڈائننگ ہال میں عجیب منظر تھا۔ مختلف ممالک سے آئے ہوئے لوگ ناشتہ کرنے میں مصروف تھے۔ ان میں زیادہ امریکی تھے۔ ہال بھرا ہوا تھا۔

میں ایک میز پر بیٹھا تو ویٹرس نے ناشتے کی چیزیں میرے سامنے لاکر رکھ دیں۔ میں نے سوچا، اس کو سمجھا دوں کہ میں مسلمان ہوں۔ بیکن وغیرہ نہیں کھاتا۔ ابلا ہوا انڈا کھا لوں گا۔ کارن فلیک اور چائے کے لئے مجھے گرم دودھ چاہیئے۔

وہ میری باتیں سن کر چونکا۔ کہنے لگا "یہاں تو کارن فلیک ٹھنڈے دودھ کے ساتھ کھاتے ہیں لیکن میں آپ کے لیے چند منٹ میں گرم دودھ لاؤں گا ـــــ بیکن وغیرہ آپ کو نہیں دیا جائے گا میں جانتا ہوں کہ مسلمان ایسی چیزوں سے پرہیز کرتے ہیں۔"

تھوڑی دیر میں وہ گرم دودھ اور اُبلے ہوئے دو انڈے لے آیا۔ میں نے ناشتہ کیا، اور پھر اپنے کمرے میں واپس جا کر نعیم ملک کا انتظار کرنے لگا۔

ساڑھے نو بجے ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ ہوٹل کے ریسپشن کاؤنٹر سے ایک لڑکی بول رہی تھی کہنے لگی "آپ سے ایک صاحب نعیم ملک ملنا چاہتے ہیں۔ کیا انھیں اوپر بھیج دوں؟"

میں نے کہا "ضرور بھیج دیجیے میں ان کا انتظار کر رہا ہوں۔"

دو تین منٹ میں نعیم ملک کمرے میں آ گئے۔ صبح صبح ان کے آنے سے مجھے بڑی خوشی ہوئی کیونکہ ایک تو میں تنہائی محسوس کر رہا تھا، دوسرے مجھے اس اجنبی شہر میں ایک رہنما کی ضرورت تھی جو پہلے مجھے اسکول آف اورینٹل اسٹڈیز لے جائے اور پھر لندن کی سیر کرائے۔

نعیم کچھ دیر میرے پاس بیٹھے۔ پھر یہ طے ہوا کہ پہلے اسکول چلنا چاہیے تاکہ ان لوگوں کو میرے لندن پہنچنے کی اطلاع ہو جائے۔

چنانچہ ہم لوگ ہوٹل سے باہر نکلے، ورسل اسکویر کو پار کر کے چند منٹ میں اسکول آف اورینٹل اینڈ افریکن اسٹڈیز پہنچ گئے۔

اس اسکول کی عمارت سات منزلہ ہے۔ اس کے سامنے لندن یونیورسٹی کے سینٹ ہال کی عمارت ہے جس میں یونیورسٹی لائبریری اور انسٹی ٹیوٹ آف ایجوکیشن ہے۔ اسکول کے برابر برک بک کالج اور یونیورسٹی کالج لندن ہے۔ اس کے سامنے یونیورسٹی کالج ہاسٹل ہے۔ اسکول سے ملحق وو برن اسکویر ہے جس میں ایک پرانی عمارت اسکول کے پاس ہے اور اس میں بھی اسکول کے اساتذہ بیٹھتے اور کام کرتے ہیں۔

اسکول کی عمارت میں ہم داخل ہوئے تو دیکھا کہ دائیں جانب کاؤنٹر پر ایک پورٹر بیٹھا

ہوا ہے جو استادوں اور طالب علموں کے اوورکوٹ اور چھتریاں وغیرہ اپنے پاس رکھتا ہے۔ بائیں جانب جونیئر کامن روم ہے جس میں طلبار اور طالبات جمع ہیں اور ان کی باتوں اور قہقہوں کی آوازیں سنائی دے رہیں۔

سامنے لفٹ تھا۔ ہم لوگ لفٹ سے تیسری منزل پر پہنچے، اور سیدھے مسٹر گیٹ ہاؤس سکول کے اسسٹنٹ سکریٹری کے کمرے میں گئے۔ آہستہ سے دروازہ کھٹکھٹایا۔ اندر سے آواز آئی "کم ان" ہم اندر داخل ہوئے دیکھا سامنے گیٹ ہاؤس بیٹھے ہیں۔ کھڑے ہو کر بڑے اخلاق سے ملے۔ ہوٹل سے میں نے انھیں فون کر دیا تھا اور اپنے لندن پہنچنے کی اطلاع دے دی تھی۔ اس لئے انھوں نے مجھے فوراً پہچان لیا۔ اپنے پاس بٹھایا اور باتیں کرنے لگے۔

کہنے لگے "آپ کا سفر کیسا گذرا؟ کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی؟"

میں نے کہا "میں بڑے آرام سے لندن پہنچا۔ ایرپورٹ پر میرے دوست نعیم اور رالف رسل پہنچ گئے تھے۔ وہاں سے ہم لوگ ریوری ہوٹل آئے۔ ہوٹل میں بھی ہر طرح کا آرام ہے۔"

کہنے لگے "مجھے خوشی ہے کہ آپ آرام اور اطمینان سے لندن پہنچ گئے۔ اب آپ چند روز ہوٹل میں سکون سے رہیے۔ مکان کا انتظام بھی جلدی ہی ہو جائے گا۔ میں ہر خدمت کے لئے حاضر ہوں۔ کبھی کوئی دشواری ہو تو مجھے بتایئے۔ ہمارے درمیان کوئی اجنبیت نہیں ہے۔ ہم ایک دوسرے سے خوب واقف ہو گئے ہیں۔ خاصے عرصے آپ سے خط و کتابت ہوتی رہی ہے۔ اب ملاقات بھی ہو گئی۔ مجھے آپ سے مل کر بے حد خوشی ہوئی ہے۔"

میں نے کہا "آپ سے پرانی واقفیت ہے۔ اور اب تو یہ واقفیت دوستی میں تبدیل ہو گئی ہے۔ مجھے آپ کی وجہ سے یہاں ہر طرح کا آرام ملا ہے۔ میں آپ کا شکر گذار ہوں۔"

پھر مسٹر گیٹ ہاؤس نے پوچھا "آپ کے پاس پونڈ کتنے ہیں؟"

میں نے کہا "میرے پاس صرف دس پونڈ ہیں۔ ہماری حکومت نے بڑی مشکل اور

منّت خوشامد سے صرف دس پونڈ مجھے دیئے ہیں، ورنہ صرف پانچ پونڈ دے رہے تھے۔ کہنے لگے "دس پونڈ میں کیا ہوگا؟ دس پونڈ میں تو آپ ایک دن بھی لندن میں نہیں گذار سکتے۔ آپ کے لئے تو سب سے پہلے کم از کم ڈیڑھ دو سو پونڈ کا چیک بنوانا چاہیے۔"

یہ کہہ کر انھوں نے اسکول کی اکاؤنٹنٹ مس شیلا اسمتھ کو فون کیا اور ان سے کہا کہ "ڈاکٹر بریلوی آگئے ہیں ان کے حساب کا چیک بنا دیجیے۔ وہ ابھی آپ سے ملنے آئیں گے۔"

یہ کہہ کر انھوں نے فون بند کیا، اور مجھ سے کہا "آپ کو ذرا سی زحمت ہوگی میں چاہتا ہوں آپ کی ملاقات اکاؤنٹنٹ سے ہو جائے۔ اکاؤنٹنٹ بہت اہم شخص ہوتا ہے۔ قریب ہی اُن کا کمرہ ہے۔ زحمت کرکے اُن کے پاس چلے جائیے۔ وہ بینک میں آپ کا حساب بھی کھلوا دیں گی اور چیک بھی آپ کو دے دیں گی۔"

یہ باتیں کرکے میں گیٹ ہاؤس کے پاس سے اُٹھ کر اسکول کی اکاؤنٹنٹ مس اسمتھ کے پاس گیا۔ بڑے تپاک سے ملیں اور کہا "آپ چند منٹ بیٹھئے میں نے آپ کا ایک سو تینتالیس پونڈ کا چیک بنوا دیا ہے۔ بینک کو خط بھی لکھ دیا ہے۔ ایک دفعہ آپ کو حساب کھلوانے کے لئے ویسٹ منسٹر بینک مورگیٹ جانا پڑے گا۔ اسکول کا حساب مورگیٹ برانچ میں ہے۔ صرف ایک دفعہ حساب کھلوانے کے لئے وہاں جانا پڑتا ہے۔ میرا خط انھیں دے دیجیے گا وہ چیک جمع کرلیں گے، آپ کا حساب کھول لیں گے۔ اس کے بعد جب بھی ضرورت ہو سو پونڈ تک اسکول کے قریب کی ویسٹ منسٹر بینک بلومسبری برانچ سے نکلوا سکتے ہیں۔ مورگیٹ جانے میں کوئی دشواری نہیں ہوگی۔ رسل اسکویر سے ٹیوب میں بیٹھئے، مورگیٹ پہنچ جائیں گے۔ بینک ٹیوب اسٹیشن کے برابر ہے۔"

میں چند منٹ ان کے پاس بیٹھا۔ پھر چیک اور خط لیا، اور نعیم کے ساتھ رسل اسکویر سے ٹیوب میں بیٹھ کر مورگیٹ پہنچا۔ ویسٹ منسٹر بینک میں خط اور چیک دیا۔ کاؤنٹر پر جو لڑکی کام کر رہی تھی، اس نے دو منٹ میں حساب بھی کھول دیا اور چیک بک بھی مجھے

ے دی، اور کہا "جتنے پونڈ کی آپ کو ضرورت ہو اس کا چیک لکھ دیجیے، ابھی رقم آپ کو ل جائے گی"

میں نے پچاس پونڈ کا چیک لکھا۔ اس لڑکی کو دیا۔ اُس نے دو منٹ میں ایک ایک پونڈ کے پچاس نوٹ مجھے دے دیئے، اور شکریہ ادا کر کے مجھے رخصت کر دیا۔

اب جیب میں پیسے آ گئے تو ذرا اطمینان ہوا۔ نعیم کے ساتھ پہلے تو ایک ریستوراں میں چائے پی، پھر آس پاس کی سیر کی، اور پھر واپس اسکول آ گئے۔

میں نے سوچا اب ذرا رالف رسل سے گپ شپ کرنی چاہیئے۔ چنانچہ میں نعیم کو رخصت کر کے رسل کے کمرے میں گیا۔ اس زمانے میں اُن کا کمرہ اسکول آف اورینٹل اسٹڈیز کی نئی عمارت سے ملحق ووبرن اسکویر میں تھا۔ یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ اس کمرے پر اُن کے نام کے ساتھ میرے نام کا بورڈ بھی لگا ہوا ہے۔ اس سے یہ معلوم ہوا کہ مجھے بھی اسی کمرے میں بیٹھ کر کام کرنا ہے۔ حیرت اس بات پر ہوئی کہ ابھی مجھے اسکول میں آئے ہوئے صرف چند گھنٹے ہوئے ہیں اور نام کا بورڈ کمرے کے دروازے پر لگا دیا گیا۔ باقاعدگی اور تیزی سے کام کرنے کی جو روایت یہاں نظر آئی، اُس کو دیکھ کر میں بہت خوش ہوا۔

کمرہ اندر سے بند تھا۔ میں نے آہستہ سے کھٹکھٹایا تو اندر سے آواز آئی "کم ان" یہ رسل کی آواز تھی۔

میں دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا تو دیکھا رسل سامنے کرسی پر بیٹھے ہیں۔ میز پر کاغذات بکھرے ہوئے ہیں، اور معمول کے مطابق اُن کا کام جاری ہے۔ ایک کی جگہ دو میزیں کمرے میں پڑی ہوئی ہیں۔

میں نے کہا "آپ کا کمرہ بہت اچھا ہے، یہاں خاموشی ہے، اور سامنے کھڑکی میں سے چھوٹا سا لان بھی نظر آتا ہے۔

کہنے لگے "صرف یہ میرا ہی کمرہ نہیں ہے۔ آپ کا کمرہ بھی ہے۔ ہم لوگ یہیں بیٹھ کر

کام کریں گے۔ طالب علم اور ریسرچ اسکالر بھی یہیں آجائیں گے۔ میں پڑھاؤں گا تو آپ سینیئر کامن روم میں چلے جائیں گے۔ آپ پڑھائیں گے تو میں سینیئر کامن روم یا لائبریری میں چلا جاؤں گا۔"

میں نے کہا "یہ اچھی بات ہے کہ ہم دونوں اس کمرے کو استعمال کریں گے۔"

کہنے لگے "بات یہ ہے کہ اسکول میں اساتذہ کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ نئی عمارت میں کمرے کم ہیں اس لئے ووبرن اسکوئر کی پرانی عمارت میں دو دو اساتذہ کو ایک ایک کمرہ دے دیا گیا ہے۔ اب یہاں نئی عمارت کی منزل تعمیر ہوگی تو یہ مسئلہ حل ہو جائے گا۔ لیکن اس میں وقت لگے گا۔ ہو سکتا ہے کہ جب یہ عمارت تعمیر ہو تو ہم اور آپ دونوں یہاں موجود نہ ہوں۔"

میں نے کہا "میں اس پرانی عمارت میں خوش رہوں گا۔ مجھے نئی چیزوں سے کوئی خاص دلچسپی نہیں ہے۔"

اس طرح ہم لوگ کچھ دیر کمرے میں بیٹھ کر باتیں کرتے رہے۔

ایک بجا تو رسل نے کہا "چلئے ریفیکٹری میں کھانا کھانے چلتے ہیں۔ کھانا بہت ضروری ہے۔"

میں نے کہا "ہاں چلئے۔ کھانا بہت ضروری ہے۔ کھانا کھائے بغیر تو کوئی کام نہیں ہو سکتا۔"

چنانچہ ہم لوگ اسکول کی نئی عمارت میں اساتذہ کی ریفیکٹری میں کھانا کھانے کے لئے گئے۔

یہاں کھانے کا معقول انتظام تھا۔ میزیں کھانے کے خوشنما برتنوں سے سجی ہوئی تھیں۔ مینو کارڈ سامنے رکھے ہوئے تھے۔ چار پانچ ادھیڑ عمر کی خواتین اساتذہ کے لئے کھانا لاکر میزوں پر رکھ رہی تھیں۔ ان کے انداز میں بڑی شگفتگی، شائستگی اور خوش سلیقگی تھی۔ بڑے بڑے پروفیسر کھانا کھانے میں مصروف تھے۔ شگفتگی اور شادابی

کا ماحول تھا، اس ماحول کو دیکھ کر طبیعت باغ باغ ہوئی۔

ہم لوگوں نے یہاں کھانا کھایا، اور پھر سینیر کامن روم میں دوسری منزل پر کافی پینے گئے۔ اس زمانے میں آٹھ دس شلنگ میں اچھا خاصا کھانا مل جاتا تھا اور کافی کی قیمت صرف چھ پنس فی پیالی تھی۔

کھانے اور کافی سے فارغ ہو کر ہم لوگوں نے اپنے آپ کو تازہ دم محسوس کیا، اور پھر اپنے کمرے میں آئے۔ یہاں بیٹھ کر ہم نے پڑھانے کا ٹائم ٹیبل وغیرہ بنایا۔ میرے حصے میں بی اے آنرز کی تیسری اور چوتھی جماعت کے ہفتے میں چار لکچر آئے۔ پہلی اور دوسری جماعت کے لکچروں کا کام رسل نے اپنے ذمے لیا۔ اس کے علاوہ پی ایچ ڈی کے ہفتے میں دو گھنٹے ملے۔ اس وقت اسکول میں پی ایچ ڈی کے تین اسکالر کام کر رہے تھے۔ دو میرے سپرد کیے گئے۔ ایک کو رسل نے اپنے پاس رکھا۔ اس طرح ہفتے میں کل چھ سات گھنٹے کا کام مجھے ملا جو ظاہر ہے کہ زیادہ نہیں تھا۔

ایک ہفتے کے بعد میں نے باقاعدگی سے پڑھانا شروع کر دیا۔ بی اے آنرز کے طالب علموں کو میں نے شاعری میں ولیؔ، میرؔ، سوداؔ، دردؔ، غالبؔ، مومنؔ، آتشؔ، حالیؔ، اقبالؔ، جوشؔ وغیرہ پڑھانا شروع کیا۔ ناول، افسانے میں سرشار، شرر، نذیر احمد، رسوا، منٹو، عصمت چغتائی اور کرشن چندر، اور سنجیدہ نثر میں، سرسید، حالی، شبلی، آزاد، عبدالحق وغیرہ مجھے پڑھانے کے لیے دیے گئے۔ طالب علموں کی تعداد پندرہ سے زیادہ نہیں تھی، اس لیے میں نے ان لوگوں کو بڑے شوق سے پڑھایا۔

لندن یونیورسٹی میں بی اے آنرز فرسٹ ڈگری سمجھی جاتی ہے اور اس کو ہمارے ایم اے کے برابر تصور کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد طالب علم پی ایچ ڈی میں داخل ہو سکتا ہے۔ لکچراری بھی اس کو مل سکتی ہے۔

غرض اس طرح بی اے آنرز کے طلبا و طالبات کو لکچر دینے کا کام میں نے شروع کر دیا

اور ساتھ ہی پی ایچ ڈی کے کام کی نگرانی بھی شروع کر دی۔ یہ کام چونکہ ایسا کچھ زیادہ نہیں تھا اس لیے میں پڑھانے کے بعد اسکول آف اورینٹل اسٹڈیز اور لندن یونیورسٹی کی لائبریریوں میں بیٹھتا تھا، کچھ عرصے بعد میں نے برٹش میوزیم، انڈیا آفس لائبریری اور رائل ایشیاٹک سوسائٹی کی لائبریریوں میں بھی جانا شروع کر دیا۔ ان لائبریریوں میں جانے سے مجھے بہت فائدہ ہوا، میری آنکھیں کھل گئیں، میرا ذہن روشن ہو گیا، میرے علم میں گراں قدر اضافہ ہوا اور علمی و تحقیقی کام کرنے کے نئے نئے میدان میرے سامنے آئے۔ پانچ چھ سال کے دورانِ قیام میں میں نے ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کیا، کام میں لگا رہا جس کے نتیجے میں کئی کتابیں طباعت و اشاعت کے لیے تیار ہو گئیں۔

اسکول کا ماحول بہت اچھا تھا۔ اساتذہ کی بڑی عزت تھی۔ سب لوگ بڑے احترام سے ملتے تھے۔ اسکول کے انتظامی عملے کے لوگ ڈائرکٹر، سکریٹری، صدر شعبہ کبھی کسی استاد کو اپنے دفتر میں بلاتے نہیں تھے۔ کیونکہ استاد کو دفتر میں بلانا اس کی شان کے خلاف اور معیوب سمجھا جاتا تھا، کسی تقریب کے بہانے سے ملاقات کر لیتے تھے۔ یا پھر ذاتی خط کے ذریعے سے پیغام بھیج دیتے تھے۔

جب میں شروع شروع لندن گیا اور اسکول میں چند روز گذارے تو اسکول کے ڈائرکٹر پروفیسر فلپس نے جو بعد میں لندن یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہو گئے۔ ایک دن اپنی سکریٹری مس خشین کے ذریعے سے یہ پیغام بھیجا کہ کیا آپ ان کے ساتھ کافی پینے کے لیے وقت نکال سکتے ہیں؟ کیا بارہ بجے کا وقت آپ کے لیے مناسب رہے گا؟ میں نے فوراً جواب لکھا کہ جمعہ کو بارہ بجے حاضر ہو سکتا ہوں۔ چنانچہ میں بارہ بجے ان کے دفتر میں پہنچا، سکریٹری نے کہا "آپ کو بڑی زحمت ہوئی۔ پروفیسر فلپس آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔ آپ کا شکریہ کہ آپ نے کافی کے لیے وقت نکالا"۔

یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ گھڑی کی سوئی بارہ پر پہنچی۔ پروفیسر فلپس خود اپنے کمرے سے باہر آ گئے اور احترام کے ساتھ مجھے اپنے کمرے میں لے گئے۔ بڑی محبت سے مجھے صوفے پر بٹھایا اور

باتیں کرنے لگے۔

کہنے لگے "آپ کئی دن سے لندن میں ہیں۔ مجھے افسوس ہے کہ اب تک آپ سے ملاقات نہ ہو سکی۔ میں چند روز کے لیے آکسفورڈ چلا گیا تھا۔ کل ہی واپس آیا ہوں۔ یہاں ہوتا تو پہلے ہی دن آپ سے ملاقات ہوتی۔ تاخیر کے لیے معذرت خواہ ہوں۔"

میں نے کہا، "آپ کی مصروفیات بے شمار ہیں۔ میں خود حاضر ہونا چاہتا تھا لیکن دریافت کرنے سے معلوم ہوا کہ آپ لندن سے باہر ہیں۔ میں آپ کے واپس آنے کا انتظار کرتا رہا۔ کل معلوم ہوا کہ آپ واپس آ گئے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی آپ کے ساتھ کافی پینے کی دعوت بھی ملی۔ بہت شکر گذار ہوں۔"

چند منٹ میں ایک خاتون نے کافی لا کر میز پر رکھ دی۔ اس کے ساتھ سینڈوچز، کیک اور کچھ دوسری چیزیں بھی تھیں۔

پروفیسر فلپس نے خود کافی بنائی، اور پیالی میری طرف بڑھائی اور کھانے کے لیے بھی اصرار کیا۔

میں نے ایک سینڈوچ کھائی اور کافی پی۔

پروفیسر فلپس کہنے لگے "آپ پہلی دفعہ لندن آئے ہیں۔ آپ کو یہ شہر عجیب سا لگ رہا ہوگا۔ ہر طرف تاریکی، بادل، ہلکی ہلکی بارش، دھواں (اسماگ)۔ مگر کیا کیا جائے لندن کی فضا یہی ہے۔ دھوپ یہاں کم ہی نکلتی ہے۔ ہم لوگ یہاں دھوپ کو ترستے ہیں۔ دھوپ کھانے کے لیے ہزاروں پونڈ خرچ کر کے سپین، اٹلی، یونان، اور ترکی جاتے ہیں۔ پاکستان کی دھوپ اور گرمی تو آپ کو یہاں بہت یاد آئے گی۔"

میں نے کہا "ابھی تو لندن میں موسم ایسا کچھ خراب نہیں ہے۔ اکتوبر کا مہینہ تو اچھا ہی گذر رہا ہے۔ آگے دیکھیے کیا ہوتا ہے ــــ ویسے سردی مجھے پسند ہے۔"

پروفیسر فلپس ہنسے اور کہنے لگے "دسمبر، جنوری اور فروری میں یہاں شدید سردی ہوگی

برف بھی گرے گی، بارشیں بھی ہوں گی۔ بہت ہی خراب موسم ہوگا۔ خیر آپ تو جوان ہیں برداشت کرلیں گے، اور اس موسم کا لطف اٹھائیں گے۔ امید ہے آپ کا وقت یہاں اچھا گذرے گا۔"

میں نے کہا "ابھی چند روز ہی میں نے لندن میں گذارے ہیں۔ مجھے لندن پسند ہے یہاں مجھے اجنبیت کا احساس نہیں ہوتا۔ لوگ بھی بہت مہذب اور شائستہ ہیں۔"

کہنے لگے "جی ہاں! لندن روایت پسند شہر ہے۔ پرانی تہذیبی روایات سے دلچسپی رکھنے والوں کو یہ شہر پسند آتا ہے، اور آپ کی دلچسپی کی تو یہاں بے شمار چیزیں ہیں۔ یہاں لائبریریاں ہیں، میوزیم ہیں، آرٹ گیلریز ہیں، ہندوستان اور پاکستان سے متعلق یہاں آپ کو بہت سی نئی نئی چیزیں ملیں گی، اور آپ ریسرچ کا کام یہاں بخوبی کرسکیں گے۔"

میں نے کہا "میں تو ریسرچ کا ایک منصوبہ بنا کر لایا ہوں۔ پاکستان و ہندوستان کی ثقافت اور اردو زبان و ادب پر یہاں کی لائبریریوں میں خاصا مواد ہے۔ میں انشاء اللہ چند روز میں کام شروع کردوں گا۔ میرے لئے تو یہاں گراں بہا خزانے ہیں۔"

پروفیسر فنیس میرے ریسرچ کے منصوبے کی تفصیل کو سُن کر بہت خوش ہوئے۔ کہنے لگے "آپ اطمینان سے یہاں کام کیجئے۔ کبھی میری خدمت کی ضرورت ہو تو بے تکلفی سے میرے پاس آیئے اور مجھے بتایئے، میں ہر خدمت کے لئے ہر وقت حاضر ہوں۔"

میں نے کہا "آپ کا بہت بہت شکریہ! آپ نے پاکستان پر قابلِ قدر کام کیا ہے میں اس سے بھی استفادہ کروں گا۔"

کہنے لگے "پاکستان کی تاریخ اور ثقافت سے مجھے بھی گہری دلچسپی ہے۔ ہندوستان کے مسلم کلچر کا میں بھی دلدادہ ہوں۔ اسکول اور یونیورسٹی کے انتظامی معاملات میں مصروف رہتا ہوں۔ خاصا وقت ان کاموں میں صرف ہوجاتا ہے۔ علمی کاموں کے لئے وقت کم ملتا ہے۔ پھر بھی کچھ نہ کچھ کرتا رہتا ہوں۔"

غرض ایک گھنٹے تک اسی طرح کی باتیں ہوتی رہیں۔ جب گھڑی کی سوئی ایک پر پہنچی تو پروفیسر فلپس نے کہا "آپ کا وقت بہت قیمتی ہے۔ میں نے آپ کا خاصا وقت لیا لیکن آپ سے ملنے کی خواہش تھی۔ آپ کے ساتھ کافی پی کر اور باتیں کر کے بہت لطف آیا۔ جی چاہتا تھا اور باتیں ہوں لیکن آپ کی مصروفیت کا خیال ہے۔ خیر ابھی تو آپ عرصہ دراز تک یہاں رہیں گے۔ ملاقاتیں ہوتی رہیں گی۔ سینئر کامن روم میں تو چائے اور کافی پر آپ سے اکثر ملنے کا موقع ملے گا۔ آپ کا بہت بہت شکریہ کہ آپ نے اپنی مصروفیات میں سے کچھ وقت میرے لیے نکالا۔ میں آپ کا بے حد شکر گزار ہوں۔"

میں سمجھ گیا کہ پروفیسر فلپس نے میرے لئے ایک گھنٹے کا وقت نکالا تھا لیکن کس شائستگی کے ساتھ انھوں نے اس کا اظہار کیا۔ اپنی مصروفیت کا ذرا بھی ذکر نہیں کیا میری مصروفیات کا ذکر کرتے رہے۔ ان کی تہذیب اور شائستگی کو دیکھ کر جی خوش ہوا۔

ایک بجے کے بعد میں نے اُن سے اجازت لی، اور ان سے رخصت ہو کر اپنے گھر میں آیا جہاں رسل میرا انتظار کر رہے تھے۔ میں نے انھیں پوری روداد سنائی۔ بہت خوش ہوئے اور پھر باتیں کرتے ہوئے ہم کھانا کھانے کے لئے چلے گئے۔

اسی طرح ایک روز اسکول کے سکریٹری کرنل موائز بارٹایٹ سے ملاقات ہوئی میں خود ان سے ملنے چلا گیا۔ بڑی محبت اور اخلاق سے ملے۔

کہنے لگے "آپ سے ایک زمانے سے تعارف ہے۔ کئی مہینے سے ہماری خط و کتابت ہوتی رہی ہے۔ آج ملنے کی خواہش بھی پوری ہوئی۔ میں اسکول میں آپ کو خوش آمدید کہتا ہوں۔"

میں نے کہا "آپ سے ملنے کا بڑا ہی اشتیاق تھا۔ آپ کے خطوں میں شفقت اور محبت کی باتیں ہوتی تھیں، اور ان کی وجہ سے دل میں آپ سے ملنے اور باتیں کرنے کی ایک لہر سی اٹھتی تھی۔"

کہنے لگے "آپ کی محبت ہے آپ سے مل کر جی بہت خوش ہوا۔ امید ہے آپ کا

وقت یہاں اچھا گذرے گا۔ آپ تحقیق کا کام بھی کریں گے اور طالب علم بھی آپ سے استفادہ کریں گے۔"

کرنل ڈاکٹر موائز بارٹلیٹ (COLOND DR MOYSE BARTLET) سے دیر تک اس قسم کی باتیں ہوتی رہیں۔ اس کے بعد انھوں نے دو تین کاغذ نکالے، ان پر مجھ سے دستخط کروائے اور اسکول کے انتظامی ڈھانچے کے بارے میں کچھ معلومات فراہم کیں۔

کوئی ایک گھنٹہ ان کے ساتھ گذار کر میں واپس اپنے کمرے میں آیا

شعبۂ اردو، پاکستان و ہندوستان کے صدر اس وقت پروفیسر جان برف (G. BRONGH) تھے۔ وہ سنسکرت کے پروفیسر تھے اور انھوں نے بدھ مذہب اور تہذیب پر بھی خاصا کام کیا تھا لیکن پاکستان و ہند کی تہذیب و ثقافت سے بھی انھیں گہری دلچسپی تھی۔ ان سے "تو اکثر میری ملاقات ہوتی تھی، بڑے احترام سے پیش آتے تھے، اور میری ہر بات مان لیتے تھے۔

میں نے اس صورت حال کو غنیمت جانا اور ایک دن ان سے رالف رسل کی بہت تعریف کی، اور کہا کہ "یہ شخص نہ صرف صحیح اور با محاورہ اردو زبان بولتا ہے، بلکہ اردو کے ادبیات کا بھی اس نے باقاعدگی سے مطالعہ کیا ہے۔ اس کی ایک کتاب میر، سودا، درد اور میر حسن پر شائع ہونے والی ہے۔ ٹائپ اسکرپٹ میرے پاس ہے۔ اگر آپ اس کو دیکھنے کے لئے وقت نکال سکیں تو آپ کی خدمت میں پیش کر دوں —— ان کو اردو میں کم از کم ریڈر ہونا چاہئے۔"

پروفیسر برف نے کہا "ٹائپ اسکرپٹ مجھے دے دیجئے، میں اس کا مطالعہ کرکے یونیورسٹی کو یہ تجویز بھیج دوں گا کہ ان کو اردو میں ریڈر ہونا چاہئے۔"

ایک مہینے کے بعد پروفیسر صاحب مجھے سینئر کامن روم میں ملے۔ ہم نے کافی پی اور باتیں کرتے رہے۔ دوران گفتگو انھوں نے بتایا کہ ان کی تجویز یونیورسٹی نے منظور کر لی ہے اور رالف رسل کو اردو کا ریڈر بنا دیا گیا ہے۔

مجھے یہ سن کر بہت خوشی ہوئی۔ کافی پی کر اپنے کمرے میں گیا اور رسل کو یہ خوش خبری

سنائی۔ وہ بھی خوش ہوئے۔ اردو کی تعلیم و تحقیق کو اس سے فائدہ ہوا۔ اسی خیال سے میں نے یہ تجویز پیش کی تھی۔

پاکستان و ہند کے شعبے میں ایک اور پروفیسر، پروفیسر رائٹ (PROFESSOR WRIGHT تھے، یہ بھی سنسکرت کے پروفیسر تھے اور پروفیسر برف (PROFESSOR BROUGH) کے دست راست سمجھے جاتے تھے۔ جب پروفیسر برف اپنی تحقیقات کے سلسلے میں انگلستان سے باہر جاتے تھے تو شعبے کی صدارت انھیں کے سپرد کی جاتی تھی۔ اچھے آدمی تھے۔ بڑے اخلاق سے ملتے تھے لیکن کچھ الجھنوں کا شکار تھے۔ اس لئے ہر وقت کچھ پریشان سے نظر آتے تھے تیزی سے بولتے تھے۔ ان سے مل کر یوں محسوس ہوتا تھا جیسے جلدی میں ہیں۔ فوراً کوئی کام انجام دے کر جلدی میں کہیں اور جانا چاہتے ہیں۔ مزاج میں کچھ نوآبادیاتی رنگ و آہنگ بھی تھا۔ اس لئے بعض اوقات عجیب و غریب باتیں کرتے تھے۔

پروفیسر رائٹ سے بھی میری کئی ملاقاتیں ہوئیں، اور میں نے انھیں لطیف، مہذب اور شائستہ آدمی پایا لیکن ایک سال گذرنے کے بعد ان سے ایک اکیڈمک معاملے میں میرا اختلاف ہوا، اور معاملہ لندن یونیورسٹی کی کمیٹی فار ہائر اسٹڈیز اینڈ ریسرچ تک پہنچا۔

ہوا یوں کہ جب میں نے کئی ریسرچ اسکالرز کو لندن میں پی ایچ ڈی کرنے کے لئے پاکستان سے بلایا تو یہ بات انھیں کچھ اچھی نہیں لگی، اور انھوں نے پشاور کے ایک اسکالر شمس الدین صدیقی کے موضوع تحقیق کے بارے میں بے جا دخل اندازی کی جس سے میں نے اختلاف کیا۔ شاید اس سے قبل انھیں اس کا تجربہ نہیں ہوا تھا۔

شمس الدین صدیقی پشاور یونیورسٹی میں شعبۂ اردو کے صدر تھے۔ انھوں نے خواہش ظاہر کی کہ وہ لندن آکر پی ایچ ڈی کرنا چاہتے ہیں۔ میں نے کوشش کرکے ان کا داخلہ کروا دیا اور یہ فیصلہ کیا کہ سودا کے کلام کو ان سے اڈیٹ کروایا جائے کیونکہ اس وقت سودا کے کلام کے کوئی بیس پچیس نسخے لندن کے مختلف کتب خانوں میں موجود تھے۔ یہ موضوع میں نے منظور

کروالیا۔ شمس الدین لندن آگئے، اور انھوں نے کام شروع کردیا۔

جب ایک سال انھیں کام کرتے ہوئے گذر گیا، اور ایم اے سے پی ایچ ڈی میں ان کے تبادلے کا مسئلہ پیش آیا تو میری سفارش کے باوجود پروفیسر رائٹ نے اس کی مخالفت کی۔ دراصل وہ چاہتے تھے کہ شمس الدین کو پی ایچ ڈی کے بجائے ایم اے کی ڈگری ملے۔ چنانچہ انھوں نے میرے سفارشی نوٹ پر اختلافی نوٹ لکھا، اور اس سلسلے میں مجھ سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ شعبے کی سکریٹری مسز گارلنڈ نے ان کا پیغام مجھ تک پہنچایا۔

پیغام ملتے ہی میں اُن کے کمرے میں اُن سے ملنے چلا گیا۔ بڑے اخلاق سے ملے۔ کہنے لگے "آپ نے ایک اسکالر کی پی ایچ ڈی میں تبادلے کی سفارش کی ہے۔ میرے خیال میں انھیں پی ایچ ڈی میں ٹرانسفر نہیں کرنا چاہیے۔ سودا کے کلام کی ایڈیٹنگ کوئی اہم موضوع نہیں ہے۔"

میں ان کی باتیں سنتا رہا۔ بالآخر میں نے ان سے پوچھا "کیا آپ نے سودا کے کلام کا مطالعہ کیا ہے؟ کیا آپ کو معلوم ہے کلام سودا کے کتنے قلمی نسخے لندن کی مختلف لائبریریوں میں ہیں؟"

کہنے لگے "یہ میرا موضوع نہیں ہے۔ اس لیے مجھے اس کا مطلق علم نہیں۔"

میں نے کہا "پروفیسر رائٹ! یہ اکیڈمک معاملہ ہے۔ میں نے سوچ سمجھ کر اسکالر کو ایم اے سے پی ایچ ڈی میں ٹرانسفر کرنے کی سفارش کی ہے۔"

کہنے لگے "اچھا، کل کمیٹی فار ہائر اسٹڈیز اینڈ ریسرچ کی میٹنگ ہے۔ اس میں اس موضوع پر بحث کرلیں گے۔ کیا آپ اس میٹنگ میں شریک ہوں گے؟"

میں نے کہا "جی ہاں! میں میٹنگ میں پہنچوں گا۔ کمیٹی کا جو بھی فیصلہ ہوگا۔ میں اس کو تسلیم کروں گا لیکن میں اپنے موقف کی وہاں وضاحت ضرور کروں گا۔"

یہ باتیں کرکے میں وہاں سے رخصت ہوا۔ دوسرے روز کمیٹی کی میٹنگ میں سینٹ ہال پہنچا۔ میٹنگ کی صدارت افریقی زبانوں کے پروفیسر گتھرے (PROFESSOR GUTHRIE) کررہے تھے۔ جب یہ معاملہ بحث کے لیے پیش ہوا تو پروفیسر رائٹ نے اس پر اپنے خیالات پیش کیے

اور مخالفت کی۔ پروفیسر گتھرے نے اس پر مجھے اپنا موقف پیش کرنے کے لیے کہا۔

میں نے صرف اتنی بات کہی کہ "میں نے تحریر میں اس کی سفارش کر دی ہے۔ میرا موقف صاف ظاہر ہے۔"

اس پر پروفیسر گتھرے بولے "پروفیسر رائٹ! چونکہ پروفیسر بریلوی اس مضمون کے استاد ہیں، اور انھوں نے تحریر میں اپنے اسکالر کو پی ایچ ڈی میں تبادلے کی سفارش کر دی ہے اس لیے سوائے اس کے اور کوئی چارہ نہیں کہ ان کی سفارش کو تسلیم کر لیا جائے۔"

ظاہر ہے کہ یہ کمیٹی کے صدر کا فیصلہ تھا۔ اس لئے پروفیسر رائٹ خاموش رہے لیکن اٹھ کر یہ کہا کہ "اسکالر کی انگریزی اچھی نہیں معلوم ہوتی۔ کام کس طرح کریں گے؟"

اس پر میں نے کہا "جناب صدر! یہ اسکالر عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد دکن سے انگریزی زبان اور ادبیات میں بھی ایم اے ہے۔ اس لیے اس کی انگریزی کی قابلیت پر شبہ نہیں کیا جا سکتا۔"

غرض اس بحث کے بعد میرا موقف تسلیم کر لیا گیا، اور پروفیسر رائٹ کی بات نہیں مانی گئی لیکن جب میٹنگ ختم ہوئی اور ہم باہر نکلے تو پروفیسر رائٹ نے میرے گلے میں باہیں ڈالیں مجھے کامیابی پر مبارک باد دی اور کہا کہ "میں آپ کی ہمت کی داد دیتا ہوں۔"

کوئی دوسرا ہوتا تو اس اکیڈمک معاملے کو ذاتی مسئلہ بنا لیتا، اور اس کو اپنی ناکامی کا ملال ہوتا لیکن پروفیسر رائٹ نے ایسا نہیں کیا بلکہ اپنے دفتر میں واپس جا کر پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر کو خط لکھا جس میں میری تعریف کی، اور مزید چھٹی کے لئے سفارش کی تاکہ میں لندن میں زیادہ سے زیادہ وقت گذار سکوں۔

یہ سب کچھ ایک معقول انگریز پروفیسر ہی کر سکتا ہے۔

انگلستان کے دوران قیام میں میں نے یہ محسوس کیا کہ وہاں کے تعلیمی نظام میں طبقاتی تفریق کا خیال نہ ہونے کے برابر ہے۔ یہاں نہ کوئی افسر ہے نہ ماتحت۔ ہر شخص کی اپنی اپنی جگہ

اہمیت ہے۔ پروفیسر، ریڈر لکچرار کی تنخواہوں میں فرق ضرور ہے لیکن ان سب کا کام تدریس اور تحقیق ہے اور وہ ان کاموں میں مصروف اور مگن رہتے ہیں۔ اس لئے سب ایک دوسرے کی عزت کرتے ہیں۔

یونیورسٹی کے نیچے درجے کے اساتذہ کو کوئی کم مرتبہ نہیں سمجھتا، اور یہ لوگ بھی اپنے آپ کو کسی سے کمتر نہیں سمجھتے۔ کلرک، آفس بوائے اور پورٹر سب دیانتداری سے اپنا کام کرتے ہیں، کسی سے ڈرتے نہیں، خوفزدہ نہیں ہوتے، خوشامد نہیں کرتے، اور کوئی بڑا افسر بھی ان سے یہ توقع نہیں کرتا کہ وہ اس کے نیچے نیچے بچھیں گے۔

ہمارے اسکول میں ایک صاحب مسٹر جونس تھے جو پورٹر کے فرائض انجام دیتے تھے۔ اسکول کے اندر داخل ہونے والے پھاٹک کے پاس اُن کا چھوٹا سا کمرہ تھا۔ اس کے سامنے وہ کاونٹر پر بیٹھے رہتے تھے۔ پروفیسروں اور طالب علموں کے اوور کوٹ، برساتیاں، چھتریاں اور کچھ دوسری چیزیں اپنے پاس رکھتے تھے۔ یہی ان کا کام تھا۔ ہر ایک سے بڑی خندہ پیشانی سے پیش آتے تھے۔ مزاج میں بذلہ سنجی بھی تھی اس لئے ہر وقت ہنستے اور کوئی نہ کوئی لطیفہ اور ہنسانے والی بات کرتے رہتے تھے۔

ایک دن لندن میں آندھی چل رہی تھی اور موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ اسکول کے ڈائرکٹر اس عالم میں اپنی موٹر سے نکل کر اسکول کے اندر داخل ہوئے۔ ان کے کندھے پر برساتی بغل میں چھتری اور ہاتھ میں تھیلا (پورٹ فولیو) تھا۔ اس طرح لدے پھندے اسکول میں داخل ہوئے تو مسٹر جونس کو مخاطب کرکے کہا "مسٹر جونس اچھا خاصا طوفان ہے" (MR JONES! QUITTE - A STORM)

مسٹر جونس نے جواب دیا "جی ہاں جناب! اچھا خاصا طوفان ہے"۔ YES SIR ! QUITE A STORM)

لیکن وہ نہ تو اس عالم میں پروفیسر فلپس کو دیکھ کر اپنی جگہ سے اٹھے اور نہ انھوں نے

اُن کے ہاتھ سے چیزیں لے کر انہیں ان کے کمرے تک پہنچانے کی کوشش کی۔ پروفیسر فلپس کو اُن سے اس بات کی توقع بھی نہیں تھی کیونکہ لندن میں ہر شخص اپنا سامان خود اٹھاتا ہے۔

پروفیسر فلپس بجلی کی سی تیزی کے ساتھ لفٹ میں چلے گئے اور اپنے کمرے میں پہنچ گئے۔

لندن یونیورسٹی کے تمام پروفیسروں کے کمروں کے سامنے کوئی چپراسی قسم کی مخلوق نظر نہیں آتی جس کو ہندوستان اور پاکستان میں PEON بھی کہا جاتا ہے۔ میں نے اپنے انگریز احباب سے پوچھا تو معلوم ہوا کہ PEON انگریزی لفظ نہیں ہے۔ یہ تو پرتگالی زبان کا لفظ ہے۔

ہندوستان میں پرتگالیوں نے چپراسی رکھنے کی روایت قائم کی اور یہ سلسلہ برعظیم میں انگریزوں کے زمانے تک رائج رہا بلکہ انگریزوں کے چلے جانے کے بھی اب تک جاری ہے۔

چپراسی کی حیثیت سے مختلف اداروں میں کام لینا خلافِ تہذیب و شائستگی تصور کیا جاتا ہے۔ کیونکہ انسان انسان سب برابر ہیں۔

اگر کوئی یہاں کسی سے ملنا چاہتا ہے تو یا تو وہ فون پر وقت مقرر کرے گا، یا پھر کمرے کے سامنے پہنچ کر دستک دے گا۔ اندر سے آواز آئے گی (COME IN) "آجائیے"

اور اس طرح وہ کمرے میں داخل ہو کر کام کی بات کرے گا اور شکریہ ادا کر کے رخصت ہو جائے گا۔

لندن یونیورسٹی کے دوران قیام میں مجھے انگلستان کے تعلیمی نظام اور انتظامی معاملات کو بہت قریب سے دیکھنے کے مواقع ملے۔ لندن یونیورسٹی کے اسکول آف اورینٹل اینڈ افریکن اسٹڈیز میں تو میں چھ سال تک پروفیسر کی حیثیت سے کام کرتا رہا لیکن ASSOCI-
(ASSOCIATION OF - II ATION OF BRITISH ORIENTALISTS
UNIVERCITY TEACHERS کے ممبر کی حیثیت سے مجھے آکسفورڈ، کیمبرج، لیڈز، اڈنبرا، بلفاسٹ، گلاسگو، برمنگھم، ڈبلن، کارڈیف وغیرہ جانے اور وہاں قیام کرنے کے مواقع ملے۔ ان تمام مقامات پر میں نے یونیورسٹیوں کو دیکھا، کانفرنسوں میں شرکت کی، لائبریریوں سے

استفادہ کیا، اہم پروفیسروں سے ملاقاتیں کیں، سیمیناروں میں شریک ہوا۔ اس طرح انگلستان کی یونیورسٹیوں کے نظامِ تعلیم اور علمی ماحول سے خاصی واقفیت حاصل کر لی۔

سب سے اہم بات جو میں نے انگلستان کی یونیورسٹیوں میں دیکھی، وہ وہاں کی آزاد فضا اور اس آزاد فضا میں کام کرنے کی دھن تھی۔ پروفیسروں اور طالب علموں کو اس آزاد فضا کی بدولت میں نے دیانت دار، مخلص اور محنتی پایا۔ منافقت ان میں سے کسی میں مجھے نظر نہ آئی۔

انگلستان ایک جمہوری ملک اور فلاحی مملکت ہے۔ یہاں جس کا جی چاہے سوچے۔ جس نظریے پر چاہے ایمان رکھے۔ کوئی کسی پر انگلی نہیں اٹھاتا۔ کوئی کسی پر اعتراض نہیں کرتا۔ کوئی کسی پر پابندی نہیں لگاتا۔ یہ سب کچھ اس کے ذاتی معاملات ہیں اور یہاں کسی کے ذاتی اور داخلی معاملات میں مداخلت نہیں کرتا۔ ہر شخص اپنے فرائض کو نہایت دیانت داری سے انجام دیتا ہے اور اس کے جو حقوق ہیں ان کو کسی طرح بھی چھوڑنے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔ لیکن یہ حقوق کبھی بھی غصب نہیں کئے جاتے۔ اس لئے ان کے پامال ہونے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔

ایک دن اسکول آف اورینٹل اینڈ افریکن اسٹڈیز کے ڈائرکٹر پروفیسر فلپس سینیر کامن روم میں اپنی کافی کی پیالی لے کر میرے پاس آکر بیٹھ گئے، اور باتیں کرنے لگے۔ دورانِ گفتگو انھوں نے کہا: مجھے اس بات کی بڑی خوشی ہے کہ ہمارے اسٹاف کے چار پانچ آدمی آئندہ الیکشن میں حصہ لے رہے ہیں اور وہ موجودہ حکومت کی مخالف پارٹی سے تعلق رکھتے ہیں۔"

میں یہ سن کر حیران ہوا۔ اس لئے میں نے پوچھا "کیا اساتذہ کو عملی سیاست میں حصہ لینے کی اجازت ہے؟"

پروفیسر فلپس نے کہا "بالکل اجازت ہے۔ یہ آزاد ملک ہے۔ جمہوری ملک ہے۔ یہاں کسی پر کوئی پابندی نہیں۔ بعض اساتذہ تو یونیورسٹی میں ایسے ہیں جو سوشلسٹ ہیں۔

اُن کے خیالات پر بھی کوئی پابندی نہیں، یہ اور بات ہے کہ میں ذاتی طور پر سوشلسٹوں سے اتفاق نہیں کرتا۔ میں ذاتی طور پر قدامت پسند ہوں۔ اس فلاحی مملکت میں سوشلسٹ ہونے کی کیا ضرورت ہے۔"

میں اُن کی یہ باتیں سُن کر حیران ہوا، اُن کی ہاں میں ہاں ملاتا رہا اور یہ کہتا رہا کہ "واقعی پروفیسر کو آزاد ہونا چاہیئے۔ اُس کے جوہر اسی طرح کھل سکتے ہیں۔ انگلستان کا نظام اِس اعتبار سے مثالی حیثیت رکھتا ہے۔"

پھر اُنھوں نے ایک اور واقعہ سُنایا۔

کہنے لگے "آج سے چند سال پہلے افریقہ کے کسی ملک سے ایک اہم شخصیت، انگلستان کی ملکہ کے ذاتی مہمان کی حیثیت سے لندن آئی ہوئی تھی۔ اسکول آف اورینٹل اینڈ افریکن اسٹڈیز میں افریقی زبانوں کے بھی بڑے بڑے پروفیسر تھے۔ ملکہ نے یہ خواہش ظاہر کی کہ اگر افریقی زبان کے انگریز پروفیسر اُن کے مہمان سے ملنے اور ترجمانی کے فرائض انجام دینے کے لیے اپنی مصروفیات میں سے تھوڑا سا وقت نکال کر محل میں آ سکیں گے تو ملکہ ذاتی طور پر ممنون ہوں گی۔ لیکن پروفیسر نے اِس دعوت کو قبول نہیں کیا اور یہ کہہ کر صاف انکار کر دیا کہ اُن کے پاس اس کام کے لئے وقت نہیں ہے لیکن اِس پروفیسر سے کسی کو کوئی شکایت نہیں ہوئی کیونکہ انھیں اس کی پوری آزادی تھی۔"

اس پر میں نے کہا "واقعی، انگلستان میں پروفیسر کا منصب بہت بلند ہے، اس کی بڑی عزت ہے، اور وہ ہر اعتبار سے آزاد ہے۔"

اسکول میں میرے پاس پڑھانے کا کام کم تھا۔ ہفتے میں پانچ چھ لکچر سے زیادہ نہیں تھے۔ اس لئے مجھے لندن کی لائبریریوں میں جانے کے لئے خاصا وقت مل جاتا تھا۔ پڑھانے کے بعد زیادہ وقت میں مختلف کتب خانوں میں گزارتا تھا۔ ان کتب خانوں میں، اسکول آف اورینٹل اینڈ افریکن اسٹڈیز، برٹش میوزیم، انڈیا آفس، رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے کتب خانے خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ان کتب خانوں میں میں نے خاصا وقت گزارا، اور مجھے یہاں

ہندوستان اور پاکستان کی تاریخ اور تہذیب، ثقافت اور اردو زبان و ادب سے متعلق بہت سی اہم اور نادر و نایاب چیزیں ہیں۔

اسکول آف اورینٹل اینڈ افریکن اسٹڈیز کے لائبریرین اس وقت مسٹر پیرسن (MR. PERSON) تھے جنھیں ہندوستان اور پاکستان اور مشرقی علوم سے گہری دلچسپی تھی، اور جنھوں نے ایک اہم کیٹلاگ بھی بنائی تھی۔ پہلی ہی ملاقات میں ان سے میری دوستی ہو گئی۔ بڑے ہی ملنسار آدمی تھے۔ دلچسپ باتیں کرتے تھے۔ برعظیم کے تمام پہلوؤں پر ان کی معلومات قابل رشک تھی۔ ریٹائرمنٹ کے بعد وہ لندن یونیورسٹی میں BIBLIOGRAPHY کے پروفیسر ہو گئے تھے۔

وہ مجھ سے کہنے لگے "یہاں اسکول کی لائبریری میں آپ کے کام کی بہت سی چیزیں ہیں۔ آپ یہاں بیٹھ کر اطمینان سے کام کیجیے۔ ہندوستان کے برطانوی دور کی تاریخ پر یہاں اچھا خاصا سرمایہ ہے۔ بعض نادر و نایاب چیزیں بھی ہیں، جن کو آج تک کسی نے نہیں دیکھا۔ آپ کی ریسرچ کے لیے یہ چیزیں بہت مفید ثابت ہوں گی۔"

میں نے ان کے ساتھ چائے پی کر اسکول کی لائبریری میں گھوم پھر کر ایک جائزہ لیا پھر کیٹلاگ دیکھی۔ یہاں مجھے فورٹ ولیم کالج کے بارے میں خاصی چیزیں ملیں جن میں سے بیشتر بالکل نادر و نایاب تھیں۔ ان میں ڈاکٹر جان گلکرسٹ کی تمام مطبوعہ تصانیف کے علاوہ ان کی انگریزی نظموں کا قلمی نسخہ بھی ملا جو کس مپرسی کے عالم میں پڑا ہوا تھا۔ اس کو نکال کر دیکھا تو میں حیران رہ گیا۔ یہ ان کے ہاتھ کی لکھی ہوئی نظمیں تھیں جن کے صفحات الگ الگ تھے۔ جلد تک نہیں باندھی گئی تھی۔ گلکرسٹ ایجوکیشنل ٹرسٹ نے ان کے کاغذات اسکول کو دے دیئے تھے۔ ان میں یہ نظمیں بھی تھیں۔ ان نظموں کو دیکھ کر مجھے یوں محسوس ہوا جیسے بیش بہا خزانہ میرے ہاتھ آ گیا ہے۔

ان نظموں میں گلکرسٹ کی ابتدائی زندگی کے بارے میں گراں قدر معلومات تھی۔

اس لئے میں نے ان کو شائع کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا۔ چنانچہ لاہور واپس جا کر میں نے نظموں کو ایک مقدمے کے ساتھ پہلے اورینٹل کالج میگزین میں چھاپ دیا اور بعد میں ان کو کتابی صورت میں شائع کر دیا۔ ساری دنیائے علم و ادب ان نظموں کو دیکھ کر حیران رہ گئی، کیونکہ یہ ایک بالکل ہی نئی ادبی دریافت کی حیثیت رکھتی تھیں۔ بڑے بڑے اسکالروں نے ان کے بارے میں مجھے خط لکھے۔ جن میں ان خیالات کا اظہار تھا کہ یہ کام تو بہت پہلے کسی انگریز کو کرنا چاہیئے تھا لیکن ان کو دریافت کرنے اور اہتمام کے ساتھ شائع کرنے کا سہرا ایک پاکستانی کی قسمت میں تھا۔

اسکول کی لائبریری میں مجھے جو دوسری چیزیں ملیں ان کو میں نے اپنی ریسرچ میں استعمال کیا، اور ان کی بدولت بعض اہم کتابیں طباعت و اشاعت کے لئے تیار ہوئیں۔

اسکول کی لائبریری میں کام کرنے کے ساتھ ساتھ میں برٹش میوزیم کی لائبریری میں بھی جانے لگا۔ یہاں میری ملاقات اورینٹل سیکشن کے ڈائرکٹر مسٹر گارڈنر (MR.GARDNER) سے ہوئی جنہوں نے اس اہم لائبریری کے دروازے میرے لئے کھول دیئے اور میں زیادہ وقت یہاں گذارنے لگا۔ یہاں مجھے بعض ایسے قلمی نسخے ملے جو نادر و نایاب تھے اور جن کو کسی نے کبھی دیکھا تک نہیں تھا۔ ان میں نواب کریم خان کا سیاحت نامہ (اردو کی پہلی ڈائری)، مرقع مخلص (آنند رام مخلص کی یادداشتیں)، مرزا کاظم علی جوآن کی شکنتلا، مظہر علی خاں ولآ کی ہفت گلشن اور مادھونل کام کندلا، سید حیدر بخش حیدری کا دیوان، ان کا تذکرہ، گلشن ہند، ان کی مختصر کہانیاں، بینی نارائن جہآں کی چار گلشن، نبی بخش شوق اکبرآبادی کا فسانۂ عشق، گلکرسٹ کی نقلیات ہندی، نواب فیض علی خاں ممتاز کی ممتاز الامثال، میر سوز کا دیوان، دیوان میر حسن، آغا جو شرف کی شکوہ فرنگ، واجد علی شاہ کی افسانۂ عشق اور حزن اختر، میر حسن کی بعض غیر مطبوعہ مثنویاں، دیوان میر حسن، دیوان مبتلا کے نادر و نایاب نسخے ملے جن کو میں نے اسی زمانے میں کراچی اور لاہور سے شائع کر دیا۔

برٹش میوزیم ہی میں کام کرنے کی بدولت مجھے سید حیدر بخش حیدری کی نادر و نایاب تالیف گلزارِ دانش اور دیوانِ ولا کے قلمی نسخوں کا علم ہوا جس کو میں نے کوپن ہیگن ڈنمارک جاکر رائل لائبریری سے حاصل کیا، اور ان کو بھی اورینٹل پبلیکیشنز کی طرف سے شائع کردیا۔ ادبی مورخین کا خیال تھا کہ ان کتابوں کے نسخے کہیں موجود نہیں ہیں، لیکن میری کام کرنے کی دھن اور لگن نے ان کو دریافت کرلیا۔ اور خدا کا شکر ہے کہ یہ نادرو نادر و نایاب کتاب اورینٹل کالج کی طرف سے دو جلدوں میں شائع بھی ہوگئی۔

برٹش میوزیم کی لائبریری میں زیادہ وقت گزارنے سے مجھے بہت فائدہ ہوا۔ مجھے ان تہ خانوں میں جانے کی اجازت مل گئی، جہاں جنوبی ایشیا میں شائع ہونے والا ایک ایک پرزہ موجود ہے۔ اس ذخیرے میں مجھے بے شمار کام کی چیزیں ملیں جو میری جھولی میں محفوظ ہیں اور انشاء اللہ پچاس سال تک شائع ہوکر جنوبی ایشیا کی تاریخ، تہذیب اور ادب میں اضافے کا باعث بنتی رہیں گی۔

انڈیا آفس لائبریری اس زمانے میں فارین آفس کا ایک حصہ تھی۔ میں وہاں بھی اکثر جاتا تھا، اور اس لائبریری سے بھی استفادہ کرتا تھا۔ یہاں بھی مجھے اپنی ریسرچ کے سلسلے میں بیش بہا خزانے دستیاب ہوئے۔ اس کتب خانے میں مجھے تمام سہولتیں حاصل تھیں۔ مسٹر سٹینلے سٹن (STANLEY SUTTON اس زمانے میں انڈیا آفس لائبریری کے لائبریرین اور ڈائرکٹر تھے۔ وہ نہایت نیک، شریف اور مدد کرنے والے انسان تھے۔ اُن سے بہت میری دوستی ہوگئی اور ان کی دوستی نے ان خزانوں کے دروازے میرے لیے کھول دیے جو انڈیا آفس لائبریری میں محفوظ تھے۔ چند سال بعد یہ لائبریری فارین آفس سے BLACK FRIARS میں منتقل ہوگئی جہاں اس کے لئے جدید طرز کی عمارت تعمیر کی گئی تھی۔ میں یہاں بھی کئی سال تک کام کرنے کے لیے جاتا رہا اور اس عجیب و غریب لائبریری سے استفادہ کرتا رہا، خصوصیت کے ساتھ انگریزوں کے زمانے کی وہ فائلیں میرے لیے خصوصی دلچسپی کا باعث بنیں جن میں اس زمانے کے اربابِ اختیار کے ذریعے

کاغذات تھے جن کا مطالعہ ہندوستان کی تاریخی، تہذیبی اور ادبی مطالعے کے لئے بیش بہا خزانہ تھا۔

لندن کے دوران قیام میں مجھے آکسفورڈ اور کیمبرج جانے کے مواقع ملتے رہے۔ میں نے وہاں کی لائبریریوں میں بھی کام کیا۔ وہاں بھی مجھے اپنے تحقیقی کام کے سلسلے میں اہم چیزیں ملیں جن سے میں نے اپنی ریسرچ کے سلسلے میں استفادہ کیا۔ بادلین لائبریری آکسفورڈ BODELEIN LIBERARRY OXFORD اور کنگز کالج کیمبرج (KING'S COLLEGE CAMBIREDGE کی لائبریریوں میں مجھے بعض نادر و نایاب قلمی نسخے بھی ملے جن کے مائکرو فلم میں نے حاصل کئے جو میرے پاس محفوظ ہیں اور انشاءاللہ جلد شائع ہوں گے۔

لندن میں کوئن این اسٹریٹ پر ایک اہم لائبریری رائل ایشیاٹک سوسائٹی کی بھی تھی۔ اس میں بیٹھ کر وہی لوگ کام کرسکتے تھے جو سوسائٹی کے فیلو ہوں۔ میں چونکہ سوسائٹی کا فیلو تھا اس لئے مجھے وہاں کام کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ یہاں جنوبی ایشیا کی تاریخ، تہذیب اور ادبیات پر نادر و نایاب مخطوطے تھے۔ ان کی کوئی باقاعدہ کیٹلاگ نہیں تھی۔ بہت سے مخطوطے بکسوں میں بند تھے۔ یہاں مجھے اپنے کام سے متعلق خاصی تعداد میں اہم مطبوعہ کتابیں اور قلمی نسخے ملے۔ ان میں خلیل علی خاں اشک کی گلزار چین اور رسالۂ کائنات کے قلمی نسخے خاص طور پر قابل ذکر ہیں، ان کے بارے میں ادبی مورخین نے لکھا تھا کہ یہ کتابیں اب دنیا میں کہیں موجود نہیں ہیں۔ میں نے ان کو اورینٹل کالج کی طرف سے شائع کردیا۔ یہاں مجھے میراجی کی گنج خوبی کا قلمی نسخہ بھی ملا جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ میراجی کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔ میں نے اس کا عکس چھاپنے کا منصوبہ بنایا ہے تاکہ یہ ہمیشہ کے لئے محفوظ ہو جائے۔ اس کے علاوہ اس لائبریری میں مجھے جنوبی ایشیا کے مسلم کلچر پر بھی خاصا مطبوعہ اور غیر مطبوعہ مواد ملا، جس سے میں اپنے تحقیقی کاموں میں استفادہ کرتا رہا ہوں، اب بھی کر رہا ہوں اور آئندہ بھی کرتا رہوں گا۔

غرض لندن کے مختلف کتب خانوں میں مجھے برعظیم پاکستان و ہند کی تاریخ و

تہذیب اور ادبیات پر ایسا نادر و نایاب مواد ملا جو بیش بہا خزانے کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کی روشنی میں برعظیم کی اسلامی تہذیب خصوصاً اردو زبان و ادب کی تاریخ کو از سرِ نو کسی اور طریقے سے ترتیب دینے کی ضرورت محسوس ہوگی۔ یہ خیال میرا نہیں، تاریخ ادبیات کے نامور پروفیسروں کا ہے جس کا اظہار انھوں نے اس کام کو دیکھ کر کیا ہے جو اب تک میری کوشش اور کاوش سے شائع ہو کر سامنے آچکا ہے۔ لیکن اس کے علاوہ بھی میری جھولی میں بہت کچھ ہے۔

یہ دولتِ بیش بہا اس لئے میرے ہاتھ آئی کہ میں نے اس کی تلاش و جستجو میں عمرِ عزیز کا خاصا حصہ صرف کیا۔ لندن میں قیام کے دوران میں نے ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کیا۔ بس انھیں کاموں میں لگا رہا، اور انھیں میدانوں کی خاک چھانتا رہا۔ ہمارے ہاں کسی کو بھی اس کا علم نہیں کہ برٹش میوزیم، انڈیا آفس، رائل ایشیاٹک سوسائٹی، آکسفورڈ، کیمبرج، اڈنبرا، ٹیوبنگن (جرمنی)، کوپن ہیگن (ڈنمارک)، پیرس (فرانس) اور انگلستان کی مختلف کاؤنٹیز کے کتب خانوں میں برعظیم کے مسلمانوں کی تاریخ و تہذیب، فکر و فلسفہ اور دین و مذہب پر چھپنے والا اور نہ چھپنے والا ایک ایک پرزہ محفوظ ہے۔ ہماری تساہلی اور بے حسی نے تو وہ سب کچھ ضائع کر دیا۔ مغرب کے لوگوں نے اس کو محفوظ رکھا۔ اب بھی اس کو اپنایا جا سکتا ہے۔ حکومتوں کی سطح پر اسکالروں کی ایک ٹیم بنا کر اس کی تلاش و جستجو کی جا سکتی ہے، اور اس کے مائکروفلم حاصل کئے جا سکتے ہیں۔ جزوی طور پر یہ کام میں نے کیا بھی ہے لیکن یہ کام بڑے پیمانے پر ہونا چاہیئے تاکہ ہم اپنی اپنی تاریخ کو از سرِ نو قومی زاویے سے لکھ سکیں، اور ادبی تاریخ کو اس مواد کی روشنی میں ایک نئے طریقے سے مرتب کر سکیں۔ کاش وطنِ عزیز کے اربابِ اختیار کو اس کام کی اہمیت کا احساس ہو، اور ان کے ہاتھوں قومی تعمیر کے اس اہم منصوبے کو عملی صورت دی جائے۔ انھیں اس بات کا علم ہونا چاہیئے کہ جو مواد یورپ میں بکھرا پڑا ہے، اس کی کوئی باقاعدہ فہرست نہیں ہے۔ وہ تو بے شمار کتب خانوں اور ان کے تہہ خانوں میں محفوظ ہے جہاں تک انسان کا پہنچنا تو درکنار، پرندہ تک پر نہیں مار سکتا۔

علامہ اقبال نے اس کی اہمیت کو محسوس کیا تھا اور یہ کہہ کر اس صورت حال پر خون کے آنسو بہائے تھے ؎

مگر وہ علم کے موتی کتابیں اپنے آبا کی
جو دیکھیں ان کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سیپارہ

لیکن ہم پر پھر بھی کوئی اثر نہ ہوا، ہم اقبالؒ کی پرستش تو کرتے رہے لیکن ان کی باتوں کو درخورِ اعتنا نہ سمجھا، اور آج ہمارا معاشرہ جس فکری اور تہذیبی انتشار سے دوچار ہے، اس کا ایک بہت بڑا سبب یہ بھی ہے کہ ماضی سے ہم نے کنارہ کشی اختیار کر لی اور علم کے دروازے اپنے اوپر بند کر لئے، اور ہمارے آباؤ اجداد نے ان میدانوں میں جو میراث چھوڑی تھی، اس سے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

لندن کے دورانِ قیام میں اس افسوسناک صورت حال کا خیال میرے دل میں کانٹے کی طرح کھٹکتا رہا اور میں بھی اقبالؒ کے اس شعر کو بار بار پڑھ کر خون کے آنسو بہاتا رہا۔ اربابِ اختیار کو بار بار توجہ دلائی لیکن نقار خانے میں طوطی کی آواز بھلا کون سنتا ہے!

لندن علمی و ادبی اعتبار سے ہی نہیں، تہذیبی اور جمالیاتی اعتبار سے بھی نہایت دلکش شہر ہے بظاہر دیکھنے میں یہاں تاریکی رہتی ہے۔ عمارتیں بھی بیشتر سیاہ ہیں۔ بکنگھم پیلیس تک باہر سے سیاہ نظر آتا ہے۔ لندن کی فضاؤں میں ہر وقت جو دھواں پھیلا رہتا ہے اس کی وجہ سے یہ عمارتیں سیاہ ہو جاتی ہیں، لیکن اس کے باوجود یہ شہر خوبصورت ہے، اور اس میں ہر اعتبار سے خوبصورت لوگ رہتے ہیں، نہ صرف صورت کے اعتبار سے بلکہ سیرت کے اعتبار سے بھی یہاں خوبصورتی کا احساس ہوتا ہے، اور یہاں کی ہواؤں اور فضاؤں میں حسن و جمال کے دریا بہتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

یہاں کی سب سے بڑی خوبصورتی یہ ہے کہ ہر شخص یہاں آزاد ہے۔ یہاں کوئی کسی کو آزار ہر شخص جو چاہے وہ سوچ سکتا ہے۔ جو چاہے وہ خیالات و نظریات رکھ سکتا ہے۔

انسان یا جانور کو تکلیف پہنچانا یہاں سب سے بڑا گناہ ہے۔ ہر شخص ایک دوسرے کی عزت کرتا ہے، اُس کا خیال رکھتا ہے، اُس کو تکلیف نہیں دیتا۔ انگریز خواہ مخواہ کسی سے بولتا نہیں، چپ رہتا ہے لیکن اگر کبھی کسی کو مدد کی ضرورت ہو تو پھر اس کی زبان سے نکلتا ہے "کیا میں آپ کی مدد کر سکتا ہوں" (CAN I HELP YOU)، ذہانت کا یہ عالم ہے کہ اگر آپ راستہ پوچھنا ہے تو وہ آپ کے انداز سے پہچان لے گا کہ آپ راستہ بھول گئے ہیں اور اس سلسلے میں اس کی مدد چاہتے ہیں۔

ایک دن میں کسی صاحب سے ملنے جا رہا تھا۔ ان کا مکان اس سے قبل کبھی دیکھا نہ تھا۔ COLLINDALE اسٹیشن سے باہر نکلا تو سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ لمبی سڑک پر بائیں طرف جاؤں یا دائیں جانب۔ میں ذرا دیر رُک کر سوچنے لگا۔ اتنے میں پیچھے سے آواز آئی "کیا میں آپ کی مدد کر سکتی ہوں" (CAN I HELP YOU) ایک خاتون اپنے بچے کو پریم میں لئے ہوئے جا رہی تھیں۔ انھوں نے فوراً یہ محسوس کیا کہ میں شش و پنج میں ہوں اور راستہ بھول گیا ہوں۔ ایک منٹ میں انھوں نے مجھے پتہ بتا دیا، اور میں چند منٹ میں وہاں پہنچ گیا۔

اسی طرح جب کہیں ٹیلی فون کیجئے تو ایک نہایت لطیف، شیریں اور شائستہ سی آواز آئے گی CAN I HELP YOU اس اعتبار سے لندن شہر کا جواب نہیں ہے۔ یہاں میں نے ہر شخص کو مدد کے لئے تیار دیکھا۔ یہاں کوئی کسی سے الجھتا نہیں، تو تو میں میں نہیں کرتا۔ کوئی کسی کی طرف دیکھتا نہیں، کوئی کسی کو گھورتا نہیں، کوئی کسی سے دست و گریباں نہیں ہوتا، کوئی کسی کے کام کو روکتا نہیں، کوئی کسی کو پریشان نہیں کرتا۔

ٹیوب میں جو لوگ سفر کرتے ہیں اُن کے پاس اخبار ضرور ہوتا ہے۔ یہ اخبار دن میں تین چار بار چھپتے ہیں۔ ان میں کوئی خاص بات نہیں ہوتی لیکن ٹیوب میں بیشتر سفر کرنے والے ان اخباروں پر نگاہ جمائے رہتے ہیں۔

میں نے اپنے ایک انگریز دوست سے ایک دن پوچھا کہ "ٹیوب میں اخبار سامنے رکھنے کا

کیا مقصد ہے؟ — ان اخباروں میں دیر تک پڑھنے کی تو کوئی خاص چیز نہیں ہوتی!"

وہ کہنے لگا: "یہ اخبار اس لئے لوگ اپنے سامنے رکھتے ہیں تاکہ دوسرے لوگوں کو یہ احساس نہ ہو کہ وہ ان کی طرف دیکھ رہے ہیں بلکہ گھور رہے ہیں۔ کسی کی طرف خواہ مخواہ دیکھنے اور گھورنے کو یہاں معیوب سمجھا جاتا ہے۔"

میں یہ سُن کر حیران ہوا اور دفعتاً میری زبان سے نکلا "یہ تو تہذیب اور شائستگی کی انتہا ہے۔"

لندن میں مجھے اچھے دوست اور اچھے پڑوسی ملے۔ میں شروع شروع اپنے خاندان کے ساتھ مرکزی لندن کے قریب ٹفنل پارک (TUFFNELL PARK) میں رہا۔ اس کے بعد کوئی دو تین سال FORTIS GREEN میں گذارے۔ آخری دو سال HAMPSTEAD کے علاقے میں TANZA ROAD پر ایک فلیٹ میں قیام کیا جس کی کھڑکیاں پارلیمنٹ ہل کی طرف کھلتی تھیں، اور حدِ نظر تک سبزہ ہی سبزہ نظر آتا تھا۔ کیٹس ہاؤس یہاں سے بہت قریب تھا، جہاں وہ بلبل ابھی تک اپنے نغمے سناتی ہے جن کو سُن کر کیٹس نے اپنی مشہور نظم ODE TO NIGHINGALE لکھی تھی۔ فارٹس گرین کے آس پاس ہائی گیٹ ووڈ اور کوئنز ووڈ۔ TANZA ROAD کے قریب پارلیمنٹ ہل اور HAMPSTEAD HEATH کی سرسبز پہاڑیاں اور کھلے میدان تھے۔ میں ان جنگلوں اور پہاڑیوں میں صبح شام خوب سیر کرتا تھا، اور یہاں کے حسن و جمال کی داد دیتا تھا۔ روزانہ پارلیمنٹ ہل سے چل کر HAMPSTEAD HEATH کو پار کر کے KEN WOOD تک جاتا تھا۔ کیسے خوبصورت مناظر تھے! — احباب یہ کہتے تھے کہ آپ نے صحیح معنوں میں HEATH کو DISCOVER کیا ہے۔ اس کے علاوہ ہائیڈ پارک، کنسنگٹن گارڈن اور کیو گارڈن جانا بھی میرے معمولات میں داخل تھا۔

فارٹس گرین FORTIS GREEN میں ہماری ایک لینڈ لیڈی بیٹرکس ٹوڈر ہارٹ BEATRIX TUDOR HEART تھیں، جو نہایت انسان دوست، رحم دل اور مہذب و شائستہ خاتون تھیں۔ کسی شخص کو پریشانی میں نہیں دیکھ سکتی تھیں۔ کوئی تکلیف میں ہو تو اُن کی

آنکھوں میں آنسو آ جاتے تھے۔ بندوق کو نہیں دیکھ سکتی تھیں۔ لڑائی جھگڑے سے انھیں شدید نفرت تھی۔ ان کو دیکھ کر یہ احساس ہوتا تھا کہ وہ انسانیت اور محبت کا ایک مجسمہ ہیں۔ بچوں سے انھیں دلچسپی تھی چنانچہ چھوٹے بچوں کی تعلیم و تربیت کے موضوع پر انھوں نے کتابیں بھی لکھی تھیں جو لندن اور پیرس میں شائع ہوئی تھیں۔ بچوں کی ایک نرسری بھی انھوں نے کھول رکھی تھی جس کا مقصد بچوں کی خدمت کرنا تھا۔

بیٹرکس نے اپنے باغ میں اپنے لئے ایک چھوٹا سا کاٹیج تعمیر کروالیا تھا۔ اس میں اکیلی رہتی تھیں۔ اس میں انھوں نے کبھی تالا نہیں لگایا کہتی تھیں "یہ علاقہ پچاس سال قبل ایک گاؤں تھا۔ یہاں سکون ہی سکون تھا۔ یہاں لوگ اپنے گھروں میں تالا نہیں لگایا کرتے تھے۔ ان کی دیکھا دیکھی ہم نے بھی اپنے فلیٹ میں تالا لگانا چھوڑ دیا۔ سب کچھ کھلا ہوا چھوڑ کر باہر چلے جاتے اور گھنٹوں باہر رہ کر واپس آتے تھے لیکن کبھی کسی نے گھر کو نہیں چھیڑا۔ چوری کا یہاں کوئی تصور نہیں تھا۔

ہم لوگ بیٹرکس (BEATRIX) کے ساتھ تین چار سال تک رہے۔ ہمیں اُن کے گھر میں نہ صرف آرام ملا بلکہ ان کے ساتھ ہر لحاظ سے بہت ہی اچھا وقت گذرا اور ہم لوگ ان کی انسانیت اور شرافت سے بہت متاثر ہوئے اُن کی بیٹی جینفر جونس بھی بڑی مہذب اور پڑھی لکھی خاتون تھیں۔ وہ تعمیرات کی پروفیسر تھیں۔ ان کے بچے مارگریٹ اور سڈ بھی بہت مہذب تھے۔

لندن اگرچہ بہت بڑا شہر ہے اور دور دور تک پھیلا ہوا ہے، بلکہ یہ کہنا چاہیئے کہ کہیں ختم نہیں ہوتا لیکن اس کے باوجود یہاں پارک ہیں میدان ہیں، سرسبز و شاداب پہاڑیاں ہیں، جنگل ہیں سڑکوں پر سڑکوں پر درختوں کے جھنڈ ہیں، نہریں ہیں، تالاب ہیں، باغات ہیں جن کو دیکھ کر آنکھوں میں نور اور دلوں میں سرور پیدا ہوتا ہے۔ سبزے سے محبت کا یہ عالم ہے کہ اکثر علاقوں کے نام کے ساتھ GREEN یا سبز کا لفظ ضرور لگایا جاتا ہے۔ درختوں سے دلچسپی کی یہ کیفیت ہے کہ ہر علاقے میں جو پرانے درخت ہیں، ان کے ریکارڈ علاقے کے

دفتروں میں موجود ہے۔

ہمارے فارٹس گرین (FORTISGREEN) کے مکان میں جو وسیع و عریض باغ تھا۔ اس میں اونچے اونچے آسمانوں سے باتیں کرتے ہوئے ناشپاتیوں (CONFERENCE PEARS) کے کئی درخت تھے۔ بیٹرکس (BEATRIX) کی بیٹی جینفر جونس (JENNIFAR JONES) نے جب اپنی زمین پر فلیٹ بنانے کا منصوبہ بنایا، اور اس کو منظوری کے لیے کاؤنٹی کونسل کے سامنے پیش کیا تو وہاں سے دو آدمی اس جگہ کو دیکھنے کے لیے آئے۔ انھوں نے کہا کہ نقشہ تو منظور ہو جائے گا لیکن یہاں کانفرنس پیرز کے جو کئی سو سال پرانے درخت ہیں، انھیں کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچنا چاہیے۔ ان درختوں کی ناشپاتیاں بھورے رنگ کی نہایت شیریں ہوتی تھیں، جن کو کھا کر شہد و شکر کا مزہ آتا تھا، اور وہ درخت بھی ایسے سرسبز و شاداب، شاندار اور خوبصورت تھے کہ انھیں حسن و جمال کا شاہکار کہا جائے تو بے جا نہیں۔

لندن میں بہار کا موسم بہت ہی خوبصورت ہوتا ہے۔ پلین ٹریز (PLAIN TREES) سردی گذرنے کے بعد سرسبز و شاداب ہو جاتے ہیں۔ ہریالی ہر طرف اپنا جادو جگاتی ہے۔ کئی مہینے تک قسم قسم کے پھول اپنی بہار دکھاتے ہیں۔ اس زمانے میں ریجنٹ پارک، کیو گارڈن، ہائیڈ پارک اور کنسنگٹن گارڈن میں ایسے ایسے پھول کھلتے ہیں کہ ان کو دیکھ کر جی خوش ہوتا ہے اور دل یہ چاہتا ہے کہ زندگی انھیں کے درمیان بسر کر دی جائے۔

موسم بہار میں تقریباً تین مہینے تک مختلف قسم کے ان پھولوں کے کھلنے کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔

میں نے لندن کے ان خوبصورت درختوں، سبزہ زاروں، شاداب پہاڑیوں اور جنگلوں سے خوب لطف اٹھایا اور خاصا وقت ان کے درمیان گذارا۔

لندن شہر کی تاریخ یہ بتاتی ہے کہ اس کی خوبصورتی اور تہذیب و شائستگی کا یہ اثر تھا کہ جو سیاح، شاعر، ادیب، مفکر، مصور، بت تراش یہاں آیا وہ یہیں کا ہو کر رہ گیا۔ اس شہر

کی مہمان نوازی کا یہ عالم یہ عالم تھا کہ آج بھی ان کے ناموں کی تختیاں ان مکانوں پر لگی ہوئی ہیں جہاں انھوں نے قیام کیا تھا اور اُن کی قبریں تک یہاں کے قبرستانوں میں محفوظ ہیں ـــــ اور یہ قبرستان بھی باغوں کی طرح خوبصورت نظر آتے ہیں۔

اس شہر کے چپے چپے پر تاریخ لکھی ہوئی ہے۔ یہاں پرانے محل ہیں، قدیم مکانات ہیں، میوزیم ہیں، آرٹ گیلریاں ہیں، تھیٹر ہیں، موسیقی کے مرکز ہیں جن کو لندن والوں نے اپنی اصل حالت میں محفوظ رکھا ہے۔ اپنے تاریخی آثار اور قدیم چیزوں کو محفوظ رکھنے کا جو جذبہ اور شوق و ذوق مجھے لندن میں نظر آیا وہ میں نے دنیا کے کسی ملک میں نہیں دیکھا۔

لندن میں رہ کر ہم لوگوں نے انگلستان اور آئرلینڈ کے مختلف شہر اور مناظر کے اعتبار سے خوبصورت علاقے بھی دیکھے۔ میں نے لندن میں ایک نئی کار موریس آکسفورڈ خرید لی تھی۔ اس میں دور دراز علاقوں کا سفر کیا۔ جہاں جی چاہا وہاں ٹھہرے۔ آکسفورڈ اور کیمبرج تو جاتے ہی رہتے تھے ایک دفعہ ناٹنگھم، برمنگھم، لیڈز، لیک ڈسٹرکٹس، گلاسکو، نیوکاسل، اور اڈنبرا جانے کا پروگرام بنایا، اور ان شہروں کے آس پاس کے دیہاتی علاقوں کی سیر بھی کی۔ مناظر کے اعتبار سے یہ علاقے بہت دلکش تھے۔ لوگ بھی بہت اچھے ملے، جی خوش ہوا، سفر کا لطف آگیا۔

میرا چھوٹا بھائی ڈاکٹر نزہت یار خاں اس زمانے میں شمالی آئرلینڈ کے شہر بلفاسٹ میں ڈاکٹر تھا۔ ایک دفعہ تعطیلات میں ہم وہاں گئے، اور شمالی آئرلینڈ کے ایک ایک شہر اور ایک ایک گاؤں کی سیر کی، اور پھر جمہوریہ آئرلینڈ کے دارالحکومت ڈبلن بھی گئے۔ ڈبلن میں ہم نے ٹرینٹی کالج دیکھا، چسٹر بیٹی لائبریری گئے، جیمس جوائس کی یادگاریں دیکھیں اور گرافٹن اسٹریٹ کے خوبصورت بازاروں کی سیر کی۔ واپسی میں ڈبلیو۔ بی۔ ییٹس کے گاؤں سلائیگو بھی گئے۔ آئرلینڈ خوبصورت ملک ہے۔ یہاں کے شہر خوبصورت، صاف ستھرے، ساحلی علاقے دلکش اور ان میں رہنے والے لوگ نہایت مہذب، شائستہ، خلیق اور انسان دوست نظر آئے۔

موسم گرما کی تعطیلات میں ایک دفعہ میں نے یورپ اور مشرق وسطیٰ کے مختلف ملکوں

اور اُن کے اہم شہروں اور دیہاتوں کو دیکھنے کے لئے طویل سفر کیا۔ لندن سے کار میں چلے چینل پار کیا، بلجیم پہنچے، وہاں سے فرانس، جرمنی، آسٹریا، یوگوسلاویہ، یونان، ترکی، شام، عراق اور ایران گئے۔ کوئی ڈیڑھ مہینہ اس سفر میں صرف ہوا۔ تھکن بھی بہت ہوئی لیکن لطف بہت آیا کیونکہ کار میں سفر کرنے کی وجہ سے ان ملکوں کے نہ صرف شہر دیکھنے میں آسانی ہوئی بلکہ دیہاتی علاقوں کو دیکھنے کے مواقع بھی ملے۔ یورپ کے تقریباً تمام اہم تاریخی مقامات کی سیر کی اور استنبول، انقرہ، دمشق، حلب، بغداد، کربلا اور نجف اشرف میں زیارتوں پر جاکر اپنے دلوں کو روحانی مسرتوں سے مالامال کیا۔

غرض لندن میں پانچ چھ سال کا قیام ہر اعتبار سے دلچسپ اور مفید رہا۔ ایک نئی دنیا کو دیکھنے کا موقع ملا جو مشرق سے بالکل مختلف تھی۔ انگلستان اور یورپ کے مختلف ممالک کی معاشرتی اور تہذیبی زندگی کا مطالعہ کیا۔ انسانیت اور انسان دوستی کے عجیب و غریب تجربات ہوئے۔ یہاں کے نظامِ تعلیم سے اپنے آپ کو آشنا کیا۔ خوبصورت مقامات کی سیر کی۔ حسین و دلآویز مناظر سے لطف اندوز ہوا۔ حسین اور خوبصورت لوگوں سے ملا۔ لائبریریوں کو کھنگالا اور ان لائبریریوں میں سے بے شمار گوہرِ نایاب ہاتھ آئے۔

اور اس طرح قیامِ لندن کا پانچ چھ سال کا طویل عرصہ آنکھ جھپکاتے گذر گیا۔

لندن کے دورانِ قیام میں مجھے انگریزوں کے علمی، ادبی اور تعلیمی ماحول کو بہت قریب سے دیکھنے کے مواقع ملے۔ تعلیمی اداروں کے انتظامی معاملات کو بھی میں نے بغور دیکھا اور ان کے مختلف پہلوؤں کو سمجھنے کی کوشش کی۔ تدریس و تحقیق کے نئے طور طریقے بھی میں نے یہاں سیکھے۔ یہاں کے پروفیسروں سے میں نے بہت کچھ حاصل کیا اور اُن کی بدولت کام کرنے کی لگن اور علمی اعتبار سے کچھ نہ کچھ کرتے رہنے کی دھن میری زندگی کا حصہ بن گئی۔ انگلستان کے ASSOCIATION OF BRITISH ORIENTALISTS اور ASSOCIATION OF UNIVERSITY TEACHERS کے ایک فعال ممبر کی حیثیت سے مجھے انگلستان کی مختلف یونیورسٹیوں میں جانے کے مواقع ملے۔ میں ان یونیورسٹیوں کے بڑے بڑے پروفیسروں سے ملا۔ ان کے علمی اور تعلیمی نظام کو

بہت قریب سے دیکھا۔ اس ماحول میں مجھے مشرقی علوم پر سائنسی انداز میں کام کرنے کے آداب آئے۔ سچائی، خلوص، محبت، جفاکشی اور روشن خیالی کی دولتِ بیش بہا مجھے نصیب ہوئی۔ احترامِ آدمی، آزادی اور انسان دوستی کے خیالات میری شخصیت کے جز بن گئے۔

میں اس خوشگوار ماحول میں اپنی زندگی کے بہترین دن گزار رہا تھا کہ ۱۹۶۵ء کی جنگ چھڑ گئی۔ ہندوستان نے پاکستان پر حملہ کر دیا۔ لندن کے بعض اخباروں نے یہ خبر تک چھاپ دی کہ ہندوستانی فوجیں لاہور میں داخل ہو گئی ہیں۔ یہ سن کر بُرا حال ہوا۔ طرح طرح کے خیالات پریشان کرتے رہے۔ کئی دن تک اپنے شہر اور گھر والوں کی خیریت نہیں ملی۔ آنکھوں سے آنسو رواں رہے۔ کھانا پینا تک مفقود ہو گیا۔ اس عالم میں حالات معلوم کرنے کے لئے پاکستانی سفارت خانے گیا۔ وہاں ایک افراتفری کی کیفیت دیکھی۔ کوئی خبر نہیں ملی۔ چوتھے روز نیشنل بینک کے ٹیلیکس سے یہ علم ہوا کہ الحمد للہ لاہور محفوظ ہے اور پاکستانی فوج نے ہندوستانیوں کو واہگہ کے اُس پار دھکیل دیا ہے۔ یہ معلوم کر کے جان میں جان آئی۔ پھر تاشقند معاہدے کی خبر ملی۔ جنگ ختم ہو گئی۔ ہم نے خدا کا شکر ادا کیا۔

انگلستان کے وزیرِ اعظم مسٹر ولسن نے یہ بیان دیا کہ ہندوستان نے پاکستان پر حملہ کیا ہے اور جارحیت اُن کی طرف سے ہوئی ہے۔ اس پر ہندوستان نے بڑی لے دے کی لیکن وزیرِ اعظم ولسن اپنے موقف سے نہیں ہٹے۔ اُنھوں نے یو۔ این۔ او میں اپنے نمائندے کو واضح ہدایت کی کہ جب اجلاس ہو تو اس موقف کو واضح طور پر پیش کیا جائے کہ جارحیت ہندوستان کی طرف سے ہوئی ہے۔

ڈاکٹر محمد باقر اور اُن کی بیگم صاحبہ اس زمانے میں میرے ساتھ لندن میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ وہ جنگ کے دوران پاکستان روانہ ہوئے۔ میں نے بہت منع کیا نہیں مانے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ عدن میں جا کر پھنس گئے۔ انھیں خاصی پریشانی ہوئی۔ اطلاع ملنے پر انھیں پونڈ بھیجے۔ انھوں نے لبوں

میں سفر کیا۔ شکر ہے کہ کئی مہینے کے بعد خشکی کے راستے سے پاکستان پہنچے۔ ہم لوگوں نے یہ خبر سن کر سجدۂ شکر ادا کیا۔

۱۹۶۶ء میں میرے پانچ سال لندن میں پورے ہوگئے۔ پنجاب یونیورسٹی نے چھ سال کی چھٹی منظور کر دی تھی لیکن ایک سال قبل مجھے واپس بلا لیا گیا۔ اسکول آف اورینٹل اینڈ افریقن اسٹڈیز نے مجھے لاہور سے واپس آ کر ایک سال مزید لندن میں رہنے کی اجازت دے دی۔ چنانچہ ۱۹۶۸ء میں پھر لندن واپس پہنچا اور مزید ایک سال یہاں گذارا۔ اس میں شعبۂ پاکستان و ہند کے صدر پروفیسر برلٹ اور اسکول کے ڈائرکٹر پروفیسر فلپس کی شرافت اور انسانیت کو دخل تھا۔ انھوں نے میری یہ تجویز منظور کی اور اس طرح مجھے لندن میں ایک سال مزید گذارنے کا موقع ملا۔ اس ایک سال میں کئی ادھورے کام پورے ہوگئے۔ اور میں اطمینان سے یہ کام مکمل کر کے لاہور واپس آیا۔

معاہدے کے مطابق سکول نے میرا تمام سامان لاہور بھجوایا۔ اسکول آف اورینٹل اسٹڈیز کے ڈپٹی سکریٹری گیسٹ ہاؤس نے اس کام میں میری بڑی مدد کی۔ میرا خیال تھا سو پونڈ میں سارا سامان پاکستان پہنچ جائے گا۔ لیکن گیسٹ ہاؤس نے اس کے لئے ایک سو چالیس پونڈ منظور کروالئے اور چالیس پونڈ کا اضافہ اس لئے کروایا کہ سامان کراچی ہوتا ہوا لاہور جائے گا۔ STAPPLETON SHIPPING CO. نے ایک سو چالیس پونڈ میں گھر کی ہر چیز کتابیں، فرنیچر، کپڑے اور موٹر کار بڑے سلیقے سے پیک کر کے لاہور پہنچا دیں۔ اس معاملے میں کسی قسم کی کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔

اور اس طرح میں، میری بیوی بچے اطمینان سے اپنے تمام ساز و سامان کے ساتھ چھ سال کی بے شمار حسین یادوں اور ان گنت خوشگوار تجربات کو اپنے دلوں میں سمیٹے لندن سے لاہور واپس پہنچ گئے۔

لاہور کے ماحول میں مجھے اس بات کا شدت سے احساس ہوا کہ لندن کے قیام کا زمانہ ہر اعتبار سے میری زندگی کا بہترین زمانہ تھا۔ یہاں میں نے بڑے ہی سکون کے ساتھ پانچ

چھ سال گزارے۔ لندن کے چپے چپے کو دیکھا، پارکوں، باغوں، پہاڑوں، جھیلوں، اور جنگلوں کی سیر کی۔ یہاں کے میوزیم اور آرٹ گیلریاں دیکھیں۔ یہاں کی پرانی عمارتوں، اور تاریخی مقامات کا نظارہ کیا۔ یہاں کے قبرستانوں میں اہم شخصیتوں کی قبروں پر گیا۔ یہاں کے بارونق بازاروں میں گھوما پھرا۔ یہاں کی درسگاہوں سے رابطہ قائم کیا۔ بڑے بڑے پروفیسروں، اسکالروں، ادیبوں اور شاعروں سے ملا۔ یہاں کے ڈرامے، بیلے اور اوپیرا دیکھے۔ یہاں کی لائبریریوں میں علمی کام کیا، اور یہاں کے خوبصورت اور شائستہ لوگوں سے ملنے کے مواقع مجھے ملے۔

اور اس خیال کی شمع کو دل میں فروزاں کر کے وطن واپس آیا کہ واقعی لندن ایک جنت سے کسی طرح کم نہیں ہے، یہ تو فردوس بریں ہے؎

اگر فردوس بر روئے زمیں است
ہمیں است و ہمیں است و ہمیں است

چودھواں باب

پنجاب یونیورسٹی

اور اب لاہور میں ایک دفعہ پھر ایک نئی زندگی کا آغاز ہوا۔

۲۵ر جون کو میں لاہور پہنچا۔ شدید گرمی تھی۔ لندن کے سرد موسم کی یاد ستاتی رہی، لیکن نئی ذمہ داریوں کا اتنا بوجھ اٹھانا پڑا، اور یونیورسٹی میں تنظیمِ نو کے کاموں میں اتنی مصروفیت رہی کہ گرم اور سرد موسم کا احساس ہی باقی نہ رہا۔ بہت کام کرنا پڑا۔ اگرچہ یکم جولائی سے موسم گرما کی تعطیلات شروع ہونے والی تھیں لیکن یونیورسٹی میں کام اتنا زیادہ تھا کہ ایک دن کی چھٹی بھی نصیب نہ ہو سکی۔

ڈاکٹر محمد باقرؒ اس وقت اورینٹل کالج کے پرنسپل، اور پروفیسر حمید احمد خاں صاحب پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے۔ دونوں میرے وطن واپس آنے سے بہت خوش ہوئے، اور میرے ساتھ بڑی شفقت اور محبت سے پیش آئے۔ ان کا تعاون مجھے ہمیشہ حاصل رہا، اور اُن کی بدولت نئی زندگی میں جو بے شمار مسائل درپیش تھے، وہ بخیر و خوبی حل ہو گئے۔

پرنسپل اور وائس چانسلر نے اسی دن مجھے اردو کا صدر شعبہ بنا دیا جس دن میں لاہور پہنچا تھا۔ کیونکہ میں شعبے میں سب سے زیادہ سینیئر تھا۔ چند روز موسم گرما کی تعطیلات شروع ہونے والی تھیں۔ شدید گرمی تھی۔ بیشتر طالب علم جا چکے تھے۔ پڑھانے کا کوئی خاص کام نہیں تھا۔ اس لئے میں نے زیادہ وقت شعبے کے انتظامی معاملات کی دیکھ بھال میں صرف کیا۔ نیا ٹائم ٹیبل بنایا۔ مختلف

پرچوں کو پڑھانے کی تقسیم نو کی کمیٹی آف کورسز اور کمیٹی آف کنٹرول اور شعبے کے اساتذہ کی میٹنگیں بلائیں۔ اُن میں ان تمام تبدیلیوں کو منظور کر دیا، اور شعبے کی تنظیم نو کے بارے میں صلاح و مشورے کیے تاکہ جب موسم گرما کی تعطیلات کے بعد یونیورسٹی کھلے تو کوئی دشواری پیش نہ آئے۔

میرے واپس وطن آنے سے شعبے کے اساتذہ اور عملے کے تمام لوگ بہت خوش ہوئے۔ شعبے کے ایک مددگار مظفر ایک دن میرے پاس آئے اور کہنے لگے کہ "مجھے چھ سال سے موسم گرما کی تعطیلات میں ایک دن کی چھٹی بھی نہیں ملی۔ آپ تو ابھی نئے نئے لندن سے واپس آئے ہیں ظاہر ہے کہ آپ کے پاس بہت کام ہے اس لئے آپ مجھے چھٹی تو نہیں دیں گے۔"

میں نے کہا "نہیں، آپ کو قواعد و ضوابط کے مطابق جتنی چھٹی ملنی چاہیئے میں ضرور دوں گا تاکہ آپ اپنے ضروری کام کر کے اور تازہ دم ہو کر واپس آئیں۔ چھٹی تو ضروری چیز ہے۔ دفتر میں سٹاف کے جتنے لوگ ہیں، وہ سب کے سب باری باری ایک ایک مہینے کی چھٹی پر چلے جائیں۔ آپ فہرست بنا لیجیے۔"

وہ میری یہ باتیں سن کر بہت خوش ہوئے اور یہ خوش خبری اُنھوں نے عملے کے دوسرے لوگوں کو بھی سنائی۔ وہ لوگ بھی بہت خوش ہوئے۔

یہ سب کچھ میں نے لندن میں سیکھا تھا، اس لئے اسٹاف کی چھٹی کے بارے میں مجھے فیصلہ کرنے میں کوئی دقت پیش نہیں آئی۔ میں نے اُن کا حق سمجھ کر موسم گرما کی تعطیلات میں ان لوگوں کو چھٹی دینے کا فیصلہ کیا۔

میں لندن ہی میں تھا جب اردو کی پروفیسرشپ کا اشتہار اخبارات میں دے دیا گیا۔ کیونکہ ڈاکٹر سید عبداللہ کی مدت ملازمت پوری ہو گئی تھی، اور انھیں سنڈیکیٹ نے ریٹائر کر دیا تھا۔ وائس چانسلر حمید احمد خاں صاحب نے اس کی تفصیل ایک ذاتی خط میں لکھ کر مجھے لندن بھیج دی تھی، اور یہ خواہش ظاہر کی تھی کہ اب مجھے واپس آ جانا چاہیئے۔ چنانچہ میں اُنھی کی خواہش پر لندن یونیورسٹی کی ملازمت کو خیرباد کہہ کر لاہور واپس

آگیا تھا۔ پروفیسری کے لئے درخواست میں نے لندن ہی سے بھیج دی تھی جس پر مناسب کارروائی کا سلسلہ میرے واپس آنے سے قبل ہی شروع ہو گیا تھا۔ بظاہر میرے پروفیسر ہونے میں کوئی خاص دشواری نہیں تھی کیونکہ میں شعبے میں سب سے سینیئر تھا اور گذشتہ بیس پچیس سال میں میری ریسرچ کا تھوڑا بہت کام بھی چھپ کر شائع ہو گیا تھا لیکن بعض لوگ یہ نہیں چاہتے تھے کہ میں پروفیسر ہو جاؤں چنانچہ مخالفت کا بازار گرم تھا اور عجیب طرح کی ریشہ دوانیوں نے ہنگامے بپا کر رکھے تھے۔ جنگ کا سا سماں تھا۔ ایکسپرٹس مقرر ہو چکے تھے اور بعض لوگوں کی کوشش یہ تھی کہ وہ میرے حق میں رائے نہ دیں لیکن ان ریشہ دوانیوں کا کوئی خاص اثر نہ ہوا۔ جو ہونا تھا وہ ہو کر رہا۔ ۱۴؍ اکتوبر ۱۹۶۲ء کو میں پنجاب یونیورسٹی میں اردو کا پروفیسر ہو گیا۔ مخالفین پر اوس سی پڑ گئی اور یہاں کے رواج کے مطابق مبارکبادوں کے سلسلے شروع ہوئے جو مختلف صورتوں میں کئی مہینے تک جاری رہے اور میں مخالفین اور منافقین کی اس کیفیت کو دیکھ کر حیران ہوتا رہا۔

پروفیسری کا فیصلہ بڑے ڈرامائی انداز میں ہوا۔ ۱۶؍ اکتوبر کو یونیورسٹی کے سلیکشن بورڈ کی میٹنگ تھی۔ میں بھی بحیثیت صدر شعبہ ایک لیکچرر کے تقرر کے سلسلے میں اس میٹنگ میں موجود تھا۔ جب یہ معاملہ بورڈ کے سامنے پیش ہوا تو وائس چانسلر صاحب نے ایک شخص کے تقرر میں دلچسپی کا اظہار کیا لیکن میں نے اس سے انٹرویو میں کچھ سوال پوچھے تو وہ مجھے کمزور نظر آیا۔ اس لئے میں نے وائس چانسلر سے اختلاف کیا۔ پون گھنٹے تک اس پر بحث ہوتی رہی۔ بالآخر یہ فیصلہ ہوا کہ اس جگہ کا اشتہار پھر دے دیا جائے۔ ہو سکتا ہے کہ کچھ بہتر لوگ درخواستیں دیں۔ ظاہر ہے کہ وائس چانسلر کی تجویز سے اختلاف عام طور کیا نہیں جاتا۔ لیکن معاملہ اکیڈمک تھا اور مجھے شعبے کی تنظیم نو کرنی تھی اس لئے میں نے اختلاف کو ضروری سمجھا۔ ظاہر ہے کہ اس اختلاف سے وائس چانسلر کچھ ناخوش ضرور ہوئے ہوں گے۔

میں اس میٹنگ سے اٹھ کر گھر آ گیا۔ اور یہ سوچتا رہا کہ وائس چانسلر صاحب ضرور رنج

آدمی ہیں۔ اب جب میری پروفیسری کا مسئلہ پیش ہوگا تو شاید میری مخالفت کریں گے۔

لیکن میری حیرت کی کوئی انتہا نہیں تھی جب سات بجے کے قریب ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ میں نے فون اٹھایا تو وائس چانسلر صاحب کی آواز آئی "میں حمید احمد خاں بول رہا ہوں آپ کو مبارکباد دینے کے لئے فون کر رہا ہوں، مبارک ہو آپ آج پنجاب یونیورسٹی میں اردو کے پروفیسر ہو گئے۔ ایک ایکسپرٹ کی رائے نہیں آئی تھی اس لئے معاملہ رکا ہوا تھا سلکشن بورڈ کی اس میٹنگ میں بھی یہ معاملہ ایجنڈے پر نہیں رکھا گیا تھا لیکن ابھی چند منٹ ہوئے ایکسپریس تار کے ذریعے ڈھاکے سے تیسرے ایکسپرٹ کی رائے آئی جو آپ کے حق میں تھی۔ میں نے اسی وقت یہ طے کیا کہ اسی میٹنگ میں یہ معاملہ پیش کر دیا جائے۔ آپ کے حق میں متفقہ طور پر فیصلہ ہوا ہے۔ ممبر آپ کے کام سے خوش معلوم ہوتے تھے۔ سب نے تعریف کی اور آپ کے پروفیسر ہونے پر مبارکباد دی۔ دراصل تیسرے ایکسپرٹ پر کچھ لوگوں کا دباؤ بہت تھا۔ فون پر فون اور خط پر خط جا رہے تھے اس لئے وہ کچھ ڈانواڈول اور پریشان سے تھے۔ لیکن بالآخر انھوں نے آپ کے حق میں فیصلہ دیا اور اس سلسلے میں وائس چانسلر کو تار کے ذریعے اطلاع دی۔ مجھ پر بھی دباؤ بہت تھا اور مجھے اس دباؤ کی وجہ سے خاصی پریشانی تھی۔ میرے اوپر جو بوجھ تھا وہ اس فیصلے سے اتر گیا۔ اب آپ خوش رہیئے اور اطمینان سے کام کیجئے۔ اب اورینٹل کالج میں صرف آپ ہی ایک پروفیسر ہیں۔ اس لئے دو سال کے بعد آپ ہی اورینٹل کالج کے پرنسپل ہوں گے۔ انشاءاللہ کل ملاقات ہوگی تو آپ کو مزید تفصیل سناؤں گا۔"

میں حمید احمد خاں صاحب کی یہ باتیں سن کر حیران ہوا، اور ان کی بڑائی کا قائل ہو گیا۔ میں نے لیکچرار کے تقرر کے سلسلے میں ان کی تجویز سے اختلاف کیا تھا لیکن کیڈمک معاملہ تھا۔ اس لئے انھوں نے برا نہیں مانا، اور بغیر ایجنڈے کے میری پروفیسری کے معاملے کا میرے حق میں فیصلہ کروا کے مجھے فون پر یہ خوش خبری سنائی۔

پنجاب یونیورسٹی میں اردو کا پروفیسر ہونا میرے لئے بہت بڑا اعزاز تھا۔ اس لئے مجھے

اس خبر کو سن کر بے حد خوشی ہوئی۔ اُس زمانے میں یعنی آج سے کوئی بیس پچیس سال قبل پروفیسری آسانی سے نہیں ملتی تھی۔ ایک مضمون میں صرف ایک پروفیسر ہوتا تھا۔ وہ بھی ساری زندگی کام کرنے اور قلم گھسنے کے بعد۔ آج کی طرح تھوک کے حساب سے پروفیسر نہیں بنائے جاتے تھے اُس زمانے میں تو پروفیسر ہونے کی آرزو میں لوگ مر جایا کرتے تھے۔

ڈاکٹر محمد باقر اُس وقت اورینٹل کالج کے پرنسپل تھے۔ میرے پروفیسر ہونے کی خبر سُن کر وہ اپنی بیگم صاحبہ کے ساتھ غریب خانے پر تشریف لائے اور مجھے مبارکباد دی اُن کا تعاون مجھے ہمیشہ حاصل رہا۔ اُن کے احسانات کو میں کبھی بھلا نہیں سکتا۔

اسی ملاقات میں مجھ سے کہنے لگے "تم اسی سال باقاعدہ پرنسپل ہونے سے قبل ہی اورینٹل کالج کے پرنسپل ہو جاؤ گے میں سال بھر کے لئے دسمبر میں امریکہ جا رہا ہوں نیویارک کی بفیلو یونیورسٹی میں ایک سال وزیٹنگ پروفیسر کی حیثیت سے کام کروں گا۔ میری عدم موجودگی میں تم اورینٹل کالج کے قائم مقام پرنسپل ہو گے، واپسی کے بعد میں صرف ڈیڑھ سال پرنسپل رہوں گا۔ پھر تم میری جگہ مستقل پرنسپل ہو جاؤ گے۔ ریٹائر ہونے کے بعد میں تمہیں اس کالج کا مستقل پرنسپل بنا کر جاؤں گا"۔

میں نے کہا "باقر صاحب! میرے لئے تو پروفیسری ہی کافی ہے۔ آپ جانتے ہیں میں اکیڈمک مزاج کا آدمی ہوں۔ انتظامی معاملات سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں ہے"۔

باقر صاحب کہنے لگے "اورینٹل کالج میں یونیورسٹی کے چار پانچ شعبے ہیں۔ انتظامی معاملات کی دیکھ بھال شعبوں کے سربراہ کرتے ہیں، اس لئے پرنسپل کے پاس ایسا کچھ زیادہ انتظامی کام نہیں ہوتا۔ سب سے زیادہ سینیئر پروفیسر کو پرنسپل بنا دیا جاتا ہے۔ اور اس کو ان تمام شعبوں کا سربراہ تصور کیا جاتا ہے۔ اورینٹل کالج کی پرنسپلی بہت بڑا اعزاز ہے۔ ڈاکٹر لائٹنر، سر آرل اسٹین، پروفیسر آرنلڈ، پروفیسر سٹریٹن، پروفیسر وولنر، پروفیسر شفیع، پروفیسر اقبال اور پروفیسر برکت علی قریشی اس کالج کے اہم پرنسپل تھے۔ تم کم از کم بارہ چودہ سال اس کالج کے پرنسپل ضرور رہو گے"۔

دراصل ڈاکٹر باقر بڑے باقاعدہ آدمی تھے۔ انھوں نے یہ سارا حساب لگا رکھا تھا اور وہ اس خیال سے بہت خوش تھے کہ مجھے طویل عرصے تک اورینٹل کالج کے پرنسپل کی حیثیت سے کام کرنے کا موقع ملے گا۔

میرے پروفیسر ہونے کے چند ماہ بعد ڈاکٹر باقر ایک سال کے لئے امریکہ چلے گئے، اور میں اورینٹل کالج کا قائم مقام پرنسپل ہو گیا۔ وطن واپس آنے کے بعد دو سال انھوں نے اورینٹل کالج میں پرنسپل کی حیثیت سے مزید گذارے۔ سن ۱۹۶۰ء میں وہ ریٹائر ہو گئے اور ان کی جگہ مجھے مستقل طور پر اورینٹل کالج کا پرنسپل بنا دیا گیا۔

اورینٹل کالج کا پرنسپل ہونا میرے لئے بہت بڑا اعزاز تھا۔ میرے پیش رو بہت بڑے بڑے لوگ تھے۔ انھیں بین الاقوامی شہرت حاصل تھی اور انھوں نے اورینٹل کالج کو اپنی اپنی پرنسپلی کے زمانے میں بین الاقوامی شہرت کا تعلیمی اور تحقیقی ادارہ بنا دیا تھا۔

میں نے اورینٹل کالج کے پرنسپل اور پنجاب یونیورسٹی میں اردو کے پروفیسر کی حیثیت سے ان بزرگوں کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کی اور خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ چند سال میں اورینٹل کالج کی شہرت دور دور تک پھیل گئی۔ دنیا کے بیشتر ترقی یافتہ ملکوں کی یونیورسٹیوں میں اس کو اسکول آف اورینٹل اینڈ افریکن اسٹڈیز لندن کی طرح کا تعلیمی اور تحقیقی ادارہ سمجھا جانے لگا۔ اس زمانے میں امریکہ، روس، انگلستان، چین، جاپان، جرمنی، فرانس، اٹلی، مراکش، ایران، افغانستان، ترکی، شام، اردن، سعودی عرب، مصر اور ہندوستان وغیرہ سے بڑے بڑے اسکالر اور پروفیسر اورینٹل کالج میں آئے۔ انھوں نے یہاں لکچر دیئے، تقریبات میں شرکت کی اور اپنے جو تاثرات وزیٹر بک میں درج کئے ان سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اورینٹل کالج نے اس زمانے میں بین الاقوامی شہرت حاصل کر لی تھی، اور اس کو دنیا کی تمام اہم یونیورسٹیوں میں مشرقی اور اسلامی علوم کا ایک باوقار ادارہ سمجھا جانے لگا تھا۔

اس شہرت میں اورینٹل کالج میگزین کا بڑا ہاتھ تھا۔ میں نے اورینٹل کالج میگزین کی تنظیم نو

کی طرف خصوصی توجہ دی، اس کو معنوی اور صوری اعتبار سے جاذبِ نظر بنایا۔ اس سے قبل میگزین پھیکا پھیکا سا لگتا تھا تاخیر بھی بہت ہوتی تھی، بیشتر مضامین بھی خانہ پُری کے خیال سے شائع کیے جاتے تھے۔ میں نے کوشش کر کے نادر و نایاب چیزیں اُس میں شائع کیں جن کی وجہ سے اس ریسرچ جرنل کا معیار بلند ہوا اور دُنیا کی تمام یونیورسٹیوں اور تحقیقی اداروں میں اس کو بھیجا جس کی وجہ سے مشرقی علوم سے دلچسپی رکھنے والے اسکالر اس سے آشنا ہوئے۔ اور انھوں نے اس سے گہری دلچسپی کا اظہار کیا۔

یہ پروفیسر حمید احمد خاں صاحب کی وائس چانسلری کا زمانہ تھا۔ [illegible]۔ پروفیسر تو انگریزی ادبیات کے تھے لیکن مزاج ان کا مشرقی تھا، اور وہ جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کی تہذیب ثقافت، اور زبان و ادب کے دلدادہ تھے۔ اردو زبان اُن کے خیال میں اسلامیانِ ہند کی عظیم تہذیب کی سب سے بڑی نشانی تھی۔ اُنھوں نے اردو کے لیے پنجاب یونیورسٹی میں بڑا کام کیا۔ اُن کے زمانے میں یونیورسٹی میں بیشتر کام اردو زبان میں ہونے لگا۔ صورت یہ ہوئی کہ فائلوں پر نوٹ انگریزی لکھے جاتے تھے، کیونکہ عملے کے لوگ اس کے عادی تھے لیکن جب یہ فائلیں وائس چانسلر کے پاس جاتی تھیں تو خاں صاحب اُن پر احکامات اردو میں صادر فرماتے تھے، اور اس طرح انھوں نے اردو کا ماحول یونیورسٹی میں پیدا کر دیا تھا۔

اپنی وائس چانسلری کے زمانے میں حمید احمد خاں صاحب نے ادارۂ تالیف و ترجمہ قائم کیا اور تاریخ مسلمانانِ پاکستان و ہند کی تالیف اور طباعت و اشاعت کا منصوبہ بنایا جس کی بیس جلدیں شائع ہوئیں۔ دائرۂ معارفِ اسلامیہ کا کام بھی اُن کے زمانے میں ترقی و کمال سے ہمکنار ہوا۔ اورینٹل کالج کے طباعت و اشاعت کے کئی منصوبے بھی منظور کیے اور خاصی تعداد میں نادر و نایاب کتابیں میری پرنسپلی کے زمانے میں شائع ہو گئیں۔ ان میں سید حیدر بخش حیدری کی نادر و نایاب کتاب گلزارِ دانش کی دو جلدیں، اور دیوانِ ولّا خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ان کتابوں کے نسخے مجھے کوپن ہیگن ڈنمارک کی رائل لائبریری میں ملے تھے۔ ادبی مورخوں

نے یہ لکھا تھا کہ یہ کتابیں اب دنیا میں کہیں موجود نہیں لیکن میں نے انگلستان کے دوران قیام میں، ان کو تلاش کر لیا۔ خاں صاحب نے سنڈیکیٹ سے یہ فیصلہ کروایا کہ یہ نادر و نایاب کتابیں اورینٹل پبلیکیشنز فنڈ سے پرنسپل اورینٹل کالج کی نگرانی میں شائع ہوں گی۔ ان کے علاوہ خاں صاحب کی وائس چانسلری کے زمانے میں میں نے ڈاکٹر جان گلکرسٹ کی انگریزی نظمیں، مرقع مخلص، خلیل علی خاں اشک کی گلزار چین اور رسالۂ کائنات، مظہر علی خاں ولا کی ہفت گلشن اور مادھونل کام کندلا، گلکرسٹ کی نقلیات ہندی، الٰہی بخش شوق اکبر آبادی کی افسانۂ عشق، آغا محمد شرف کی شکوۂ فرنگ، دیوان مبتلا، دیوان حیدری بھی شائع کر دیں جو اس سے قبل کبھی شائع نہیں ہوئی تھیں۔

خاں صاحب کی وائس چانسلری کے زمانے میں سنہ ۱۹۶۹ء میں غالب کا جشن صد سالہ منانے کے لئے ایک کمیٹی بنائی تھی۔ میں بھی اس کا ایک ممبر تھا۔ اس کمیٹی نے غالب کی تمام تصانیف کو از سر نو اڈیٹ کر کے شائع کرنے کا پروگرام بنایا اور چند سال میں غالب کی تمام اردو اور فارسی کتابیں اڈیٹ کروا کے بڑے سلیقے سے شائع کر دیں۔ ترتیب و تدوین کا زیادہ کام علامہ سید وزیر الحسن عابدی اور مولانا غلام رسول مہر نے کیا۔

اس موقع پر میں نے بھی اپنی دو کتابیں 'غالب' اور 'مطالعۂ غالب' اور 'غالب کا فن' شائع کیں، جن کو خاں صاحب نے بہت پسند کیا۔

غالب کا جشن صد سالہ سنہ ۱۹۶۹ء میں منایا گیا۔ یونیسکو اور وزارت تعلیمات حکومت پاکستان کے تعاون سے اس جشن کو منانے کے لئے ایک بین الاقوامی کانفرنس منعقد کی گئی۔ اورینٹل کالج کے پرنسپل اور صدر شعبۂ اردو کی حیثیت سے یہ کام مجھے سونپا گیا۔ میں نے بہت بڑے پیمانے پر سمپوزیم کے جلسے سینٹ ہال میں منعقد کئے۔ اس سمپوزیم میں پاکستانی اسکالروں کے علاوہ ہارورڈ یونیورسٹی امریکہ کی پروفیسر اینی میری شمل اور انگلستان کے ڈیوڈ میتھیوز، رالف رسل اور افغانستان کے محمد حسین مجددی نے شرکت کی اور غالب پر اپنے مقالے پڑھے۔

اس کے علاوہ پروفیسر اور پرنسپل ہونے کے بعد اورینٹل کالج کے جشن صد سالہ منانے کا

پروگرام بھی میرے سپرد ہوا خیال تھا کہ ڈاکٹر محمد باقر اپنی پرنسپلی کے زمانے میں اس کام کو انجام دیں گے لیکن وہ بہت مصروف رہے۔ ایک سال کے لئے باہر بھی چلے گئے۔ اس لئے اس کام کی طرف خاطر خواہ توجہ نہ کرسکے۔ کچھ تحقیقی کتابیں انھوں نے ضرور شائع کردیں لیکن جلسے کا انتظام نہ کرسکے۔

پنجاب یونیورسٹی کی انتظامیہ نے جشن صد سالہ منانے کے لئے پچیس[٢٥] ہزار روپے کی گرانٹ منظور کی تھی۔ اس رقم میں سے ڈاکٹر باقر صاحب نے تحقیقی کتابوں کی طباعت پر تقریباً بارہ ہزار روپے کی رقم خرچ کی تھی۔ اب ہمارے پاس صرف بارہ ہزار باقی رہ گئے تھے۔ ظاہر ہے اس رقم میں وہ کام نہیں ہوسکتا تھا جس کا منصوبہ میرے ذہن میں تھا۔ اس لئے میں نے جشن صد سالہ کمیٹی کی میٹنگ بلائی۔ اس کمیٹی کے صدر جسٹس ایس۔ اے رحمٰن صاحب تھے۔ کیمیا کے پروفیسر خواجہ صلاح الدین بھی اس کے ایک اہم ممبر تھے۔ میں نے ان کے سامنے اپنا منصوبہ رکھا جس کو متفقہ طور پر منظور کیا گیا۔ یونیورسٹی سے مزید رقم طلب کی گئی لیکن اس کا کوئی مثبت نتیجہ نہیں نکلا۔

بہرحال میں نے اللہ کا نام لے کر کام شروع کر دیا۔ منصوبہ یہ بنایا کہ جشن نامہ کے نام سے اورینٹل کالج کے اساتذہ کے تحقیقی مقالے شائع کئے جائیں اور کچھ نادر و نایاب کتابیں اس موقع پر طباعت سے آراستہ ہوں چنانچہ دو سال کے اندر جشن نامہ کی پہلی جلد شائع ہوگئی اور ڈاکٹر جان گلکرسٹ کی انگریزی نظمیں، دیوان حیدری، حیدری کی مختصر کہانیاں، حیدری کا تذکرہ گلشن ہند، گلکرسٹ کی نقلیات، دیوان مبتلا، حکیم الٰہی بخش شوق کا فسانۂ عشق، حیدری کی گلزار دانش (۲ جلدیں)، دیوان ولا، بینی نارائن جہاں کا چار گلشن، مرقع مخمس ـــــ یہ سب نادر و نایاب کتابیں میں نے کالج کی طرف سے شائع کردیں۔ اور دنیا کی تمام اہم یونیورسٹیوں کو بھجوا دیں، اس کا اثر بہت اچھا ہوا۔

اب منصوبہ یہ بنایا کہ جشن صد سالہ کے موقع پر بجائے صرف ایک جلسہ کرنے کے ماہرین علوم مشرقی کی بڑے پیمانے پر ایک بین الاقوامی کانفرنس منعقد کی جائے جس کے اجلاس کم از کم ایک ہفتے تک جاری رہیں اور اس میں تمام اہم یونیورسٹیوں کے پروفیسر اور اسکالر شریک ہوکر اورینٹل کالج

کی ادبی علمی خدمات، اسلامی علوم، عربی ادبیات، فارسی زبان و ادب، اسلامیانِ ہند کی تہذیب اور اردو زبان و ادب کے بارے میں اپنے اپنے تحقیقی مقالے پڑھیں۔ چنانچہ میں نے اس کے لئے دنیا کی مختلف یونیورسٹیوں کے سربراہوں کو خط لکھ دیئے۔ سب جگہ سے یہ جواب آئے کہ ان کے پروفیسر اور اسکالر اپنی اپنی یونیورسٹیوں کے خرچ پر لاہور پہنچیں گے اور اپنے اپنے تحقیقی مقالے ان اجلاسوں میں پڑھ کر اورینٹل کالج کو خراجِ تحسین پیش کریں گے۔ میرے رفقا اس کامیابی کو دیکھ کر حیران رہ گئے۔ یہ سب کچھ کسی غیبی مدد سے ہوا۔

۱۹۷۰ء کے شروع میں اس بین الاقوامی کانفرنس کو ترتیب دینے کا ارادہ تھا لیکن ۱۹۶۹ء میں میری والدہ محترمہ کا انتقال ہو گیا جس کی وجہ سے میں بہت پریشان رہا۔ وہ کچھ عرصے سے علیل تھیں۔ فروری کے مہینے میں وہ اچانک اللہ کو پیاری ہو گئیں۔ وہ میرے لئے سب کچھ تھیں۔ اُن کے انتقال سے یوں محسوس ہوا جیسے میرے جسم کا کوئی حصہ ہے۔ میں اس صدمے کو برداشت نہ کر سکا، اور کام کرنے کے قابل نہ رہا۔ آج تک میں انہیں یاد کرتا ہوں۔

اور پھر ۱۹۷۱ء میں مشرقی پاکستان کے علیحدہ ہونے کا المیہ پیش آیا۔ پاکستان کا ایک حصہ ہم سے کٹ گیا اور ہمارے نوے ہزار فوجیوں نے مشرقی پاکستان میں ہتھیار ڈال دیے۔ یہ سب کچھ بڑی طاقتوں کی سازشوں سے ہوا۔ مجھ پر اس سانحے کا یہ اثر ہوا کہ پانچ چھ دن تک آنسو بہاتا رہا۔ اس عرصے میں کھانا تک نہیں کھایا۔ کیونکہ میرے خیال میں یہ نہ صرف ہماری تاریخ کا بلکہ اسلامی تاریخ کا سب سے بڑا المیہ تھا۔ لیکن اسی زمانے میں ذوالفقار علی بھٹو صاحب نے اس ملک کی قیادت سنبھالی تو کچھ حوصلہ پیدا ہوا۔ بچے کھچے پاکستان کے جگر لخت لخت کو جمع کیا، نئی حکومت بنائی، نوے ہزار فوجی رہا کروائے، شملہ معاہدہ کیا، اسلامی سربراہ کانفرنس بلائی اور اس کو کامیاب بنانے میں وہ شب و روز مصروف رہے۔ حالات کو نارمل کرنے کی کوشش کی، اور اس طرح وطن عزیز کے زخموں پر مرہم رکھا۔ ان اقدامات کی بدولت چند مہینے میں حالات کسی قدر معمول پر آ گئے۔

اب ہم نے پھر اورینٹل کالج کا جشن صد سالہ منانے کی تیاریاں شروع کیں۔ دنیا کی مختلف یونیورسٹیوں کو پھر خط لکھے۔ سب نے مثبت جواب دیا، اور لکھا کہ وہ اورینٹل کالج کی بین الاقوامی کانفرنس میں شرکت کی غرض سے لاہور پہنچنے کے لئے تیار بیٹھے ہیں۔

۱۹۷۲ء کا سال ختم ہو چکا تھا۔ مارچ کا مہینہ لاہور میں موسم کے اعتبار سے بہت خوبصورت ہوتا ہے۔ درختوں پر شباب آجاتا ہے۔ کونپلیں پھوٹنے لگتی ہیں۔ ہر طرف پھول کھل جاتے ہیں۔ صحیح معنوں میں بہار آجاتی ہے اس لئے ہم نے ۱۲ر مارچ سے ۱۷ر مارچ تک کانگریس کے مختلف جلاسوں کا پروگرام بنا لیا۔ اخبارات میں اعلان کر دیا گیا۔ پروگرام چھاپ کر تقسیم کر دیے گئے۔ مندوبین کو تار بھی بھیج دیے۔ ان کاموں میں شعبۂ عربی کے صدر ڈاکٹر رانا احسان الٰہی نے میری بڑی مدد کی۔

بالآخر مارچ کا مہینہ آگیا۔ تیاریاں مکمل ہو گئیں۔ میں نے کالج کے پرنسپل اور کانگریس کے سیکریٹری کی حیثیت سے یہ فیصلہ کیا کہ کانگریس کا افتتاحی اجلاس ۱۲ر مارچ کو ہوگا۔ اس کے بعد اورینٹل کالج کی ادبی خدمات، عربی اور اسلامی علوم، ایرانی تہذیب اور فارسی زبان و ادب، برعظیم پاکستان و ہند اور اردو زبان و ادب، پنجابی زبان و ادب اور مشرقی علوم کے مسائل کے متعلق ہر روز دو دو اجلاس ہوں گے۔ ان میں مندوبین اپنے اپنے مقالے پڑھیں گے۔

ملکی اور غیر ملکی مندوبین ۱۰ر مارچ کو لاہور پہنچ گئے تھے۔ ان میں روس کی ماسکو یونیورسٹی کی مادام استیپ نیانس، امریکہ کے ڈاکٹر ڈوڈوڈ بری، جرمنی کی این میری شمل اور ڈاکٹر وانتسر، سعودی عرب کی جدہ یونیورسٹی کے ڈاکٹر محمود زینی، مدینہ یونیورسٹی کے شیخ ناصر العبودی اور شیخ علی مشرف، مصر کی ازہر یونیورسٹی کے ریکٹر شیخ الفحام اور عبدالمقصود شلقامی، انگلستان کی لندن یونیورسٹی کے رالف رسل اور ڈرہم یونیورسٹی کے جان بی ووڈز، نیدرلینڈ کی لائیڈن یونیورسٹی کے پروفیسر بوجان، ترکی کی استنبول یونیورسٹی کے پروفیسر عبدالقادر قرہ خاں۔ ایران کی تہران یونیورسٹی کے پروفیسر مجتبیٰ مینوی، ڈاکٹر ناصرالدین شاہ حسینی، ڈاکٹر مظاہر مُصفّا اور غلام مُصدّق، مشہد یونیورسٹی کے

پروفیسر جلال متینی اور پروفیسر مشکاۃ الدینی افغانستان کی کابل یونیورسٹی کے پروفیسر ولی اللہ سمیعی اور پروفیسر سعید افغانی کراچی یونیورسٹی کے ڈاکٹر ابواللیث صدیقی ڈاکٹر محمد یوسف، ڈاکٹر ریاض الاسلام ڈاکٹر عابد علی خاں، ڈاکٹر فرمان فتحپوری، ڈاکٹر ابوالخیر کشفی، پروفیسر ممتاز حسین، سندھ یونیورسٹی کے ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں، پشاور یونیورسٹی کے ڈاکٹر میر ولی خاں، ڈاکٹر شمس الدین صدیقی، ڈاکٹر سید مرتضیٰ جعفری، خاطر غزنوی، خیال بخاری اور اسلام آباد کی ڈاکٹر کنیز فاطمہ یوسف کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

بالآخر ۲ مارچ کا تاریخی دن آگیا۔ افتتاحی اجلاس سینیٹ ہال میں سوا چار بجے کے قریب شروع ہوا۔ پنجاب کے وزیر اعلیٰ ملک معراج خالد اس اجلاس میں مہمان خصوصی تھے۔ ڈاکٹر اجمل نے اس اجلاس کی صدارت کی۔ اس اجلاس میں باہر کے مندوبین کے علاوہ پروفیسر حمید احمد خاں سابق وائس چانسلر پنجاب یونیورسٹی، علامہ علاء الدین صدیقی، ڈاکٹر سید عبداللہ، ڈاکٹر محمد باقر ڈاکٹر عبداللہ چغتائی، پروفیسر سید وقار عظیم اور پنجاب یونیورسٹی اور کالجوں کے پروفیسروں نے بھی شرکت کی۔

تلاوت کلام پاک کے بعد میں نے کالج کے پرنسپل اور کانگریس کے سکریٹری جنرل کی حیثیت سے افتتاحی اجلاس کا آغاز اپنے افتتاحیہ خطبے سے کیا جس میں اورینٹل کالج کی تاریخ بیان کرنے کے بعد اس کی علمی، تعلیمی، تحقیقی اور ادبی روایت پر روشنی ڈالی اور جشن صد سالہ کی کچھ تفصیل پیش کی، اس کے بعد صدر پاکستان جناب ذوالفقار علی بھٹو کا پیغام پڑھ کر سنایا۔ اس کے بعد آکسفورڈ یونیورسٹی کا پیغام پروفیسر سراج الدین نے، کیمبرج یونیورسٹی کا پیغام ڈاکٹر رفیع محمد چودھری نے لندن یونیورسٹی کا پیغام رالف رسل نے، تہران یونیورسٹی کا پیغام پروفیسر نصر الدین شاہ حسینی نے اور مشہد یونیورسٹی کا پیغام پروفیسر جلال متینی نے پڑھ کر سنایا۔ ان پیغامات کے بعد جسٹس ایس اے رحمٰن صدر جشن صد سالہ کمیٹی نے خطبۂ استقبالیہ پڑھا، اور وائس چانسلر ڈاکٹر محمد اجمل نے تقریر کی۔

اجلاس کے بعد یونیورسٹی ہال کے لان میں مندوبین کو پنجاب یونیورسٹی کی طرف سے

استقبالیہ دیا گیا، اور شب کو اورینٹل کالج میں پرنسپل کی طرف سے دیے گئے عشائیے میں مہمانوں نے شرکت کی۔

دوسرے دن ۱۳ مارچ کو اورینٹل کالج کی ادبی خدمات کے موضوع پر دو اجلاس ہوئے۔ اورینٹل کالج اور پنجاب یونیورسٹی کے اساتذہ کے علمی کاموں کی نمائش بھی ہوئی۔ پہلے اجلاس کے صدر پنجاب کے وزیر خزانہ محمد حنیف رامے صاحب نے اور دوسرے اجلاس کی صدارت کی مہمانِ خصوصی پروفیسر حمید احمد خاں صاحب تھے۔ دوسرے اجلاس کی صدارت اورینٹل کالج کے سابق طالب علم اور مشہور شاعر فیض احمد فیض صاحب نے کی اور پروفیسر صوفی غلام مصطفیٰ تبسم، ڈاکٹر عبداللہ چغتائی، ڈاکٹر میر ولی خاں، حکیم نیر واسطی، مولانا عبدالقدوس اور ڈاکٹر جابر علی خاں نے اورینٹل کالج کے بارے میں تقریریں کیں اور ڈاکٹر ابواللیث صدیقی اور چودھری غلام رسول مہر نے اپنے مقالے پڑھے۔ شب کو یونائیٹڈ بینک کی طرف سے مہمانوں کے اعزاز میں عشائیہ دیا گیا۔

تیسرے دن اسلامی علوم اور عربی زبان و ادب کے بارے میں دو اجلاس ہوئے۔ پہلے کی صدارت لائیڈن یونیورسٹی کے پروفیسر نولجان نے کی اور شاہ ولی اللہ پر اپنا مقالہ پڑھا۔ دوسرے اجلاس کی صدارت اورینٹل کالج کے پرانے طالب علم پروفیسر ڈاکٹر وحید مرزا صاحب نے کی۔ ان اجلاسوں میں پروفیسر نولجان، ڈاکٹر محمد یوسف، ڈاکٹر راجا احسان الٰہی، پروفیسر قدرت اللہ فاطمی، پروفیسر عبدالمقصود شلتاگی اور اسما رشید صاحبہ نے مقالے پڑھے۔ اجلاس کے اختتام کے بعد سینیٹ روم میں چائے ہوئی اور خانۂ فرہنگ ایران نے عشائیہ کا انتظام کیا۔

چوتھے دن ایران کی تہذیب اور فارسی زبان و ادب پر دو اجلاس ہوئے۔ پہلے اجلاس کی صدارت اقبال لاہوری کے نامور مصنف پروفیسر مجتبیٰ مینوی نے کی۔ سفیر کبیر ایران آقائے منوچہر ظلی نے اس کا افتتاح فرمایا، اور اس اجلاس میں ایران کے ڈاکٹر جلال متینی، ڈاکٹر [illegible] مرتضیٰ، ڈاکٹر عبدالمحسن مشکاۃ الدینی، ڈاکٹر ضیاء الدین سجادی، ڈاکٹر احمد علی رجائی، ڈرہم یونیورسٹی کے ڈاکٹر جان ہے ووڈ اور استنبول یونیورسٹی کے ڈاکٹر عبدالقادر قرحان نے اپنے مقالے پڑھے۔ دوسرے اجلا

کی صدارت کابل یونیورسٹی افغانستان کے پروفیسر ولی اللہ سمیعی نے کی، اور اس اجلاس میں صدر کے خطاب کے بعد جو عربی زبان میں تھا، ڈاکٹر ناصر الدین شاہ حسینی، پروفیسر سعید افغانی، ڈاکٹر عابد علی خاں اور ڈاکٹر نسیم نے مقالے پڑھے۔ عشائیہ پیکیجز لیمیٹڈ کے سربراہ سید بابر علی شاہ نے دیا۔

پانچواں دن ثقافتِ پاکستان و ہند اور اردو زبان و ادب کے لیے مخصوص تھا۔ پہلے اجلاس کی صدارت سندن یونیورسٹی کے رالف رسل نے کی اور اس اجلاس میں پروفیسر حمید احمد خاں، پروفیسر مارا استیپانیانس (روس)، پروفیسر یولجان رنبیدر (لینڈ)، ڈاکٹر شمس الدین صدیقی، ڈاکٹر ریاض الاسلام، خاطر غزنوی صاحب، ڈاکٹر کارلو کپولا (امریکہ) نے مقالے پڑھے۔ دوسرے اجلاس کے صدر سندھ یونیورسٹی ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں صاحب تھے۔ مولانا کوثر نیازی نے اس اجلاس کا افتتاح کیا۔ اس اجلاس میں رالف رسل، ڈاکٹر منظور احمد، ڈاکٹر ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر افتخار احمد غوری نے مقالے پڑھائے۔ عشائیہ حبیب بینک نے دیا۔

کانگریس کا آخری اجلاس چھٹے دن ہوا۔ پہلے اجلاس کی صدارت پروفیسر علاء الدین صدیقی نے کی۔ اس میں پنجابی زبان و ادب پر ڈاکٹر لئیق بابری، پروفیسر مقبول بیگ بدخشانی اور بیگم رفیعہ مدعلی نے مقالے پڑھے۔ دوسرے اجلاس کی صدارت استنبول یونیورسٹی کے پروفیسر عبدالقادر قرہ خان نے کی۔ اس اجلاس میں مندوبین نے اپنے اپنے ملکوں میں مشرقی علوم کی ترقی پر اظہارِ خیال کیا اور قراردادیں پیش ہوئیں۔ عشائیہ پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر نے دیا۔

اور اس طرح ماہرینِ علومِ مشرقی کی یہ کانگریس اختتام کو پہنچی۔ چھ دن تک دن دن بھر اس کے اجلاس ہوتے رہے۔ علمی ماحول کے ساتھ جشن کا سا سماں رہا۔

اس کانگریس کی روداد کو مقالوں اور تصویروں کے ساتھ میں نے جشن نامہ اورینٹل کالج کے نام سے ایک ضخیم اور خوبصورت جلد کی صورت میں چھاپ کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دیا۔ دنیا کی تمام یونیورسٹیوں اور تحقیقی اداروں نے اس کو پسند کیا اور تہنیت و مبارکباد کے خطوط لکھے اور اس خیال کا

اظہار کیا کہ ایسی کانفرنس مشرقی علوم کی تاریخ میں کبھی منعقد نہیں ہوئی اور نہ کسی کانفرنس کی ایسی مفصل ضخیم اور دیدہ زیب رپورٹ اس طرح کتابی صورت میں شائع ہوئی، حکومت پاکستان نے اس کو اپنے نقطۂ نظر سے دیکھا اور اس خیال کا اظہار کیا کہ اس کانفرنس سے دنیا کے مختلف ملکوں میں لوگوں کو یہ احساس ہوا کہ پاکستان میں حالات نارمل ہیں۔

ہمارے ہاں اس کامیابی نے رشک و حسد کی آگ کو بھڑکایا۔ بہت سے لوگ برہنہ ہو گئے۔ اخبارات میں کچھ مضامین بھی ہمارے خلاف نکلے، اور یہ ایسے لوگوں نے لکھے جو بظاہر ہمارے دوست تھے لیکن جن کی آستینوں میں سانپ تھے۔ ایک دوست تو ایسے تھے کہ رشک و حسد کی وجہ سے جن کا ذہنی توازن بگڑ گیا اور ان سے ایسی ایسی حرکتیں سرزد ہونے لگیں جن کو پاگل پن ہی کہا جا سکتا ہے لیکن میں نے ان باتوں کا کوئی نوٹس نہیں لیا، اور یہ مصرعہ پڑھ کر خاموش ہو گیا ؎

اے روشنیِ صبح تو بر من بلا شدی

مولانا حامد علی خان صاحب سابق اڈیٹر ہمایوں و الحمرا یہ سب دیکھ کر ایک دن میرے پاس تشریف لائے اور فرمایا کہ آپ نے اورینٹل کالج کا جشن صد سالہ منایا ہے جس طرح وہ پنجاب یونیورسٹی کی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہے گا، اب کوئی سو سال زندہ رہے گا تو اس کو پھر یہ موقع ملے گا۔ آپ نے تو خوش اسلوبی سے کام کر لیا۔ رشک و حسد انسان کو اندھا کر دیتا ہے۔ آپ اس کی مطلق پروا نہ کیجیے

میں نے کہا، مولانا۔ جشن صد سالہ خصوصاً بین الاقوامی کانگریس کی کامیابی میں کسی غیبی مدد کا ہاتھ تھا۔ جس طرح یہ سب کچھ ہوا وہ انسان کے بس کی بات نہیں تھی۔

یہ بڑے ہی سیاسی انتشار کا زمانہ تھا۔ سیاسی سطح پر بھی لوگ آپس میں لڑ رہے تھے۔ اور انفرادی سطح پر بھی لوگ سازشوں ہی کو سب کچھ سمجھتے تھے۔ مشرقی پاکستان کی جنگ اور اس کے نتیجے میں پاکستان کے دو ٹکڑے ہو جانے کی وجہ سے ہر طرف انتشار پھیل گیا تھا اس

میں ہندوستان کی بدنیتی اور بڑی طاقتوں کی سازشوں کا ہاتھ تھا۔ نوے ہزار پاکستانی فوجیوں کا ہتھیار ڈالنا، اور اپنی شکست کو تسلیم کرنا میری سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ زندگی ایک عذاب معلوم ہونے لگی تھی لیکن یہ سوچ کر اپنے دل کو سمجھاتا تھا کہ سربراہِ مملکت جب عیاشی کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لے تو یہی کچھ ہوتا ہے۔ وہ تو نشے میں دھت امریکہ کے SEVENTH FLEET کا انتظار کرتا رہا، لیکن وہ نہ آیا، اور پاکستان ٹکڑے ہوگیا۔ اس کا آدھا جسم کٹ گیا جس کی وجہ سے بقیہ حصہ تڑپتا رہا۔

اس عالم میں پیپلز پارٹی نے جگر لخت لخت کو جمع کیا، نئی حکومت بنائی۔ اس کے رہنماؤں نے، جو کچھ کیا جا سکتا تھا، وہ کیا۔ بڑے بڑے جرنیل ریٹائر کیے گئے۔ اسمبلیوں کی تشکیل کی گئی، متفقہ طور پر نیا آئین بنایا گیا۔ چھ سات سال ان کی حکومت رہی۔ اس زمانے میں شملہ معاہدہ ہوا، فوجی قید و بند سے آزاد کرائے گئے۔ پہلی اسلامی سربراہی کانفرنس بھی ہوئی جس میں تمام اسلامی ممالک کے سربراہ شریک ہوئے۔ سیاسی استحکام بھی کسی حد تک نصیب ہوا لیکن انتشار اور افراتفری سے نجات نہ مل سکی، نجات ملتی بھی کیسے؟ سب کچھ تو تباہ و برباد ہو چکا تھا۔

ابھی چند سال نہیں ہوئے تھے کہ مخالفت نے نظام مصطفےٰ کی تحریک کی صورت اختیار کی اور قتل و غارت گری کا بازار گرم ہوا، اور پھر ایک دن صبح کو یہ خبر ملی کہ پیپلز پارٹی کی حکومت ختم ہوگئی اور فوج نے اقتدار سنبھال لیا۔ اس کے بعد وہ سب کچھ ہوا جو چشمِ فلک نے اس سے قبل کبھی دیکھا نہیں تھا۔ میں یہ سب کچھ دیکھ کر تڑپتا اور تلملاتا رہا اور پاکستان کی سلامتی اور پاکستانیوں کے لئے دعا کرتا رہا۔

اس زمانے میں، ایک اہم تعلیمی ادارے کے سربراہ کی حیثیت سے مجھے عجیب و غریب تجربات ہوئے۔ اساتذہ اور پڑھے لکھے لوگوں کو میں نے عجیب و غریب روپ میں دیکھا لیکن شکر ہے کہ اورینٹل کالج اس انتشار اور افراتفری کی فضا کا شکار نہیں ہوا۔ اس زمانے میں بڑے بڑے جنوں کو میں نے شیشے میں اتارا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اورینٹل کالج ان سازشوں سے بچا رہا۔ بعض طالب علموں کی نکیل اس زمانے میں سیاسی لوگوں کے ہاتھوں میں تھی جن کا مقصد ہنگامہ آرائی کر کے تعلیمی فضا کو

ترتیب کرتا تھا۔ کچھ نادان اساتذہ بھی اپنے ذاتی مفاد کے پیش نظر ایسے طالب علموں کے ساتھ ہوجاتے تھے۔ ظاہر ہے کہ اس کا اثر تعلیمی اور علمی ماحول پر خراب ہوتا تھا۔ میں نے دانش مندی شفقت اور محبت سے اس مسموم ماحول کا مقابلہ کیا، اور خدا کا شکر ہے کہ مجھے حالات کو درست رکھنے میں خاطر خواہ کامیابی ہوئی۔

میں تعلیم کو محدود کرنے کا قائل نہیں تھا، کیونکہ میرے خیال میں ہر فرد کو تعلیم حاصل کرنے کا حق حاصل ہے۔ اس لیئے میں نے اپنی پرنسپلی کے زمانے میں ہر طالب علم کے لئے اس درس گاہ کے دروازے کھول دیئے۔ میرے زمانے میں داخلوں پر کوئی پابندی نہیں تھی۔ اردو، عربی، فارسی اور یورپی زبانوں کے شعبوں میں جس کا جی چاہے داخل ہو سکتا تھا۔ ام۔ اے کے ایک ایک کلاس میں کئی کئی سو طالب علم داخل ہو جاتے تھے۔ اور پڑھنے لکھنے میں ان کا ایسا دل لگتا تھا کہ بیشتر دو سال میں خاصی ترقی کرتے تھے، اور امتحانات میں اچھے خاصے نمبر حاصل کرکے پاس ہو جاتے تھے۔ ہزاروں طالب علم اس طرح ام۔ اے پاس ہوئے اور کامیابی کے بعد انھوں نے مختلف محکموں میں ملازمتیں حاصل کیں۔ دو سال کالج میں رہ کر وہ بڑے باشعور ہو جاتے تھے۔ انسانی زندگی اور ان کے رشتوں کا اُن کے ہاں شدید احساس پیدا ہو جاتا تھا اور اس کے نتیجے میں اُن کی شخصیتوں میں انسانیت اور انسان دوستی کی خوشبو اس طرح رس بس جاتی تھی کہ اُن کو پہچانا جا سکتا تھا۔ یہ کام صرف شفقت اور محبت ہی سے انجام پا سکتے ہیں۔ میرے مزاج میں اپنے طالب علموں کے لئے سوائے شفقت اور محبت کے اور کچھ نہیں تھا۔ ہزارہا طالب علم میرے زمانے میں انسانیت، انسان دوستی، بلند اخلاق، تہذیب و شائستگی کی دولت بیش بہا سے مالا مال ہو کر کالج سے نکلے۔

میری پرنسپلی کے زمانے میں سمسٹر کا نظام شروع ہوا۔ اس کے لیئے ایک کمیٹی بن گئی۔ میں بھی اس کمیٹی کا ممبر تھا۔ میں نے اس نظام کی مخالفت کی، اور اس خیال کا اظہار کیا کہ امریکہ کی نقالی اچھی بات نہیں۔ وہاں کے حالات مختلف ہیں، ہمارے حالات مختلف ہیں۔ پہلے ایسا معاشرہ پیدا کیجیے جس

میں سمسٹر کا نظام پروان چڑھ سکے۔ پہلے دیانت داری پیدا کیجئے تاکہ طالب علم اور اساتذہ دونوں سے یہ توقع کی جاسکے کہ وہ سمسٹر کے نظام سے صحیح طور پر فائدہ حاصل کرسکیں۔ لیکن کمیٹی کے ممبروں نے میری بات نہیں مانی کیونکہ اشارہ تو اوپر سے تھا۔ تکمیل تو کسی اور کے ہاتھ میں تھی۔

غرض نئے تعلیمی سال سے سمسٹر کا نظام قائم ہوگیا۔ اس کو بہانا بنا کر سب سے پہلے تو اس وقت کے وائس چانسلر صاحب نے یونیورسٹی کے مختلف شعبوں میں داخلے پر پابندی لگائی۔ مختلف شعبوں میں بڑی محدود تعداد میں طالب علم داخل کئے گئے۔ اورینٹل کالج میں تو کل تعداد پچاس سے بھی کم رہ گئی۔ اردو میں بیس پچیس داخل کئے گئے، فارسی میں پانچ چھ، عربی میں سات آٹھ۔ کمیٹی کی میٹنگ ہوئی تو میں نے پرنسپل کی حیثیت سے احتجاج کیا، اور کہا کہ یہ سب کچھ اورینٹل کالج کو ختم کرنے کے لئے کیا جارہا ہے لیکن میری بات اس وقت نہیں مانی گئی، اور کہا گیا کہ کسی طرح سمسٹر کے نظام کو کامیاب بنانا ہے۔ اس پر میں نے کہا کہ سمسٹر کے نظام کو اپنا کر آپ نے امریکہ کی نقل کی ہے، لیکن آپ لوگوں کو معلوم ہے کہ امریکہ کی یونیورسٹیوں میں، جہاں سمسٹر کا نظام چل رہا ہے وہاں ہر یونیورسٹی میں طالب علموں کی تعداد لاکھوں تک پہنچتی ہے۔ پھر بھی میری بات نہیں مانی گئی۔ بالآخر یہ معاملہ کسی طرح وائس چانسلروں کی کمیٹی میں پیش ہوا۔ تمام وائس چانسلروں نے پنجاب یونیورسٹی کی اس پالیسی سے اختلاف کیا۔ اس کے نتیجے میں کچھ تعداد بڑھائی گئی لیکن اس اضافے کے بعد بھی تعداد بہت کم تھی۔

غرض اس طرح پنجاب یونیورسٹی کے تعلیمی نظام کو برباد کردیا گیا۔ اس سال پوسٹ گریجویٹ شعبوں میں طالب علموں کی تعداد پانچ سو سے زیادہ نہیں تھی۔ یہ اطلاع مجھے پشاور یونیورسٹی کے اس وقت کے وائس چانسلر ڈاکٹر جی۔ دیم خٹک نے بہم پہنچائی، اور اس پر افسوس کا اظہار کیا۔ ڈاکٹر ظفر علی ہاشمی ایک دن کسی تقریب میں ملے کہنے لگے "آپ کی یونیورسٹی میں پوسٹ گریجویٹ طالب علموں کی تعداد ڈھائی فی صد ہے جب کہ پشاور میں چوبیس فی صد اور کراچی میں تیس بتیس فی صد ہے"۔

میں یہ سب کچھ سن کر دل ہی دل میں کڑھتا اور ارباب اختیار کی حماقتوں پر ماتم کرتا رہا۔ تعلیم کو

محدود کرنا خصوصاً پاکستان کے سب سے بڑے صوبے میں میری ناچیز رائے میں ایک ایسا گناہ تھا جس کو معاف نہیں کیا جا سکتا۔

یہ سمسٹر کا نظام پنجاب یونیورسٹی میں تین چار سال تک چلتا رہا اور تعلیم تباہ ہوتی رہی۔ اس کے علاوہ کچھ طالب علم ہتھیاروں کے زور پر اساتذہ کو زیادہ نمبر دینے اور پاس کرنے پر مجبور کرتے رہے۔

یہ سب کچھ ایک بہت بڑا المیہ تھا۔

اب طالب علم جیسے جیسے وقت گزرتا گیا، ہنگامہ آرائی کے عادی ہوتے گئے۔ اساتذہ کی بے عزتی عام بات ہو گئی۔ نوبت مار پیٹ تک پہنچی بعض اساتذہ کو نہ صرف بے عزت کیا گیا بلکہ نوبت زدوکوب تک پہنچی۔ پگڑی کا سنبھالنا مشکل ہو گیا۔ وائس چانسلروں کے گھیراؤ کئے گئے اُن کے گھروں پر حملے ہوئے، ہوسٹل اسلحہ خانے بن گئے۔ آئے دن گولیوں کا چلنا عام ہو گیا۔ بعض طالب علم قتل بھی کئے گئے۔ پولیس کا یونیورسٹی میں داخل ہونا معمول بن گیا۔

میں ایک خاموش تماشائی کی طرح اس روز بروز بگڑتی ہوئی صورت حال کو دیکھتا رہا لیکن کچھ کر نہ سکا بے بس تھا۔

میرے خیال میں دو وائس چانسلروں نے اپنی غلط پالیسیوں کی وجہ سے پنجاب یونیورسٹی کو سب سے زیادہ نقصان پہنچایا، اور اس کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔

ایک تو ان میں شیخ امتیاز علی صاحب تھے اور دوسرے ڈاکٹر خیرات محمد ابنِ رسا۔

شیخ امتیاز علی صاحب مزاج کے سخت تھے۔ علمی اور تعلیمی معاملات کو بالکل نہیں سمجھتے تھے وہ لاء کالج کے پرنسپل تھے۔ اس لئے صرف قانون سے انھیں دلچسپی تھی کسی اور ڈسپلن سے انھیں کوئی سروکار نہ تھا۔ اُن کی پرورش پولیس کے ماحول میں ہوئی تھی۔ اس لئے یونیورسٹی کے مسائل کو حل کرنے کے لئے ہمیشہ پولیس کا سہارا لیتے تھے۔ بات بات پر پولیس کو یونیورسٹی میں بلا لیتے تھے اور خود بھی یونیورسٹی کے وائس چانسلر کی بجائے پولیس افسروں کا

رویہ اختیار کر لیتے تھے۔ اُن کے اس انداز نے یونیورسٹی کو پولیس کا تھانہ بنا دیا تھا، اور اس کے نتیجے میں مختلف طرح کی ہنگامہ آرائیاں کچھ زیادہ ہی بڑھ گئیں اور اکیڈمک ماحول یونیورسٹی سے رخصت ہو گیا۔

ویسے شیخ صاحب ملنے جلنے میں بڑے مہذب آدمی تھے۔ میرے ان کے ساتھ ذاتی تعلقات تھے اور وہ میری عزت کرتے تھے اور ہمیشہ مجھے بھائی صاحب کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔ میرے پڑوسی بھی تھے۔ غریب خانے پر بھی اکثر تشریف لاتے تھے۔

لیکن یونیورسٹی کے نظام کو چلانا انہیں نہیں آتا تھا کیونکہ وہ اکیڈمک آدمی نہیں تھے۔ مزاج میں سفاکی بھی تھی جو میری رائے میں اکیڈمک ماحول کی سب سے بڑی دشمن ہے۔

برخلاف اس کے ڈاکٹر خیرات محمد بڑے سادہ لوح آدمی تھے۔ اُن کے مزاج میں بچپن بہت تھا بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہے کہ ادھیڑ عمر کو پہنچنے کے باوجود وہ بالکل بچے تھے۔ بچوں کی طرح رہتے تھے بچوں کی طرح ہنستے تھے، بچوں کی طرح باتیں کرتے تھے، بچوں کی طرح لباس پہنتے تھے، بچوں کی طرح ڈرتے تھے، بچوں کی طرح خوف کھاتے تھے۔ بچوں کی طرح فیصلے کرتے تھے، بچوں کی طرح خوشامد کرتے تھے۔ غرض اُن کے ہر انداز سے بچپنا ٹپکتا تھا۔ پیپلز پارٹی کی حکومت کے زمانے میں وہ ذوالفقار علی بھٹو صاحب کو دنیا کا سب سے بڑا آدمی سمجھتے تھے، لیکن اُن کی حکومت کے ختم ہونے اور خود اُن کے ختم ہو جانے کے بعد وہ مارشل لا کے اربابِ اختیار کی شان میں رطب اللسان رہنے لگے اور دکھانے کے لیے ایک دین دار مسلمان اور اسلام کے بہت بڑے علمبردار بن گئے۔

مقبوضہ کشمیر سے وہ تعلیم حاصل کرنے کے لیے علی گڑھ بھیجے گئے تھے۔ وہاں سے ایم ایس سی کرنے کے بعد پاکستان آ گئے۔ کئی سال ایف سی کالج میں لکچرار رہے۔ پھر لکچرار کی حیثیت سے یونیورسٹی میں آ گئے۔ وظیفہ مل گیا، امریکہ چلے گئے۔ جان براؤن یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کیا، وہاں سے واپسی پر یونیورسٹی میں ریڈر اور پھر کیمیا کے پروفیسر ہو گئے۔ یہ سب کچھ صرف چند برسوں میں ہوا۔

پھر پیپلز پارٹی کے دورِ حکومت میں ایک دن یہ خبر ملی کہ وہ پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر

ہوگئے۔ اس تقرر میں پیپلز پارٹی کے کچھ کشمیری رہنماؤں کا ہاتھ تھا۔ وائس چانسلر ہونے کے بعد میرے پاس اورینٹل کالج میں آئے اور کہا کہ "آپ بہت سینیئر پروفیسر ہیں۔ مجھے مشورہ دیجئے۔ وائس چانسلری کے کام کو چلانے میں مجھے آپ کے تعاون کی ضرورت ہے۔

میں نے کہا "میں ہر خدمت کے لئے حاضر ہوں۔"

لیکن دل میں یہ خیال موجیں مارتا رہا کہ اتنی بڑی یونیورسٹی کی وائس چانسلری خصوصاً اس دورِ انتشار میں اُن کے بس کی بات نہیں۔

اور یہ خیال صحیح ثابت ہوا۔

کئی سال وہ پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر رہے۔ اور میں نے اُن کی وائس چانسلری کے زمانے میں عجب عجب تماشے دیکھے۔ اس زمانے میں یونیورسٹی کی باگ ڈور دو چار لڑکوں کے ہاتھ میں تھی۔ وہ جو چاہتے تھے کرواتے تھے۔ وائس چانسلر اُن کے ہاتھ میں کٹھ پتلی بنا ہوا تھا، اور ہنگامہ پسند طالب علموں کی خوشامد کرتا تھا۔ یونیورسٹی کے اساتذہ کا وائس چانسلر سے ملنا جوئے شیر نکالنے سے کم نہ تھا۔ کیونکہ وہ اساتذہ اور خصوصاً سینیئر اساتذہ سے منہ چھپاتے پھرتے تھے۔ سیاسی پارٹیوں سے تعلق رکھنے والے لڑکے ٹھوکر مار کر وائس چانسلر کے دفتر کا دروازہ کھولتے تھے، اور دندناتے ہوئے اندر آجاتے تھے۔ وائس چانسلر کے پاس کوئی بھی بیٹھا ہو، وہ کسی سے بھی مصروفِ گفتگو ہوں، کوئی اہم میٹنگ ہو رہی ہو، وائس چانسلر ان سب کو چھوڑ چھاڑ کر ان لڑکوں کی خوشامد میں مصروف ہو جاتا تھا۔ ایسے مواقع پر ان کی حالت دیکھنے والی ہوتی تھی۔ اس پر ترس آتا تھا۔

ایک دن میں نے اورینٹل کالج اور یونیورسٹی کے بعض اہم معاملات پر بات کرنے کے لیے وائس چانسلر سے وقت مقرر کیا تھا۔ بارہ بجے ملاقات کا وقت تھا۔ میں ٹھیک بارہ بجے پہنچا اور وائس چانسلر سے باتیں کرنے لگا۔ ابھی مشکل سے دس پندرہ منٹ گزرے تھے کہ کسی نے ٹھوکر سے وائس چانسلر کے کمرے کا دروازہ کھولا، اور بغیر اجازت کے اندر داخل ہوا۔

یہ یونیورسٹی کے ایک طالب علم رہنما تھے۔ اُن کے پیچھے ایک استاد بھی تھے جو اُن کی مصاحبت کے فرائض انجام دے رہے تھے۔

یہ لوگ کمرے میں داخل ہوئے تو وائس چانسلر صاحب اُٹھ کر کھڑے ہو گئے، اور انھیں اپنے قریب صوفے پر بٹھایا۔ اور پوچھا ”کیا بات ہے“

میں نے لڑکوں کے سامنے وائس چانسلر کو ریشہ خطمی ہوتے ہوئے دیکھا تو کہا ”جناب وائس چانسلر صاحب! میں نے ایک ہفتہ پہلے وقت مقرر کیا تھا۔ میری باتیں بہت اہم ہیں۔ کسی کے سامنے یہ باتیں نہیں ہو سکتیں۔ آپ یا تو مجھ سے باتیں کر لیجیے یا پھر ان لوگوں سے باتیں کیجیے۔“

وائس چانسلر صاحب کچھ شرمندہ سے ہوئے۔ طالب علم رہنما سے کیسے کہہ سکتے تھے کہ آپ وقت مقرر کر کے آئیے۔ وہ کچھ ڈرے ڈرے اور سہمے ہوئے سے نظر آئے۔ مجھے اُن پر ترس آیا۔

کہنے لگے ”میں صرف پانچ منٹ کی اجازت چاہتا ہوں، انھیں رخصت کر کے آتا ہوں۔“

یہ کہہ کر وہ کمرے کے ایک کونے میں ان لوگوں کے ساتھ بیٹھ گئے اور نیو کیمپس میں کسی ہال یا گھر کی تعمیر کے موضوع پر باتیں کرنے لگے۔ ظاہر ہے کہ یہ کام وائس چانسلر کا نہیں، یونیورسٹی کے پروجیکٹ ڈائرکٹر کا تھا۔

چند منٹ کے بعد وہ واپس آئے تو ہماری باتیں شروع ہوئیں۔

میں نے کہا ”جناب وائس چانسلر صاحب! آپ ان لوگوں کو ملنے جلنے کے آداب سکھائیے۔ وائس چانسلر سے وقت مقرر کر کے ملنا چاہیے کیونکہ وہ ایک مصروف آدمی ہوتا ہے۔ یونیورسٹی کے سربراہ کا احترام بہرحال ضروری ہے۔“

کہنے لگے ”آپ تو سب کچھ جانتے ہیں۔ یونیورسٹی کی فضا کا آپ کو بخوبی علم ہے۔ یہ لوگ تو ذرا دیر میں مارنے مرنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔ اس لیے میں ڈھیل دینے کی پالیسی پر عمل کر رہا ہوں۔“

میں نے کہا ”خیر، یہ آپ کا معاملہ ہے۔ آپ جس طرح چاہیں، اپنے نظام کو چلائیے۔

مجھے ان معاملات میں دخل دینے کا کوئی حق نہیں ہے۔"

اس پالیسی کے نتیجے میں یونیورسٹی کی فضا روز بروز بد سے بدتر ہوتی گئی۔ وائس چانسلر کے اس رویے نے اساتذہ کی عزت خاک میں ملا دی۔ جب وائس چانسلر کی عزت نہ کی جائے تو اساتذہ بے چارے کس شمار قطار میں ہیں۔

یہ فضا روز بروز سنگین سے سنگین تر ہوتی گئی۔ اور وائس چانسلر کی جگہ لڑکے جو چاہتے وہ کرنے لگے۔ استاد اور طالب علم کے رشتے کا تقدس خاک میں مل گیا۔ استاد بھی اپنی عزت بچانے کے لئے وائس چانسلر کی طرح طالب علموں کی خوشامد کرنے لگے۔ یونیورسٹی میں لڑکوں کا سکہ چلنے لگا۔

ایک دن اُس وقت کے وزیر تعلیم محمد علی خاں ہوتی صاحب لاہور آئے۔ ایک جگہ کھانے پر اُن سے ملاقات ہوئی۔ باتوں باتوں میں کہنے لگے "میری اطلاع یہ ہے کہ آپ کی یونیورسٹی کو دو تین لڑکے چلاتے ہیں۔"

میں نے کہا "آپ کو یہ علم کیسے ہوا؟ اور آپ نے اس طرح اس کا اظہار کیوں کیا؟ وائس چانسلر کا تقرر تو آپ ہی لوگ کرتے ہیں۔ آپ کو تو اس کی شکایت نہیں ہونی چاہیے۔" خود کردہ را علاجے نیست"

کہنے لگے "وائس چانسلر کے تقرر میں میرا ہاتھ بالکل نہیں۔ میں نے تو یہ خبریں سن کر اُس کی مخالفت کی تھی لیکن آپ کے وائس چانسلر صاحب تو صدر صاحب کے پیر پکڑ لیتے ہیں اور صدر صاحب ذاتی طور پر اتنے شریف آدمی ہیں کہ اہل عمر سے اختلاف نہیں کر سکتے۔ ان کی کسی تجویز کو رد نہیں کرتے۔ یہ صورت حال ان کی شرافت ہی کا نتیجہ ہے۔"

میں اس کے بعد کیا کہتا۔ "رموز مملکتِ خویش خسرواں دانند" کہہ کر چپ ہو گیا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب امریکہ کی نقالی میں شعبوں کے صدر صاحبان کا روٹیشن ہو رہا تھا۔ یعنی پروفیسر کی جگہ بعض شعبوں میں لکچرار سربراہ بنا دیے گئے تھے۔ پروفیسروں کو اُن کے ماتحت کام کرنے اور اپنے ماتحتوں اور شاگردوں کے احکامات ماننے کے لئے مجبور کر دیا گیا تھا۔ عجیب نظام

تھا۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کے نظام میں سازشیں ہی پنپ سکتی ہیں اور اکھاڑ پچھاڑ ہی کا بول بالا ہو سکتا ہے۔ شعبوں کے روٹیشن کے نظام کو بنیاد بنا کر اس زمانے میں ایک سازش یہ کی گئی کہ یونیورسٹی کے کالجوں کے پرنسپل بھی روٹیشن کے نظام کے تحت مقرر کئے جانے چاہئیں۔ یونیورسٹی کے تین کالج تھے۔ لاء کالج، ہیلی کالج اور اورینٹل کالج۔ اس سازش کے تحت جناب وائس چانسلر صاحب نے اورینٹل کالج کے پرنسپل سے بغیر پوچھے ہوئے بعض لوگوں کے زیر اثر یہ فیصلہ فرمایا کہ اورینٹل کالج میں پرنسپل کو بھی روٹیٹ ہونا چاہیئے۔ بعض لوگوں سے ڈر کر اس معاملے کو بالا ہی بالا سنڈیکیٹ میں رکھا اور اس کو پاس بھی کروا لیا لیکن پرنسپل اورینٹل کالج کو اس سے بے خبر رکھا۔ قانون کے مطابق اس معاملے کا سینیٹ میں جانا ضروری تھا۔ چنانچہ جب سینیٹ کا ایجنڈا تیار ہوا تو مجھے اس کی خبر ملی۔

میں نے وائس چانسلر صاحب کو فون کیا۔ اطلاع ملی کہ وہ دفتر میں موجود نہیں ہیں۔ میں نے کہا "یہ بات نہیں ہے۔ وہ دفتر میں موجود ہیں لیکن پرنسپل اورینٹل کالج کا سامنا کرنے کی اُن میں ہمت نہیں ہے، میں خود ان سے ملنے آ رہا ہوں۔

یہ کہہ کر میں نے فون بند کیا اور اُٹھ کر سیدھا اُن کے دفتر میں پہنچا۔ میری بات صحیح نکلی۔ وائس چانسلر صاحب موجود تھے۔

میں دروازہ کھول کر اندر چلا گیا۔ وائس چانسلر صاحب مجھے دیکھ کر پریشان ہوئے۔ چہرے پر ہوائیاں اُڑنے لگیں۔ مجھے دیکھ کر خود ہی فرمانے لگے "میں مجبور ہو گیا۔ میرے اوپر بہت دباؤ تھا۔ اب یہ معاملہ آج پانچ بجے سینیٹ کی میٹنگ میں پیش ہو گا۔ آپ اپنے ساتھیوں کو تیار کر لیجئے تاکہ وہ اس کی مخالفت کریں۔ ووٹنگ سے فیصلہ ہو گا۔"

خیرات صاحب کی یہ بات سُن کر میں نے ایک لفظ بھی کہنا مناسب خیال نہیں کیا۔ کمرے سے باہر نکل آیا اور سیدھا پنجاب سیکرٹریٹ گیا۔ اُس وقت SOLICITOR میرے ایک عزیز تھے۔ اُن کو تفصیل سنائی۔ وہ مجھے اپنے ساتھ ایک وکیل کے پاس لے گئے۔ STAY کے لئے کاغذات

کیے، پھر ہم تینوں ایک جج کے پاس گئے، جس نے حالات کو سُن کر اور کاغذات کو دیکھ کر STAY ORDER لکھ کر اپنے خاص چپراسی کے ذریعے ڈھائی بجے وائس چانسلر صاحب کو بھجوا دیا، جو پونے تین بجے اُن کو پہنچ گیا۔ اُن کا منصوبہ خاک میں مل گیا۔ میری ملاقات تو اُن سے اس کے بعد ہوئی نہیں لیکن بعض لوگوں نے یہ بتایا کہ وہ عدالت کے احکامات سے سخت پریشان اور شرمندہ ہوئے۔

پانچ بجے سینٹ کی میٹنگ شروع ہوئی۔ میں بھی سینٹ کے ایک ممبر کی حیثیت سے اُس میں شریک ہوا۔ جب اورینٹل کالج کی پرنسپل کے روٹیشن کا معاملہ زیرِ بحث آیا اور رجسٹرار نے اُس کی کچھ تفصیل سینٹ کے سامنے پیش کی تو میں نے اُٹھ کر کہا کہ "اس موضوع پر اس اجلاس میں بحث کرنا توہینِ عدالت ہے۔ یونیورسٹی کے رجسٹرار اور وائس چانسلر کو اس سنگین مسئلے کے نتائج کو ذہن میں رکھنا چاہیے۔"

اتنا کہنا تھا کہ وائس چانسلر صاحب پر اور اُن لوگوں پر جو اس سازش میں شریک تھے، سب پر اوس سی پڑ گئی۔ زبانیں لڑکھڑانے لگیں۔ قدم ڈگمگائے۔ منہ فق ہو گئے اور سب کو سانپ سونگھ گیا۔ خاموشی کے بادل چھا گئے۔ اور اس خاموشی کے عالم میں یہ معاملہ غرقِ دریا ہو گیا۔

وائس چانسلر صاحب اور اُن کے حواری اپنا سا منہ لے کر رہ گئے۔ میں نے جو تیر چلایا تھا وہ نشانے پر لگا، اور اس نے سازشیوں کا کام تمام کر دیا۔

خوشامد کا بدترین لمحہ میں نے اُس وقت دیکھا جب سینٹ کی میٹنگ کے بعد وائس چانسلر صاحب اُن لوگوں کو طفل تسلیاں دینے لگے جو اُن کے آس پاس جمع ہو گئے تھے اور اس معاملے کے بارے میں تفصیلات جاننا چاہتے تھے جس میں وائس چانسلر صاحب کو منہ کی کھانی پڑی تھی اور ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا تھا۔

بدحواسی کے عالم میں، یہ جانے بغیر کہ میں بھی پیچھے کی طرف رُکا ہوا کھڑا ہوں، وہ فرما رہے تھے آئندہ میٹنگ میں یہ معاملہ ضرور پیش ہوگا۔ فیصلہ ہو جائے گا۔ بس آئندہ میٹنگ کے بعد دو تین دن میں اورینٹل کالج کے موجودہ پرنسپل سے چارج لے لیں گے۔ آپ مطمئن رہیے۔

یہ سن کر میں نے کہا "یہ بھی توہینِ عدالت ہے، ابھی تو عدالت نے STAY دیا ہے، اب مقدمہ کم از کم چار چھ سال ضرور چلے گا۔ کس کی مجال ہے جو اورینٹل کالج کے پرنسپل سے چارج لے"۔

وائس چانسلر صاحب کو ایک دفعہ پھر میں نے شرمندگی کے عالم میں دیکھا اور مجھے پھر ان پر ترس آیا۔

چار پانچ سال یہ مقدمہ چلتا رہا۔ عدالت کے سامنے یونیورسٹی اور وائس چانسلر کی بڑی رسوائی ہوئی۔ کیونکہ میرے وکیل نے یہ بتایا کہ ہر پیشی پر جج صاحب یونیورسٹی کے وکیل اور رجسٹرار کو مخاطب کرکے یہ ضرور کہتے تھے کہ کم از کم یونیورسٹی کے لوگوں کو تو اپنے پروفیسروں اور دانشوروں کی عزت کرنی چاہیے۔ انھیں اس طرح پریشان کرنے کی بجائے اُن کے لیے سکون اور اطمینان کی فضا پیدا کرنی چاہیے تاکہ وہ اطمینان سے علمی اور تعلیمی کام کرسکیں لیکن اس معاملے میں جو بات بھی یونیورسٹی کی طرف سے پیش کی جاتی ہے، وہ خود اس کے لیے باعثِ رسوائی ہے!

بالآخر کئی سال کے بعد سیشن جج صاحب نے یہ فیصلہ دیا کہ یونیورسٹی کا موقف اورینٹل کالج کی پرنسپلی کے روٹیشن کے بارے میں غلط ہے، اور اب تک اس سلسلے میں جو کارروائی ہوئی ہے وہ صحیح نہیں ہے۔ کسی قانون کی رُو سے بھی پرنسپل کا روٹیشن نہیں ہوسکتا۔ خصوصاً اورینٹل کالج کے پرنسپل کا کیونکہ وہ سب سے زیادہ سینیئر پروفیسر کی حیثیت سے اس پوزیشن کو حاصل کرتا ہے۔ یہ ایک پروفیسر کا اعزاز ہے اور کسی کے اعزاز کو کوئی چھیننے کا مجاز نہیں۔ یونیورسٹی کو چاہیے کہ ان معاملات میں الجھنے کے بجائے اپنے پروفیسروں اور عالموں کی عزت کرے تاکہ وہ سکون اور اطمینان کے ساتھ علمی اور تعلیمی کام انجام دے سکیں۔ ڈاکٹر عبادت علمی، ادبی دنیا کی ایک مشہور و معروف شخصیت ہیں، یونیورسٹی کو ان کی عزت کرنی چاہیے۔

یہ فیصلہ ہوا تو ایک دن یونیورسٹی کے رجسٹرار قریشی صاحب میرے پاس اورینٹل کالج میں آئے اور کہنے لگے کہ مجھے وائس چانسلر صاحب نے بھیجا ہے اور کہا ہے کہ اس معاملے میں اس سے قبل جو کچھ ہوا ہے، اس کے لیے وہ معذرت خواہ ہیں۔ یہ سب کچھ بعض لوگوں کی سازش کا نتیجہ تھا جو

اب بے نقاب ہو چکے ہیں۔"

میں نے کہا: "قریشی صاحب! وائس چانسلر صاحب تو بہت دیر میں اس کا علم ہوا۔ ان تک میرا یہ پیغام پہنچا دیجئے کہ فتح ہمیشہ حق کی ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے عزت دیتا ہے جس کو چاہتا ہے ذلیل کرتا ہے۔ یہ میرا ایمان ہے۔"

خیرات صاحب کی سادہ لوحی کا ایک اور واقعہ بھی میں کبھی بھول نہیں سکتا۔

اورینٹل کالج کے شعبۂ عربی میں ایک لیکچرار کی جگہ تھی۔ اس پر ایک سال کے لئے عارضی طور پر پرنسپل کے ایما پر عربی کے استاد کا تقرر کیا گیا تھا۔ سال بھر کے بعد یونیورسٹی کی طرف سے اس پوسٹ کا اشتہار دیا گیا۔ خاصی تعداد میں درخواستیں آئیں۔ امیدوار سلکشن بورڈ کے سامنے پیش ہوئے۔ میں بھی پرنسپل اورینٹل کالج کی حیثیت سے سلکشن بورڈ کی میٹنگ میں موجود تھا۔ امیدواروں سے ممبروں نے سوال پوچھے۔ سب سے اچھا انٹرویو اسی امیدوار کا ہوا جو ایک سال تک اس پوسٹ پر کام کرتا رہا تھا لیکن ایک طالب علم امیدوار جو سب سے آخر میں پیش ہوا، اس سے جو سوال پوچھے گئے، ان میں سے بیشتر کا وہ جواب نہ دے سکا لیکن جب انتخاب کا مرحلہ آیا تو وائس چانسلر صاحب نے یہ فرمایا کہ "یہ آخری امیدوار بہت اچھا تھا، اس کا تقرر ہونا چاہیئے"۔ میں نے اس تجویز سے اختلاف کیا اور کہا کہ "اس نے تو کسی سوال کا جواب صحیح نہیں دیا۔ سب سے اچھا امیدوار مجھے وہ معلوم ہوتا ہے جو ایک سال تک شعبے میں کام کرتا رہا ہے"۔ جب میں بولا تو جسٹس سردار اقبال نے مجھ سے اتفاق کیا، اور کہا کہ "ڈاکٹر صاحب صحیح کہتے ہیں"۔ جب سردار صاحب بولے تو دوسرے ممبروں نے بھی ان سے اتفاق کیا۔ وائس چانسلر صاحب کی تجویز رد کر دی گئی، اور ہماری بات متفقہ طور پر مان لی گئی۔ وائس چانسلر صاحب اپنا سا منہ لے کر رہ گئے۔

جب سلکشن بورڈ کی میٹنگ ختم ہوئی تو میں نے ذاتی طور پر تنہائی میں خیرات صاحب سے پوچھا کہ "آپ نے اس طالب علم کی حمایت کیوں کی جس نے کسی ایک سوال کا جواب بھی صحیح نہیں دیا تھا؟" انھوں نے کہا: "مجھ سے کچھ لڑکوں نے اس کی سفارش کی تھی۔ ان کا خیال تھا کہ وہ شعبے کے لئے

مفید ثابت ہوگا۔ اسی لیے میں نے اس کے حق میں رائے دی۔"

میں نے کہا کہ "وائس چانسلر کی تجویز کبھی رد نہیں کی جاتی۔ آپ کو چیر کی طرف سے یہ تجویز پیش نہیں کرنی چاہیے تھی۔ پہلے دوسرے ممبروں کی رائے لے لیتے تو اچھا ہوتا۔ اس طرح وائس چانسلر کی پوزیشن خراب ہوتی ہے۔"

خیرات صاحب میری یہ باتیں سن کر چپ ہوگئے، اور کرتے بھی کیا!

اس قسم کے ماحول میں میں نے پرنسپلی کے کئی سال گزارے۔ اس کا اثر طبیعت پر بہت خراب ہوا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ میں نے میٹنگوں میں جانا چھوڑ دیا، اور دور سے اس انتشار اور بدنظمی کا تماشا دیکھتا رہا جس سے یونیورسٹی خیرات صاحب کی وائس چانسلری کے زمانے میں دوچار ہوئی تھی، اور جس میں وائس چانسلر کو کوئی خاطر میں نہیں لاتا تھا۔ چند لڑکے جو چاہتے تھے اُن سے کروا لیتے تھے، اور بیانگ دہل یہ کہتے پھرتے تھے کہ "ایسا وائس چانسلر ہمیں کبھی نہیں مل سکتا جو ہمارے نیچے نیچے بچھتا ہے اور ہم سے ڈرتا ہے، اور ہماری ہر بات ماننے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ یونیورسٹی کو تو ہم چلاتے ہیں۔"

اس فضا سے یونیورسٹی کا انتظامی نظام بھی متاثر ہوا۔ اس زمانے میں یونیورسٹی کے خزانہ دار کی حیثیت سے غالباً حکومت کے ایما پر ایک ایسے صاحب کا تقرر ہوا جنھوں نے کبھی کوئی یونیورسٹی نہیں دیکھی تھی، اس لیے احساسِ کمتری کا شکار تھے۔ خیر اکاؤنٹس کی حد تک تو اس کو نظرانداز کیا جا سکتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ اکاؤنٹس کے کام کو اچھی طرح جانتے ہوں، لیکن غضب یہ ہوا کہ چند سال بعد انھیں رجسٹراری کے فرائض بھی سونپ دیے گئے۔ اب وہ خزانہ دار بھی تھے اور یونیورسٹی کے رجسٹرار بھی۔ کئی سال تک وہ تنِ تنہا ان دونوں پوسٹوں کو سنبھالے رہے۔ ایسا کیوں ہوا؟ خدا ہی بہتر جانتا ہے۔ سنا ہے حسابات میں کچھ گڑبڑ تھی۔ اس لیے ان کی موجودگی کو ضروری سمجھا گیا ؎

رموزِ مملکتِ خویش خسرواں دانند

سنہ ۱۹۷۷ء میں علامہ اقبالؒ کا جشن صد سالہ قومی سطح پر منانے کا فیصلہ کیا گیا۔ میں علامہ اقبالؒ نیشنل کمیٹی کا ممبر تھا۔ وہاں یہ فیصلہ ہوا کہ اقبال بین الاقوامی کانگریس لاہور میں پنجاب یونیورسٹی کے زیر اہتمام منعقد کی جائے۔ اس کام کے لئے جو کمیٹی بنائی گئی اس کا مجھے ایک ممبر نامزد کیا گیا۔ شاید اس وجہ سے کہ میں اقبالؒ نیشنل کمیٹی کا بھی ممبر تھا۔ اس کا زیادہ کام خواجہ غلام صادق مرحوم نے کیا خواجہ صاحب یونیورسٹی میں فلسفہ کے پروفیسر اور بڑے ہی باقاعدہ اور محنتی آدمی تھے۔ انھوں نے بڑی خوش اسلوبی سے اقبالؒ کانگریس کا اہتمام کیا۔ اور کانگریس بہت کامیاب رہی۔ لیکن اس کے ایک اجلاس میں بغیر ممبروں سے مشورہ کئے ہوئے ایک رزولیوشن یہ بھی پیش کیا گیا کہ علامہ اقبالؒ کو نوبل پرائز (POSTHUNIOUS) ملنا چاہیے۔ جب یہ قرارداد اجلاس میں پیش کی گئی تو میں حیران ہوا۔ یہ ایسے افراد کے ذہن کا نتیجہ تھی جو نوبل پرائز دینے والے ادارے کے حالات سے ناآشنا تھے۔ اتفاق سے مندوبین میں ڈنمارک کے ایک ایسے صاحب بھی تھے جو نوبل پرائز کمیٹی کے ممبر تھے۔ جب انھوں نے وہاں کے حالات بتائے تو وائس چانسلر صاحب نے رزولیوشن کو واپس لے لیا۔

آنچہ دانا کند، کند نادان
لیک بعد از خرابیٔ بسیار

نیشنل کمیٹی نے جشن اقبالؒ کے موقع پر علامہ اقبالؒ کے مختلف پہلوؤں پر خاصی تعداد میں کتابیں شائع کرنے کا پروگرام بنایا۔ یہ کتابیں اقبال اکیڈمی کے زیر اہتمام ڈاکٹر معزالدین ڈائرکٹر اقبال اکیڈمی نے نہایت اہتمام سے شائع کیں۔ میرے سپرد اقبال کی نثر پر کتاب لکھنے کا فیصلہ ہوا۔ موضوع نیا تھا اس لئے میں نے اس کو قبول کر لیا۔ اور چند مہینے میں علامہ اقبالؒ کی نثر کے موضوع پر کتاب لکھ کر دے دی جس کو اقبال اکیڈمی نے شائع کر دیا۔ اسی زمانے میں مکتبہ عالیہ لاہور نے میری ایک اور کتاب "اقبالؒ ۔ احوال و افکار" شائع کی۔ ان کتابوں کو پسند کیا گیا اور جلد ہی ان کے ایڈیشن ختم ہو گئے۔

جشن اقبالؒ کے موقع پر میں نے اورینٹل کالج میگزین کے دو ضخیم خاص نمبر انگریزی اور اردو شائع کئے اور جشن نامۂ اقبالؒ کے نام سے انگریزی اور اردو کی دو ضخیم جلدیں بھی شائع کر دیں۔ ساری دنیا میں ان کو پسند کیا گیا۔ ان جلدوں کے بارے میں کچھ کہنا خود ستائی کا مترادف ہوگا اس لئے میں سوائے اس کے کچھ اور نہیں کہہ سکتا کہ ایسی دیدہ زیب اور خوبصورت کتابیں علامہ اقبالؒ پر اس سے قبل شائع نہیں ہوئیں۔ ان میں اورینٹل کالج اور پنجاب یونیورسٹی کے اساتذہ کے مقالات کو شائع کیا گیا تھا۔ ان کتابوں کی وجہ سے اورینٹل کالج اور پنجاب یونیورسٹی کے اساتذہ کے بارے میں بین الاقوامی سطح پر یہ تاثر عام ہوا کہ ان اداروں نے علامہ اقبالؒ پر تحقیقی اور تنقیدی کام کر کے اہم قومی خدمات انجام دی ہیں، اور یہ کہ ان کا کام معیار کے اعتبار سے بہت وقیع اور قابل قدر ہے۔

اور یہی ان مقالات کو جشن نامۂ اقبالؒ کی صورت میں اہتمام کے ساتھ شائع کرنے کا بنیادی مقصد تھا۔

شکر ہے کہ مجھے اس مقصد میں خاطر خواہ کامیابی ہوئی۔

علامہ اقبالؒ کا سال ساری دنیا میں دھوم دھام سے منایا گیا۔ پاکستان کے ساتھ ساتھ امریکہ انگلستان، جرمنی، فرانس، ایران اور ہندوستان میں علامہ اقبالؒ پر سمپوزیم اور سیمینار ہوئے، اور اس طرح شاعر مشرق اور مفکر اسلام کو خراج تحسین پیش کیا گیا۔

ہندوستان کے بین الاقوامی سیمینار میں پاکستانی وفد کے ایک ممبر کی حیثیت سے مجھے بھی شرکت کا موقع ملا۔ یہ بین الاقوامی سیمینار نئی دہلی میں ہوا، اور اس میں دنیا کے تقریباً تمام اہم ملکوں کے اسکالروں اور پروفیسروں نے شرکت کی۔ اس کے کئی اجلاس وگیان بھون میں ہوئے۔ ان اجلاسوں میں خیال انگیز مقالے پڑھے گئے۔ یہاں میری ملاقات روس کے نامور اسکالر جیلی شفیقہ سوخاچیف، سمونوف اور مادام پولیا سکا سے ہوئی جو فصیح اردو بولتے تھے، اردو ادب کے بارے میں ان کی معلومات حیرت انگیز تھی۔ اس طرح ملے جیسے برسوں سے جانتے تھے۔ کہنے لگے ”آپ کی

تحریریں ہم لوگ پڑھتے ہیں اور طالب علموں کو پڑھاتے ہیں۔ اس طرح برسوں سے آپ سے ملاقات ہے۔ ان لوگوں نے اس سمینار میں علامہ اقبالؒ کی انسان دوستی اور احترام آدمی کے پہلوؤں کو ابھارا اور اس موضوع کے مختلف پہلوؤں پر فکر انگیز مقالے پڑھے۔ چیکوسلوواکیہ کے یان ماریک بھی یہاں برسوں کے بعد ملے۔ جرمنی کی رینی میری شمل سے بھی ملاقات ہوئی۔ امریکہ اور ایران کے بھی کئی اسکالرز ملے۔ غرض یہ بین الاقوامی سمینار ہر اعتبار سے نہایت مفید ثابت ہوا۔

میں نے اس بین الاقوامی اقبال سمینار کی روداد ایک رپورتاژ کی صورت میں لکھی جو کتابی صورت میں "جشن اقبالؒ۔ نئی دہلی" کے نام سے شائع ہو چکی ہے۔

علامہ اقبال سنٹنری کمیٹی کے فیصلے کے مطابق پنجاب یونیورسٹی میں اقبالیات کا شعبہ قائم ہوا لیکن افسوس کے ساتھ یہ کہنا پڑتا ہے کہ اس معاملے میں پرنسپل اورینٹل کالج سے کوئی مشورہ نہیں کیا گیا۔ اس شعبے کا ایک دفتر تو ضرور قائم ہوا لیکن اس میں کوئی قابل ذکر کام نہ ہو سکا۔ دراصل یہ شعبہ بھی یونیورسٹی کی مخصوص فضا کی وجہ سے سازشوں کا شکار ہو گیا۔ سازش کے ماحول میں علمی کام پروان نہیں چڑھ سکتے۔ ضرورت اس بات کی تھی کہ یہ شعبہ سازشوں سے دامن بچا کر روشن خیالی کے ماحول میں کسی منصوبے کے تحت کام کرتا تاکہ علامہ اقبالؒ کے بلند پایہ افکار و خیالات سے دنیا کے ہر ملک میں لوگ روشناس ہوتے۔ اسلام اور پاکستان کی خدمت کے لئے ایسا کرنا ضروری تھا لیکن یونیورسٹی کے ارباب اختیار کی غلط پالیسیوں نے اس کو پھلنے پھولنے کا موقع ہی نہیں دیا۔

پروفیسر حمید احمد خاں مرحوم نے اپنی وائس چانسلری کے زمانے میں پنجاب یونیورسٹی میں، وفاقی حکومت کی گرانٹ سے تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند کا ایک شعبہ قائم کیا تھا۔ اس شعبے نے دس پندرہ سال میں سی درجے کا تحقیقی کام کیا اور اسلامیان ہند کی تہذیبی زندگی خصوصاً ان کے ادبیات پر نفیس ضخیم جلدیں شائع کر دیں۔ میری پرنسپلی کے زمانے میں اچانک یہ فیصلہ کیا گیا کہ اب اس شعبے کو بند کر دیا جائے اور پرنسپل اورینٹل کالج کے سپرد یہ کام ہو کہ وہ اس شعبے کے اثاثوں کو ٹھکانے لگائے۔

جب میرے پاس سرکاری طور پر اطلاع آئی تو میں نے یہ فیصلہ کیا کہ اس شعبے کو بند نہ کیا جائے۔ وفاقی حکومت کی گرانٹ سے اس میں ادبی تحقیق کا مزید کام کیا جا سکتا ہے۔ ادبی تاریخ ایک اتھاہ سمندر ہے۔ ابھی مطبوعہ جلدوں کی انڈکس بنائی جا سکتی ہے۔ پھر نادر و نایاب قلمی نسخوں کی طباعت و اشاعت کا کام بھی ہو سکتا ہے۔ یونیورسٹی کا اس منصوبے پر ایک پیسہ بھی خرچ نہیں ہوگا۔ وفاقی حکومت اس کے لئے خصوصی گرانٹ دیتی رہے گی۔ وفاقی وزارتِ تعلیمات کے سیکریٹری اس زمانے میں ڈاکٹر ممتاز علی قاضی صاحب تھے میں نے ان سے رابطہ قائم کیا، اور تحقیقی کام کا ایک پانچ سالہ منصوبہ پیش کر دیا۔ یہ منصوبہ منظور کر لیا گیا، اور ریسرچ کے لئے گرانٹ ہمیں مل گئی۔

اب شعبے میں پھر جان پڑ گئی۔ جن ریسرچ اسکالروں کی ملازمتیں ختم کر دی گئی تھیں اور جنھیں نوٹس مل گئے تھے، ان کو میں نے بحال کیا، اعزازی طور پر ڈائرکٹر کا عہدہ سنبھالا، اور تاریخ ادبیات کی شائع شدہ جلدوں کا اشاریہ بنانے کا کام شروع کروا دیا اور تھوڑے عرصے میں ایک جلد مقدمے کی اور پانچ جلدیں اشاریے کی شائع کر دیں۔ وفاقی حکومت کی ایک لاکھ روپے کی ریسرچ گرانٹ سے کئی سال تک یہ کام جاری رہا۔

یہ بات بعض لوگوں کو بہت ناگوار گذری کیونکہ اس میں ان کا عمل دخل نہیں تھا، اور اس طرح سازشوں کا طویل سلسلہ شروع ہو گیا، اور بالآخر خیرات محمد ابن رسا صاحب ان سازشوں کا شکار ہو کر اس شعبے کے قاتل ثابت ہوئے۔ انھوں نے ہمیشہ کی طرح اس شعبے کے سربراہ سے پوچھے بغیر آمرانہ انداز میں نہایت بھونڈے طریقے سے اس کو بند کر دیا حالانکہ اس شعبے میں ادبی تحقیق کا مفید کام ہو رہا تھا اور یونیورسٹی ایک پیسہ بھی اس پر خرچ نہیں کر رہی تھی۔

مجھے اس کا علم اس وقت ہوا جب میں نے وائس چانسلر کو ایک نوٹ پروفیسر سید وزیر الحسن عابدی صاحب کی تنخواہ بڑھانے کے لئے لکھا۔ میں نے عابدی صاحب کا تقرر ریسرچ اسکالر کی حیثیت سے شعبہ تاریخ ادبیات میں کر لیا تھا۔ اس وقت تنخواہ ان کی صرف ہزار روپے مہینہ

مقرر ہوئی تھی، حالانکہ اُن کے شاگردوں تک کو اس شعبے میں پندرہ سولہ سو روپے مل رہے تھے عابدی صاحب نے شعبے کے لئے مفید کام کیا تھا۔ اس لئے میں نے ان کی تنخواہ بڑھا کر سولہ سو روپے کرنے کی سفارش کی، اس پر وائس چانسلر صاحب نے یہ لکھا، اب تو چند مہینے میں یہ شعبہ بند ہو رہا ہے، اس لیے عابدی صاحب کی تنخواہ میں اضافہ نہیں کیا جا سکتا۔ مجھے اس کا بہت صدمہ ہوا۔ اس لئے کہ یونیورسٹی کا اس شعبے پر ایک پیسہ بھی صرف نہیں ہو رہا تھا، وفاقی حکومت کی گرانٹ سے میں نے اس شعبے میں جان ڈالی تھی، اور عابدی صاحب نے اس کے کاموں کو تکمیل سے ہمکنار کرنے میں میرا ہاتھ بٹایا تھا اور مجھے بڑا سہارا دیا تھا۔

جب میں نے اس وقت کے سکریٹری تعلیمات ڈاکٹر قاضی صاحب کو یہ خبر سنائی تو انھوں نے حیرت زدہ ہو کر گہرے افسوس اور رنج و غم کا اظہار کیا اور کہا کہ آپ کی یونیورسٹی پاکستان کا واحد ادارہ ہے جس کے لئے حکومت ریسرچ گرانٹ دینا چاہتی ہے لیکن ارباب اختیار کہتے ہیں کہ انھیں اس کی ضرورت نہیں، اور اپنے اسکالروں کے ساتھ اس طرح کا سلوک کرتے ہیں۔

دراصل یہ سب کچھ اس منصوبے کا حصہ تھا کہ پرنسپل اورینٹل کالج جب دو تین سال بعد اپنی ملازمت کی مدّت پوری کر کے اردو کی پروفیسری اور اورینٹل کالج کی پرنسپلی سے ریٹائر ہوگا تو اس شعبے کا ڈائرکٹر بہرحال رہے گا، یہ بات خیرات صاحب کو منظور نہیں تھی۔ مجھے ان تمام باتوں کا بخوبی علم تھا۔ اس سے میں دل ہی دل میں مصحفی صاحب کا یہ شعر پڑھ کر خاموش ہو رہا ۔

وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہیں
وہ بات اُن کو بہت ناگوار گذری ہے

لیکن ممتاز علی قاضی صاحب بہت بڑے آدمی تھے۔ وہ صحیح معنوں میں پروفیسر تھے اور پروفیسروں کے معاملات و مسائل کو بخوبی سمجھتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے اس منصوبے کو ایک پروفیسر کے پرسنل پروجیکٹ کی حیثیت سے منظور کر کے ہماری گرانٹ جاری رکھی۔

میں نے اس سے فائدہ اٹھایا اور اپنے ریسرچ پروجیکٹ کو تن تنہا جاری رکھا۔

اور چند سال کے اندر اردو ادب کی تاریخ کے مختلف پہلوؤں پر کئی کتابیں شائع کر دیں۔ سب سے پہلے اردو کے باوا آدم ولیؔ اورنگ آبادی پر کام کیا، اور ایک نہایت ضخیم کتاب "ولیؔ اورنگ آبادی" کے نام سے شائع کی۔ اس کے بعد اردو کے عظیم شاعر میر تقی میرؔ پر کام کیا اور تین کتابیں "میر تقی میرؔ"، "جہانِ میرؔ" اور "نکات الشعرا" شائع کیں۔ اس کے بعد میں نے اردو فارسی کے عظیم صوفی شاعر حضرت خواجہ میر دردؒ پر کام کیا، اور تین کتابیں "حضرت خواجہ میر دردؒ — حیات اور شاعری"، "دیوانِ فارسی" اور "نالۂ درد (اردو ترجمہ)" شائع کر دیں۔ اردو تنقید پر بھی کام کیا اور اس موضوع پر دو کتابیں "ادب اور ادبی قدریں" اور "تنقید اور اصولِ تنقید" شائع کیں۔ میر حسن کی مثنوی سحر البیان پر بھی اس زمانے میں کام کیا اور "سحر البیان کا تنقیدی مطالعہ" کے نام سے ایک کتاب شائع کر دی۔ غالبؔ پر بھی کام کیا، اور "غالبؔ کا فن" اور "غالبؔ، ایک مطالعہ" کے ناموں سے دو کتابیں نہایت اہتمام سے شائع کر دیں۔ اردو ناول اور افسانے (فکشن) پر بھی کام کرتا رہا، اور اس موضوع پر ایک ضخیم کتاب "افسانہ اور افسانے کی تنقید" شائع ہو گئی۔ اس کے ساتھ ساتھ جدید اردو ادب کی اہم شخصیتوں پر بھی کام کرتا رہا اور شاعرِ انقلاب حضرت جوشؔ ملیح آبادی، علامہ نیاز فتحپوری، پروفیسر حمید احمد خاں، فیضؔ صاحب، بلونت سنگھ کی شخصیتوں پر ایک کتاب "جلوہ ہائے صد رنگ" اور بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق، حضرت جگرؔ مراد آبادی، مولانا حسرتؔ موہانی اور حضرت مولانا ابوالکلام آزاد پر ایک کتاب "رہ نوردانِ شوق" کے نام سے اور مجازؔ، میرا جی، ناصر کاظمی، محمد حسن عسکری اور صوفی غلام مصطفےٰ تبسم کی شخصیتوں پر ایک کتاب "آوارگانِ عشق" کے نام سے شائع کی۔ ان تینوں کتابوں میں اردو ادب کی ان اہم شخصیتوں پر نیا مواد تھا۔ ایک کتاب "پاکستان کے تہذیبی مسائل" پر بھی شائع کی جس میں پاکستانی تہذیب اور زبان و ادب کا مطالعہ تھا۔ بعض اہم نادر و نایاب قلمی نسخوں پر بھی کام کیا۔ اور نواب کریم خاں کا سیاحت نامہ (اردو کی پہلی ڈائری)، الٰہی بخش شوقؔ اکبر آبادی کا "فسانۂ عشق"، نواب فیض علی خاں ممتازؔ کا "ممتاز الامثال"، مظہر علی خاں ولاؔ کا "دیوانِ ولاؔ"، عبید اللہ خاں مبتلا

کا دیوان مبتلاؔ اور بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق کے خطوط کے دو مجموعے شائع کیے۔ کچھ رپورتاژ اور سفرنامے بھی اس زمانے میں لکھے اور لندن کا سفرنامہ ارضِ پاک سے دیارِ فرنگ تک جشنِ اقبالؒ۔ نئی دہلی، ترکی میں دو سال، اور دیارِ حبیب میں چند روز بھی لٹریری ہسٹری پروجیکٹ کے زیرِ اہتمام شائع ہوئے۔

اس طرح پانچ چھ سال کے عرصے میں اسلامیانِ پاکستان و ہند کی تہذیب اور اردو ادب کے مختلف پہلوؤں پر اچھا خاصا کام ہو گیا، اور مجموعی طور پر اس پروجیکٹ کی بدولت بیس بائیس کتابیں شائع ہو گئیں، اور ابھی میری جھولی میں بہت کچھ ہے، کام جاری ہے۔ ہر سال دو تین کتابیں شائع ہوتی رہیں گی، اور ان کتابوں کو سامنے رکھ کر اردو ادب کی تاریخ کو کسی دوسرے طریقے سے لکھنا ضروری ہو جائے گا۔

خدا کا شکر ہے کہ اس کام کو اردو اور پاکستان کی تہذیب و ثقافت سے دلچسپی رکھنے والوں نے پسند کیا، اور اس کام کو بین الاقوامی شہرت نصیب ہوئی۔

میں نے عمرِ عزیز کے تیس پینتیس سال پنجاب یونیورسٹی میں ایک مدرس کی حیثیت سے گزارے، پڑھاتا رہا اور قلم بھی گھستا رہا۔ ہزارہا لیکچر میں نے دیے اور ہزارہا صفحے لکھے اور دہلی، لاہور، لندن میں بے شمار تحقیقی مقالوں کی نگرانی کی۔ یہ سب کچھ کسی غیبی مدد سے ہوا۔ اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم اور بزرگانِ دین اور صوفیائے کرام کی نوازشیں اور برکتیں میرے شاملِ حال رہیں ورنہ اس قسم کے تعلیمی اور علمی کاموں کو انجام دینا میرے بس کی بات نہیں تھی۔

۳؍ اگست ۱۹۸۵ء کو پنجاب یونیورسٹی میں میری مدتِ ملازمت پوری ہو گئی اور میں اردو کے پروفیسر، شعبے کے صدر، اورینٹل کالج کے پرنسپل، سرمک اور اورینٹل لرننگ کے ڈین، اور تاریخِ ادبیاتِ مسلمانانِ پاکستان و ہند کے ڈائرکٹر کی حیثیت سے تقریباً چالیس سال کام کر کے ریٹائر ہو گیا۔

تا دستِ رسم بود زدم چاک گریباں   شرمندگی از خرقۂ پشمینہ ندارم

ریٹائر ہونے کے بعد پنجاب یونیورسٹی نے میرے ساتھ جو کچھ کیا وہ ایک بڑی ہی المناک داستان ہے، میری طبیعت پر اس کا اتنا بوجھ ہے کہ میں یہاں اس کو بیان کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

ڈیڑھ دو سال تک میری پنشن روکی گئی۔ پنشن کے حساب میں ڈنڈی ماری گئی۔ بروقت گریجویٹی ادا نہیں کی گئی۔ خدا جانے کیوں تین سو روپے مہینہ میری پنشن میں سے ہر مہینے کاٹے جاتے رہے۔ گریجویٹی میں سے دس ہزار روپے کی رقم روکی گئی اور اس طرح خورد برد ہوئی۔ یونیورسٹی نیو کیمپس کے جس مکان میں میں رہتا تھا، اس کی بجلی کاٹ دی گئی، گیس کی سپلائی بند کی گئی، پانی بھی بند کر دیا گیا، ٹیلی فون کاٹ دیا گیا۔ اورینٹل کالج کے اسٹاف روم سے میری تصویر اتاری گئی۔

اورینٹل کالج کے زمانے کی چھپی ہوئی میری کتابیں دیمک کی غذا بننے کے لئے کسمپرسی کے عالم میں ڈال دی گئیں۔ بعض کتابیں جو اورینٹل پبلیکیشنز فنڈ سے چھپی تھیں، ان کا معاوضہ ادا نہیں کیا گیا۔

اور سب سے زیادہ افسوسناک بات یہ ہوئی کہ لندن کے دوران قیام میں یورپ کے مختلف ملکوں سے جو نادر و نایاب قلمی نسخے میں نے حاصل کئے تھے، اور جن کو حاصل کرنے میں ذاتی طور پر زر کثیر صرف کیا تھا، طویل سفر کی مشقتیں اٹھائی تھیں اور جن کی ترتیب و تدوین میں اپنا لہو جلایا تھا اور جن کو شائع بھی کر دیا تھا۔ اس کا ایک پیسہ بھی مجھے ادا نہیں کیا گیا۔ کسی اور ادارے سے ان کتابوں کو چھپواتا تو لاکھوں روپے اس کا معاوضہ ملتا۔ لیکن میں نے پنجاب یونیورسٹی اور اورینٹل کالج کی طرف سے ان نادر و نایاب کتابوں کو اس لئے چھاپا کہ ان سے ان اداروں کی عزت بڑھے گی۔ ان کے وقار میں اضافہ ہوگا اور یہ احساس عام ہوگا کہ علمی دنیا میں یہ ادارے منفرد حیثیت رکھتے ہیں۔

اس سے بھی زیادہ افسوسناک بات یہ ہوئی کہ کسی نے یہ نہیں پوچھا کہ میاں چالیس سال تک اس دشت کی سیاحی کرنے کے بعد کس حال میں ہو؟ کیسی گذر رہی ہے؟ زیست کس طرح کرتے ہو؟ زندہ رہنے کے کیا کیا سہارے ہیں؟ کاروبار حیات کس طرح چلتا ہے؟ شب و روز کس طرح گذرتے ہیں؟ تم نے اتنا کام کیا ہے تمہیں ایمریٹس پروفیسر کیوں نہیں بناتے؟

جب انسانیت، تہذیب اور اخلاق معاشرے سے رخصت ہو جائے تو پھر یہی صورت

حال پیدا ہوتی ہے اور اس میں انسان سفاک، بلکہ حیوان اور درندہ ہو جاتا ہے۔ خون سفید ہونا اسی کو کہتے ہیں۔

میں ان حالات کا شکار تھا کہ ایک اور ماتمِ سخت سے مجھے دوچار ہونا پڑا۔ میرے والد صاحب ۲۳ مارچ ۱۹۸۱ء کو انتقال کر گئے۔ اُن کے رخصت ہو جانے سے میری دنیا اجڑ گئی۔ ہر طرف تاریکی کا بسیرا نظر آنے لگا۔ یوں محسوس ہونے لگا جیسے میرا جسم کاٹ دیا گیا ہے۔ میں یتیم و بے یار و مددگار ہو گیا۔ گذشتہ کئی سال سے میرا زیادہ وقت اُن کی خدمت میں گذرتا تھا اور میں شب و روز ان کی دیکھ بھال کرتا تھا۔ اب اُن کے رخصت ہو جانے سے خدمت کروانے والا کوئی نہ رہا۔ ایک مہیب اور بھیانک سا خلا پیدا ہوا اور تنہائی کے عفریت میرے آس پاس منڈلانے لگے۔

پریشانی کے اس عالم میں پنجاب یونیورسٹی اور اورینٹل کالج نے، جن کی خدمت میں میں نے عمرِ عزیز کا بہترین حصہ گذارا تھا، مجھے ایسے ایسے آزار پہنچائے جن کا خیال کر کے کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ اس لیے میں نے ان دونوں اداروں سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے قطع تعلق کر لیا۔

میرا تو اب پنجاب یونیورسٹی سے کوئی تعلق نہیں۔ سُنتا ہوں کہ وہاں اب صرف بدنظمی اور بددیانتی کی حکمرانی ہے۔ مادہ پرستی نے بدترین روپ اختیار کر لیا ہے۔ اربابِ اختیار جائدادیں بنانے میں مصروف ہیں۔ قاعدے قانون صرف میرے لیے تھے۔ اب وہاں کسی کی گریجویٹی اور پنشن نہیں روکی جاتی۔ گھروں کی بجلی اور گیس نہیں کاٹی جاتی۔ ٹیلی فون بند نہیں کیا جاتا۔ بعض لوگ کئی کئی سال سے ریٹائر ہونے کے بعد بھی، اور کسی اور ملک، اور شہر میں ملازمت کرنے اور منتقل ہونے کے باوجود بھی، یونیورسٹی کے مکانوں میں ابھی تک براجمان ہیں۔ حالانکہ اُن کی کئی کئی کوٹھیاں اسی شہر لاہور میں تعمیر ہو چکی ہیں۔

یہ حالات ہوں تو ہمیشہ کسی نہ کسی صورت میں قہرِ الٰہی نازل ہوتا ہے، اور میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ یہ قہر نازل ہو چکا ہے۔ منافقت، دورنگی، بددیانتی، ہٹ دھرمی، سفاکی، مردم آزاری، بے عملی اور بے حسی کے ہاتھوں انتشار اور افراتفری، بدنظمی اور بددیانتی کی جو فضا پیدا ہوتی ہے

وہ قہر نہیں تو اور کیا ہے؟ کوئی کل اب سیدھی نہیں رہی، اساتذہ بے عزت، اور طالب علم بے مہار ہیں۔ ان کی بغلوں میں کتابوں کی جگہ ہتھیار ہیں، انتظامیہ مفلوج ہے، ارباب اختیار خوفزدہ ہیں۔ اور ایک ایسا انتشار ہے جو زمانے کی آنکھوں نے اس سے قبل کبھی دیکھا نہیں تھا۔

ایک علمی اور تعلیمی ادارے کے لئے اس سے بڑا قہر اور کیا ہو سکتا ہے!

پندرھواں باب

انقرہ

۱۹۸۴ء میں دو سال کے لئے اردو زبان و ادب اور تاریخ و ثقافت پاکستان کے پروفیسر کی حیثیت سے میں انقرہ چلا گیا۔

انقرہ یونیورسٹی کے شعبۂ پاکستان و اردو میں ایک پاکستانی پروفیسر کی پوسٹ تھی اس کے لئے حکومت پاکستان کی نگاہِ انتخاب مجھ پر پڑی۔ پہلے تو میں نے انکار کیا، معذرت کی لیکن جب یہ معلوم ہوا کہ یہ معاملہ بہت اونچی سطح پر طے ہوا ہے تو میں مجبور ہو گیا اور پاکستان و ترکی کے برادرانہ تعلقات کے پیشِ نظر خدمت کے جذبے کے ساتھ میں نے اس کو قبول کر لیا۔

یہ فیصلہ ایوان صدر اسلام آباد میں ہوا۔

ہوا یوں کہ صدر پاکستان نے ایوانِ صدر میں ادیبوں کو کھانے کی دعوت دی تھی۔ جب عشائیہ اختتام کو پہنچا تو اس وقت کے وزیر تعلیم میرے پرانے رفیق کار اور دوست ڈاکٹر افضل اپنی جگہ سے اٹھ کر میرے پاس آئے اور کہا کہ "ہم لوگ آپ کو انقرہ بھیجنا چاہتے ہیں۔ میری اور صدر صاحب کی خواہش ہے کہ آپ چند سال انقرہ یونیورسٹی میں پروفیسر کی حیثیت سے گذاریں، یہ پاکستان، ترکی اور اردو زبان و ادب کی خدمت ہوگی۔ آپ کو منسٹر کا اسٹیٹس دیا جائے گا۔"

میں نے کہا "چونکہ آپ لوگوں کی یہ خواہش ہے اس لئے میں اس کو قبول کرتا ہوں۔ جب بھی حکومت کی طرف سے مناسب کارروائی ہو جائے گی، میں انقرہ چلا جاؤں گا۔"

چند روز میں یہ کارروائی مکمل ہو گئی، اور میں اپریل کے مہینے میں انقرہ روانہ ہو گیا، پاکستانی

سفارت خانے اور انقرہ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو اور ثقافت پاکستان کے پروفیسروں اور طالب علموں نے انقرہ کے ہوائی اڈے پر شعبے کے ایک استاد ڈاکٹر شوکت بولو کی سرکردگی میں میرا استقبال کیا۔ یہ لوگ ہوائی اڈے سے مجھے سیدھے انقرہ یونیورسٹی کے گیسٹ ہاؤس لے گئے، جہاں یونیورسٹی کی طرف سے میرے قیام کا انتظام تھا۔

دوسرے ہی دن سے میں نے شعبے میں کام شروع کر دیا۔ اس وقت میرے ساتھ شعبے میں صرف ایک استاد ڈاکٹر شوکت بولو تھے۔ اس کے علاوہ ایک ہماری شاگرد سلمیٰ تھی جو دفتر کا سارا کام کرتی تھی اور ابتدائی جماعتوں کو پڑھانے کا کچھ کام بھی اس کے سپرد تھا۔ طالب علموں کی تعداد کو دیکھتے ہوئے یہ اسٹاف نہ ہونے کے برابر تھا۔ طالب علم ایک ہزار کے قریب تھے۔ سات سو تو ذیلی مضمون کی حیثیت سے پاکستان کی تہذیب و ثقافت پڑھتے تھے، اور تین سو کے قریب اردو زبان و ادب کا مطالعہ کرتے تھے۔ زیادہ کام پروفیسر کی حیثیت سے مجھے اور ڈاکٹر شوکت کو کرنا پڑتا تھا۔

ڈاکٹر شوکت بڑے محنتی استاد تھے۔ فصیح اردو بولتے تھے اور پاکستان کی تاریخ و تہذیب کا انھوں نے گہرا مطالعہ کیا تھا۔ پاکستان کے شیدائی بھی تھے۔ اس لئے انھوں نے شعبے میں پاکستان اور اردو زبان و ادب سے دلچسپی کا صحیح ماحول پیدا کر دیا تھا۔

میں نے شعبے کی تنظیم نو کے سلسلے میں سب سے پہلے تو یہ ضروری خیال کیا کہ ڈاکٹر شوکت بولو کو یاردم ڈاکٹر یعنی لکچرار سے ترقی دے کر دوچنت ڈاکٹر یعنی ایسوسی ایٹ پروفیسر بنا دیا جائے۔ چنانچہ بہت تھوڑے عرصے میں وہ میری سفارش پر ایسوسی ایٹ پروفیسر بنا دیئے گئے۔ سلمیٰ کو لکچرار بنا دیا گیا، اور ایک اور شاگرد گلسیرین کو ریسرچ اسکالر مقرر کیا گیا۔ اس طرح شعبے میں اب چار استاد ہو گئے۔ ایک پروفیسر، ایک ایسوسی ایٹ پروفیسر اور دو لکچرار۔ اس طرح تدریس کا کام بخوبی چلنے لگا۔ اگلے تعلیمی سیشن سے پوسٹ گریجویٹ جماعتیں بھی کھل گئیں، اور تحقیق کا کام بھی باقاعدگی سے ہونے لگا۔

ڈاکٹر شوکت بولو بہت اچھے رفیق کار ثابت ہوئے۔ انھوں نے نہ صرف شعبے کے کاموں میں

میرا ہاتھ بٹایا بلکہ انقرہ کے دوران قیام میں ہمیشہ میرا خیال رکھا، ہر مسئلے کو حل کیا اور ذاتی معاملات میں بھی ہر سطح پر میری مدد کی۔ میرے پاس گیسٹ ہاؤس میں بیسیوں دفعہ آئے۔ مجھے انقرہ میں اور انقرہ سے باہر جگہ جگہ لئے پھرے، سیر کرائی اور قسم قسم کے ترکی کھانے کھلائے۔

میں جب بھی صبح شعبے میں پہنچتا، اور ان سے ملاقات ہوتی تو ہمیشہ کہتے "کوئی حکم؟"

میں کہتا، "شوکت صاحب! چائے پلایئے:

اور وہ شعبے کے چپراسی نوزاد کو بلا کر کہتے "نوزاد چائے!"

یہ سن کر نوزاد چائے لے آتا اور ہم ترکی چائے سے اپنے آپ کو گرم کرتے اور مختلف موضوعات پر دلچسپ باتیں کرتے۔

انھوں نے مجھے پہلے ہی دن مشرقی علوم کے شعبوں کی صدر اور فارسی کی پروفیسر ڈاکٹر ملیحہ خانم سے ملایا اور فیکلٹی کے ڈین پروفیسر ڈاکٹر محمد اونس عارق اور یونیورسٹی کے ریکٹر پروفیسر ڈاکٹر طارق سومر سے میری ملاقات کرائی۔

ملیحہ خانم نے بڑی محبت اور شفقت کا اظہار فرمایا، اور ذاتی طور پر اپنی نگرانی میں میرا کمرہ ٹھیک کروایا، نیا فرنیچر اس میں رکھوایا، اور دیر تک مجھ سے پاکستان اور ترکی کے بارے میں باتیں کیں۔

فیکلٹی کے ڈین محمد اونس عارق صاحب نے بھی خوش آمدید کہا اور مجھ سے دیر تک مختلف موضوعات پر باتیں کرتے رہے۔ ان کی ایک ایک بات سے محبت اور شفقت ٹپکتی تھی۔

ڈاکٹر طارق سومر یونیورسٹی کے ریکٹر بھی بڑے خلوص سے ملے اور نہ صرف ایک گھنٹے تک باتیں کیں بلکہ اپنے ساتھ تصویروں کی ایک نمائش میں بھی لے گئے۔ ان سے مل کر اور باتیں کر کے بہت لطف آیا۔

شعبے میں طالب علموں کی تعداد زیادہ ہونے کی وجہ سے پڑھانے کا کام زیادہ تھا۔ زیادہ کام شوکت صاحب نے اپنے ذمے لیا، اور کوشش کی کہ مجھے پڑھانے کا کام زیادہ نہ کرنا پڑے، لیکن

میں نے خود پڑھانے کا کام اس لئے زیادہ کیا کہ ترک طالب علموں کو پاکستان اور اردو زبان و
سے زیادہ دلچسپی پیدا ہو — ابتدائی جماعتوں کے بھی ہفتے میں دو دو تین گھنٹے اپنے پاس رکھے اور اس
نتیجہ بہت اچھا ہوا چند ہفتوں میں طالب علم پاکستان اور اُردو کے شیدائی ہو گئے۔ اردو میں باتیں کرنے کی کوشش کرنے لگے "گن آیدین" اور "گلے گلے" کی جگہ السلام علیکم اور خدا حافظ کہنے لگے، اور اس طرح ہمارے شعبے میں پاکستان کا ماحول پیدا ہو گیا۔

یہ میرے لئے ظاہر ہے کہ بڑی خوشی کی بات تھی۔ کیونکہ میرے خیال میں پاکستانی پروفیسر کو یہاں بھیجنے کا یہی مقصد تھا۔ بہت تھوڑے عرصے میں یہ مقصد پورا ہو گیا۔

ترکی سیکولر جمہوریہ ہے۔ اس لئے مذہبی معاملات میں لوگ زیادہ دلچسپی نہیں لیتے لیکن میں نے انقرہ کے دوران قیام میں یہ دیکھا کہ ترکوں کی رگوں میں مسلمانوں کا خون ہے، اور وہ اچھے مسلمان ہیں بعض لوگ تو خاصے مذہبی ہیں۔ مسجدیں نمازیوں سے بھری رہتی ہیں — لوگ پارکوں میں بھی نماز پڑھتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ رمضان کے زمانے میں تراویح بڑے شوق اور خشوع و خضوع کے ساتھ پڑھتے ہیں۔ خواتین کا بھی اس موقع پر مسجدوں میں خاصا مجمع ہوتا ہے۔ اذان تو پانچوں وقت بڑے اہتمام سے ہوتی ہے۔ اور انتظام ایسا ہے کہ ہر جگہ یہ آواز سنائی دیتی ہے۔ ٹیلی وژن اور ریڈیو پر گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹے کے لئے دینی پروگرام بھی ہوتا ہے پہلے کلام پاک کی تلاوت ہوتی ہے، اس کے بعد دینی مسائل بیان کئے جاتے ہیں۔

میں نے سوچا اس ماحول سے فائدہ اٹھانا چاہیئے، چنانچہ میں نے جو سبق مختلف جماعتوں کے طالب علموں کے لئے لکھے اُن میں دینی موضوعات کو خاص طور پر اپنے پیش نظر رکھا۔ ان میں طالب علموں نے گہری دلچسپی لی، اور چند مہینے میں وہ دین اسلام کے بنیادی معاملات سے پوری طرح آشنا ہو گئے۔ قرآن مجید کا ترکی ترجمہ پڑھنے لگے اور جب بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نام لکھا ہوا دیکھتے تو اس کے ساتھ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بالالتزام کہتے۔ میں نے انھیں کلام پاک کی کچھ سورتیں بھی یاد کروا دیں، درود شریف بھی سکھ دی، فاتحہ پڑھنے کا طریقہ بھی بتا دیا۔

ان تمام باتوں کا اچھا اثر ہوا، اور طالب علم دینی معاملات میں خاصی دلچسپی لینے لگے۔ اس کے علاوہ پاکستان اور ترکی کے تعلقات پر بھی میں نے کئی سبق ان کے لئے لکھے، ور انھیں یہ احساس دلایا ترکی اور پاکستان کے برادرانہ تعلقات کی تاریخ بہت پرانی ہے۔ جب ترکی جنگ بلقان میں دشمنوں سے لڑ رہا تھا تو برعظیم پاکستان و ہند کے مسلمانوں نے کس کس طرح اُن کا ساتھ دیا۔ یہاں کے مسلمان ترکوں کے شانہ بشانہ لڑنے کے لیے بھی گئے۔ پھر پہلی جنگ میں جب ترکی نے جرمنوں کا ساتھ دیا، اور انگریزوں کے مقابلے میں جرمنی کو شکست کھانی پڑی تو یہاں کے مسلمانوں نے ترکی کے لیے نہ جانے کیا کیا کچھ کیا۔ سرسید احمد خاں اور ان کے ساتھیوں نے ترکوں کی حمایت میں مضامین لکھے ور بہت سی غلط فہمیوں کا ازالہ کیا جس کی وجہ سے انگریزوں کی دشمنی خاصی حد تک کم ہوئی۔ ور پھر خلافت کی تحریک کے زمانے میں ترکوں سے محبت کا یہ عالم ہوا کہ ہر طرف ترکی کے حق میں تحریک چلنے لگی۔ ترکوں کے لئے یہاں کی عورتوں نے اپنے زیور تک دے دیئے، ور اب قیام پاکستان کے بعد ترکی اور پاکستان ایک دوسرے کے اتنے قریب آگئے کہ دنیا کے کوئی دو ملک آپس میں اتنے قریب نہیں۔ ان دونوں میں اتنی محبت ہے کہ یہ ایک ہی ملت کے دو حصے معلوم ہوتے ہیں۔

میں نے ترک طالب علموں کو اس نہج پر ترک پاکستان دوستی کی تاریخ پڑھائی۔ اُن کے اس موضوع پر خاص طور پر سبق لکھے چنانچہ ترک طلبا و طالبات کے دلوں میں ایک ولولہ تازہ پیدا ہوا اور روز بروز وہ پاکستان کے زیادہ سے زیادہ شیدائی اور دلدادہ ہوتے گئے۔ دیکھتے دیکھتے انقرہ یونیورسٹی کا شعبۂ اردو و مطالعۂ پاکستان ایک ایسا مرکز بن گیا جہاں پاکستان اور ترکی میں کوئی فرق باقی نہ رہا اور ترک طالب علم اپنے آپ کو پاکستانی کہنے میں فخر محسوس کرنے لگے۔

اس فضا میں ترک طالب علموں نے پاکستان کی ہر چیز سے والہانہ دلچسپی کا اظہار کیا، پاکستان کی تاریخ، تہذیب، معاشرت، ادب، شاعری اور نثر نگاری، سب کا مطالعہ انھوں نے باقاعدگی سے شروع کیا۔ اور ان میں ایسی دلچسپی پیدا کی کہ پاکستان جانے اور اس کی زندگی کے ہر پہلو کو دیکھنے کے خیالات کی اُن کے دلوں میں لہریں اُٹھنے لگیں۔

میں نے اس سلسلے میں پاکستان کے سفیر صاحب سے بات کی، حکومت پاکستان کو بھی لکھا، یونائیٹڈ نیشنز کے ڈائرکٹر متعینہ انقرہ سرفراز خاں ملک صاحب کو بھی اس کی طرف متوجہ کیا۔ چنانچہ انھوں نے چار ترک طالب علموں کو دو مہینے کے لئے پاکستان بھیجنے کا منصوبہ منظور کیا، اور اس سلسلے میں گرانٹ کی خاصی رقم یو۔ این۔ او کے مرکزی دفتر سے حاصل کی۔ حکومت پاکستان نے بھی اس سلسلے میں اپنے تعاون کا یقین دلایا۔ لیکن بعض حالات کی وجہ سے اس منصوبے کو ابھی تک عملی شکل نہیں دی جا سکی۔

ترکی میں مجھے بہت کام کرنا پڑا۔ اردو کی انڈر گریجویٹ جماعتوں کے ساتھ ساتھ پوسٹ گریجویٹ جماعتیں بھی یونیورسٹی میں کھول دی گئیں اور ریسرچ کے کام کا بھی باقاعدگی سے آغاز ہوا۔ اس سارے کام کا بوجھ مجھ پر پڑا۔ لیکن میں نے خوشی سے ترکی اور پاکستان کی خدمت سمجھ کر یہ بوجھ اٹھایا۔ پڑھانے کا اتنا کام میں نے اس سے قبل کبھی نہیں کیا تھا۔ لیکن مجھے یہ کام کر کے خوشی ہوئی ؎

حاصل عمر نثار رہ یارے کردم
شادم از زندگی خویش کہ کارے کردم

میں کوئی ڈھائی پونے تین سال ترکی میں رہا، اور اس طرح مجھے ترکی کو بہت قریب سے دیکھنے کے مواقع ملے۔ زیادہ وقت تو میں نے انقرہ میں گزارا۔ لیکن ترکی کے بعض دوسرے شہر قونیا، ادنان، اسکندرون، انطاکیہ، استنبول اور کاستومونو بھی دیکھے۔ ان شہروں میں بہت سی قدیم تہذیبوں کے مزار ہیں اور اسلام کی تاریخ تو چپے چپے پر لکھی ہوئی ہے۔

مولانا جلال الدین رومیؒ کا عشق مجھے کئی بار ان کے شہر قونیا لے گیا۔ میں نے ان کے مزار مبارک کی زیارت کی، فاتحہ پڑھی اور کئی بار اس مقدس مقام کا طواف کیا۔ مزار سے متصل سلطان سلیم کی مسجد میں نمازیں پڑھیں، اور مولانا کے عرس مبارک کے موقع پر ان کے درویشوں کا والہانہ رقص بھی دیکھا۔ مولانا کے محبوب شمس تبریزؒ کے مزار پر حاضری بھی دی۔ شہر کی سیر بھی کی، تاریخی مقامات بھی دیکھے اور عثمان کے مشہور قونیا کباب بھی کھائے۔ بہت لطف آیا، اور ایک عجیب طرح کی

روحانی مسرت حاصل ہوئی۔

استنبول کا تاریخی شہر بھی دیکھا، علامہ اقبالؒ نے اس شہر بے مثال کو اسلام کا دل کہا ہے۔ یہاں حضرت ایوبؓ انصاریؓ کا مزار ہے۔ بے شمار مسجدیں ہیں، محل ہیں اور ان کے علاوہ مسلمانوں کے بے شمار تاریخی آثار ہیں۔ میں نے ان سب کو دیکھنے میں خاصا وقت گذارا۔ ٹوپ کاپی، دولما باغچے، سلطان احمدؒ جامع مسجد، شاہ سلیمان، نیلی مسجد، اور ان کے علاوہ تمام مسجدوں کو دیکھا مارمارا، باسفورس اور بلیک سی کی بھی سیر کی۔ کئی دفعہ اس شہر میں گیا اور اس کے تاریخی آثار کو دیکھ کر اپنے آپ کو ایک روحانی مسرت سے سرشار کیا۔

ترکی کا قدیم شہر کاستومونو انقرہ سے خاصے فاصلے پر ہے۔ سر بہ فلک پہاڑوں اور دشوار گزار راہوں میں سے ہو کر وہاں جانا پڑتا ہے۔ یہ شہر بھی مسلمانوں کی عظمتِ رفتہ کی یادگار ہے۔ یہاں قلعہ ہے، بزرگانِ دین اور صوفیائے کرام کے مزار ہیں۔ میں نے یہاں کا قدیم قلعہ دیکھا جو ایک اونچی پہاڑی پر واقع ہے، اور جہاں سے روس کی روشنیاں صاف نظر آتی ہیں۔ یہ شہر روسی سرحد کے بہت قریب واقع ہے۔ پھر حضرت عاشق ولیؒ اور حضرت شعبان ولیؒ کے مزاروں پر حاضری دی، فاتحہ پڑھی اور اپنے ایمان کو تازہ کیا۔ یہ مزار چھ سات سو سال پرانے ہیں۔ حضرت عاشق ولیؒ کے مزار کو دیکھا۔ اس مزار میں بزرگ کے پیر باہر نکلے ہوئے اور صحیح سالم نظر آتے ہیں۔ کستومونو کے گورنر نے بتایا کہ یہاں آگ لگ گئی تھی، اس وقت سے یہ پیر باہر دکھائی دینے لگے ہیں۔ ہم نے اس پر شیشے کا بکس بنا کر لگا دیا تاکہ لوگ اس کی زیارت کر سکیں۔ یہ سب کچھ دیکھ کر اس بات کا یقین ہو گیا کہ اللہ والے لوگ اپنی قبروں میں زندہ ہیں۔ حضرت شعبان ولیؒ کے مزار پر بھی حاضری دی اور فاتحہ پڑھی۔

یوں تو ترکی میں ہر جگہ لوگ پاکستان کے عاشق ہیں لیکن اس شہر میں پاکستان کے ساتھ جو محبت دیکھی وہ کہیں اور نظر نہیں آئی۔

انقرہ کے دوران قیام میں مجھے ترکی کے ایک ایک شہر اور ایک ایک گاؤں کو دیکھنے کا

موضوع تھا اور مجھے ترکی کی ہر چیز میں حسن ہی حسن دکھائی دیا۔ ہر جگہ پاکستان کے ساتھ والہانہ محبت کے دریا موج زن نظر آئے۔

ترکوں کو عظیم اتاترک غازی مصطفےٰ کمال پاشا نے ایک زندہ قوم بنایا، اور ان کو اخوت، محبت، انسانیت، شرافت اور فراست کی خصوصیات سے مالا مال کیا۔ یہاں مردوں اور عورتوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ دونوں ایک دوسرے کا احترام کرتے ہیں اور دونوں کو ترک معاشرے میں برابری کا درجہ حاصل ہے۔ اتاترک نے عورتوں کو آزاد کیا اور معاشرے میں ایک بلند مقام دیا۔ عورتیں یہاں کی حسین اور طرحدار ہیں لیکن کوئی ان کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتا۔ ہر مرد ان کا احترام کرتا ہے۔

تقریباً تین سال میں نے انقرہ میں گذارے اور یہاں مجھے بزرگوں کی شفقت اور نوجوانوں کی ایسی محبت نصیب ہوئی جو دنیا میں کہیں اور نصیب نہ ہو سکی۔ ایک لمحے کو بھی مجھے یہ احساس نہیں ہوا کہ میں کسی غیر ملک میں ہوں' اور ترکوں کے بقول 'یابنجی' (یعنی اجنبی) ہوں۔ برخلاف اس کے ہر شخص نے مجھے 'کاردیش' (یعنی بھائی) سمجھا، اور مجھے ہمیشہ 'کاردیش' ہی کہہ کر پکارا۔ ترک طالب علموں نے میری بڑی عزت کی۔ لڑکے لڑکیاں 'ہوجا' (یعنی استاد) کہہ کر ترکی کے خاص طریقے سے میرے ہاتھ چومتے تھے، اور اپنی عقیدت اور محبت کا اظہار کرتے تھے۔

ترکی کا قیام بھی میری زندگی کا بہترین زمانہ تھا۔

میں نے ترکی کے قیام کی روداد ایک سفرنامے کی صورت میں لکھی ہے جو 'ترکی میں دو سال' کے نام سے شائع ہو چکی ہے۔ یہ سفرنامہ کیا ہے ترکی سے میرے تعلق کی ایک حکایت جذبِ شوق ہے۔ جدید ترکی کے بارے میں یہ واحد کتاب ہے جس سے ترکی اور پاکستان کے برادرانہ تعلقات سے صحیح طور پر آشنا ہونے کا موقع ملتا ہے۔ یہ میرے ذاتی تجربات و مشاہدات کی ایک دلآویز کہانی ہے لیکن اس کا دائرہ زیادہ وسیع ہے کیونکہ اس سے ترکی کی تاریخ، تہذیب و ثقافت، تعلیمی نظام اور پاکستان سے اس کی والہانہ محبت کی تصویریں آنکھوں کے سامنے آتی ہیں۔ اور اس

حقیقت کا علم بھی ہوتا ہے کہ ایک پاکستانی کے لئے ترکی کے قیام کی برکتیں بے شمار ہیں۔

یہ ترکی کے قیام ہی کی برکت تھی کہ مجھے دیارِ حبیب صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم میں آجانے اور عمرہ کرنے کا موقع ملا گذشتہ سال رمضان المبارک کے مہینے میں میں اپنی اہلیہ کے ساتھ وہاں گیا۔

ہم لوگ انقرہ سے استنبول ہوتے ہوئے جدہ پہنچے، وہاں سے مکہ مکرمہ گئے۔ عمرہ کیا، تاریخی مقامات کی زیارت کی پھر مدینہ منورہ گئے۔ مسجد نبویؐ میں نمازیں پڑھیں، روضۂ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر حاضری دی، سبز گنبد کا نظارہ کیا، مقدس مقامات کی زیارت کی اور اس طرح کئی دن دیارِ حبیب میں گذار کر اور اپنے سینوں کو ایک روحانی کیف و سرور سے منور کر کے جدہ ہوتے ہوئے وطن واپس آئے۔

اس سفر کی تفصیل بھی میں نے ایک عالم جذب و شوق میں لکھ کر "دیارِ حبیب میں چند روز" کے نام سے کتابی صورت میں شائع کر دی ہے۔ ایمان والوں کے لئے اس میں روحانی کیف و سرور، و مسرت و انبساط کا خاصا سامان ہے کیونکہ اس کو بھی عشقِ رسولؐ سے سرشار ہو کر ایک عالم جذب و شوق میں انتہائی عقیدت اور احترام کے ساتھ قلم بند کیا گیا ہے۔

یہ واحد سفرنامہ ہے جس کے مطالعے سے سعودی عرب کے حالات، خصوصاً جدہ، مکہ مکرمہ، خانہ کعبہ اور مدینہ منورہ کی ان گنت تصویریں آنکھوں کے سامنے آجاتی ہیں، اور پڑھنے والے کو نہ صرف ان مقاماتِ مقدسہ کے حالات سے آشنا کرتی ہیں بلکہ جذب و شوق کی بدولت ان روحانی کیفیات کا نقشہ بھی آنکھوں میں پھر جاتا ہے جو ان مقدس مقامات میں ایمان والوں پر طاری ہوتی ہیں۔

ترکی میں جو ڈھائی تین سال میں نے گذارے، اور مجھے وہاں جو تجربات ہوئے، ان سب کی حسین یادوں کا جھرمٹ میری زندگی کا ایک حصہ بن گیا ہے، اور ہر لمحہ ان حسین یادوں کی جلوہ سامانیاں میرے حواس پر ایک سرخوشی کی کیفیت کو طاری کر کے زندگی کو دامانِ باغباں و کفِ گل فروش بنانے میں مصروفِ کار رہتی ہیں۔

اور یہ کہتی ہوئی سنائی دیتی ہیں کہ ترکی تو ایک بت ہزار شیوہ ہے۔

سولہواں باب

تجربات و تاثرات

آج کل میں شہر لاہور میں گوشہ نشینی اور تنہائی کی زندگی بسر کر رہا ہوں!

عہد رفتہ کو یاد کرنا، بیتے ہوئے دنوں کی یادوں سے اپنے دل میں شمعیں سی فروزاں کرنا، گذرے ہوئے حسین لمحوں کو یاد کرکے اپنے آس پاس دیئے سے جلانا، حال کے بارے میں سوچنا اور غور و فکر کرنا، اور مستقبل کے بارے میں مختلف منصوبوں کے ان گنت رنگ محل تعمیر کرنا، آج کل میرا مشغلہ ہے۔

ہر وقت ان خیالات کے بادل سے چھائے رہتے ہیں کہ وقت کتنی جلدی گذرتا ہے۔ عمر عزیز کے ساٹھ سال گذر گئے۔ کل کی بات معلوم ہوتی ہے کہ میرا بچپن تھا، میں اپنے والدین کے سائے میں زندکی الجھنوں سے بے خبر اپنی زندگی کے خوبصورت ترین دن گزارتا تھا کہ دیکھتے دیکھتے یہ وقت گذر گیا۔ بچپن ماضی کے دھندلکوں میں گم ہو گیا۔ عنفوانِ شباب کا زمانہ آ گیا۔ سکول اور کالج اور یونیورسٹی میں کئی سال گذارے، تعلیم مکمل کی پھر تلاشِ معاش میں سرگرداں رہا۔ بالآخر ملازمت ملی کالجوں اور یونیورسٹیوں میں چالیس سال تک تدریس کے کام میں مصروف رہا، قلم بھی گھستا رہا، علمی ادبی کام بھی کرتا رہا۔ ہزارہا صفحے لکھے، سو کے قریب کتابیں لکھ کر شائع کیں۔ تھوڑی بہت شہرت بھی نصیب ہوئی۔

اور اب زندگی کی وہ منزل آ گئی جب انسان کے قویٰ مضمحل ہونے لگتے ہیں۔ عناصر میں اعتدال باقی نہیں رہتا۔ مہیب تاریکیاں نظر آنے لگتی ہیں۔ ان تاریکیوں میں بھٹکنے کے سوا کوئی چارہ نظر

نہیں آتا، وقت کو کون روک سکتا ہے؟ زمانے کی رفتار کس کی گرفت میں آسکتی ہے؟ قوتِ فرصت ہستی کے غم سے کون نجات حاصل کرسکتا ہے۔ یہ تو انسان کا مقدر ہے! اور زندگی کا قانون۔ بقول غالب

رو میں ہے رخشِ عمر کہاں دیکھیے تھمے
نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں (غالب)

آس پاس، اور گرد و پیش کے حالات سازگار ہوں تو انسان اس سنگین حقیقت کے "تلخ" گھونٹ بھی پی سکتا ہے، انسانی زندگی کے اس المیے کو بھی خندہ پیشانی سے برداشت کرسکتا ہے لیکن اگر خارجی حالات معمول کے مطابق نہ ہوں تو زندگی اجیرن ہو جاتی ہے اور ایک عذاب معلوم ہونے لگتی ہے۔

اس عالم میں انسان اپنے آپ کو کچھ زیادہ ہی مجبور و معذور محسوس کرتا ہے۔ پوری انسانی زندگی اسے ایک المیہ بن کر قیدِ تنہائی اور کنجِ قفس کی پرآشوب فضاؤں کا روپ اختیار کرکے ہر لمحہ اسے کچوکے سے لگاتی ہے اور وہ اس کنجِ قفس اور قیدِ تنہائی کی سی پرآشوب فضاؤں میں اپنے آپ کو پابہ زنجیر اور لہولہان محسوس کرتا ہے۔

میں اکثر یہ سوچتا ہوں کہ یہ معاشرہ اور ماحول جس میں آج کل ہم سب زندگی کے دن گزار رہے ہیں، وہ کنجِ قفس اور قیدِ تنہائی سے کسی طرح کم نہیں ہے بلکہ اس سے بھی کچھ زیادہ ہے۔

یہاں زباں بندی ہے، پابہ زنجیر ہونے والی کیفیت ہے۔ فکر و خیال کو یہاں بیڑیاں پہنادی گئی ہیں۔ صداقت یہاں پابند سلاسل ہے۔ اظہارِ رائے پر یہاں پہرے ہیں نتیجہ یہ ہے کہ سچائی اور بے باکی کا یہاں گلا گھونٹ دیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ ان حالات میں زمانہ سازی اور مصلحت اندیشی ہی کو فروغ حاصل ہوسکتا ہے۔ خوشامد اور منافقت ہی پروان چڑھ سکتی ہے۔ ڈر اور خوف ہی پنپ سکتے ہیں۔ بزدلی اور سفاکی، بے اعتنائی اور بے حسی ہی کا راج ہوسکتا ہے۔

اس صورتِ حال نے، ان قدروں کو جو کبھی ہمارا طرۂ امتیاز تھیں خاک میں ملا دیا ہے معیاروں کو ملیامیٹ کردیا ہے نتیجہ یہ ہے کہ ہر طرف افراتفری اور انتشار ہے۔ ہر چیز اپنی حد سے ہٹی ہوئی سی

معلوم ہوتی ہے۔ ہر شخص کے کئی کئی چہرے ہیں۔ کسی کو صحیح طور پر پہچاننا اور شناخت کرنا مشکل بلکہ ناممکن ہے۔ اخلاق خراب وخیال ہو گیا ہے۔ انسانیت اور شرافت، نیکی اور محبت ایک داستانِ پارینہ بن چکی ہے۔

یہ صورت حال حکومت ہی کی پیدا کردہ نہیں ہے۔ سارا معاشرہ اس کا ذمہ دار ہے۔ حکومت بھی تو معاشرے ہی کی عکاس اور ترجمان ہوتی ہے۔ معاشرے ہی سے اس کا تعلق ہوتا ہے۔ معاشرہ ناقص ہو جائے تو حکومت کیا زندگی کا کوئی شعبہ بھی اس سے دامن نہیں بچا سکتا۔ اس حمام میں سب ننگے ہو جاتے ہیں۔

آج کل ہمارے آس پاس یہی صورت حال ہے۔ جو لوگ اس صورت حال کے ساتھ مطابقت پیدا نہیں کر سکتے، اُن کے لیے یہ ماحول کنجِ قفس سے بھی زیادہ اذیت ناک ہے۔ ایک پڑھنے لکھنے والے انسان کے لئے اس اذیت سے بچنے کا ایک ہی طریقہ ہے اور وہ گوشہ نشینی اور تنہائی ہے۔ اس گوشہ نشینی اور تنہائی کی برکتیں بے شمار ہیں۔ سب سے بڑی برکت یہ ہے کہ باکردار انسان اپنے آپ کو ان کثافتوں میں آلودہ نہیں کرتا جو اس کے آس پاس بکھری ہوئی ہیں اور جن کے تعفن سے دماغ پھٹا جاتا ہے۔

گوشہ نشینی اور تنہائی میں یوں بھی بڑی خوبیاں ہیں۔ اس عالم میں انسان اپنے آپ کو محفوظ پاتا ہے۔ یہ بڑی ہی خوبصورت چیز ہے۔ اس کے حسن کا کوئی جواب نہیں۔ اس عالم میں انسان اپنے آپ کو پا سکتا ہے، اپنی ذات سے صحیح طور پر آشنا ہو سکتا ہے۔ عرفانِ ذات اور عرفانِ حیات کی دولت بیش بہا سے مالا مال ہو سکتا ہے۔ اپنے آس پاس اور گرد و پیش کا صحیح طور پہ نظارہ کر سکتا ہے۔ حالات کے نشیب و فراز پر غور و فکر بھی کر سکتا ہے۔ ان کے مد و جزر کو سمجھ بھی سکتا ہے۔

اسی لئے تو ورڈسورتھ (WORDS WORTH) نے اس کو "BLISS OF SOLITUDE" کہا ہے۔ اور میر حسن نے تو اس کی تعریف میں قلم توڑ دیا ہے۔ کیا خوب کہا ہے ؎

ذوقِ تنہائی میں خلل ڈالا
آ کے مجھ پاس اک گھڑی تو نے

یہ ذوقِ تنہائی اور گوشہ نشینی بچپن سے میرا مزاج ہے۔ طبعاً میں ہمیشہ سے کم آمیز تھا، بڑی مشکل سے کھلتا تھا، زیادہ لوگوں سے ملنے جلنے سے ہمیشہ مجھے الجھن سی ہوتی تھی۔ بزم آرائیاں مجھے آتی ہی نہیں تھیں اور جو تھوڑی بہت انجمن آرائیاں زندگی میں تھیں، وہ سب کی سب نقش و نگارِ طاقِ نسیاں ہو چکی ہیں۔ چند دوست تھے۔ وہ اب کاروبارِ حیات کے خارزاروں میں اس طرح الجھے ہوئے ہیں کہ انھیں خود اپنی بھی خبر نہیں۔ نئے دوست بنانا تو میرے لیے جوئے شیر کا لانا ہے۔

میرا مشغلہ آج کل اس عالمِ گوشہ نشینی اور تنہائی میں اپنے بکھرے ہوئے ادبی کاموں کو سمیٹنا ہے۔ صبح سے شام تک میں ان کاموں کی تشکیل و تکمیل میں وقت گزارتا ہوں۔ میری بہترین رفیق میری کتابیں ہیں اور کاغذات ہیں جن کی دیرینہ رفاقت نے مجھے دنیا کی رنگا رنگ بزم آرائیوں کے ہنگاموں سے بے نیاز کر دیا ہے۔ کام میں وقت گذر جاتا ہے اور اچھا گذرتا ہے۔ اس لیے اب مجھے انجمن آرائی کی ضرورت ہی باقی نہیں رہی۔ اب تو چاند ستاروں کے جمالِ جہاں آرا سے لطف اندوز ہونا، درختوں کے حُسن کو دیکھنا، پھولوں کی دلکشی اور دل آویزی کا نظارہ کر کے مسرت حاصل کرنا میری انجمن آرائی ہے۔

قیامِ لندن کے زمانے میں آکسفورڈ یونیورسٹی میں میرے ایک ہمعصر پروفیسر اسٹوری PROFESSOR STORY تھے۔ انھوں نے اپنی مصروفیت کے باعث لوگوں سے ملنا جلنا چھوڑ دیا تھا۔ شب و روز اپنے علمی کاموں میں مصروف رہتے تھے، اور مناظرِ فطرت سے لطف اندوز ہوتے تھے۔ ان کے پاس اتنا وقت ہی کہاں تھا کہ وہ لوگوں سے ملتے جلتے۔ کم و بیش انھیں کے نقشِ قدم پر آج میں بھی گامزن ہوں۔

شاگرد ہمیشہ سے میری کمزوری رہے ہیں۔ وہ آ جائیں تو میں اُن سے خندہ پیشانی کے ساتھ ملتا ہوں۔ اُن کی خاطر تواضع بھی کرتا ہوں۔ اُن کے مسائل بھی سنتا ہوں، اور ان کی جو خدمت بھی

مجھ سے ہو سکتی ہے، وہ بھی کرتا ہوں۔ کیونکہ خدمت سے بڑھ کر کارِ خیر میرے خیال میں، اور کوئی نہیں۔ عمرِ عزیز کے چالیس سال میں نے اپنے طالب علموں کے ساتھ انجمن آرائی میں گزارے ہیں۔ میں اُن سے باتیں کرتا رہا ہوں۔ ہزارہا طالب علم لڑکے لڑکیاں، میرے ساتھ ان باتوں میں شریک رہے ہیں۔ باتوں ہی کے ذریعے سے میں اپنے مافی الضمیر، اپنے خیالات و نظریات اور اپنے محدود علم و شعور کو ان کے سینوں میں اتارتا رہا ہوں۔ استاد صرف باتیں ہی تو کرتا ہے۔ سقراط صرف باتیں ہی کیا کرتا تھا۔

میری زندگی ایک طالب علم اور ایک معلّم کی زندگی رہی ہے۔ ہزاروں طالب علموں کو میں نے نہ صرف پڑھایا ہے بلکہ اُن کے کردار اور شخصیت کی تعمیر و تشکیل بھی کی ہے۔ ان میں بڑے بڑے جن بھی تھے جن کو میں نے شیشے میں اتارا، اور دیکھتے ہی دیکھتے یہ جن اچھے طالب علم اور اچھے انسان بن گئے۔

ہماری بدقسمتی یہ ہے کہ ہمارے ہاں استاد صرف چند کتابیں پڑھا دینے ہی کو کافی سمجھتے ہیں۔ حالانکہ استاد کا منصب اس سے بہت زیادہ بلند ہے۔ اس کا منصب تو کردار کی تعمیر اور شخصیت کی تشکیل و تکمیل ہے۔ یہ کام بڑا صبر آزما اور مشکل ہے۔ جب تک استاد کو اپنے طالب علم کے پورے حالات سے واقفیت نہ ہو، وہ شخصیت اور کردار کی تعمیر و تشکیل کے کام کو خاطر خواہ انجام نہیں دے سکتا۔ طالب علم کے خاندانی حالات، اُس کے والدین کی ذہنی کیفیت، تعلیم کے مختلف مراحل، ماضی میں اُس کی پرورش کرنے والوں کے رویوں کو جاننا اساتذہ کے لئے ضروری ہے۔ اس کام کے لئے وقت دینا پڑتا ہے۔ ذاتی اور انفرادی طور پر طالب علموں کے معاملات و مسائل میں دلچسپی لینی پڑتی ہے۔ پورا ریکارڈ رکھنا پڑتا ہے اور اس کو اکثر کھنگالنا پڑتا ہے، تب کہیں جا کر شخصیت اور کردار سازی کا یہ کام انجام پاتا ہے۔

ہمارے ہاں آج کل بیشتر طالب علموں کو شروع سے آخر تک معیاری، صحیح و صحت مندانہ تعلیمی ماحول نصیب نہیں ہوتا۔ ان میں سے بیشتر ایسے اسکولوں میں تعلیم حاصل کرتے ہیں جہاں صحیح تعلیم

اور تربیت نام کی کوئی چیز نہیں ہوتی۔ اساتذہ تک اس صورت حال سے واقف نہیں ہوتے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اساتذہ کی جہالت، بے اعتنائی، بے حسی اور سفاکی کا شکار ہوتے ہیں۔ بات بات پر مار کھاتے ہیں اور آئے دن جسمانی اور ذہنی اذیتوں سے دوچار رہتے ہیں۔ اس لئے کالج اور یونیورسٹیوں تک پہنچتے پہنچتے وہ خاصی حد تک نفسیاتی مریض ہو جاتے ہیں۔ احساسِ کمتری ان کے ہاں احساسِ برتری کی صورت میں ظاہر ہونے لگتا ہے۔ جھنجھلاہٹ، جھلاہٹ ہنگامہ پسندی انہیں کہیں کا نہیں رہنے دیتی۔ یونیورسٹیوں میں پہنچ کر انہیں کسی حد تک آزادی نصیب ہوتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس تبدیلی کے نتیجے میں بیشتر بے مہار ہو جاتے ہیں۔ اختلاف کو برداشت نہ کرنا، لڑنا جھگڑنا اور توڑ پھوڑ کرنا ان کا مزاج بن جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ان حالات میں تعلیم و تربیت ممکن نہیں۔ جب طالب علم بدتمیزی کو اپنا شعار بنا لیں اور لڑنے جھگڑنے پر آ جائیں، ہر وقت راست اقدام کی دھمکیاں دیتے ہوں اور اُن کے ہاتھوں میں کتابوں کی جگہ ہتھیار آ جائیں تو ظاہر ہے کہ نظام تعلیم کی کوئی کل سیدھی نہیں رہ سکتی۔

اس کا علاج نہ تو ان سے ڈر اور خوف ہے، نہ بے اعتنائی اور بے رخی، نہ خوشامد ہے، نہ زمانہ سازی اور مصلحت پسندی۔ اس کا علاج تو صرف یہ ہے کہ شفقت اور محبت کے ساتھ طالب علم کو اپنے شیشے میں اتار کر اُن کی کردار سازی اور شخصیت کی تعمیر و تشکیل کا کام انجام دیا جائے، یہ کام تو رسمی تعلیم سے بھی زیادہ ضروری ہے۔

میں ساری زندگی یہ کام کرتا رہا اور مجھے اس کی بدولت اپنے طالب علموں کی طرف سے وہ عزت اور محبت نصیب ہوئی جو میری زندگی کا بہت بڑا سرمایہ ہے۔ سیاسی انتشار کے دورِ پُرآشوب میں بھی جب طالب علم آپے سے باہر ہو گئے تھے، میری بات ہمیشہ مانتے تھے۔ اور اربابِ اختیار حیران تھے کہ اس شخص سے کوئی طالب علم نہ تو بدتمیزی کرتا ہے، نہ اس کے بارے میں کوئی ایسی بات کہتا ہے جس سے عزت و احترام مجروح ہو اور اس کے وقار پر آنچ آئے۔

نظام تعلیم کی ہر سطح پر استاد کا کام بہت ہی مشکل اور صبر آزما ہوتا ہے۔ لیکن جب ان تھک محنت اور لگن کے بعد اس کو اپنے مقصد میں کامیابی ہوتی ہے تو اس کا سینہ مسرتوں سے معمور ہو جاتا ہے۔ کم و بیش وہی کیفیت جو کھیتوں میں کام کرنے والے کسان کو اپنی فصلوں کو لہلہاتے ہوئے دیکھ کر نصیب ہوتی ہے۔

استاد کے پاس طاقت نہیں ہوتی، اس کے پاس بندوق نہیں ہوتی، کلاشنکوف نہیں ہوتا۔ اُس کے پاس تو صرف علم و دانش، فہم و فراست اور شفقت کے ہتھیار ہوتے ہیں، جن سے وہ میدان مارتا ہے اور فتح حاصل کرتا ہے۔

علامہ اقبالؒ نے عرصہ ہوا، اپنی ایک فارسی مثنوی میں ہمالہ، اٹک اور رود گنگ کو مخاطب کر کے پیر مردوں کے فراست سے، اور نوجوانوں کے محبت سے محروم ہونے کا شکوہ کیا تھا اور اس صورت حال کو معمول پر لانے کے لئے انقلاب کی آواز بلند کی تھی۔ یہ اشعار کس درجہ جذب و شوق سے معمور اور کتنے خوبصورت ہیں ؎

اے ہمالہ! اے اٹک، اے رودِ گنگ!
زیستن تا کے چناں بے آب و رنگ
پیر مرداں از فراست بے نصیب
نوجواناں از محبت بے نصیب
شرق و غرب آزاد و ما نخچیرِ غیر
خشتِ ما سرمایۂ تعمیرِ غیر
کس نداند جلوۂ آب از سراب
انقلاب، اے انقلاب اے انقلاب!

آج بھی میں ان اشعار کو عالمِ جذب و شوق میں بار بار پڑھتا ہوں بلکہ ہر وقت ان کا ورد کرتا ہوں۔

تعلیمی نظام میں 'جرم و سزا' کے "کاروبار" کا میں کبھی بھی قائل نہیں رہا کیونکہ میرے خیال میں تعلیم کا کاروبار ولیوں اور درویشوں کا کاروبار ہے۔ اس میں نہ تو کسی کو جرم کا مرتکب سمجھنا چاہیئے نہ کسی کو جرم کی سزا دینی چاہیئے کیونکہ اس سے مسائل کبھی حل نہیں ہوتے برخلاف اس کے پیچیدہ سے پیچیدہ تر ہو جاتے ہیں۔ اس پیچیدگی سے دامن بچا کر چلنے کے لئے وہی واحد راستہ ہے جو ہمارے صوفیائے کرام، ولیوں اور درویشوں نے بنا دیا ہے، اور جو شفقت اور محبت اور عفو و درگذر کا راستہ ہے۔

آج کل ہمارے ہاں تعلیم کو اور خصوصاً اعلیٰ تعلیم کو محدود کرنے کا بڑا چرچا ہے۔ میرے خیال میں تعلیم کو محدود کرنا خودکشی کے مترادف ہے۔ ہمارے ہاں تعلیم ہے ہی کتنی؟ مشکل سے بیس پچیس فی صد بچے تعلیم حاصل کرتے ہیں، اور وہ بھی غلط اور غیر صحت مندانہ تعلیمی ماحول میں، اور اعلیٰ تعلیم تو تین چار فی صد سے زیادہ نہیں ہے۔ ہمارے ہاں ارباب اختیار کی نادانی، بے حسی، بے اعتنائی، تن آسانی اور خود غرضی نے تو ہمارے ہاں آج کل تعلیم کو کچھ اور بھی محدود کر دیا ہے۔ یہ لوگ مغرب کی اندھی تقلید کی وجہ سے اس ملک میں بھی اعلیٰ تعلیم کو محدود کر دینا چاہتے ہیں۔ ان کو کون سمجھائے کہ مغرب کے معاشرتی ماحول میں نوجوان لڑکے لڑکیاں پندرہ سولہ سال کی عمر تک پہنچ کر اپنے آپ کو آزاد محسوس کرتے ہیں، اور اپنے والدین سے الگ ہو کر اپنا علیحدہ گھر بنا لیتے ہیں۔ اور انہیں کہیں نہ کہیں ملازمتیں مل جاتی ہیں۔ اس لئے بیشتر کو اعلیٰ تعلیم کے حصول کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوتی۔ صرف وہی لوگ اعلیٰ تعلیم کی منزل تک پہنچتے ہیں جن کو شوق ہوتا ہے اور جو اپنے شوق کے میدانوں میں کچھ کرنا چاہتے ہیں لیکن اپنے ملک میں معاشرتی حالات اس سے بالکل مختلف ہیں۔ یہاں تو جن نوجوانوں کو تعلیم سے محروم کر دیا جاتا ہے وہ بیکار پھرتے ہیں۔ ڈنڈے بجاتے ہیں اور ہنگامہ کرنے کے لئے بہانے ڈھونڈتے ہیں کیونکہ تعلیم انہیں نصیب نہیں ہوتی اور صحیح تعلیم نہ ہونے کی وجہ سے وہ زندگی کے بنیادی حقائق کو سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں۔

آج کل ہمارے ہاں یہ جو مختلف قسم کے گھناؤنے جرائم کی تعداد روز افزوں ہے، اور

ہمارے معاشرے میں ظلم وستم، سفاکی و بے رحمی، قتل و غارت گری کا جو روز بروز اضافہ ہو رہا ہے، اس کا بنیادی سبب یہی صورت حال ہے۔

انسانیت، شرافت، نیکی، سچائی، رحم دلی، محبت اور خدمت انسان کے جوہر ہیں۔ یہ خصوصیات اس کو صحیح معنوں میں انسان بناتی ہیں۔ ان تمام خصوصیات کو اپنے اندر پیدا کرنے کے لیے انسانی رشتوں کا صحیح احساس اور زندگی کی قدروں اور معیاروں کا صحیح شعور ضروری ہے۔ یہ احساس وشعور صرف اعلیٰ تعلیم ہی سے پیدا کیا جا سکتا ہے۔

ہمارے معاشرے میں ادھر کچھ عرصے سے اعلیٰ تعلیم کو سائنس، ٹیکنالوجی، اور میڈیسن کے مترادف سمجھ لیا گیا ہے۔ ایک دوڑ ہے جو ان راستوں پر دوڑی جا رہی ہے۔ یہ ایسی کچھ بُری بات نہیں ہے، ہمیں سائنس دانوں، ٹیکنالوجی کے ماہروں اور ڈاکٹروں کی ضرورت ہے لیکن ان سب کو پہلے انسان بھی تو بننا چاہیے۔ کیونکہ صحیح انسان بننے کی جتنی ضرورت ہمیں آج ہے اس سے قبل شاید کبھی بھی نہیں تھی۔

میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ صحیح انسان بننے اور انسانی رشتوں کو سمجھنے کے لئے ادب وسیع کا مطالعہ کرنا اور اس سے صحت مندانہ دلچسپی لینا ازبس ضروری ہے کیونکہ ادب کے مطالعے ہی سے انسان کی عظمت اور اس کی اہمیت کا احساس افراد کے دلوں میں جگہ بناتا ہے۔ ادب انسانوں سے محبت کرنا سکھاتا ہے، تہذیب و شائستگی کے چراغ روشن کرتا ہے۔ دلوں میں زندگی کی بنیادی قدروں کی شمعیں فروزاں کرتا ہے۔ انسانیت، شرافت، نیکی، محبت، رحم دلی کی اعلیٰ و ارفع قدریں اسی کے ہاتھوں پروان چڑھ سکتی ہیں۔

اس لئے میرے خیال میں تعلیم کی ہر سطح پر اور ہر ڈسپلن میں ادب کا مطالعہ لازمی ہے۔ سائنس ہو یا ٹیکنالوجی، فلسفہ ہو یا نفسیات، تاریخ ہو یا معاشیات و عمرانیات اس کے ساتھ جب تک ادب وشعر سے رابطہ نہیں رکھا جائے گا ہم حیوانیت اور بربریت کی طرف رواں دواں رہیں گے۔ آج کل ہمارا معاشرہ اسی صورت حال سے دوچار ہے۔

یہ باتیں میں صرف اس لئے نہیں کہ رہا ہوں کہ میں ادب کا طالب علم اور استاد ہوں۔ یہ میرا ذاتی تجربہ ہے۔ میرے وہ ہزارہا طالب علم جو میرے ساتھ ادب و شعر کا مطالعہ کرتے رہے ہیں اور اب پاکستان، ہندوستان، انگلستان، امریکہ، روس، چین، جرمنی، فرانس اور ترکی وغیرہ میں پھیلے ہوئے ہیں، ان میں سے دو چار مستثنیات کو چھوڑ کر سب کے سب ایسے مہذب شائستہ اور انسان دوست ہیں کہ انہیں صحیح معنوں میں انسان کہا جا سکتا ہے ——— اور یہ سب کچھ ادب کے مطالعے کا فیضان ہے۔

آج کل میں انہیں خیالات میں کھویا رہتا ہوں۔

گذشتہ نصف صدی میں ادب میرا اوڑھنا بچھونا رہا ہے، اور اسی کا یہ اثر ہے کہ میں انسان کو خودی اور خودداری سے محروم، بے عزت اور بے وقعت نہیں دیکھ سکتا۔ جھگڑے، فساد جبر و استبداد اور جبر و ستم سے مجھے شدید نفرت ہے۔ بندوق سے مجھے ڈر لگتا ہے۔ بندوق کو میں برداشت نہیں کر سکتا کیونکہ بندوق خون بہاتی ہے۔ میں خون نہیں دیکھ سکتا۔ انسان تو خیر بڑی چیز ہے اشرف المخلوقات ہے، جانور تک کا خون مجھ سے نہیں دیکھا جاتا۔ ایذا رسانی میرے خیال میں سب سے بڑا گناہ ہے۔ میں تو اپنے دشمن تک کو تکلیف اور اذیت کے عالم میں نہیں دیکھ سکتا۔ میرے پاس تو دشمن کے لئے بھی محبت ہی محبت ہے۔

اور یہ سب کچھ ادب کے ساتھ والہانہ وابستگی کی دین ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ محبت انسان کے لئے سب سے بڑی دولت ہے۔ یہ دولت بیش بہا اس کے ہاتھ آجائے تو پھر اسے کسی دولت کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ یہی وہ دولت بیش بہا ہے جس سے انسانی زندگی کو جنت بنایا جا سکتا ہے، اور اسی کی بدولت یہ دنیا فردوس بریں کا وہ روپ اختیار کر سکتی ہے جس کے سبز باغ آئے دن ہمیں دکھلائے جاتے ہیں اور جس سے ہمکنار ہونے کے لئے ہم رہ وادیٔ خیال کو مستانہ وار طے کرتے رہتے ہیں۔

محبت کی معنویت میں بڑی وسعت اور کشادگی، گہرائی اور گیرائی، رنگا رنگی

اور بوقلمونی ہے۔ وہ روشنی ہی روشنی ہے، نور ہی نور ہے۔ وہ تاریکیوں کو روشنی سے ہمکنار کرتی ہے۔ حُسن کا احساس دلاتی ہے، حُسنِ نظر پیدا کرتی ہے، کائنات کو حسین دلکش اور دلآویز بناتی ہے۔ حیاتِ انسانی کو زندگی بخشتی ہے، انسانی رشتوں کی اہمیت کو دل نشیں کرتی ہے، دلوں میں درد کو جگاتی ہے، سوز و گداز کو بیدار کرتی ہے، اور جذبات و احساسات کا تہذیب و شائستگی سے آشنا کرتی ہے۔ ذہن کے دریچوں کو کھولتی ہے۔ بصارت اور بصیرت کے چراغ جلاتی ہے، فہم و فراست کی شمعیں فروزاں کرتی ہے اور اس طرح انسان کو زندگی سے دلچسپی لینے، اس کو بسر کرنے، برتنے، اس سے رس نچوڑنے اور اس کی مسرتوں سے سینہ بھر لینے کے آداب آتے ہیں۔

جگر صاحب نے کیا خوب کہا ہے ؎

محبت زندگی ہی زندگی ہے
مگر تجھ بن مرے کس کام کی ہے

ڈاکٹر عبادت بریلوی

کی

کتابیں

اقبالیات

۱۔ جشن نامۂ اقبال (اردو)		شائع کردہ یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور
۲۔ جشن نامۂ اقبال (انگریزی)		〃
۳۔ اورینٹل کالج میگزین اقبال نمبر (اردو)		〃
۴۔ اورینٹل کالج میگزین، اقبال نمبر (انگریزی)		〃
۵۔ اقبال کی اردو نثر		اقبال اکیڈمی، لاہور
۶۔ اقبال ـــــ احوال و افکار		مکتبۂ عالیہ، لاہور
۷۔ جہانِ اقبال (ادبی سوانح) (زیر طبع)		ادارۂ ادب و تنقید، لاہور
۸۔ اقبال کی غزل	〃	〃
۹۔ منظوماتِ اقبال	〃	〃
۱۰۔ اقبال کا فن	〃	〃

ادبی دریافت (نادر قلمی نسخوں کی دریافت اور ترتیب و تدوین)

۱۱۔ شگفتہ، مولفہ مرزا کاظم علی جوان (مع مقدمہ)		اردو دنیا، کراچی
۱۲۔ ہفت گلشن، مولفہ مظہر علی خاں ولا	〃	〃
۱۳۔ مادھونل اور کام کندلا	〃 〃	〃
۱۴۔ دیوانِ ولا	〃 〃	ادارۂ ادب و تنقید، لاہور

۱۵۔ گلزارِ چین، مولفہ خلیل علی خاں اشک (مع مقدمہ)		ادارۂ ادب و تنقید لاہور
۱۶۔ رسالۂ کائنات 〃	〃	〃
۱۷۔ شگوفۂ فرنگ، مولفہ آغا جو شرف	〃	〃
۱۸۔ چار گلشن، مولفہ بینی نرائن جہان	〃	〃
۱۹۔ دیوانِ مبتلا، مولفہ عبید اللہ خاں مبتلا	〃	〃
۲۰۔ دیوان حیدری، مولفہ سید حیدر بخش حیدری	〃	〃
۲۱۔ مختصر کہانیاں 〃	〃	〃
۲۲۔ تذکرۂ گلشن ہند 〃	〃	〃
۲۳۔ گلزارِ دانش (دفتر اول) 〃	〃	〃
۲۴۔ گلزارِ دانش (دفتر دوم) 〃	〃	〃
۲۵۔ مرقعِ مخلص، مولفہ آنند رام مخلص (مع مقدمہ و حواشی)		〃
۲۶۔ ڈاکٹر جان گلکرسٹ کی انگریزی نظمیں، مولفہ ڈاکٹر جان گلکرسٹ		〃
۲۷۔ نقلیات ہندی جلد اول و دوم	〃	〃
۲۸۔ افسانۂ عشق، مولفہ الٰہی بخش شوق، اکبر آبادی مع مقدمہ		〃
۲۹۔ سیاحت نامہ مولفہ نواب کریم خاں مع مقدمہ		〃
۳۰۔ نالۂ درد، مولفہ حضرت خواجہ میر درد (اردو ترجمہ مع مقدمہ)		〃
۳۱۔ نکات الشعراء، مولفہ میر تقی میر (مع مقدمہ و حواشی		〃
۳۲۔ دیوانِ فارسی، مولفہ حضرت خواجہ میر درد	〃	〃
۳۳۔ جشن نامہ اورینٹل کالج (جلد اول)		〃
۳۴۔ جشن نامہ اورینٹل کالج (جلد دوم)		〃
۳۵۔ خطوط عبدالحق بنام عبداللہ چغتائی (مع مقدمہ و حواشی)		〃

تحقیق و تنقید

۳۶۔ اردو تنقید کا ارتقاء	انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی

۳۷۔ روایت کی اہمیت	انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی
۳۸۔ غزل اور مطالعہ غزل	"
۳۹۔ خطباتِ عبدالحق : مع مقدمہ	"
۴۰۔ مقدماتِ عبدالحق : مع مقدمہ	اردو مرکز لاہور
۴۱۔ انتخابِ خطوطِ غالب "	"
۴۲۔ تنقیدی زاویے (پہلا ایڈیشن)	مکتبۂ اردو لاہور
(دوسرا ایڈیشن)	اردو مرکز لاہور
۴۳۔ تنقیدی تجربے	اردو دنیا کراچی
۴۴۔ مومن اور مطالعۂ مومن	"
۴۵۔ جدید شاعری	"
۴۶۔ کلیاتِ میر (مع مقدمہ)	"
۴۷۔ کلیاتِ مومن "	"
۴۸۔ شاعری اور شاعری کی تنقید	"
۴۹۔ سحرالبیان — ایک تنقیدی مطالعہ	اورینٹل کالج لاہور
۵۰۔ غالب اور مطالعۂ غالب	رائٹرز اکیڈمی، لاہور
۵۱۔ غالب کا فن	گلوب پبلشرز، لاہور
۵۲۔ اقبالؒ کی اردو نثر	اقبال اکیڈمی، لاہور
۵۳۔ اقبالؒ — احوال و افکار	مکتبۂ عالیہ لاہور
۵۴۔ میر تقی میر (حیات اور شاعری)	ادارۂ ادب و تنقید لاہور
۵۵۔ ولی اورنگ آبادی "	"
۵۶۔ پاکستان کے تہذیبی مسائل	"
۵۷۔ حضرت خواجہ میر دردؒ	"
۵۸۔ ادب اور ادبی قدریں	"

۵۹۔ تنقید اور اصول تنقید	ادارۂ ادب و تنقید، لاہور
۶۰۔ افسانہ اور افسانے کی تنقید	〃
۶۱۔ شاعری کیا ہے؟	〃
۶۲۔ جہانِ میر	〃
۶۳۔ میر کی غزل	〃
۶۴۔ منظوماتِ میر	〃
۶۵۔ نظیر اکبرآبادی	〃
۶۶۔ جدید اردو ادب	〃
۶۷۔ فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات	〃
۶۸۔ میر امن دہلوی	〃
۶۹۔ سید حیدر بخش حیدری	〃
۷۰۔ ڈاکٹر جان گلکرسٹ	〃

رپوتاژ، ڈائری وغیرہ

۷۱۔ ارضِ پاک سے دیارِ فرنگ تک	گلوب پبلشرز، لاہور
۷۲۔ جشنِ صد سالہ اورینٹل کالج لاہور	اورینٹل کالج، لاہور
۷۳۔ جشنِ اقبال، نئی دہلی	〃
۷۴۔ آزادی کے سائے میں (زیر طبع)	ادارۂ ادب و تنقید، لاہور
۷۵۔ اورینٹل کالج میں تیس سال 〃	〃
۷۶۔ لندن میں پانچ سال 〃	〃
۷۷۔ لندن کی ڈائری ،	〃

خاکے

۷۸۔ رو نوردِ شوق	ادارۂ ادب و تنقید، لاہور
[illegible] گمان عشق	

۸۰۔ جلوہ ہائے صد رنگ		ادارۂ ادب و تنقید، لاہور
۸۱۔ یارانِ دیرینہ		〃
۸۲۔ شجر ہائے سایہ دار		〃

ادبی سوانح

۸۳۔ یادِ عہدِ رفتہ (خود نوشت)	زیر طبع	〃
۸۴۔ جہانِ میر	〃	〃
۸۵۔ جہانِ اقبالؒ	〃	〃
۸۶۔ جہانِ غالب	〃	〃
۸۷۔ سر سید احمد خاں	〃	〃
۸۸۔ مولانا حسرت موہانی	〃	〃
۸۹۔ جگر مراد آبادی	〃	〃
۹۰۔ بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق	〃	〃
۹۱۔ جوش ملیح آبادی	〃	〃
۹۲۔ مطبوعہ و غیر مطبوعہ خطوطِ اقبالؒ (علامہ اقبالؒ کے خطوط کی ترتیب و تدوین مع مقدمہ و حواشی)		〃
۹۳۔ غیر مطبوعہ خطوط بابائے اردو بنام عبادت بریلوی		〃
۹۴۔ غیر مطبوعہ خطوط نیاز فتحپوری	〃	〃
۹۵۔ غیر مطبوعہ خطوط طاہر فاروقی	〃	〃
۹۶۔ غیر مطبوعہ خطوط پروفیسر سید احتشام حسین	〃	〃
۹۷۔ غیر مطبوعہ خطوط پروفیسر سید مسعود حسن ادیب	〃	〃
۹۸۔ غیر مطبوعہ خطوط محمد حسن عسکری	〃	〃
۹۹۔ غیر مطبوعہ خطوط نالعت رسل	〃	〃
۱۰۰۔ مقالات عبدالحق (چار جلدیں)		

ڈاکٹر عبادت کی نئی کتابیں

◆

ترکی میں دو سال

ترکی کا سفرنامہ جو پاکستان کے برادر ملک ترکی کی تعلیمی، علمی، معاشرتی اور تہذیبی زندگی کی تصویروں کا ایک حسین و دلآویز مرقع ہے۔ قیمت: چالیس روپے

◆

دیارِ حبیبؐ میں چند روز

سعودی عرب کا سفرنامہ، جس میں عمرہ اور حج کی تفصیل ہے اور مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ اور دوسرے مقدس مقامات کا حال جذب و شوق کے ساتھ لکھا گیا ہے۔

قیمت: پچاس روپے

◆

یادِ عہدِ رفتہ

ڈاکٹر عبادت بریلوی کے خود نوشت حالات اس میں گذشتہ نصف صدی کے حالات کی تفصیل ہے۔ قیمت: سو روپے

◆

آزادی کے سائے میں

قیام پاکستان کے وقت کی خوں چکاں داستان کی تفصیل

قیمت: ساٹھ روپے

یادِ عہدِ رفتہ

ڈاکٹر عبادت بریلوی